وَلۡتَکُنۡ مِّنۡکُمۡ اُمَّۃٌ یَّدۡعُوۡنَ اِلَی الۡخَیۡرِ وَیَاۡمُرُوۡنَ بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَیَنۡہَوۡنَ عَنِ الۡمُنۡکَرِ ؕ وَاُولٰٓئِکَ ہُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿﴾ (آلِ عمران: ۱۰۴)

اور تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہئے کہ بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھی بات کا حکم دیں اور بُری سے منع کریں اور یہی لوگ مُراد کو پہنچے۔

اَنۡوَارُ الۡقُرۡآن

از افادات

مبلغ افریقہ علامہ مفتی قاضی انوار الحق رحمۃ اللہ علیہ

شمس آباد ضلع اٹک پاکستان

(؁۱۹۰۸ء/؁۱۹۸۱ء)

ترجمہ فارسی و عربی

مولانا محمد ایوب خان چشتی (فاضل بھیرہ شریف)

نظرِ ثانی

صاحبزادہ ڈاکٹر قاضی امجد حسین کاظمی

ترتیب و تدوین

ظفر محمود قریشی

انوارِ حقہ پبلی کیشن ضلع اٹک۔ پاکستان

جملہ حقوق بحق ناشر محفوظ ہیں

کتاب: اَنْوَارُ الْقُرْآن (تفسیر سورۃ الفاتحہ)
از افادات: علامہ مفتی قاضی انوار الحق رحمۃ اللہ علیہ
اشاعت اوّل: (۱۹۳۹ء)
اشاعت دوم: (۲۰۱۹ء)
نظرِ ثانی: صاحبزادہ ڈاکٹر قاضی امجد حسین کاظمی
ترجمہ فارسی وعربی: مولانا محمد ایوب خان چشتی (فاضل دار العلوم بھیرہ شریف)
ترتیب وتدوین: ظفر محمود قریشی
ناشر: ادارہ انوارِ حقہ پبلی کیشن ضلع اٹک
ہدیہ: 1400

ملنے کے پتے:

قاضی ڈینٹل ہسپتال مدنی روڈ اٹک (0321-5712878)
امجد ڈینٹل ہسپتال ریتلہ منڈی روڈ حضرو ضلع اٹک
اسجد ڈینٹل ہسپتال راولپنڈی روڈ فتح جنگ ضلع اٹک
ادارہ جمالیات۔ مدینہ کمپیوٹر بالمقابل TMA اٹک
کتب خانہ مقبولِ عام، اُردو بازار اٹک
تشکیل بک ڈپو، اُردو بازار اٹک
صہیب سروسز میونسپل پلازہ اٹک
یونیورسٹی بک ڈپو، یونیورسٹی پشاور

اَنْوَارُ الْقُرْآن

کے مطالب کی فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ نمبر
1	پیش لفظ (صاحبزادہ ڈاکٹر قاضی امجد حسین کاظمی)	25
2	’’انوار القرآن‘‘ پر ایک نظر (پروفیسر زاہر حسن فاروقی)	33
3	وجہ تالیف	43
4	وجود باری تعالیٰ	45
5	وجود باری پر ایک بدو کا استدلال	45
6	امام صاحب کا ایک دہریے سے مناظرہ	46
7	تمام دنیا انسان کے لئے ہے	48
8	انسان کی پیدائش کا مطلب	49
9	شرک نہایت ذلت ہے	50
10	مسلمان اور علوم جدیدہ	51
11	پیغمبروں کی ضرورت	53
12	پیغمبروں کا معصوم ہونا ضروری ہے	55
13	نبی اور رسول کا فرق	56
14	پیغمبر جس قدر ہوئے سب انسان اور مرد تھے	57
15	عورت کو کیوں درجہ نبوت نہ دیا گیا	58
16	انبیاء علیہم السلام کی تعداد	59
17	حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی ممتاز تعلیم	60
18	وجہ فوقیتِ قرآن	60

19	عقل اور فطرت کا فرق	63
20	مسلمانوں کو سبق	65
21	عقل اور فطرت کے فرق کی وضاحت کے لئے دوسری مثال	65
22	نسخ شرائع پر اعتراض اور اس کا جواب	66
23	تحریف بدا اور نسخ کا فرق	67
24	قرآنی نسخہ پہلے نسخوں سے کیوں ممتاز ہے	68
25	تحریف کتبِ سابقہ	70
26	قرآن پاک تحریف سے پاک ہے اور پاک رہے گا	71
27	ساڑھے چار سال کی لڑکی حافظہ قرآن	72
28	حفاظ کی کثرت	73
29	مسلمانوں کا قرآن سے بے مثال عشق	73
30	بے مثال عشق کی تصدیق کے لئے ایک قیمتی ٹیبل	74
31	اعراب اور حفاظتِ قرآن	75
32	قرآن پاک کی علوم کے لحاظ سے تقسیم	77
33	قرآن زندہ زبان میں نازل کیا گیا	77
34	قرآن پاک کے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت	78
35	ملک الشعراء عتبہ بن ربیعہ اور قرآن	79
36	حضور ﷺ کے اُمّی ہونے کی حکمت	80
37	قرآن پاک کے بتدریج نازل ہونے کی حکمت	82
38	رجوع بمطلب	84
39	قرآن پاک کی تلاوت	89
40	قرآن پڑھنے کے آداب	92

41	اعوذ باللہ پر ایک اعتراض اور اس کا جواب	93
42	شیطان کا لغوی معنی اور اس کی توضیح	94
43	فرشتے، شیطان اور جن میں فرق	94
44	الرجیم کی تفسیر	96
45	اِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ کے متعلق ایک نکتہ	96
46	آدم اور ابلیس کی لغزش کا مقابلہ	97
47	إِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِيْنَ کی توضیح، ایک مثال سے نصیحت	99
48	حضرت آدم اور یونس علیہما السلام کی دعاؤں میں فرق ہونے کی وجہ	100
50	بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کے متعلق	101
51	سورۂ براۃ یا توبہ میں بسم اللہ نہ ہونے کی وجہ	102
52	سورہ براۃ پر بسم اللہ پڑھنے کا حکم	103
53	بسم اللہ سے سورۃ کو کیوں شروع کیا جاتا ہے	104
54	ہر کام بسم اللہ کہہ کر شروع کرو	104
55	قرآن پاک کو بائے سے شروع کرنے کی حکمت	105
56	کوہِ جودی کو اس کے انکسار کی وجہ سے عزت دی گئی	106
57	براق کا انکسار اور اس کا نتیجہ	107
58	رجوع بمطلب	107
59	ایمان بلا عمل کی مثال	111
60	بائے کی طرح صفات پیدا کرنے کی وصیت اور ایاز کا قصہ	112
61	اسم کی تفسیر	114
62	انسان کا اللہ کے ساتھ اور اللہ کا انسان کے ساتھ عاشق اور معشوق ہونے کا لطیف فرق	115
63	رجوع بمطلب	116

64	اللہ اسم اعظم	116
65	دعا کی قبولیت پر ایک اعتراض اور اس کا جواب	116
66	رحمت کی بارش اور اس پر مثنوی کے اشعار	118
67	اللہ کے حروف کے متعلق ایک نکتہ	120
68	تنبیہ	120
69	کلمہ اللہ ہی کے حروف سے بنا ہے	121
70	چلہ اور اس میں چالیس دن کی قید	121
71	الرحمٰن الرحیم کی تفسیر	123
72	رحمت خداوندی پر شبہ اور اس کا ازالہ	124
73	رحمٰن نام رکھنا	125
74	بسم اللہ کے نکات و برکات	125
75	بسم اللہ کے ۱۹ حروف اور جہنم کے ۱۹ مؤکلات	126
76	بسم اللہ شیطانی اذیت سے بچاتی ہے	127
77	کشتی نوح کی نجات کا باعث بسم اللہ ہی تھی	127
78	کفن پر بسم اللہ لکھنا اور اس کا شرعی حکم	128
79	ابوداؤد کی ایک حدیث اور اس پر ایک حکایت	128
80	بیوی کے پاس جاتے وقت کیا پڑھے	129
81	اولاد کو بسم اللہ سکھانے کا فائدہ	129
82	بسم اللہ شافی الامراض ہے	130
83	سورۂ فاتحہ قرآن کا نچوڑ ہے	130
84	سورۂ فاتحہ سورۃ المسئلہ ہے	131
85	عرضی کے چار اجزاء اور سورۃ فاتحہ کا ان پر اشتمال	131

86	سورہ فاتحہ کے ناموں کی کثرت حضور ﷺ کی کثیر محبت کی علامت ہے	133
87	فاتحہ خلف الامام اور امام صاحب کا کارآمد لطیفہ	133
88	مذاہب کے چار ہونے پر اعتراض اور اس کا جواب	135
89	تقلید کیوں ضروری ہے	136
90	چار مشہور امام	137
91	چاروں مذہب ایک اور اُمت کے لئے باعث رحمت ہیں	138
92	اعتراض کی دوسری شق کا جواب	139
93	رجوع بمطلب اور سورہ فاتحہ کے دوسرے نام	139
94	قرآن معارف کا ناپید اکنار سمندر ہے	140
95	اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کی تفسیر	141
96	الف ۔لام کی چار قسمیں	141
97	حمد کی تین قسمیں	142
98	نماز حمد کی تینوں اقسام کی جامع ہے	142
99	اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہا مگر الشکر للہ یا اَلْمَدْحُ لِلّٰہ کیوں نہ کہا	143
100	انسان اللہ تعالیٰ کی کما حقہ حمد کرنے سے عاجز ہے	145
101	لَا اَدْرِیْ کمالِ علم کی علامت ہے	146
102	ایک عالم نے اپنی علمیت اور جہالت کا مقابلہ کیسے کیا	147
103	نیم ملاؤں کا تکبران کی جہالت کا نتیجہ ہے	147
104	امام رازی کا ایک منکسرانہ قطعہ	147
105	استحقاق جنت رحمت سے ہوگا نہ عمل سے	149
106	ہماری ناقص حمد کے قبول ہونے کی وجہ	150
107	الحمد کا لفظ مسلمانوں کو علوم جدیدہ اور قدیمہ سیکھنے کی تلقین کرتا ہے	150

108	مسلمانوں کی جہالت کا افسوسناک مظاہرہ	152
109	علمائے متقدمین نے علوم کو کس طرح تقسیم کیا	152
110	لفظ الحمد سے ابتدا اور انتہا ہے	154
111	ذاتِ باری کے لئے تمام تعریفوں کے خاص ہونے کی وجہ لِلّٰہ	155
112	انسانوں کی حمد کرنے پر اعتراض اور اس کا جوب	155
113	چھینک کے متعلق	156
114	مسلمانوں کے لئے غور کرنے کا مقام	157
115	ایک مسلمان کے دوسرے پر چھ حقوق ہیں	157
116	سلام اور اس کی خوبیاں	157
117	جنگ بدر میں ایثار کامل کا مظاہرہ	158
118	آج مسلمان باوجود کثیر التعداد ہونے کے کیوں زبوں حالی کا شکار ہیں	159
119	اپنوں کی عداوت پر ایک دلچسپ حکایت	160
120	مسلمان ہی مسلمان کو کاٹتا ہے	161
121	دعوت کے قبول کرنے کے متعلق تفصیل	162
122	قرض کے مقراض محبت ہونے کی مثال	163
123	افلاس میں دوستوں سے کیا توقع ہو سکتی ہے	163
124	خیال رکھو کہ سنت کی ادائیگی میں فرض نہ چھوٹ جائیں	164
125	عیادت کے متعلق	165
126	سیدۃ النساء بی بی فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا کا ایک رقت خیز واقعہ	166
127	اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ، وَعَلِیٌّ بَابُہَا کے متعلق دلچسپ واقعہ	168
128	آجکل کی عیادت	169
129	مسلمان کے جنازے پر جانے کا ثواب	170

130	جنازہ اٹھانے کا طریقہ	171
131	دینی اور دنیوی فوائد کا مقابلہ	171
132	حضرت آدم اور دنیا کی بے ثباتی کے متعلق	173
133	مسلمانوں کی خیر خواہی	173
134	قوم کی تباہی سے ہر فرد تباہ ہو جاتا ہے	174
135	اعضاء کا دلچسپ مکالمہ اور اس کا انطباق تقریر سابق پر	175
136	دینی اتحاد ہی سچا اتحاد ہے	176
137	اسلامی اخوت کا ایک زبردست مظاہرہ	176
138	اسلام کی بینظیر مساوات	177
139	رب العالمین کی تفسیر	179
140	رب العالمین الحمد للہ کے دعوے کی دلیل ہے	179
141	لفظ رب میں دو دقیق اشارے	179
142	رب العالمین پر اعتراض اور اس کا جواب	180
143	خوارق کے متعلق	183
144	ارہاص، معجزہ، کرامت، معونت اور قضائے حاجت کا فرق	184
145	لفظ رب کا دوسرا اشارہ	184
146	مقربین ادنیٰ مخلوق کو بھی رنجیدہ نہیں کیا کرتے	185
147	اولاد کی تربیت میں والدین کا قصور	186
148	اولاد کی گستاخیاں ان کے علم دین سے بے بہرہ ہونے کا نتیجہ	187
149	بیٹے کی لیاقت سے باپ کی قابلیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے	187
150	رَبّ اور اَبّ کا فرق	188
151	پیغمبر اُمت کی محبت کی وجہ سے میراث نہیں چھوڑتے	190

152	اسلامی دُعا کے رَبَّنَا سے شروع ہونے کی وجہ	190
153	ضروریات کے دیئے جانے کو حسبِ مصلحت سے مقیّد کرنے کی وجہ	191
154	حسبِ مصلحت پر ایک لطیف حکایت	192
155	رَبُّ العالمین کے لفظ سے اسلام کے عالمگیر ہونے کا ثبوت	193
156	عالمین کے لفظ کی تشریح	194
157	تربیت انسانی کی دلچسپ اور حیرت انگیز تشریح	194
158	مسلمانوں کی غفلت کا دکھڑا	195
159	قرآن کو کیونکر سمجھ کر پڑھنے کی ضرورت ہے	196
160	رجوع تربیتِ انسانی	198
161	انسان عالمِ صغیر ہے اور اس کا مقابلہ عالمِ کبیر سے	202
162	حضرت علیؓ کی زبانِ دُرِفشاں سے تکبر کا بہترین علاج	204
163	من عرفہ نفسہ فقد عرف ربہ کا تربیتِ انسانی کے علم پر انطباق	205
164	تسمیہ کا الرحمٰن الرحیم فاتحہ کے الرحمٰن الرحیم سے الگ ہے	206
165	رحمت کا معنی اور اس کی اقسام	206
166	تسمیہ اور فاتحہ کے الرحمٰن الرحیم میں کیا فرق ہے	207
167	تسمیہ فاتحہ کا جزو نہیں	207
168	اسلام کی بنیاد رحمتِ خداوندی پر ہے	207
169	انسان کیا اور اس کی عبادت کیا	208
170	حمدِ ربی اور رحمتِ خداوندی لازم وملزوم ہیں	209
171	اللہ کی تربیت رحمٰن ورحیم سے مرکب ہے	210
172	رحمٰن اور رحیم کی صفتوں کو بترتیب عالم میں داخل کرنے کی وجہ	210
173	ہر بڑے چھوٹے کام میں رب العزت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے	211

174	رحمتِ خداوندی اور ضرورتِ انسانی کا تعلق	212
175	الحمد للہ کی رب العٰلمین تا رحیم بھی دلیل بن سکتے ہیں اور اس کی توضیح	214
176	رحمت خداوندی پر اعتراض اور اس کا جواب	214
177	بالشوزم سرمایہ داری کو مٹانے کا غلط علاج ہے	217
178	بالشوزم کا ملکی اثر	218
179	بالشوزم کا اخلاقی اثر	219
180	اسلام اور نسلی و مالی امتیازات	219
181	زکوٰۃ کے دینے اور سود لینے سے سرمایہ داری پر کیا اثر پڑتا ہے	221
182	دنیا کی موجودہ بے چینیوں کا واحد علاج اسلام ہے	222
183	مالک یوم الدین کی تفسیر	222
184	مالک اور مَلِک کا فرق	222
185	ملک کا لفظ تناسخ اور کفارہ کی تردید کرتا ہے	225
186	تناسخ کا رد	225
187	خوبصورتی اور بدصورتی کی حقیقت	226
188	ہارون الرشید کی دو لونڈیوں میں خوبصورتی کے متعلق دلچسپ بحث	227
189	تناسخ کی خرابیاں	228
190	انسانی حالات کے مختلف ہونے کی وجہ	229
191	مسئلہ کفارہ اور اس کا رد	230
192	مالک اور ملک کے فرق سے ایک ناصحانہ نکتہ	234
193	مالک کو یوم الدین کی طرف مضاف کر کے عام بادشاہوں کو کیا سبق سکھایا	234
194	بادشاہ کے عدل وظلم سے ملک کے متاثر ہونے کی مثال	235
195	صفتِ رحم کے ساتھ صفتِ مالکیت کو بیان کرنے کی وجہ	236

196	مالک یوم الدین کے الفاظ زندگی کے انجام کو دیا دلاتے ہیں	238
197	سورہ فاتحہ کے پانچ بیان کردہ اسمائے حسنیٰ پر ہی کسی حقانی مذہب کی بنیاد ہو سکتی ہے	239
198	مالکیت کو یوم الدین کے ساتھ مختص کرنے کی حکمت	239
199	جزاوسزا کے لئے دن مقرر کرنے پر دو اعتراض اور ان کے جوابات	240
200	عذابِ اُخروی پر ایک عجیب اعتراض اور اس کا جواب	244
201	اِیَّاکَ نَعۡبُدُ یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں	244
202	انسان صفاتِ خداوندی کا مظہر ہونے کے باوجود کیوں عبادت نہیں کیا جاتا	245
203	ہماری عبادت احساناتِ ربی کا بدلہ نہیں بلکہ یہ ایک مزید احسان ہے	247
204	عبادت کی چار قسمیں	249
205	نماز عبادت کے چاروں اقسام کی جامع ہے اور اس کی تشریح	249
206	مسجدوں کی صحیح آبادی اور اس پر ایک حکایت	250
207	نماز میں انتہائی انکسار کس طرح پایا جاتا ہے	252
208	عبادت تین خیالوں سے کی جاتی ہے اور ان کا فرق	252
209	جسے خالق مل گیا سب مخلوق اس کی ہوگئی	254
210	صوفیائے کرام کے غایت عبادت کے متعلق مختلف نظریئے	255
211	عاشقوں کی تین قسمیں اور ان کا فرق	257
212	امام حسن بصری ۔ مالک بن دینار اور رابعہ بصری کی عشقِ حقیقی کے متعلق دقیق گفتگو	258
213	بایزید بسطامی کی ایک عرض اور اس کا جواب	259
214	انانیت مقصود میں حائل ہوتی ہے اور اس کی مثال	259
215	بی بی صاحبہ کی تقریر کی طرف رجوع اور اس پر یوسف علیہ السلام کے قصے کا استشہاداً بیان	260
216	طوالع الشموس سے ایک ایسا ہی واقعہ	263
217	نفس کی چار قسمیں اور ان کے حجابات نمازی سے کیسے ہٹائے جاتے ہیں	264

218	ایاک نعبد میں جمع کا صیغہ کیوں لایا گیا	265
219	قرآن کے بحرِ معانی ہونے پر شبہ اور اس کا جواب	266
220	بجائے اعبد کے نعبد لانے میں راز	267
221	متعلقات نصوص	268
222	نماز باجماعت کی فضیلت اور مسلمانوں کی افسوسناک سستی	269
223	بے نماز انسان حیوان سے بھی بدتر ہے اور اس پر ایک لطیفہ	271
224	دربار شاہانہ میں سوال کس طرح کرنا چاہیے	274
225	ابونواس کا ہاروں رشید سے ایک عجیب طرز کا سوال	275
226	استعانتِ عابد میں ایک لطیف لطف	277
227	رضوانِ الٰہی سے بڑھ کر اور کوئی نعمت نہیں اور اس پر بابا فرید کا مقولہ	278
228	ایاک کا تکرار کیوں کیا گیا	281
229	اللہ سے تعلق جوڑنا اور غیر اللہ سے توڑنا ابواب رحمت کو کھول دیتا ہے	282
230	ایک بزرگ کی ابتلاء اور ان کا عدم استقلال	284
231	کتا پیر طریقت ہے	285
232	خدا اور رسول کے محب کو کس طرح ابتلاء کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے	288
233	مقام تسلیم اور شہاب الدین سہروردیؒ کا ایک واقعہ	291
234	کتے کے پیر طریقت ہونے کے باوجود شریعت نے اس کی ممانعت کیوں فرمائی	292
235	کتے والے گھر میں اگر فرشتے داخل نہیں ہوتے تو اس مکان کے لوگوں کا روح کون قبض کرتا ہوگا	294
236	استعانت پر عبادت کو مقدم کرنے میں اسرار لطیفہ	294
237	ابراہیم بن ادہمؒ کا ایک واقعہ	298
238	ظاہری اور باطنی بادشاہوں کے فرق مراتب کی مثال	299

239	الفقر فخری کی ایک مثال سے توضیح	300
240	مسلمانوں کی حالتِ زار اور ترقی کا غلط مفہوم	303
241	بنی اسرائیل کا وعدہ امت محمدیہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ کیسے پورا ہوسکتا ہے	304
242	فرعونِ زمانہ اور فرعونِ موسیٰ کا مقابلہ	305
243	توفیقِ عبادت بھی قربِ باری کی علامت ہے اور اس پر ایک حکایت	307
244	جبریہ قدریہ اور اہل سنت کے عقائد پر ایک تنقیدی مقالہ	309
245	چند اعتراض اور ان کے جوابات	312
246	الاسلام بین الجبر و القدر کے ادق مسئلہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کس طرح چند لفظوں میں بیان فرمایا	317
247	جبرئ عقیدہ باش وقدرئ عمل کی توضیح	317
248	استعانتِ عامہ کا پہلا درجہ اور سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت	319
249	ابراہیم علیہ السلام کی استغنا اور احتیاج	320
250	آگ کے برداً سلاماً ہونے پر شبہ اور اس کا جواب	321
251	عناصر ہماری نظر میں مردہ مگر خدا کے نزدیک زندہ ہیں	322
252	ہود علیہ السلام کے قصے سے ہوا وغیرہ کا تعقل ثابت کرنا	323
253	حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جواب کے نکات	324
254	صوفی وہ ہے جسے اللہ سے بھی حاجت نہ ہو اور اس کی توضیح	325
255	حضرت ابراہیم کی قید کا نمازی کی قید سے مقابلہ	326
256	استعانت عامہ کا دوسرا درجہ	326
257	انبیاء اور اولیاء سے استعانت اور اس کی تشریح	327
258	قُربِ نوافل میں عبد آلہ معبود فاعل بن جاتا ہے	331
259	ارہاص، معجزہ، کرامت وغیرہ کا فرق	332

260	انبیاء واولیاء مرتے نہیں بلکہ ان کی موت نقل مکانی ہے	333
261	اولیاء اللہ کی محبت	336
262	اولیاء اللہ کی محبت سے ایک شخص کو کیا فائدہ ہوا	337
263	لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ والی حدیث کی توضیح	339
264	عوام مقربین سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اس پر ایک حکایت	340
265	جھوٹے مدعیان ولایت کی حالت	341
266	اولیاء کے روپ اور بہروپ پر ایک قصہ	342
267	مرشد کامل اور اس کی علامات	343
268	مرشد بننے کے لئے شرائط	345
269	جاہل پیروں کے علم شریعت کے متعلق چند اعتراض اور ان کے جواب	347
270	شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کی تشریح	349
271	طریقت کے لئے علم شریعت کا جاننا ضروری ہے	350
272	ایک جاہل عابد کا عبرت انگیز حال	353
273	من اراد العبادۃ بعد الوصول فقد اشرك کا صحیح مطلب اور حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کا ارشاد	354
274	ظاہر و باطن کا تعلق	355
275	عشق کبھی بھی نہیں چھپ سکتا	357
276	عشق کے متعلق ایک عجیب نکتہ	358
277	مکار پیروں کا اعتراض کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُمّی تھے اس لئے طریقت کے لئے علم شریعت کی ضرورت نہیں اور اس کا جواب	359
278	علم اکتسابی اور وہبی کی مثال	359
279	فضائل علم وعلما	362

280	پیرانِ بے پیر کا آخری اعتراض اور اس کا جواب	366
281	وقوعہ سابقہ سے جاہل پیروں کا غلط استنباط اور اس کی تغلیظ	369
282	اھدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِیمَ کی تفسیر	370
283	اسلام سب انبیاء کا دین تھا	371
284	شریعت اور دین میں فرق	372
285	حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بنوت تمام عالم کے لئے ہے	374
286	حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنات کا ایمان لانا	375
287	جنات کے حاضرِ دربار ہونے کا دوسرا واقعہ	375
288	گوبر اور ہڈی سے استنجا کرنے کی کیوں ممانعت ہے	376
289	عالم کی موٹی تقسیم	377
290	ملائکہ کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانا	378
291	معجزہ شق القمر	378
292	شق القمر کے معجزے پر اعتراضات اور ان کے جوابات	379
293	الساعۃ کے لفظ پر ایک شبہ اور اس کا ازالہ	381
294	اُونٹ کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسول سمجھ کر سجدہ کرنا	386
295	استنِ حنانہ کا واقعہ	387
296	عالمِ جمادات کی شہادت	388
297	سنگریزوں کی شہادت کا واقعہ مولانا روم علیہ الرحمہ کی زبان سے	389
298	حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہونے کے علاوہ خاتم النبیین بھی ہیں	390
299	ختمِ نبوت کے مسئلے پر بحث کی ضرورت	391
300	مطلق نبوت کی ضرورت کا بیان	391
301	نسخِ شرائع غزارت علمی کی علامت ہے	392

302	نسخ کی ضرورت پر عقلی دلائل	392
303	نسخِ ضرورت کی مطابقت کا دوسرا نام ہے	393
304	جسمانی غذا کے طریقے پر روحانی غذا کا انطباق	393
305	مثالِ سابق سے ختمِ نبوت کا ثبوت	394
306	ختمِ نبوت کا ثبوت نقلی طور پر	395
307	آیت خاتم النبیین پر دلچسپ بحث	396
308	حضرت زید رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کو والدین کی محبت پر ترجیح دی	397
309	ہم اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	397
310	ایک انصاریہ کی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے مثال محبت	398
311	خواجہ عبد الخالق علیہ الرحمہ کا ایک عورت سے عشق کا سبق پڑھنا	398
312	نمازی کے آگے سے گزرنے کا شرعی مسئلہ	399
313	رجوع بقصۂ انصاریہ	401
314	ہم اور عشق رسول	402
315	رجوع بسوئے شان نزول آیت	402
316	مَّا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّن رِّجَالِكُمْ پر ایک اعتراض اور اس کا جواب	404
317	ما کان کا ولکن رسول اللہ و خاتم النبیین سے تعلق	405
318	لفظ خاتم کی تشریح	406
319	حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آپ کو کونے کا پتھر فرما کر ایک بہت بڑے راز کی طرف اشارہ فرمایا	407
320	حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قصر نبوت کا آخری پتھر ہونے پر عملی پیشینگوئی	409
321	حجر اسود کی موجودہ جگہ اللہ تعالیٰ نے متعین فرمائی	409
322	حجر اسود کے ابتدا میں سفید ہونے پر تاریخی شہادتیں	409

323	حجرِ اسود کی تبدیلیوں پر اعتراضات اور اُن کے جوابات	410
324	النبیین کا الف لام، عہدِ ذہنی نہیں بلکہ استغراقی ہے	412
325	اسلام دین فطرت ہے	413
326	اسلام کیوں صراط مستقیم ہے	414
327	اسلام کے صراط مستقیم ہونے کی واضح تفصیل	415
328	صراط مستقیم کو خاص رکھتے ہوئے تشریح	416
329	اللہ تعالیٰ کی ذات صفات اور افعال کے اعتقاد کے متعلق صراط مستقیم	416
330	صراطِ مستقیم کو عام کھتے ہوئے تشریح	419
331	انسان کا اندر تبدیل ہو جانے سے خفیہ اور ظاہری جرائم ختم ہو سکتے ہیں	420
332	اندرونی تبدیلی کی ترکیب	421
333	قوت شہویہ کے متعلق	422
334	نکتہ	423
335	قوت عقلیہ کے متعلق	424
336	قوت غضبیہ کے متعلق	425
337	مصلی نے اھدنی کی جگہ اھدنا کیوں کہا	426
338	اھدنا کے متعلق ایک حکایت	427
339	اھدنا کی لفظی تفسیر اور اس کے نکات	428
340	دعا کے متعلق	431
341	حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہزاروں دعاؤں سے مشتے نمونہ از خروارے	432
342	حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام	432
343	فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا کی طرح ام المومنین ام حبیبہ رضی اللہ عنہا کا ایک واقعہ	436
344	حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قوت اور رکانہ رضی اللہ عنہ کا امتحان و اسلام	438

345	متمم الاربعین سے اسلام کو کیا قوت ملی	438
346	مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات	439
347	حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعائے استسقاء اور اس کی فوری قبولیت	440
348	منکرین دعا اور ان کے شبہات	442
349	جواب شبہ اول بطریق الزام	443
350	جوابِ تحقیقی	444
351	تقدیر کی دو قسمیں	445
352	جواب شبہ دوم	445
353	دعا معجون عبادت ہے	446
354	توکل کی تشریح اور اس کے اقسام	446
355	یقین، ظن اور وہم کا فرق	447
356	جواب شبہ سوم	448
357	جواب شبہ چہارم	449
358	دعا کی فضیلت	450
359	کس کس کی دعا جلدی قبول ہوتی ہے	451
360	دعا کرنے والے کی ہیئت کے بیان میں	452
361	ہدایت کے معنی	454
362	لفظ ہدایت کے استعمال کا قاعدہ	455
363	ہدایت چار قسم کی ہے	455
364	ہدایتِ فطری	455
365	ہدایتِ احساسی	456
366	ہدایتِ عقلی	456

367	ہدایتِ الہامی	457
368	اعتراض اور اس کا جواب	457
369	نکتہ	460
370	اھدنا کی توضیح	460
371	انسان کا وجود اتحادِ عناصر کا نتیجہ ہے	461
372	انسان کا وجود ذاتِ باری پر زبردست دلیل ہے	462
373	اھدنا کے نا سے مسئلہ شفاعت کا استخراج	463
374	نام نہاد پیر اور ان کی شفاعت	465
375	ایک پیر کا دلچسپ قصہ	466
376	اصل کا کچھ فائدہ نہیں بلکہ عمل چاہیے اس پر ہارون الرشید کا واقعہ	468
377	شفاعت کی تشریح	471
378	حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا شفیعِ عاصیاں ہونا	472
379	سبیل اور طریق کو چھوڑ کر صراط لانے کی وجہ	473
380	پُلِ صراط	474
381	ارْجِعُوا وَرَاءَ کُمْ میں ایک لطیف اشارہ	475
382	مضمونِ سابق پر ایک نصیحت آموز واقعہ	476
383	عبادتِ مالی مردے کو ضرور فائدہ دیتی ہے	477
384	ندامت اور اس کی چار قسمیں	479
385	ندامتِ اخروی	480
386	صِرَاطَ الَّذِينَ أَنعَمتَ عَلَيهِمْ کی تفسیر	481
387	انبیاء علیہم السلام	482
388	وحی اور اس کی اقسام	482

389	الہام	483
390	انبیاء کی خوابیں وحی کا درجہ رکھتی ہیں اور اس پر یوسف علیہ السلام کی خواب	483
391	نئی روشنی والوں کا صحت خواب پر اعتراض اور اس کا جواب	486
392	حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خواب	487
393	حضرت اسماعیل علیہ السلام کی رقت انگیز وصیت	489
394	حضرت لقمان علیہ السلام کا ایک سبق آموز واقعہ	490
395	حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چھری پر غصہ کرنا اور چھری کا جواب لاجواب دینا	492
396	قرآن عناصر کو زندہ کہتا ہے	493
397	حضرت یوسف اور ابراہیم علیہما السلام کی خوابوں کا نتیجہ	494
398	وحی کی دوسری قسم	494
399	غیب دو قسم کا ہے	495
400	حب وطن از ملک سلیمان خوشتر است کا واقعہ	495
401	شیخ سعدی علیہ الرحمہ کے بے ثباتی دنیا کے متعلق اشعار	497
402	روح کی وطنِ ملکوتی کے لئے فریاد	497
403	حب الوطن من الایمان کا صحیح مطلب	499
404	لقائے خداوندی کا عاشق موت کو محبوب سمجھتا ہے	500
405	حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی موت سے محبت	502
406	رجوع بسوئے مضمون سابق اور غیب کی دوسری قسم کی توضیح	502
407	معتزلہ کیوں رویتِ باری کا انکار کرتے ہیں	503
408	ادراک اور رویت میں فرق	504
409	لقائے ربی کے امکان پر دلائل	504
410	من وراء حجاب میں حجاب سے کیا مراد ہے	506

411	پردے کے پیچھے سے بات کرنے کی مثال	506
412	حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بے خود ہونے اور دیدار نہ پاسکنے کے متعلق ایک نکتہ	507
413	خر موسیٰ کے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ	508
414	وحی کا تیسرا طریقہ	508
415	منعم علیہم کے دوسرے گروہ یعنی صدیق کے متعلق	509
416	قوتِ نظریہ اور قوت عملیہ کا بیان	510
417	صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے قوت نظریہ کے کمال کے باعث واقعہ معراج کی تصدیق کی	510
418	واقعہ معراج پر بعض شبہے اور ان کا ازالہ	511
419	معراج کے جسمانی ہونے پر دلائل	512
420	مداری انڈے کو کس طرح نچاتے ہیں اور اس سے سبق	515
421	خواجہ غریب نواز کی کھڑاؤں کا اڑنا	515
422	خواجہ صاحب کی کھڑاؤں میں طاقتِ پرواز کہاں سے پیدا ہوئی	516
423	مجلس کا اثر اور اس کی مثال سعدی علیہ الرحمہ کے اشعار میں	516
424	ریڈیم اور مقناطیس کا اثر اور اس سے ایک لطیف سبق	517
425	حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نور مجسم تھے	517
426	حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سایہ نہ ہونے پر اعتراض اور اس کا جواب	518
427	حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صورت بشری، ملکی اور حقی کی توضیح	518
428	ورفعنا لک ذکرک کی عجیب وغریب تفسیر	523
429	اذان کو ہر نماز سے اوّل کیوں لازمی قرار دیا گیا ہے	524
430	سجدہ غایت تذلل کیوں ہے؟	525
431	غیروں کے مذاق کا جواب ان کے مذاق سے دو	526
432	وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کی زندہ مثال	527

433	شہید کا بیان	528
434	جنگ بدر کا ایک عجیب واقعہ	529
435	صالحین کا بیان	530
436	صلح کل سے کیا مراد ہے؟	530
437	منافقت اور صلح عام کے فرق کی ایک مثال	530
438	منعم علیہم فرقوں کے رستوں پر چلنے کی تشریح	532
439	چار چیزیں جو ایک دوسرے کی حفاظت کرتی ہیں	532
440	خلاصہ کلام غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ کی تفسیر	533
441	صراط المستقیم میں افراط وتفریط اور اس کا یہود ونصاریٰ سے انطباق	535
442	انسان تمام کام دو خیالوں کے ماتحت کرتا ہے	536
443	تفریط اور افراط والے مغضوب علیہم اور ضالین کیوں ہیں	537
444	سورہ فاتحہ کے اختتام پر آمین کہنا سنت ہے	537
445	سورہ فاتحہ کی فضیلت اور بعض مجرب اوراد	538
446	خاتمہ ودعا	540

* * *

پیش لفظ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قرآن مجید کی تفسیر کا کام آقا کریم ﷺ کے زمانے سے لے کر اب تک اُمت میں ہو رہا ہے۔ ہر مفسر اس کلامِ مقدس کی تشریح اپنے مزاج اور وقت کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر کرتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا وہ لازوال، لاثانی، لافانی اور شاہکار کلام ہے جس کی خدمت میں اُمت کے چوٹی کے اکابرین اور صاحبانِ علم وفن نے اپنی زندگیاں کھپا دیں۔

حضرت امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے پانچ سو جلدوں پر مشتمل تفسیر قرآں کی۔ حضرت فخرالدین رازی رحمۃ اللہ علیہ نے بتیس جلدوں پر قرآن کی توضیحات لکھیں۔

علامہ آلوسی رحمۃ اللہ علیہ نے اٹھارہ جلدوں پر قرآن کی تشریحات لکھیں۔ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے چار جلدوں پر مشتمل رموزِ قرآنی بیان کیے۔ الغرض اس طرح سینکڑوں مفسرین جامع تفاسیر قرآن بیان کرتے نظر آتے ہیں۔ لیکن ہر مفسر کا یہی شکوہ ہوتا ہے کہ:

دفتر تمام گشت و بیاباں رسید عمر
ماہم چناں در اول وصف تو ماندہ ایم

اور یہ حق اور سچ ہے کہ اگر ساری انسانیت کو عمر نوح علیہ السلام مل جائے۔ تمام سمندروں کے پانی سیاہی میں تبدیل ہو جائیں اور زمین کے تمام درخت قلموں میں تبدیل ہو جائیں اور انسان کا ہر ہر بال لکھنے والا ہو جائے اور کائنات کا ذرّہ ذرّہ قرأت وسماعت میں مگن ہو جائے، تب بھی قرآن کے اسرار و رموز تک کماحقہٗ رسائی نہیں ہو سکتی۔

بہر حال قرآن کی تفاسیر پر اتنا لکھا گیا کہ اتنا کسی کتاب یا اس کے کسی موضوع پر نہ لکھا گیا۔ لکھنے والوں میں اپنے پرائے محقق، مدقق، ادیب، فلسفی، عربی، عجمی سب شامل ہیں۔ قرآن نے جس سے اپنی خدمت لی، اسے عزت وسعادت سے سرفراز فرما دیا۔

انھی عزتوں اور رفعتوں کو دیکھ کر بعض نادان دوستوں اور دوست نما دشمنوں نے بھی قرآن کا ترجمہ عربی لغات دیکھ کر اور اپنے خیالات کے مطابق تفسیر کر کے اس قبیل میں داخل ہونے کی کوشش کی۔ حالانکہ صرف قرآن مجید کے ترجمہ کے لیے بھی کم از کم اکیس علوم پر عبور درکار ہے۔ مثلاً نحو، معانی، بیان، بدیع، ادب، لغت، منطق، فلسفہ، فقہ، حدیث، تصوف اصول وغیرہ وغیرہ۔ اور اگلے علماء ان علوم میں اپنی پوری زندگیاں لگا دیتے تھے۔ پھر بھی آیات متشابہات کو ہاتھ نہ لگاتے، صرف محکمات کے ترجمہ کی کوشش کرتے اور گزشتہ سارے علوم کو مدِ نظر رکھتے۔ تفسیر کرتے وقت سارے مفسرین، محدثین اور فقہا کے فرمان پر نظر رکھتے تاکہ کسی غلطی کی وجہ سے پڑھنے والا بدمذہبی یا لادینیت کا شکار نہ ہو جائے لیکن اب نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ ہر خواندہ، ناخواندہ، انگریزی تعلیم یافتہ، عربی لغت کی تھوڑی باتیں یاد کر کے قرآن کے تراجم اور تشریحات لکھ رہا ہے، جس کی وجہ سے مسلمانوں میں روزانہ نئے نئے فرقے پیدا ہو رہے ہیں جو ایک دوسرے کو کافر، مشرک، مرتد اور خارج از اسلام سمجھتے ہیں لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ جو ترجمے اور تفسیر ادب اور اکابرین اُمت کی تفاسیر کے خلاف ہیں، ان سے پرہیز کی جائے۔ اس سلسلہ میں تفسیر خواہ قرآن کی ایک آیت کے متعلق ہو یا ایک سورۃ کے متعلق یا پورے قرآن کی ہو، دیکھیں کہ کیا اس سے ادبِ مصطفیٰ، عشقِ مصطفیٰ کی خوشبو آ رہی ہے کہ نہیں۔

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باُو نہ رسیدی تمام بولہبی است

”جو تفاسیر تمھیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دروازے پر پہنچائیں تو سمجھو کہ اصل دین ہے ورنہ قرآن پڑھ کر مقامِ مصطفیٰ سے ناآشنائی ہو جائے تو پھر یہ دین نہیں، بولھبی ہے۔“

قارئین کرام سے دردمندانہ گزارش ہے کہ آج ایک سازش کے تحت ایسی تفاسیر اور تراجم کی بھرمار کی جا رہی ہے جس سے دین کی اصل روح ختم ہو رہی ہے۔ لہٰذا تمام عاشقانِ مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے گزارش ہے کہ اوپر والے ترازو پر تولنے کے بعد نہ صرف خود بلکہ اپنے احباب میں بھی محبتوں اور عقیدتوں بھرے تراجم اور تفاسیر رکھنے کی تبلیغ کریں اور اگر صاحبِ استطاعت ہیں تو خوشیوں کے مواقع پر بجائے دنیوی

تحائف دینے کے، ایسی تفاسیر کے تحائف دیں جس سے ان کی دنیا اور آخرت سنور سکے۔

زیرِ نظر تفسیر سورۃ فاتحہ موسوم بہ ’’**انوار القرآن**‘‘ میرے والدِ گرامی، عاشق رسول ﷺ حضرت علامہ مفتی قاضی انوار الحق رحمۃ اللہ علیہ کے ان دروس کا مجموعہ ہے جو آپ نے تین ماہ کے عرصہ میں دیا اور جسے احباب کی پُر زور فرمائش پر پہلی مرتبہ ۱۹۳۹ء میں شائع کیا گیا۔

چونکہ آپ فتح پوری دہلی سے فارغ التحصیل ہونے کے ساتھ اس وقت کے گریجویٹ بھی تھے اس لیے دینی اور دنیوی علوم کے امتزاج نے انھیں ماڈرن طبقہ اور جدید تعلیم سے بہرہ ور لوگوں کے مزاج کو سمجھنے کا کافی ملکہ عطا کر رکھا تھا۔ وہ وقت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر اُس وقت کی بیماریوں کی پیارے انداز سے اصلاح فرماتے۔ پھر ظاہری علوم کے ساتھ باطنی علوم کی خوشبو ان کی تحاریر و تقاریر سے امڈ امڈ کر قلب و باطن کی گہرائیوں کو معطر اور مصفیٰ کر دیتی۔

جن لوگوں کو سورۃ فاتحہ کی اس تفسیر کے مطالعہ کا موقع ملا، ان کی بڑی خواہش تھی کہ اسے دوبارہ زیورِ طباعت سے آراستہ کیا جائے تاکہ نئی آنے والی نسل بھی اس سے مستفید ہو سکے۔

قیامِ پاکستان سے پہلے کے زمانے میں عام آدمی بھی فارسی سمجھنے کی کافی استعداد رکھتا تھا۔ اس لیے آپ کی بے ساختہ باتیں فارسی اشعار، الفاظ اور عربی اقوال سے مزین ہوتیں۔ پھر اس کتاب کے ناشرِ اول میرے عمِ محترم حضرت علامہ قاضی نور الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے سرِ ورق پر ہی اس خواہش کا اظہار کیا کہ اگر زبان کچھ ذرا سلیس ہوتی تو عوام کو استفادہ میں زیادہ آسانی ہوتی۔ پھر بعد کے تبصرہ نگاروں جیسے صوفی باصفا حضرت ندر صابری رحمۃ اللہ علیہ، جناب پروفیسر اشرف الحسینی صاحب وغیرھم نے اسی خواہش کا اظہار کیا۔ خصوصاً جناب پروفیسر زاہد حسن فاروقی صاحب نے تو تفسیر کے ضمن میں بیان، نکات و واقعات اور ان کی ترتیب پر بھی اظہارِ خیال فرمایا اور اس طرح اُن کا تبصرہ بجائے تبصرے کے، اس تفسیر کا دیباچہ بن گیا۔ اس لیے اسے بھی مِن وعن ’’**انوار القرآن**‘‘ کے شروع میں شائع کر دیا گیا ہے۔

اگرچہ ۱۹۱۱ء میں میرے برادرِ مکرم جناب صاحبزادہ پروفیسر قاضی محمد سلیم صاحب مدظلہٗ العالی، نے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب کا اختصار ’’فاتحہ القرآن‘‘ کے نام سے کیا جس میں ضمناً بیان کیے گئے واقعات

اور نکات کو چھوڑ کر صرف نفسِ مضمون پر توجہ دی گئی۔ ان کی یہ کتاب چیدہ چیدہ کتب خانوں پر دستیاب ہے۔
لیکن بقول قبلہ والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کہ:

> ''تفسیر کے دوران مضامین کا ایسا سلسلہ چھڑ جاتا ہے کہ اس غیر متعلق بات کو چھوڑ کر صرف موضوع تک مقید رہنا نہایت دشوار ہو جاتا تھا۔ پھر وہ غیر متعلق بات بیان میں ایسے مرتبت اور منظم طریقے سے خود بخود چلی آتی تھی کہ اگر اسے عمداً چھوڑ دیا جاتا تو پھر بیان بے لذت اور غیر منظم ہو جاتا۔ اس کے علاوہ بعض غیر متعلق باتیں میرے خیال میں ایسی اہم اور مفید ہیں کہ ان کو چھوڑنا گویا واعظانہ تفسیر کو بدلنا تھا۔''

آپ رحمۃ اللہ علیہ کی اسی تحریر پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر زاہد حسن فاروقی صاحب نے سچ فرمایا:

> ''یہ غیر متعلق باتیں دراصل وہ مسائل ہیں جو سورۃ فاتحہ کی تفسیر کے بیان میں ضمنی طور پر سامنے آئے لیکن آپ رحمۃ اللہ علیہ ان سے صرفِ نظر کرنے کے بجائے بڑی خوب صورتی سے توضیحات پیش کر کے اصل موضوع کی طرف رواں دواں رہے۔ ایسے مواقع پر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چڑھا ہوا دریا اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ منزل کی طرف رواں دواں ہے اور جس سے جگہ جگہ پانی کے دھارے پھوٹتے ہیں اور آس پاس کی خشک کھیتوں کو سیراب کرتے ہوئے پھر اپنے بڑے دھارے میں آملتے ہیں۔ آپ رحمۃ اللہ علیہ کی یہ کسرِ نفسی ہے کہ انھوں نے فکر کے ان دھاروں کو غیر متعلق باتوں کا عنوان دیا۔ حالانکہ انھی سے سامع کے ذہن میں اُبھرنے والے سوالات اور فکر میں پڑنے والی گرہیں بڑی خوب صورتی سے کھلتی چلی جاتی ہیں۔''

قبلہ والد محترم رحمۃ اللہ علیہ کی اسی گفتار اور رفتار کی رعنائیوں کو اسی رنگ میں دیکھنے کے لیے آپ کے محبین اور معتقدین ''انوار القرآن'' کی دوبارہ اشاعت کا اصرار کرتے رہے۔

مرورِ زمانہ کے ساتھ اب جب کہ لوگ سلیس اُردو بھی مشکل سے سمجھتے ہیں، اس امر کی ضرورت کو بہت زیادہ محسوس کیا گیا کہ مشکل الفاظ اور فارسی اشعار کے تراجم ہو جائیں تا کہ قاری کو مطالعہ کے دورانِ نفسِ مضمون تک رسائی آسان ہو۔

الحمدللہ! اب یہ تفسیر ان تمام فرمائشوں کی تکمیل کے ساتھ ساتھ تخریج (حوالہ جات) سے بھی آراستہ ہو کر اہلِ محبت اہلِ ذوق کی روحانی تسکین کا سامان بہم پہنچائے گی۔

قارئین کرام! روایات میں سورۃ فاتحہ کے کئی نام آتے ہیں۔ ناموں کی یہ کثرت اس کی اہمیت کو ظاہر کرتی ہے۔ اس کا ایک نام ''اُم القرآن'' اور ''اساس القرآن'' ہے کیونکہ اس سورت میں اللہ کی حمد وثنا، اس کے اوامر ونواہی کے مطابق عمل سے اس کی عبادت کرنے، وعدہ وعید، راہِ سلوک سے متعلق جملہ نظری وعملی احکام، سعادت مندوں اور بدبختوں کے بیانات سے گویا قرآن کا نچوڑ اور بنیاد پیش کردی گئی۔ اسے قرآن کا دیباچہ بھی اسی لیے کہتے ہیں کہ پورے قرآنی مضامین کی اس کے اندر نشاندہی ہے۔

اسے سورۃ الحمد بھی کہتے ہیں کیوں کہ یہ سورۃ حمد ربی سے شروع ہوتی ہے۔ اگرچہ قرآن پاک میں چار سورتیں اور بھی ایسی ہیں جو الحمد سے ہی شروع ہوتی ہیں جیسے (۱) سورۃ انعام (۲) سورۃ کہف (۳) سورۃ سبا (۴) سورۃ فاطر۔ باقی چار سورتوں میں قدرے تفصیل ہے جب کہ سورۃ فاتحہ میں یہ بطریق اجمال کیا گیا جیسے سمندر کو کوزے میں بند کرنا۔ اس سورۃ کو سبع مثانی بھی کہتے ہیں۔

حضرت ابوسعید المعلیٰ ؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ آ، میں تجھے قرآن کی ایسی سورہ کی تعلیم دوں جو سبع مثانی اور عظیم ترین ہے جو مجھے دی گئی۔

یہ الحمدللہ رب العالمین ۔۔۔ الخ ہے۔ عربی میں سبع سات کو کہتے ہیں کیوں کہ یہ سات آیات پر مشتمل ہے اور اسے ہر نماز میں کم از کم دو مرتبہ پڑھا جاتا ہے، اس لیے سبع مثانی کہتے ہیں۔

☆ ایک روایت کے مطابق یہ دو دفعہ نازل ہوئی۔ اوّل بار مکہ معظمہ میں اور دوسری مرتبہ مدینہ منورہ میں۔

☆ اس سورۃ کو ''سورۃ الشفا'' بھی کہتے ہیں۔

☆ حضرت ابوسعید خدری ؓ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ:

''فَاتِحَةُ الْكِتَابِ شِفَاءٌ مِنْ كُلِّ سُمٍّ''

کہ سورۃ فاتحہ ہر زہر کا تریاق ہے۔

☆ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے کسی قبیلے کے سردار کو جسے سانپ ڈس گیا تھا، سورۃ فاتحہ کا نقش یعنی تعویذ بنا کر دیا، وہ سردار اِس کی برکت سے ٹھیک ہو گیا۔

☆ نبی کریم ﷺ نے اِس کی تعریف فرمائی۔ اِس لیے اس سورۃ کا نام ”سورۃ رقیہ“ بھی ہے۔ رقیہ کا مطلب تعویذ اور نقش ہے۔

☆ اِس سورۃ کا ایک اہم نام ’سورۃ مسئلہ‘ بھی ہے یعنی سوال کرنے کی سورت۔

چونکہ انسان سراپا عاجز و محتاج ہے، اسے قدم قدم پر تائیدِ غیبی کی ضرورت ہے، دنیا کے معمولی معمولی بادشاہوں کے پاس بھی عرضیاں ان کے مقرر کردہ طریقوں پر بھیجی جاتی ہیں۔ اِن کے مخاطب کے لیے خاص القابات، جو چھپے ہوئے ملتے ہیں، تاکہ عرضی والا کمی کرکے بجائے کچھ انعام پانے کے، سزا کا حق دار نہ بن جائے۔ اِسی طرح سورۃ فاتحہ کو سرکار نے سورۃ مسئلہ بتایا۔ اب وہ عرضی جو مالک خود اپنی مخلوق کو سکھائے، جس میں خود اُس کے پسندیدہ الفاظ ہوں تو وہ عرضی کیسے مسترد ہو سکتی ہے۔

اِسی عرضی کو ہی ہم نماز کی ہر رکعت میں پیش کرتے ہیں۔ اِسی واسطے حضور ﷺ فرماتے ہیں:

لاَ صَلاَةَ إِلاَّ بِفَاتِحَةِ الْكِتَابِ
کہ فاتحہ کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

اِس لیے اُمتِ مسلمہ کے ہر بالغ، نابالغ، پڑھے لکھے یا اَن پڑھ کو سورۃ فاتحہ یعنی اللہ کے حضور عرضی زبانی یاد ہوتی ہے۔

اگرچہ قرآن بغیر سمجھ کر پڑھنے والے کو بھی ثواب ملتا ہے، جیسے حضور ﷺ نے فرمایا:
”الم“ جو کہ حروفِ مقطعات ہیں اور جن کا ترجمہ آج تک کوئی مفسر نہ کر سکا، وہ یہ کہنے پر مجبور ہوئے کہ اِس کا ترجمہ یا خدا جانے یا مصطفیٰ ﷺ جانے۔ اِس کے بارے میں آقا کریم ﷺ نے فرمایا کہ یہ تین حروف ہیں اور ہر حرف کے اوپر دس نیکیوں کا ثواب دیا جاتا ہے۔

یہاں پر تو اُن لوگوں کا جواب ہو گیا جو کہتے ہیں کہ بغیر ترجمہ سیکھے نماز ہی نہیں ہوتی۔ یہ لوگ افراط کا شکار ہیں اور جو کہتے ہیں کہ ترجمہ کی ضرورت ہی نہیں، وہ تفریط کا شکار ہیں۔ جن کو ترجمہ نہیں آتا یہ نیت رکھنی چاہیے کہ مولا تیرے سکھائے ہوئے الفاظ تیری بارگاہ بے کس نواز میں پیش کر رہے ہیں، اپنے فضل و کرم سے

منظور فرما! اور ساتھ لازمی طور پر اِس کا ترجمہ سیکھنے کی کوشش کرنی چاہیے تاکہ جب آپ یہ درخواست پیش کر رہے ہوں تو آپ کا دل بھی آپ کی زبان کا فریق بن سکے۔

پڑھے لکھے لوگوں کو علمائے حقہ کی تفاسیر خاص کر سورۃ فاتحہ کی، جسے ہم پنج وقتہ نمازوں میں پڑھتے ہیں، لازماً مطالعہ کرنا چاہیے اور ناخواندہ حضرات کو بھی علمائے حقانی سے رابطہ کر کے اِس کی حقیقی لذتوں سے آشنائی حاصل کرنی چاہیے۔

یقین جانیے کہ اگر ہم نماز میں سورۃ فاتحہ، اِس کے معانی و اسرار و رموز کی موجوں کے ساتھ پڑھیں تو یہ موجیں ضرور بالضرور ہمیں اِس وحدت کے سمندر سے ہم کنار کر دیں گی اور بمطابق حدیثِ جبریل علیہ السلام کہ رب کی ایسی عبادت کر کہ تُو اُسے دیکھ رہا ہو ورنہ اتنی کیفیت تو پیدا کر کہ رب تجھے دیکھ رہا ہے، کی کیفیات جیسی لذتوں سے آشنائی ہو سکے گی۔

قارئین کرام! علامہ محمود آلوسی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اِس سورۃ کے بیس سے زیادہ نام ہیں۔ یہ اسماء کی کثرت، اِس سورۃ کی عظمت اور ہمہ گیریت پر دلالت کرتی ہے۔

اللہ اکبر!! کہاں سورۃ فاتحہ کی عظمت اور کہاں ہماری بے بضاعتی۔

اللہ کریم اِس سورۃ مبارکہ کی تفسیر کی طباعت کے سلسلے میں جو ہماری ناقص سی کوشش ہوئی ہے، خادمین قرآن کے جوتوں میں جگہ عطا فرما دے۔

ناسپاسی ہو گی کہ اگر میں عزیزم جناب ظفر محمود قریشی صاحب، پیرِ طریقت جناب صاحبزادہ میجر محمد قاسم صاحب، صاحبزادہ پروفیسر قاضی محمد سلیم صاحب، جناب علامہ مولانا محمد ایوب خان چشتی صاحب (فاضل دارالعلوم بھیرہ شریف)، اور پیکرِ اخلاص و وفا پیر سید صابر حسین شاہ صاحب، ڈاکٹر شجاع اختر اعوان، طاہر اسیر، سجاد حسین سرمد کا نام نہ لوں۔ جن کے عملی اور علمی تعاون سے یہ تفسیر عرصہ اَسی (۸۰) سال بعد دوبارہ منصہ شہود پر آئی۔ اللہ کریم سب کی کاوشوں کو منظور فرما کر قرآن اور صاحبِ قرآن کی شفاعتوں سے بہرہ مند فرمائے۔

آمین بحرمتِ سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

دعاجو:

صاحبزادہ ڈاکٹر **قاضی امجد حسین کاظمی**/سیفی/ اویسی

* * *

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ
اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ١ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ٢
مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ٣ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ
نَسْتَعِيْنُ ٤ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ٥ صِرَاطَ
الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ
عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ٦

اَنْوَارُ الْقُرْآن پر ایک نظر

پروفیسر زاہر حسن فاروقی

انوار القرآن حضرت علامہ انوار الحق مرحوم فاضل دار العلوم فتحپوری دہلی کے واعظانہ خطبات کا مجموعہ ہے۔ مولانا مرحوم نے ”وجہ تالیف“ میں خود اس امر کی وضاحت فرمادی ہے کہ:

> ”میرے پراگندہ (بکھرے ہوئے) اور منتشر خیالات ہیں جو سورہ فاتحہ کی واعظانہ تفسیر میں ضمناً بیان ہوئے تھے۔“

مولانا کا ارشاد ہے کہ وہ تقریر کے بعد کچھ اشارات نوٹ فرمالیتے تھے اور پھر ان ہی اشارات کو حاجی عمر اور حاجی علی صاحبان کے اصرار پر مفصل لکھ کر کتابی صورت دی گئی۔ اس تالیف کو مولانا مرحوم نے انتہائے عجز و انکسار سے کام لیتے ہوئے ”پراگندہ (بکھرے ہوئے) اور منتشر خیالات“ فرمایا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ باقاعدہ منصوبے کے تحت مبسوط مقالہ تحریر نہ کرنے کے باوجود جو حسن ترتیب ان منتشر خیالات میں نظر آتا ہے وہ لائق تحسین وستائش ہے۔

علاوہ ازیں ان مباحث میں ایسے ضمنی نکات بھی خوبی سے پیش کر دیئے گئے ہیں جو ایک مسلم کے لیے رہنمائی اور بہتری کا سبب ہو سکتے ہیں گویا چراغ سے چراغ جلتا چلا گیا اور راہروؤں کے لیے جادۂ منزل روشن تر ہوتا چلا گیا۔

مولانا مرحوم وجہ تالیف میں رقم طراز ہیں!

> ”مطالعہ کرتے وقت آپ کو اس کتاب میں بعض غیر متعلق باتیں بھی معلوم ہوں گی“

یہ ”غیر متعلق باتیں“ بھی دراصل وہ مسائل و نکات ہیں جو سورہ فاتحہ کی تفسیر کے بیان میں ضمنی طور پر سامنے آتے رہے اور مولانا ان سے صرف نظر کرنے کے بجائے بڑی خوبصورتی سے ان کی توضیحات پیش کرتے ہوئے اصل موضوع کی طرف رواں دواں رہے۔ ایسے موقعوں پر یوں محسوس ہوتا ہے جیسے چڑھا ہوا دریا اپنی تمام تر جولانیوں کے ساتھ منزل کی طرف رواں دواں ہے جس میں سے جگہ جگہ پانی کے دھارے

پھوٹتے ہیں اور آس پاس کی خشک کھیتیوں کو سیراب کرتے ہوئے پھر اپنے بڑے دھارے میں آملتے ہیں۔

مولانا کی یہ محض کسرِ نفسی ہے کہ انھوں نے فکر کے ان دھاروں کو ”غیر متعلق باتیں“ کا عنوان دیا ورنہ ان ہی غیر متعلق باتوں سے سامع کے ذہن میں اُبھرنے والے سوالات اور فکر میں پڑنے والی گرہیں بڑی خوبصورتی سے کھلتی چلی جاتی ہیں۔

انوار القرآن معنوی اعتبار سے جامع العلوم ہے۔ کتاب کا آغاز وجود باری تعالیٰ کے دلائل وشواہد عقلی ونقلی سے ہوتا ہے پھر دنیا اور انسان کی تخلیق کا مقصد زیر بحث لایا گیا ہے اور یہیں سے انسان کے سب سے بڑے گناہ اور سب سے بڑی گمراہی یعنی شرک کا مسئلہ بھی اُبھرتا ہے۔ باری تعالیٰ نے جہاں انسان کو آزادی فکر وعمل کی صفت عطاء فرمائی وہیں اس کی رہنمائی کا بھی بے مثل اہتمام انبیائے کرام مبعوث فرما کر کر دیا ہے۔ مولانا نے انبیائے کرام کی بعثت ضرورت، معصوم عن الخطاء، نبی اور رسول میں فرق، انبیاء کی تعداد، عورت کے درجہ نبوت پر فائز نہ کیے جانے کی حکمت جیسے اہم موضوعات کو خوبصورت اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ حضور نبی کریم ﷺ کی بعثت آپ ﷺ کا مقام ومرتبہ، آپ ﷺ کی تعلیمات پیش کرنے کے بعد مولانا مرحوم نے قرآن کریم کے کلام اللہ ہونے، اس کے محفوظ من جانب اللہ ہونے، تمام صحائف آسمانی میں برتر ہونے، تدریجی نزول کی حکمت، حضور ﷺ کے اُمی ہونے کی حکمت، قرآن کے علوم، تلاوت کے آداب و برکات و فیوض، الفاظِ بسم اللہ کی وضاحت و برکات پر خوبی کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ چاروں فقہی مسالک کا در اصل ایک ہی ہونا اور اُمت کے لیے باعث رحمت ہونا جیسے اہم موضوع کو کمال اعجاز سے سمیٹتے ہوئے مولانا اپنے بنیادی موضوع سورہ فاتحہ کی تفسیر کا آغاز فرماتے ہیں۔

مولانا نے سورہ فاتحہ کے الفاظ وآیات کی تفسیر عالمانہ بصیرت کے ساتھ فرمائی ہے اور ہر آیت کی تفسیر کے دوران ان تمام اشکالات کا بھی مہتم بالشان جواب دیا ہے جو مختلف طبقوں خاص طور پر غیر مسلموں کی طرف سے سامنے آتے رہے۔ اسی ذیل میں نماز اور مساجد کی اہمیت، ضرورت اور مقام ومرتبہ بھی زیر بحث آگئے ہیں۔ ایاک نعبد وایاک نستعین کی تفسیر میں مولانا مرحوم نے بڑی کاوش فرمائی ہے۔ استعانت کا مسئلہ

اہل ایمان میں ایک نزاعی مسئلہ رہا ہے۔ استعانت من جانب اللہ پر تو اجماع اُمت ہے لیکن استعانت میں جانب غیر اللہ ہمیشہ اہل ایمان میں موضوع بحث رہا ہے، اور اس بحث نے اکثر اُمت میں نفاق پیدا کیا ہے۔ آج بھی اہل اسلام کے دو مسالک کے بیشتر علماء اسے اس انداز میں زیر بحث لاتے ہیں کہ بادیٔ النظر میں یوں محسوس ہونے لگتا ہے کہ گویا یہ دو الگ مذاہب ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

مولانا مرحوم نے اس نازک نزاعی مسئلے کو بڑی نفاست اور حُسنِ ادا سے اس خوبی کے ساتھ پیش کیا ہے کہ یہ دونوں مسلک جدا نہیں رہتے بلکہ یک جان ہو جاتے ہیں۔

’’یعنی جب ہم تیری عبادت کرتے ہیں تو پھر مدد کس سے مانگیں۔ مدد بھی تجھ ہی سے مانگیں گے کیونکہ کام تیرا کریں اور دام کے لیے دوسرے کے سامنے ہاتھ کیوں پھیلائیں۔ تو مدد نہ کرے تو کس کی طاقت ہے کہ وہ مدد کر سکے اور تو دے تو کون ہے جو تیرے چشمۂ رحمت کو بند کر سکے‘‘۔

سورۃ فاتحہ کی آخری دو آیات کی تفسیر کے بیان میں حضرت مولانا مرحوم نے ختم نبوت، اسلام، صراطِ مستقیم، حضور ﷺ کی دعائیں، دعا کی اہمیت، فضائل و برکات پر سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔ ان ہی مباحث میں معراج مبارک کے جسمانی ہونے پر دلائل پیش کیے گئے ہیں اور حضور ﷺ کا سایہ نہ ہونے پر اعتراض کا بھی شیخ عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ کے حوالے سے مسکت جواب دیا گیا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں!

’’انھوں (حضرت عبدالحق محدث دہلوی علیہ الرحمہ) نے فرمایا! لازم نہیں کہ ہر جسم کا سایہ بھی ضرور ہو۔ دیکھو ایک مجسم چیز لے کر اس کے چاروں طرف لیمپ روشن کر دو اور پھر دیکھو کہ اس کا سایہ کیسے غائب ہوتا ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ کی ذات گرامی باوجود بشریت نور خداوندی کے ساتھ ہر طرف سے ایسی محیط تھی کہ آپ کا سایہ زمین پر نہ پڑتا تھا۔

مولانا عشق کے لطیف موضوع کو چھیڑتے ہوئے عاشق کے تین درجے بیان فرماتے ہیں۔ اعلیٰ درجے کا عاشق، عاشق ذاتی ہے جو نفع و ضرر سے بے نیاز ہو کر محبوب کی ذات سے عشق کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے محبوب کی ہر ہر ادا عزیز از جان ہے جس کا ہر ستم بھی اُس کے لیے عین راحت ہے۔ کمتر درجے کا عاشق، عاشق

صفاتی ہے جسے محبوب کی کسی صفت مثلاً حسن جاہ ومنصب یا علم سے عشق ہوتا ہے۔ ادنیٰ ترین عاشق عاشق احسانی ہے۔ اس کی محبت نہ تو محبوب کی ذات سے ہے اور نہ صفت احسان سے بلکہ اس کا عشق نتیجۂ احسان ہے۔ مولانا فرماتے ہیں!

کہ حقیقی عشاق، عشق صفاتی اور عشق احسانی کو مذہب عشق میں شرک سے تعبیر کرتے ہیں گویا مذہب عشق میں صرف عشق ذات ہی اصل ہے۔

جبر وقدر کے نازک مسئلے کی مولانا نے بڑی خوبی سے وضاحت فرمائی ہے۔ وہ فرقہ جبریہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ کسی شخص کے ایک کام کرنے یا نہ کرنے کو ازل سے ہی جانتے ہیں اس واسطے وہ اپنے افعال میں مجبور ہے لیکن اگر لفظ اختیار کو بھی زیادہ کرلیں تو ان کا وہمی قلعہ ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا ہے۔ ایک شخص اپنے نوکر کو ایک کام کرنے کا حکم دیتا ہے اس شخص کے علم میں ہے کہ نوکر اس کام کو اپنے اختیار سے یوں کرے گا۔ اب نوکر نے اس کے علم کے مطابق اس کام کو پورا کیا تو ظاہر ہے کہ نوکر کا یہ کام اختیاری ہی کہلائے گا۔ حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کی روایت کردہ حدیث مبارک ہے!

”اللہ تعالیٰ کے علم کی تمہارے افعال کے متعلق ایسی مثال ہے جیسی آسمان کی جو تمہارا سائبان ہے اور زمین کی جو تمہارا مقام ہے پس جس طرح تم زمین آسمان سے نہیں نکل سکتے اسی طرح تمہارا علم خداوندی سے نکلنا بھی محال ہے اور جیسا کہ زمین وآسمان تم کو گناہوں پر مجبور نہیں کرسکتا اسی طرح علم الٰہی بھی تمہیں گناہ کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔

مولانا نے بھی ایسے ہی پختہ دلائل کے ساتھ اس موضوع پر بہت سے سوالات اور ان کے بھرپور جوابات دیئے ہیں حاصل یہ ہے کہ بے شک تمام کائنات، اشیاء، اعمال اللہ کی تخلیق ہیں مگر انسان فاعل ہے جس میں اُس کی نیت شامل ہوتی ہے اور اسی فاعلیت اور نیت کی بناء پر جزاء وسزا کا مستحق قرار پاتا ہے۔

مولانا نے ایک اور موضوع ”کتا پیر طریقت ہے“ بڑی وضاحت سے چھیڑا ہے۔ آپ نے پہلے کتے کی صفات بیان فرمائی ہیں یعنی:

۱۔ کتا بھوکا بھی رہے تو اپنے مالک کا دروازہ چھوڑ کر غیر کے دروازے پر نہیں جاتا۔

۲۔ کتے کا اپنا کوئی مکان نہیں ہوتا جہاں اور جس حال میں مالک رکھتا ہے تابع مالک رہتا ہے۔

۳۔ کتا رات بھر بیدار رہتا ہے اور مالک نے جس کام کے لیے پالا ہے وہ کام پوری طرح بجالاتا ہے۔

۴۔ کتا مرنے کے بعد ترکہ نہیں چھوڑتا۔

۵۔ مالک ظلم کرے، مارے، بھوکا رکھے تو بھی کتا مالک سے نہ ناراض ہوتا ہے نہ شکوہ کرتا ہے اور نہ اس کا در چھوڑتا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں کہ!

یہی صفات عاشق الٰہی کی ہیں کہ بری سے بری حالت میں اللہ کے در کو چھوڑ کر غیر اللہ کے در پر نہیں جاتا، مالک حقیقی کا ہر حال میں تابع فرمان رہتا ہے وہ جس حال میں اور جہاں رکھے راضی برضا رہتا ہے۔ شب بیداری اس کی خصوصیت ہوتی ہے۔ مصائب زمانہ پر صابر و شاکر رہتا ہے اور شکوہ و شکایت سے نا آشنا۔ یہی راہ سلوک ہے اور یہی طریقت۔

مولانا کا یہ بیان اتنا دلنشیں ہے کہ بے اختیار کتے کی ان صفات پر رشک آتا ہے اور ہم کہ علائق دنیوی کی دلدل میں دھنسے ہوئے ہیں اطاعت ''مالک'' میں کتے کی خاک یا برابری کے بھی قابل نہیں۔

شریعت و طریقت کا مسئلہ بھی ہمارے ہاں خاصے نزاع کا باعث رہا ہے۔ بعض اہل طریقت گو علی الاعلان نہ سہی مخفی طور پر یا دبے لفظوں میں بہر حال طریقت کو شریعت سے الگ راہ کہتے رہیں ہیں مگر مولانا نے اہل طریقت کے اس نئے تصور طریقت کا علی الاعلان بطلان فرمایا ہے۔ انھوں نے نام نہاد پیروں اور نام نہاد بزعم خود اہل طریقت کو واشگاف الفاظ میں ٹھگ اور بہروپیے قرار دیا ہے۔ حق تو یہ ہے کہ اہل حق کا منصب ہی یہ ہے کہ اعلائے کلمۃ الحق کے موقعہ پر وہ کسی مصلحت کا شکار نہ ہوں۔ حق کو الفاظ کے پردوں میں چھپانے کے بجائے متلاشئ حق کی راہ میں حائل پردوں کی طنابیں کاٹ کر اُسے نور حق کی کرنوں سے قلب و ذہن کو منور کرنے کی سعادت سے بہرہ ور کریں۔

مولانا نے یہ فرض بڑی خوبی سے ادا کیا ہے۔ انھوں نے نام نہاد صوفیوں اور پیروں کی پھیلائی ہوئی طریقت کے نام نہاد تصور کی دھند کو اپنی تمازتِ ایمانی سے نیست و نابود کر دیا ہے۔

مولانا فرماتے ہیں!

علمِ طریقت علمِ شریعت کی ایک شاخ ہے جس طرح شاخ اپنے وجود میں درخت کی محتاج ہے اسی طرح طریقت اپنے وجود میں شریعت کی محتاج ہے۔ علمِ طریقت تو علمِ شریعت کی جزو ہے"۔

ظاہر ہے جز وکل سے برتر نہیں ہوسکتا، شاخ درخت پر فضیلت حاصل نہیں کرسکتی۔ اس کے علاوہ یہ بھی قابلِ توجہ بات ہے کہ شاخ درخت سے ہی شادابی حاصل کرتی ہے درخت کے تابع نہ رہے تو خشکی اور ویرانی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ طریقت شریعت کے تابع نہ ہو تو پھر وہ طریقت نہیں گمراہی بن جاتی ہے۔ شریعت سے نفور رکھنے والے نام نہاد پیر اور صوفی اس سلسلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام پر حضرت خضر علیہ السلام کی برتری کی مثال دیتے ہیں مگر وہ اس نکتے کو بھول جاتے ہیں یا پھر اغماض برتتے ہیں کہ خضر علیہ السلام محض نبی اور موسوی شریعت کے متبع تھے۔ مزید یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام کو ہر اس بات پر ٹوکا اور اعتراض کیا جو شریعت کے مطابق نہیں تھی۔

مولانا فرماتے ہیں کہ!

علم طریقت علم شریعت کی جزو ہے تو شریعت کا عالم طریقت کا عالم کیسے نہ ہوگا؟۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ طریقت کے بعض جزوی مکشوفات اللہ تعالیٰ ایک شخص پر کشف فرمائیں مگر دوسرے کو ان اسرار سے ناواقف رکھا جائے اس سے عالم شرع کے کمال میں کچھ نقص نہیں آتا۔ جس طرح ایک کم علم والے کو یہ معلوم ہو کہ دیوار کے پیچھے کیا ہے مگر ایک عالم فاضل اس سے بے خبر ہو تو کیا محض ایک جزوی واقعہ کے جان لینے سے یہ شخص اس فاضل سے افضل ٹھہرایا جائے گا؟۔

مولانا ایسے پیروں کو جو خلافِ شریعت کام مریدوں سے کرائیں انھیں بھیڑیا قرار دیتے ہیں۔ فرماتے ہیں!

اور جب وہ خود شرع کی اتباع تو کیا کریں۔ دوسروں کو بھی خلاف شرع کاموں کی رغبت دلائیں تو وہ بزرگ تو کیا انسان کی شکل میں گرگ (بھیڑیا) ہیں۔ ایسے بے پر پیروں سے بُعد ہی اچھا ہے۔ ان کا قرب، قربِ جہنم ہے۔

صوفیائے کرام کے غایتِ عبادت کے متعلق اظہار خیال فرماتے ہوئے مولانا تحریر کرتے ہیں کہ!

بعض صوفیاء کے مطابق جس نے اپنے آپ کو مشاہدۂ الٰہی میں فنا کر دیا اور عبادت دنیا و آخرت کی بھلائی کی غرض کے بجائے محض طلب مولیٰ کے لیے کی وہی حقیقی عبادت گزار ہے۔ ان صوفیاء نے طلب مولیٰ کے سوا دنیا و آخرت کی بھلائی کا خیال گناہ قرار دیا ہے۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ عبادت سے رضائے الٰہی اس لیے مقصود ہے کہ دنیا و آخرت کی بھلائی حاصل ہو تو گویا اس نے دنیا و آخرت کو مقصود بنایا اور رضائے الٰہی کو اس کا وسیلہ اور یہ ظاہر ہے کہ وسیلہ مقصود سے کم درجے کا ہوتا ہے تو گویا اللہ کو دنیا و آخرت سے کم درجہ پر سمجھا۔

مولانا بڑی جرأت ایمانی کے ساتھ اس دلیل کو ردّ کرتے ہوئے فرماتے ہیں!

عاقبت کو مقصود بنانا اس کی تمنا کرنا اور اس کا اللہ جل شانہ سے طلب کرنا تو خود قرآن پاک کی رو سے جائز ہے۔ اور رب العزت نے قرآن پاک میں:

”ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ “۔

یہی بہت بڑی کامیابی ہے“

فرما کر طلب عقبیٰ کو فوز عظیم اور مقصود مخیم ٹھہرایا ہے۔

جہاں تک صرف رضائے الٰہی کے لیے عبادت کا تعلق ہے تو وہ اہل عشق کا معاملہ ہے ہر مسلمان کا نہیں۔ گویا حضرت رابعہ بصری علیہ الرحمہ کے مطابق جب تک ”میں“ کا وجود ہے تو عشق نہیں شرک ہے۔

فنافی الذات ہو جائے تو نہ ”میں“ کا وجود رہا اور نہ آرزو۔

استعانت انبیاء و اولیاء کے باب میں مولانا فرماتے ہیں!

انبیاء و اولیاء سے استعانت کرنا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ خدا کے مقبول و مستجاب بندے ہیں استعانت بالغیر نہیں۔۔۔۔ کیونکہ مسلمان ان کو محض وسیلہ اور سبب سمجھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ بھی (دنیاوی بادشاہوں کی طرح) انبیاء و اولیاء کو بعض اس قسم کے اختیارات دیتے ہیں۔

مولانا کا یہ ارشاد گرامی محل نظر ہے۔ اس باب میں مولانا مرحوم نے اولیائے کرام سے استعانت اور مدد طلب کرنے کو درست اور جائز قرار دیا ہے۔

مولانا صرف عربی مدرسے کے فارغ التحصیل ہی نہیں بلکہ دنیاوی علوم سے بھی بہرہ ور تھے آپ

گریجویٹ بھی تھے۔ دینی علوم کے ساتھ دنیاوی علوم بھی ہم کاب ہوں تو ذہن وفکر کو اتنی وسعت حاصل ہو جاتی ہے کہ سارے منظر اجلے اجلے نکھرے نکھرے نظر آنے لگتے ہیں۔

فکر کا یہی نکھار ''**انوار القرآن**'' کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ مولانا دقیق مسائل پر اظہار خیال فرماتے ہوئے بھی بڑے روشن خیال نظر آتے ہیں۔ دینی اور علمی دقیق مسائل پر ان کی پوری گرفت ہونے کے ساتھ ساتھ ذہنی کشادگی اور جولانی طبع کا ہر ہر مرحلہ پر بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ اختلافی اور نزاعی مسائل کی گتھی سلجھاتے ہوئے وہ پہلو بچا کر نہیں گزرتے بلکہ ایسے موقعوں پر وہ اس چڑھتے ہوئے دریا کی مانند ہوتے ہیں جو وزنی پتھروں سے بچ کر گزرنے کے بجائے انھیں اپنے ساتھ بہا کر لے جاتا ہے۔

انھیں زبان و بیان پر قدرت حاصل ہے۔ الفاظ وتراکیب کے حسن سے فائدہ اٹھانا جانتے ہیں۔ وہ دقیق مسائل کے بیان میں بھی ہمارے اکثر علماء کی طرح مشکل اور وزنی زبان استعمال نہیں کرتے۔ وہ صحنِ گلشن میں صبا کا ایک ایسا جھونکا ہیں جو کانٹوں کو بھی اسی طرح گدگداتا ہے جس طرح پھولوں کی نازک پنکھڑیوں کو۔ وہ تقریر کا فن بھی جانتے ہیں اور تحریر کا بھی ان کی تحریر میں زور بیان دلپذیر بھی ہے اور فکر انگیز بھی۔ اعتدال ان کی تحریر کا خاصہ ہے۔ وہ کہیں بھی ایسے تیز رو رہنما نظر نہیں آتے جو اپنی تیز رفتاری میں اپنے ہم کابوں کو پیچھے چھوڑ جاتے ہیں۔

''انوار القرآن'' بنیادی طور پر خطبات کا مجموعہ ہے اس لیے کہیں کہیں خطیبانہ انداز نمایاں ہے۔ ''اب جب آپ کو معلوم ہوگیا''۔ ''اب سوچنا یہ ہے''۔ مسلمانوں یاد رکھو'، مگر دیکھتے ہیں' دنیا میں غور تو کرو' جیسے خطیبانہ جملے کہیں کہیں نظر آتے ہیں مگر وہ بھی ایسے موقعوں پر جہاں مولانا کسی نکتے پر سامعین کو خصوصی توجہ دلانا چاہتے ہیں لیکن ان کے یہ خطیبانہ جملے ان کی تحریر کے تسلسل کو مجروح نہیں کرتے بلکہ پڑھنے والوں کی مزید توجہ کا باعث بن جاتے ہیں اور اس طرح مولانا کا مقصد پورا ہو جاتا ہے۔

۵۰۰ سے زائد صفحات پر مشتمل ''انوار القرآن'' کا اختتام سورہ فاتحہ کی فضیلت اور بعض مجرب اوراد کے بعد درود شریف کے ساتھ اس دعا پر ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمارے تمام صغیرہ وکبیرہ گناہ اس ذکر کی برکت سے معاف فرمائے (آمین)

''انوار القرآن''، دینی کتب میں بلا شبہ ایک گرانمایہ اضافہ ہے اور لائق مطالعہ ہے۔

* * *

وجۂ تالیف

آئندہ جو کچھ آپ کی نظر سے گزرے گا وہ میرے پراگندہ (**بکھرے ہوئے**) اور منتشر خیالات ہیں جو سورہ فاتحہ کی واعظانہ تفسیر میں ضمناً بیان ہوئے تھے۔ چونکہ سامعین کو دورانِ وعظ بہت کچھ دلچسپی معلوم ہوتی تھی۔ اس لیے روزانہ تقریر ختم کرنے کے بعد ضروری باتوں کو ایک کاپی پر نوٹ کر لیا جاتا تھا۔ تین مہینے کے مسلسل بیان کے بعد جب سورہ فاتحہ کی تفسیر کو ختم کیا گیا تو میرے کرم فرما علم دوست حاجی عمر، حاجی علی صاحب ساکن کچھ کا اصرار ہوا کہ اگر ان اشارات کو مفصل لکھ کر کتابی صورت میں شائع کیا جائے تو اُمید ہے کہ عوام کے لیے نہایت مفید ثابت ہوں گے۔ اگرچہ میں خود اپنی تحریر و تقریر کو مدنظر رکھتے ہوئے اس افادہ کو ایک موہوم سی چیز سمجھتا ہوں مگر ایک تو پاس خاطر دوسرے ہو سکتا ہے کہ یہ تمام مجموعہ نہیں۔ تو شاید کسی نکتہ نواز کو اس کتاب سے کوئی نکتہ ہی علمی یا عملی حیثیت سے پسند آجائے تو اُس ربِ بے نیاز کے دربار دُربار میں اس سیہ کار و شرمسار کی نجات کا باعث بن جائے۔

مطالعہ کرتے وقت آپ کو کتاب میں بعض غیر متعلق باتیں بھی معلوم ہوں گی مگر دورانِ بیان مضامین کا سلسلہ کچھ ایسا چھڑ جاتا تھا کہ اس غیر متعلق بات کو چھوڑ کر صرف موضوع میں مقید رہنا نہایت دشوار ہو جاتا تھا۔ پھر وہ غیر متعلق بات بیان میں ایسے مرتبط (**اگلی اور پچھلی باتوں سے خاص تعلق اور رابطہ**) اور منظم طریقے سے خود بخود چلی آتی تھی کہ اگر اُسے عمداً چھوڑ دیا جاتا تو پھر بیان بالکل بے لذت اور غیر مرتبط ہو جاتا۔ اس کے علاوہ وہ بعض غیر متعلق باتیں میرے خیال میں ایسی اہم اور مفید تھیں کہ اُن کا چھوڑنا گویا واعظانہ تفسیر کے رنگ کو بدلنا تھا۔

بہر حال باری تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جس نے اتنا عرصہ مجھے اور سامعین کو قرآن پاک کے ذکر وسماع میں مشغول رکھا اور ہمیں طاقت دی کہ اُس وقت جب کہ دوسرے لوگ اپنے عزیز اوقات اور اموال کو تھیٹروں اور ہوٹلوں میں برباد کر رہے تھے ہم اُس کی مقدس کتاب کے ذکر وفکر میں مشغول رہے۔ اے اللہ! ہمیں ہمیشہ اپنی رضامندی پر چلنے کی توفیق دے اور ہمارے دینی و دنیوی مقاصد اس قرآن مجید کے طفیل پورے فرما۔ آمین

اللھم اھدنا بھدایۃ القرآن و نجنا من النار بحرمۃ القرآن ویسر علینا امور الدّنیا والاخرۃ بالقرآن وحصل مقاصدنا بالقرآن۔ واشف اسقامنا بحرمۃ القرآن اللھم تمم اٰمالنا ببرکۃ کلامك القدیم وھون علینا سکرات الموت بالقرآن الکریم وصل اللہ علی خیر خلقہ سیدنا و مولٰینا محمد و علی اٰلہ وصحبہ واتباعہ اجمعین۔ اٰمین یا رب العالمین۔

چار چیز آوردہ ام شاہا کہ در گنج تو نیست
نیستی و حاجت و جرم وگناہ آوردہ ام

ترجمہ: اے میرے رب میں ایسی چار چیزیں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں جو آپ کے خزانے میں نہیں۔ اپنی ذات کی نفی اور حاجت اور جرم وگناہ۔

خادمِ اِسلام
قاضی انوارالحق
لارنس مارکوئس پرتگالی افریقہ

بسم الله الرحمن الرحيم

الحمد الله الغفور الودود ۔ الملك المعبود ۔ العميم الجود ۔ المتعالی عن الضد والند والجهات والحدود ۔ العليم السميع البصير لا يخفى عليه دبيب النملة السوداء فی الليالی السود ۔ اشهد ان لا له الا الله وحده لا شريك له شهادة يفوز قائلها يوم الموعود ۔ واشهد ان سيدنا و مولينا محمدًا عبده ورسوله صاحب لواء الشفاعة والحوض المورود صل الله عليه وعلى اله وصحابه ۔ الذين كانو الركع والسجود ۔ اما بعد!!!

معزز حضرات ۔ وعدہ کے مطابق سورۂ فاتحہ کی تفسیر شروع کرنے سے پہلے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے ۔ کہ ابتدا میں قرآن پاک کی ضرورت اور اسکی اگلی کتابوں پر فوقیت (بڑائی) کے متعلق مختصر سی تقریر کر دی جائے ۔ کیونکہ جب تک کسی چیز کی ضرورت ہی ثابت نہ ہو تو اس میں خواہ مخواہ اپنے قیمتی وقت کو صرف کرنا بے سود اور لاحاصل ہے ۔

وجودِ باری تعالیٰ:

آپ سب سے پہلے اس کائنات اور اس کے نظام پر غور کریں ۔ آپ جب کسی چیز کو ایک خاص لمبائی چوڑائی اونچائی اور سلیقے سے بنا ہوا دیکھتے ہیں تو بلا تامل اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ یہ چیز خود بخود نہیں بنی ۔ بلکہ اس کا کوئی نہ کوئی بنانے والا ضرور ہے ۔ خواہ اس کے بنانے والے کو آپ دیکھ سکیں یا نہ ۔ مثلاً جب آپ ایک میز کو دیکھتے ہیں کہ اس کی چار ٹانگیں ہیں ۔ ایک سطح ہے ۔ سطحِ تختہ ایک خاص لمبائی چوڑائی اور موٹائی رکھتا ہے تو فوراً اس کے دیکھتے ہی آپ کے ذہن میں اس کے بنانے والے کا بھی یقین آجاتا ہے ۔

وجودِ باری پر ایک بدو کا استدلال:

ایک بدو سے جب خدا کے وجود کے متعلق سوال کیا گیا ۔ تو اس نے فوراً بے ساختہ جواب دیا ۔

سبحان الله ان البعرة تدل على البعير وان اثر الاقدام لتدل على المسير ۔ فالسماء ذات ابراج والارض ذات فبحاج والبحار ذات امواج الا تدل ذلك على وجود اللطيف الخبير ۔

یعنی جب اونٹ کی مینگنی دیکھ کر اونٹ کے ہونے کا یقین آجاتا ہے۔ اور اسی طرح قدموں کے نشانات کسی چلنے والے کا پتہ دیتے ہیں۔ تو پھر یہ برجوں والے آسمان۔ کشادہ رستوں والی زمین۔ اور متلاطم **(بھپری ہوئی)** امواجِ دریا **(دریا کی لہریں)** اُس ربّ الارباب اور صانعِ ارض وسما **(آسمان وزمین کا بنانے والا)** کے وجود پر کس طرح دلیل نہ ہوں گے۔ اسی واسطے تو اللہ تعالیٰ نے اپنی مقدس کتاب قرآن مجید میں ان چیزوں کی ہستی اور پیدائش میں غور وخوض کرنے کی دعوت دی ہے۔ تاکہ اس تفکر وتدبر سے ہمارا ذہن ان چیزوں کے خالق اور صانع کی طرف منتقل ہو کر باری تعالیٰ کے وجود کا اعتقاد پیدا کر سکے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے!

اَفَلَمۡ یَنۡظُرُوۡۤا اِلَی السَّمَآءِ فَوۡقَهُمۡ کَیۡفَ بَنَیۡنٰهَا وَ زَیَّنّٰهَا وَ مَا لَهَا مِنۡ فُرُوۡجٍ ()

(کہف:٦)

یعنی کیا یہ لوگ اپنے اوپر آسمان کو نہیں دیکھتے کہ ہم نے اس کو کس طرح بنا کر مزیّن **(خوبصورت سجا ہوا)** کیا۔ اور اس میں کسی قسم کا شگاف نہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے!

الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ فِرٰشًا۔ (البقرۃ:٢٢)

یعنی تمہارا اللہ وہ عظیم الشان ذات ہے۔ جس نے تمارے لئے زمین کو بچھونا بنایا۔

غرضیکہ یہ سب دلائل ہیں جن کے ضمن میں اپنی ہستی کو ثابت فرمایا ہے۔ تو گویا ہر عاقل اور ہوشمند اس دنیا کو دیکھ کر ضرور اس نتیجہ پر پہنچ سکتا ہے کہ اس نظام کا منظم کرنے والا اس کائنات کا پیدا کرنے والا اور پھر پیدا کر کے موجودہ باقاعدہ شکل عطا کرنے والا کوئی نہ کوئی وجود باجود ضرور ہے۔ اسی بے مثال اور لازوال ہستی کو مسلمان اللہ تعالیٰ کہتے ہیں۔ باری تعالیٰ کے مقدس وجود پر اپنی جگہ سینکڑوں دلائل موجود ہیں اور اللہ جل شانہ کے وجود کا انکار کرنا گویا روز روشن میں سورج کا انکار کرنا ہے

امام ابو حنیفہ علیہ الرحمہ کا ایک دہریے سے مناظرہ:

لکھا ہے کہ امام صاحب علیہ الرحمہ کے ساتھ ایک منکر خدا کا مقابلہ قرار پایا۔ امام صاحب وقت مقررہ سے ذرا دیر کر کے آئے۔ جب آپ جلسہ میں تشریف لائے تو سب سے پہلے اس دہریہ **(خدا کے وجود کا منکر)** نے

سوال کیا کہ حضرت کیا وجہ ہے کہ آپ معیّنہ وقت سے تاخیر کر کے آئے؟۔

آپ نے فرمایا!

صاحب مجھے وقت تو یاد تھا مگر آج میں نے ایک نہایت حیرت انگیز معاملہ دیکھا۔ جس کے تماشے میں ایفائے وعدہ (**وعدہ پورا کرنا**) میں ذرا دیر ہوگئی۔

اُس ملحد نے پوچھا کہ وہ کیا تماشہ تھا؟ جس کے لئے آپ رُک گئے۔

آپ نے فرمایا کہ!

میں نے آج دریا کے کنارے پر چند منتشر اور پراگندہ (**بکھرے ہوئے**) لکڑیوں کے ٹکڑے پڑے دیکھے مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب کہ وہ ٹکڑے خود بخود ادھر اُدھر سے دوڑ کر ایک دوسرے سے پیوست ہو گئے اور میرے دیکھتے ہی دیکھتے نہایت خوشنما مضبوط اور اعلیٰ کشتی تیار ہو کر دریا میں تیرنے لگی۔

ملحد نے آپ کی اس بے تکی بات پر زور سے قہقہہ لگایا اور حاضرین جلسہ سے بھی امام صاحب کے عذر کی داد چاہی۔

امام صاحب نے فرمایا کہ!

صاحب تم میری بات ہنسی میں کیوں اڑا رہے ہو کیا ایسا ہونا ممکن نہیں؟۔

دہریے نے کہا!

حضرت! کہیں ایسا ہوتے سنا ہے یا اس قسم کا بعید از عقل (**عقل سے دور**) قصہ خود بنالیا ہے۔

ایک کشتی مخصوص ترتیب کی ایک خاص ہیئت کے ساتھ خود بخود کہیں بن سکتی ہے اور پھر بن کر آپ سے آپ ہی دریا میں پڑ کر تیرنے لگنا تو افترا پر افترا ہے۔

آپ نے فرمایا! میاں جب ایک چھوٹی سی کشتی خود بخود نہ بن سکتی ہے نہ تیر سکتی ہے تو پھر یہ زمین و آسمان کی کشتیاں خود بخود بن کر ازل سے آج تک کیسے تیر رہی ہیں۔

دہریہ کی سمجھ میں امام صاحب کی حکمت بھری مثال آگئی اور وہ فوراً اپنے عقیدہ سے تائب ہو کر مسلمان ہوگیا۔

اسی واسطے میں نے باری تعالیٰ کے وجود کے انکار کو روزِ روشن میں سورج کے انکار کے برابر بیان

کیا ہے۔ وجودِ باری کے بدیہی (ظاہر) ہونے کے سبب سے پیغمبروں کا کام لوگوں کو خدا کی توحید کی طرف بلانا ہوتا تھا۔ وہ خدا کے وجود کے ثبوت کرنے کے زیادہ درپے نہ ہوتے تھے بلکہ منکرینِ وجود کو کالعدم (معدوم) سمجھ کر وحدت کی تبلیغ میں مشغول رہا کرتے تھے۔

تمام دنیا انسان کے لیے ہے:

اب اس کے بعد آپ کائنات میں غور کریں تو معلوم ہو گا کہ دنیا کا پتہ پتہ اور ذرہ ذرہ انسان کی خدمت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ ہوا، سورج، پانی اور درخت وغیرہ سب کے سب انسان کے خادم اور نوکر ہیں۔ مگر اس کا اپنا وجود کائنات میں سے کسی شے کے لیے کارآمد اور مفید نہیں اور وہ یوں ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اگر آج دنیا میں ہوا نہ ہو تو تھوڑے ہی وقت میں انسانی زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ سورج نہ ہو تو دن کا نکلنا، غلوں کا پکنا اور لاکھوں اور چیزیں جو اس سے متعلق ہیں بند ہو کر تباہی کا باعث بن جائیں۔

پانی نہ ہو تو اس کا اثر جو حیاتِ انسانی پر پڑ سکتا ہے وہ بالکل ظاہر ہے۔ درخت نہ ہوں تو انسان اپنی خارج شدہ کاربن ڈائی آکسائیڈ سے تباہ ہو جائے اور درختوں کے ذریعہ کاربن ڈائی آکسائیڈ آکسیجن میں تبدیل ہو کر زندگی میں مدد نہ دے تو موجودہ آکسیجن کا سٹور تھوڑے ہی دنوں میں ختم ہو کر انسانی نظام کا فیصلہ کر دے۔

لیکن اگر آج انسان کے وجود کو دنیا سے نابود کر دیا جائے تو کیا آپ کے خیال میں ہوا، سورج، پانی یا دنیا کی کسی اور چیز پر اس کے نہ ہونے سے اثر پڑے گا۔ دنیا میں کتنا زمانہ انسان نہ تھا اور یہ سب کچھ تھا اور خدا معلوم دنیا سے کتنا زمانہ انسان ناپید ہو گا اور یہ سب کچھ ہو گا تو معلوم ہوا کہ انسان اس دنیا کی کسی چیز کے کام کا نہیں۔ ورنہ اس کے نہ ہونے سے ضرور دنیا کی چیزوں پر بالواسطہ یا بلاواسطہ اثر پڑتا۔ تو گویا سب دنیا انسان کی خدمت اور چاکری کے لئے پیدا کی گئی ہے۔

اسی واسطے اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے!

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا۔ (البقرة:٢٩)

یعنی اللہ تعالیٰ وہ پاک ذات ہے۔ جس نے تمہارے لئے زمین کی سب چیزوں کو پیدا فرمایا۔

انسان کی پیدائش کا مطلب:

اب سوچنا یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے دنیا و مافیہا **(دنیااوراس میں جو کچھ ہے)** کو انسان کی خدمت کے لئے پیدا کیا۔ اور انسان ان میں سے کسی کے کام کا بھی نہیں۔ تو کیا انسان کے وجود کو بیکار محض پیدا کیا گیا۔ کیا اس کی پیدائش کا مطلب صرف دوسروں سے خدمت لینا ہے۔ اور خود یہ کسی کا بھی خادم نہیں۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ فرماتا ہے!

اَفَحَسِبْتُمْ اَنَّمَا خَلَقْنٰكُمْ عَبَثًا وَّاَنَّكُمْ اِلَيْنَا لَا تُرْجَعُوْنَ۔ **(المومنون:۱۱۵)**

کیا اے انسانوں تم گمان کرتے ہو کہ ہم نے تم کو بیکار بنایا ہے اور تم ہماری طرف لوٹ کر نہ آؤ گے۔

نہیں بلکہ جس طرح دنیا کی ہر ادنیٰ چیز اپنے سے اعلیٰ کی خادم اور فرمانبردار اور مطیع ہے۔ دنیا کی چیزوں میں اگر غور کرو گے۔ تو ان کو تین قسم کا پاؤ گے۔ جمادات **(پتھر)**۔ نباتات **(سبزیاں)** اور حیوانات۔ جمادات نباتات کی خادم اور فرمانبردار ہے۔ بناتات حیوانات کی چاکر **(نوکر)** ہے۔ اور پھر حیوانات میں غور کرنے سے ان میں بھی بعض بعض کے خادم اور فرمانبردار ہیں۔

حیوانات کے معزز طبقہ انسانی پر نظر ڈالو۔ تو اس میں بھی چھوٹا بڑے کا اور ادنیٰ اعلیٰ کا مطیع اور خادم ہے۔ تو معلوم ہوا۔ کہ جس قاعدہ سے انسان دوسری جمادات **(پتھر)**۔ نباتات اور حیوانات کا مخدوم **(جس کی خدمت کی جائے)** اور مطاع **(جس کی تابعداری کی جائے)** ہے۔ اسی قاعدے کے مطابق وہ اپنے سے بزرگ اور برتر ہستی یعنی اللہ جل شانہ کا خادم اور مطیع ہے۔ وہ دنیا کا مالک مگر مالکِ دنیا کا مملوک **(غلام)** ہے۔ وہ کائنات کا فرماندہ **(حکم چلانے والا)** مگر خالق کائنات کا فرمانبردار ہے۔

شیخ سعدی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔

ابروباد ومہ وخورشید و فلک در کاراند   تا تو نا نے بکف آری او بغفلت نخوری
ہمہ از بہر تو سر گشتہ و فرمابنر دار   شرط انصاف نباشد کہ تو فرماں نبری

ترجمہ: بادل، ہوا، چاند، سورج اور آسمان تیرے کاموں میں لگے ہوئے ہیں تاکہ تجھے کھانا میسر آئے اور تو غفلت کے ساتھ نہ کھائے۔ لیکن یہ انصاف نہیں ہے کہ تمام چیزیں تیرے لیے محنت کریں اور فرمانبردار

ہوں اور تو اپنے مالک کا فرمانبردار نہ بنے۔

شرک نہایت ذلّت ھے:

اب جب آپ کو معلوم ہو گیا کہ انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کیلئے پیدا کیا ہے۔ تو انسان کو بھی چاہئے کہ اُسی خالق و مالک کی اطاعت و عبادت کرے۔ اگر وہ خالق کائنات کے بغیر کسی اور چیز کی عبادت کریگا تو گویا وہ اپنے آپ کو اپنے فطرتی اعلیٰ مرتبہ سے گرا کر ذلیل اور پست مرتبہ پر رضا مندی ظاہر کرتا ہے۔ چنانچہ جن قوموں نے بھی اللہ تعالیٰ کی عبادت چھوڑ کر غیر اللہ کی پرستش شروع کی۔ اور دنیوی اشیاء کو اپنا معبود و مسجود بنایا۔ تو آخر کار وہ قومیں غلامی کی ذلت اور جہالت کے عمیق (گہرے) غار میں دھکیل دی گئیں۔

ہندو قوم کو ہی دیکھو کہ جب انہوں نے خالقِ حقیقی سے رشتہ کاٹ کر غیر اللہ کیساتھ تعلق پیدا کرلیا۔ آگ کو دیکھا تو اگنی دیوتا کہہ کر جھک گئے۔ سورج کو دیکھا تو سورج دیوتا کہہ کر معبود بنالیا۔ چاند کو دیکھا تو چندر ماں کہہ کر سجدہ میں گر گئے۔ غرضیکہ سانپ۔ مگرمچھ۔ پتھر۔ درخت اور ہر چھوٹی بڑی چیز دیوتا اور خدا بنالی گئی۔ اور دنیا کی ہر چیز کو جو کچھ ذرا بھی اہمیت رکھتی تھی۔ معبود و مسجود کا مرتبہ دے دیا گیا۔ تو ان کو چیر پھاڑ کر اُن کے اجزاء معلوم کرنا اُن کے تجربے کرنا۔ اُن کو بھٹیوں میں گلا کر اُن سے فائدہ اٹھانا بھی سب ناجائز ٹھہرا کیونکہ معبود کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ ہتک (توہین) کے مترادف تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ عابدین بھی:

”ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ“ (آل عمران:۱۱۲)
کا زندہ مصداق بنادیئے گئے۔

دوسری قومیں جو اس دنیا کی ہر ایک چیز کو اپنا خادم سمجھتی تھیں اور جو ان کی تجمیع وتفریق **(جمع وتفریق)** اور قطع و برید **(کاٹنا چھانٹنا)** سے حیرت انگیز نتیجے نکال رہی تھیں ہندوؤں پر چڑھ آئیں۔ اور ادنیٰ وقت کے ساتھ انہیں اپنا غلام بنالیا کیونکہ حملہ آور قومیں تو دنیا کی ہر چیز کو اپنا غلام اور خادم سمجھتی تھیں۔ اور ہندو خود ان چیزوں کے پرستار اور غلام بنے ہوئے تھے یا دوسرے الفاظ میں وہ حملہ آور قوموں کے غلاموں کے غلام تھے۔ تو پھر وہ اپنے مالکوں اور آقاؤں سے کس طرح مقابلہ کرسکتے۔

مسلمان اور علوم جدیدہ:

مسلمان بھی جب تک دینی علوم کے ساتھ دنیوی علوم سیکھتے تھے۔ جب وہ حقیقی طور پر:

”اَنَّ اللّٰہَ سَخَّرَ لَکُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰاتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ“ (لقمان: ۲۰)

ترجمہ: کیا تم نے نہیں دیکھا کہ جو کچھ آسمانوں میں اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو خدا نے تمہارے قابو میں کر دیا ہے

کی آیت پر عمل کرتے تھے۔ اور ان چیزوں کی تسخیر سے پورا پورا فائدہ اُٹھاتے تھے تو ان کا بھی دنیا میں طوطی بولتا تھا۔ مگر جب انہوں نے بھی ان علوم کی طرف پیٹھ پھیر دی اور علم کو ”منیتہ المصلیٰ“ میں ہی موقوف سمجھنے لگے۔ تو آخر کار ان کو بھی عزت کے درجہ سے گرا کر ان کا تاج وتخت دوسروں کے حوالے کر دیا گیا۔

مسلمانو۔ یاد رکھو۔ تم کو اس احکم الحاکمین کا حکم ہے کہ جس کے قبضۂ قدرت میں دارین کی عزت و دولت ہے۔ کہ تم دین کے علوم کے ساتھ دنیا کے علوم بھی حاصل کرو۔ نماز۔ روزہ۔ حج۔ اور زکوٰۃ وغیرہ کے مسائل کے ساتھ ایروپلین۔ الیکٹرک۔ بندوق اور توپ کا بھی علم سیکھو۔

قرآن پاک میں اسی واسطے فرمادیا ہے کہ!

”وَاَعِدُّوْا لَھُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّۃٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَیْلِ تُرْھِبُوْنَ بِہٖ عَدُوَّ اللّٰہِ وَعَدُوَّ کُمْ“ (انفال: ۶۰)

ترجمہ: اور دشمن کے مقابل حتّی المقدور اپنی قوت کو مجتمع کرو اور گھوڑوں کے لشکر تیار رکھو اور ان چیزوں کے ذریعہ اپنے اور اللہ کے دشمنوں کو ڈراؤ۔

مختصر الفاظ میں مطلب یہ ہوا کہ اے مسلمانو دشمنوں کے مقابل میں قوت پیدا کرو۔ اور مسلمان قوت تو تب ہی پیدا کر سکتے ہیں۔ کہ جب اس قوت کے پیدا کرنے کا علم بھی جانتے ہوں۔ بغیر علومِ جدیدہ کے وہ دشمن کے مقابلہ میں اُن جیسی یا اُن سے زیادہ طاقت کس طرح مہیا کر سکتے ہیں۔ مگر افسوس کہ آج ہم اوّل تو علم حاصل ہی نہیں کرتے۔ اور اگر بدقت تمام کچھ کرنے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو وہ علم صرف نماز روزہ حج زکوٰۃ کے جزوی مسائل پر ختم ہو جاتا ہے مگر قوت کا علم یا دوسرے الفاظ میں اسبابِ جہاد کے متعلق کہ جس کی

وجہ سے ہماری نمازیں روزے اور دوسری دینی ضروریات قائم رہی ہیں اور رہ سکیں گی بالکل ناواقف اور قطعاً نابلد ہوتے ہیں۔ جب دعا میں:

''فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ''

کے الفاظ آتے ہیں۔ تو انتہائی زور سے آمین پکارتے ہیں۔ مگر قومِ کافرین پر غلبہ حاصل کرنے کی عملی صورت دیکھو تو کچھ بھی نہیں۔ اگر صرف دعاؤں اور پُرزور آمینوں سے کام چل سکتا۔ تو حضور سرورِ عالم جیسے مقدس پیغمبر جنگِ بدر میں دو زرہیں زیبِ تن (پہنا) نہ فرماتے۔ جنگِ اُحد میں اپنے مبارک دانت شہید نہ کرواتے۔ جنگِ احزاب میں اپنے نازک ہاتھوں سے خندق نہ کھودتے اور جنگِ حنین میں تیروں کی بارش کا مقابلہ نہ فرماتے۔ حالانکہ حضور ﷺ سے زیادہ مستجاب الدعوات (جس کی دعا قبول ہوتی ہو) ہستی اور کون ہو سکتی ہے۔ مگر آپ نے اپنی اُمت کے لئے ایک شاندار اُسوہ چھوڑا۔ آپ نے تعلیم دی کہ ؎

بر توکل زانوئے اشتر ببند

ترجمہ: اللہ کے توکل پر اونٹ کو چھوڑ دیا جائے تو وہ کہیں سے کہیں نکل جائے گا۔ اس واسطے پہلے اس کے گھٹنے کو باندھو پھر اللہ پر توکل کرو۔

یعنی دینا کے اسباب کر کے نتیجہ اللہ پر چھوڑ دو۔

اور دُعا کے ساتھ دوا کرنے کا طریقہ سمجھایا۔ تو:

''فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِيْنَ''

اے اللہ کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

تو دعا ہے اس کے ساتھ اسبابِ جہاد کا علم اُن کا استعمال اور اُن کا وقت ضرورت جمع کرنا دوا ہے۔ مگر آج تو صرف دعا ہے۔ دوا کا نام تک نہیں۔ جس طرح اسلام کی عالیشان عمارت پانچ رکنوں پر کھڑی ہے۔ اور اُن کے استحکام سے عمارت کا استحکام ہے۔ اسی طرح یہ رکن خود خارجی حفاظت کے محتاج ہیں۔ کیونکہ دشمن تمہاری اس شاندار بلڈنگ کو گرانے کیلئے تمہارے ستونوں کو اُکھاڑنے کی کوشش کرینگے۔ اب اگر تم ان ستونوں کو اعدا کی دستبرد (ہاتھوں سے) سے محفوظ نہ رکھ سکو گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ دلکش عمارت ایک دن زمین کے برابر

کردی جائیگی۔

وہ حفاظت علم جہاد ہے۔ جس طرح دنیا کا کوئی مکان بغیر حفاظت اور چوکیداری کے محفوظ نہیں رہ سکتا۔ اسی طرح ایمانی واسلامی مکان بھی شیطان اور اُس کی ذریات (چیلے، اولاد) سے بغیر حفاظت و دفاع کے کیسے بچایا جاسکتا ہے تو گویا اسلام کی حفاظت جہاد سے متعلق ہے اور جہاد کے لئے آلاتِ حرب (اسلحہ) اور لڑائی کے ہتھیاروں کا علم حاصل کرنا نہایت ضروری ہے۔ اور یہ علم ہم تب ہی سیکھ سکتے ہیں کہ جب ان دنیوی چیزوں کو اپنا خادم اور غلام سمجھیں۔ ان کے غلام بن کر ہم ان سے کسی قسم کا فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ تو معلوم ہوا کہ یہ سب دنیا انسان کی خدمت کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اور خود انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت واطاعت کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔

اسی تخلیق انسانی کے مقصود کو قرآن پاک نے:

"وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ٥" (الذریات:۵۶)

اور میں نے جن اور آدمی اسی لئے بنائے کہ میری بندگی کریں۔

کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

پیغمبروں کی ضرورت:

اس طویل تقریر کا خلاصہ یہ ہوا کہ انسان تمام دنیا سے خدمت لے۔ ان سے فائدہ اٹھائے۔ مگر وہ اللہ تعالیٰ کا فرمانبردار و مطیع رہے۔ اور ایسے کام کرے کہ جس سے وہ بے مثال آقا راضی ہو۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ خادم مالک کی اطاعت وفرمانبرداری اُسی صورت میں کرسکتا ہے کہ جب اس کی رضامندی کے طریقوں سے واقف ہو۔ اسے معلوم ہو کہ میرا مالک اس کام کے کرنے سے خوش ہوگا اور اس کام کے کرنے سے ناراض۔ مگر اللہ تو اللہ انسان دوسرے انسان کی رضامندی بھی بغیر اس کے بتائے ہوئے نہیں معلوم کرسکتا حالانکہ دونوں کی دو آنکھیں۔ دو ہاتھ۔ دو پاؤں۔ تمام انسانی ضروریات میں متحد، پھر بھی اگر ننگے ہو کر ایک دوسرے سے اپنا سینہ ملالیں تو بھی خادم بغیر اپنے مالک کے بتائے ہوئے اُس کی رضامندی وغیر رضامندی سے آگاہ نہیں ہوسکتا۔ تو جب ایک انسان دوسرے انسان کی رضامندی بغیر اُس کے بتائے ہوئے معلوم نہیں کر

سکتا۔ تو پھر ایک محتاج انسان اللہ تعالیٰ کی رضا وغیر رضا بغیر اس کے بتائے ہوئے کیسے معلوم کر سکے گا کیونکہ یہ انسان، وہ خدا، یہ حادث (نیا) وہ قدیم، یہ جسم وہ نور، یہ محتاج وہ غنی۔ غرضیکہ ہر ایک صفت میں رات اور دن کا فرق ہے۔ لہذا یہ ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنی مرضی وغیرِ مرضی کو اپنے بندوں پر ظاہر فرماتا ہے تاکہ بندے اس کے حکم پر چل کر اُس کی رضامندی حاصل کر سکیں۔

مگر آپ دیکھتے ہیں کہ دنیا کا ادنیٰ سے ادنیٰ بادشاہ جو اس حاکم حقیقی کے سامنے پر شپہ (**مچھر کے پر**) سے بھی کم حیثیت رکھتا ہے۔ اپنے احکام اور فرامین گلی گلی اور کوچہ کوچہ پھر کر عوام کو نہیں سنایا کرتا۔ بلکہ اپنے خواص اور مقربین کے ذریعہ سے اپنے احکام عوام تک پہنچوا دیتا ہے جس سے لوگ بادشاہ کی مرضی سے واقف ہو کر حکم کی تعمیل کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور خلاف ورزی کی صورت میں انہیں سزا دی جاتی ہے۔ تو پھر وہ احکم الحاکمین کہ جس کی شان تو یہ ہے کہ جب قیامت کے دن تختِ جلال پر جلوہ فرما کر پوچھیں گے!

”لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ“۔

کہ اے لوگو آج کس کی بادشاہی ہے۔

اس وقت کسی قیصر وخاقان۔ کسی امیر وسلطان کے منہ سے جواب نہ نکل سکے گا۔ ہیبت اور خوف کی وجہ سے کپکپا رہے ہونگے۔ اور بالکل ساکت وصامت بت بنے کھڑے ہونگے کہ ذات باری کی طرف سے ندا ہوگی:

لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ

کہ آج بڑے جابر اور قاہر اللہ کی بادشاہی ہے۔

جس کی حکومت ابدی۔ جس کی سلطنت بے مثال۔ اور جس کا ملک بلا شراکت ہے۔ تو پھر آپ ہی بتایئے کہ ایسا شہنشاہ ذوالجلال کس طرح ہر کس وناکس کو اپنے احکام منہ در منہ سناتا پھرے۔ اور پھر اگر سنائے بھی۔ تو سننے والا کون ہوگا۔

موسیٰ علیہ السلام جیسے اولو العزم اور دریائے معرفت کے پیراک نبی تو ایک ہی تجلی میں بے ہوش ہو گئے۔ اور طور جیسے پہاڑ ایک ہی جلوے میں ”دَكًّا دَكًّا“ ہو گئے۔ کسی نے کہا ہے۔

موسیٰ زہوش رفت بیک جلوہ صفات

تو عین ذات مے نگری در تبسمی

ترجمہ: موسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کا ایک صفاتی جلوہ دیکھ کر بے ہوش ہو گئے لیکن یارسول اللہ آپ نے اللہ کریم کی ذات کے مشاہدے کیے اور مسکراتے رہے۔

تو پھر اگر ذاتِ باری بے حجاب ہو کر عوام کو اپنے احکام سنائے تو اس انسان ضعیف البنیان کا کیا حال ہو گا۔ تو معلوم ہوا کہ حکمت و عقل کا یہی تقاضا تھا۔ کہ اللہ جل شانہ اپنے احکام دوسروں کے ذریعہ اپنے بندوں تک پہنچانے کا انتظام فرمائیں۔ اور اپنی رضا و غیر رضا کے متعلق عوام کو خواص کے ذریعہ سے اطلاع کروا دیں۔

پیغمبروں کا معصوم ہونا ضروری ہے:

مگر یہ ضروری ہے کہ بادشاہ جن خاص شخصوں کو تبلیغ احکام کے لئے چنے وہ اُس کے پورے مطیع اور فرمانبردار ہوں۔ کیونکہ اگر وہ پورے مطیع اور فرمانبردار نہ ہونگے۔ تو ہو سکتا ہے کہ وہ بادشاہ کا حکم عوام تک پہنچائیں ہی نہیں یا اس میں کسی قسم کی تبدیلی یا کمی کر دیں۔ دنیا کے بادشاہ تک بھی سرکشوں اور نافرمانوں کو اپنے درباروں میں گھسنے نہیں دیتے۔ چہ جائیکہ اُنہیں مقرب بنائیں۔ مگر وہ غریب تو پھر بھی بوجہ انسان ہونے کے بسا اوقات دھوکا کھا جاتے ہیں اور ایک دشمن کو دوست سمجھ کر اپنا معتمد بنا لیتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ تو ظاہر و باطن کا جاننے والا ہے۔ اس پر تو دل کا خفی سے خفی راز بھی پوشیدہ نہیں۔ اس کی شان تو:

''اِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ ط ۝ (آل عمران:۵)

ترجمہ: اللہ پر کچھ چھپا نہیں زمین میں نہ آسمان میں۔

اس واسطے اس ذات پاک کے متعلق اس قسم کے دھوکا کھا جانے کا ذرہ برابر بھی شبہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ وہ جس شخص کو بھی اپنے احکام و فرمان کے پہنچانے کے لئے چنے گا۔ وہ کبھی بھی دھوکا باز یا دوست نما دشمن نہیں ہو سکتا بلکہ ظاہر و باطن میں وہ پورا پورا فرمانبردار ہو گا۔ اسی لئے مسلمان پیغمبروں کو ہر قسم کے گناہوں سے مبرا اور معصوم سمجھتے ہیں۔ کیونکہ اگر وہ خود گنہگار ہوں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کے برخلاف کرتے ہوں تو وہ دوسروں کے لئے کس طرح قابل اعتبار سمجھے جا سکتے ہیں۔ اور خداوندِ قدوس تبلیغ احکام جیسا اہم کام کس طرح ان کے سپرد کر سکتا ہے۔

تو خلاصہ کلام یہ نکلا کہ ہم کو اللہ تعالیٰ کا حکم ماننا ضروری ہے۔ مگر حکم کو ماننے سے پہلے حکم سے مطلع ہونا بھی ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے حکم کو معصوم خواص اور مقربین کے ذریعہ اپنے بندوں پر ظاہر فرماتا ہے۔ اصطلاح شریعت میں ان معصوم مقربین کو نبی یا رسول کہا جاتا ہے۔

نبی اور رسول میں فرق:

بعض عالموں کا خیال ہے کہ نبی اور رسول کے لفظوں میں کوئی فرق نہیں۔ بلکہ یہ دونوں لفظ مترادف اور ہم معنی ہیں۔ اور ان الفاظ کے ہم معنی ہونے کے ثبوت میں وہ آیتیں اور حدیثیں پیش کرتے ہیں۔ کہ جہاں پر ایک ہی شخص کو کبھی تو رسول بولا گیا ہے۔ اور کبھی بنی۔ دوسرے علماء رسول کو نبی سے عام سمجھتے ہیں۔ اور وہ کہتے ہیں۔ کہ رسول کا لفظ قرآن نے فرشتوں اور انسانوں دونوں کے لئے استعمال کیا ہے۔ جیسے سورہ حج کے دسویں رکوع میں آتا ہے!

” اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ط۔ (الحج:۷۵)

ترجمہ: یعنی اللہ تعالیٰ فرشتوں اور انسانوں میں سے رسول چنتا ہے۔

مگر جمہور اہل سنت و جماعت اس بات کے قائل ہیں کہ نبی عام ہے اور رسول خاص۔ کیونکہ رسول وہ ہوتا ہے۔ جسے مستقل شریعت اور کتاب دی گئی ہو۔ مگر نبی کا لفظ عام ہے۔ کبھی اس کا اطلاق رسول پر کیا جاتا ہے۔ اور کبھی اس پیغمبر کے لئے بھی بولا جاتا ہے۔ جسے کوئی مستقل کتاب یا شریعت نہیں دی گئی۔ بلکہ وہ پہلے رسول کی شریعت ہی کی طرف لوگوں کو بلاتا ہے۔ اور اس کا کام رسولِ سابق کے مردہ احکام کو زندہ کرنا اور اس کے لائے ہوئے قوانین کی تنشیر (پھیلانا) و تبلیغ کرنا ہوتا ہے۔ (اور اس کی مکمل تشریح ختم نبوت کے بیان میں ہے) قرآن پاک میں نبی اور رسول کے فرق اور پھر ان کے عام اور خاص ہونے کے متعلق سورہ حج کے ساتویں رکوع کی ۵۲ آیت میں ارشاد ہوتا ہے!

”وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ“۔

ترجمہ: ہم نے آپ سے پہلے کوئی رسول بھیجا اور نہ کوئی بنی۔

اس آیت سے ایک تو یہ معلوم ہوا کہ رسول اور نبی کے معنوں میں فرق ہے۔ ورنہ دونوں کو ایک جگہ جمع نہ کر

دیا جاتا۔ پھر اس سے رسول کے خاص اور نبی کے عام ہونے کا بھی پتہ چلا۔ کیونکہ خاص کے بعد عام کو بیان کرنا بہ نسبت برعکس کے زیادہ فصیح ہے۔ اور پھر رسول کے لفظ کا نبی سے خاص ہونے میں حضور سرورعالم کی اس حدیث سے پتہ چلتا ہے جس میں آپ نے فرمایا!

كم الأنبياء؟ قال: "مائة ألف وأربعة وعشرون ألفًا". قلت: يا رسول الله، كم الرسل منهم؟ قال: "ثلاثمائة وثلاثة عشر۔

(تفسیر ابن کثیر: جلد ۲، دار طیبۃ للنشر والتوزیع)

یعنی انبیا علیہم السلام ایک لاکھ چوبیس ہزار ہوئے ہیں۔ اور رسول صرف تین سو پندرہ۔

تو معلوم ہوا کہ نبی اور رسول میں فرق ہے۔ رسول خاص ہے اور نبی عام۔ ہاں البتہ قرآن پاک میں بعض مقامات پر ایک کو دوسرے کی جگہ توسعاً (کثرت) استعمال بھی کیا گیا ہے۔

پیغمبر جس قدر ہوئے سب انسان اور مرد تھے:

آسمانی کتابوں سے صاف ظاہر ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر آقائے نامدار حضرت محمد رسول اللہ ﷺ تک جس قدر پیغمبر ہوئے سب کے سب انسان اور مرد ہوئے ہیں۔ غیر انسان یا عورت کو مخلوقات کی طرف پیغمبر بنا کر نہیں بھیجا گیا۔ اس سے انسان کے دل میں ضرور خیال پیدا ہوتا ہے۔ کہ جب اللہ تعالیٰ کو اپنے احکام کسی معصوم پیغمبر کے ذریعے سنانے کی ضرورت تھی۔ تو پھر کیوں نہ اللہ تعالیٰ نے یہ پیغمبر، فرشتوں سے چن کر روانہ فرمائے۔ جن کی شان میں خود قرآن پاک:

”لَّا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَآ اَمَرَهُمْ وَ يَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝“ (تحریم:۶)

کے الفاظ بیان فرما رہا ہے۔

یعنی فرشتوں کی شان تو یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے کسی حکم کی نافرمانی نہیں کرتے۔ بلکہ وہ ہر ایک حکم کو بدرجۂ اتم (انتہائی اعلیٰ طریقے سے) بجالاتے ہیں۔

اور پھر اگر انسانوں ہی کو پیغمبری کا مرتبہ دینا تھا تو عورتوں نے کیا قصور کیا تھا کہ ان میں کسی ایک کو بھی اس جلیل مرتبہ سے سرفراز نہ کیا گیا۔

(**جواب**) انسانوں میں سے پیغمبروں کو منتخب کرنے میں باری تعالیٰ کی یہ حکمت ہے کہ بنی آدم کے لئے اتحادِ جنس کی وجہ سے استفادہ آسان ہو۔ اور وہ انسانیت میں شریک ہونے کی وجہ سے اپنے بنی نوع کو تمام ضروریات اور حاجات میں کھلی کھلی رہنمائی کر سکیں۔ کیونکہ اگر فرشتوں کو چن کر ان کی طرف پیغمبر بنایا جاتا تو اختلافِ جنس کی وجہ سے ان سے وحشت رہتی اور چونکہ وحشت افادہ واستفادہ (**فائدہ اُٹھانا**) میں ہارج ہوتی ہے۔ اس واسطے نبوت کے فرائض کو وہ انسانوں میں پوری پوری طرح نہ بجالا سکتے۔

اس کے علاوہ مادی چیزوں کے ساتھ جب ان کا تعلق ہی نہ ہوتا تو وہ اُن کے متعلق کیا رہنمائی کرتے۔ مثلاً جب وہ خود بال بچے، طعام، مکان اور رشتہ داروں کے بکھیڑوں سے پاک ہیں۔ تو وہ دوسروں کو اس کے متعلق کیا صحیح مشورہ دیتے اس واسطے پیغمبروں کا انتخاب انسانوں ہی سے کیا گیا۔ قرآن پاک میں کفار کے اسی اعتراض کو کئی جگہ بیان کیا گیا۔ کیونکہ وہ بھی کہتے تھے۔ کہ اگر اللہ نے پیغمبر بھیجنا تھا تو پھر فرشتوں سے کیوں نہ بھیجا۔ چنانچہ سورہ بنی اسرائیل میں ہے!

’’وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنۡ يُّؤۡمِنُوۡۤا اِذۡ جَآءَهُمُ الۡهُدٰٓى اِلَّاۤ اَنۡ قَالُوۡۤا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوۡلًا ۝ قُلۡ لَّوۡ كَانَ فِى الۡاَرۡضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمۡشُوۡنَ مُطۡمَئِنِّيۡنَ لَنَزَّلۡنَا عَلَيۡهِمۡ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَـكًا رَّسُوۡلًا ۝‘‘۔

(بنی اسرائیل: ۹۴)

یعنی لوگوں کو ایمان لانے سے کسی چیز نے منع نہیں کیا۔ جبکہ ان کے پاس ہدایت آئی۔ مگر یہ کہ انہوں نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے ایک انسان کو رسول بنا کر بھیجا ہے۔

اب باری تعالیٰ کفار کے اس اعتراض کا ’’**قل**‘‘ سے جواب دیتے ہیں۔ کہ اے حبیب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم انہیں کہہ دیجئے کہ اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے سکونت رکھتے تو ضرور ہم ان پر آسمان سے فرشتہ رسول بنا کر روانہ کرتے۔ کیونکہ ہر ایک چیز کو اپنے ہم جنس سے فائدہ ہوتا ہے۔ اس واسطے انسانوں کی طرف انسان ہی رسول بنا کر روانہ کرنا حکمت کا مقتضی تھا۔

عورت کو کیوں درجہ نبوت نہ دیا گیا:

اور عورت کو درجہ نبوت کے لئے اس واسطے نہ چنا گیا کہ نبی کے لئے بڑے استقلال اور تحمل کی

ضرورت ہے۔ لوگ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس پر پتھر برساتے ہیں اور اس کی تبلیغ کی مخالفت کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں اُٹھا رکھتے۔ مگر وہ ان تمام مخالفتوں اور دشمنوں کا مضبوط دل سے مقابلہ کرتا ہے۔ اور اس قسم کے معاندانہ سلوک اس کے پائے استقلال کو تبلیغی رستہ سے ذرہ برابر بھی نہیں ہٹا سکتے۔ مگر عورت فطرتاً کمزور ہے۔ اس کی بناوٹ اس کے اعضا اور اس کا ماحول اتنی تکلیف برادشت کرنے کی اسے اجازت نہیں دے سکتا۔

اسی واسطے تو قرآن پاک نے:

''اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَى النِّسَآءِ''(النساء: ۳۴)

ترجمہ: مرد عورتوں پر مسلط و حاکم ہیں۔

کا قانون بیان فرمایا ہے۔ جب یوں عام واقعات زندگی میں عورت عقلاً ونقلاً علماً اور عملاً کمزور ثابت ہوتی ہے۔ تو پھر ایسی مخالفتوں کی بوچھاڑ میں کس طرح ثابت قدم رہ کر وہ اپنے فرائض کو پورا کر سکے گی۔ لہذا ضروری ہوا۔ کہ عبد و معبود کا درمیانی واسطہ کہ جس کے ذریعہ سے مرضیات وغیر مرضیاتِ خداوندی **(اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ وغیر پسندیدہ)** معلوم ہوتی رہیں۔ کوئی الوالعزم مرد ہی ہوا کرے۔

انبیاء علیہم السلام کی تعداد:

اللہ تعالیٰ نے دنیا پیدا فرمانے کے بعد مخلوقات کو اپنی مرضی سے مطلع کرنے کے لئے بے شمار انبیا علیہم السلام کو بھیجا۔ جن کی صحیح تعداد کا حال اللہ تعالیٰ ہی کو معلوم ہے۔ کیونکہ انبیاء کی تعداد کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے مختلف روائتیں بیان کی گئی ہیں۔ کسی میں ایک لاکھ چوبیس ہزار کسی میں دو لاکھ چوبیس ہزار۔ کسی میں کچھ زیادہ اور کسی میں کچھ کم۔ جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان اعداد سے صرف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ان کی کثرت کو بیان فرمانا ہے نہ کہ حصر (گنتی) کو۔ اسی واسطے ہمیں بھی چاہئے کہ پیغمبروں کی تعداد کو کسی خاص عدد میں محصور نہ کر دیں۔ کیونکہ اگر کوئی شخص ایک عددِ معین (مقررہ تعداد) پر ایمان لایا اور اسے ہی یقینی تعداد سمجھ لیا۔ تو اب اگر حقیقت میں پیغمبروں کی تعداد اُس خاص عدد سے کم ہے۔ تو گویا اس نے بعض غیر نبی ہستیوں کو نبی مانا۔ اور یہ ظاہر ہے کہ نبی کو غیر نبی یا غیر بنی کو نبی ماننا سراسر کفر ہے۔ اس لئے احوط **(زیادہ احتیاط)** اور اسلم **(سلامتی)** طر

یقہ یہی ہے۔ کہ انبیاء کی تعداد کو کسی خاص عدد میں حصر نہ کیا جائے۔ بلکہ اگر کوئی تعداد کہے تو ساتھ ہی کم بیش بھی کہہ لیا کرے۔ یعنی یوں کہا کرے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم وبیش کیونکہ اس لفظ کے کہنے سے کسی قسم کا خدشہ ہی نہ رہتا۔

حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کی ممتاز تعلیم:

لوگوں کو احکام پہنچانے کے لئے انبیا علیہم السلام کے سلسلہ کو روانہ کیا گیا۔ اسی سلسلۂ نبوت کی آخری اور اہم کڑی ہمارے سردار حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ آپ پر نبوت کے سلسلے کو ختم کر دیا گیا۔ رسول ہونے کی حیثیت سے آپ کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک مستقل شریعت اور قانون دیا گیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مجموعۂ قوانین کا نام قرآن مجید یا فرقان حمید ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پہلے بھی دوسرے نبیوں کو کتابیں دیں گئیں۔ جن کے ذریعے سے انہوں نے لوگوں کو گمراہی سے نکال کر ہدایت کا رستہ دکھایا۔ ان میں چھوٹی چھوٹی کتابیں یا صحیفے ۱۰۴ تھے۔ مگر بڑی اور مشہور کتابیں قران پاک کے علاوہ تین تھیں۔ یعنی توریت۔ زبور اور انجیل۔ توریت حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اور زبور حضرت داؤد علیہ السلام پر اور انجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر نازل کی گئی۔ مگر ان سب سے طرز تعلیم رہنمائی اور ایصال الی المطلوب میں قرآن پاک بہت ہی ممتاز اور فوق ہے۔

وجۂ فوقیتِ قرآن:

دنیا میں غور کرو تو معلوم ہوگا۔ کہ انسان کو ڈرانے دھمکانے اور سکھانے کے طریقے مختلف وقتوں میں مختلف ہوا کرتے ہیں۔ مثلاً جب ایک شیر خوار بچے کو ڈرانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو صرف ''وہ کتا آیا'' یا ''ہوّا'' کہہ دینا کافی ہے۔ مگر جب ذرا بڑا ہوتا ہے تو پھر وہ صرف ان باتوں سے نہیں ڈرتا بلکہ ان الفاظوں کے ساتھ کچھ کھٹ کھٹ یا کتے کی سی آواز نکالنے کی بھی ضرورت پڑتی ہے۔ جب اس درجہ سے گزر کر ذرا اور بڑا ہو جاتا ہے۔ تو پھر نہ تو کھٹ کھٹ سے وہ ڈرتا ہے۔ اور نہ کتے کی آواز سے۔ بلکہ اس وقت تو اسے بعض دفعہ چپت لگا دی جاتی ہے اور بعض دفعہ پیسہ یا مٹھائی وغیرہ کا لالچ دے کر کام نکلوایا جاتا ہے۔ لیکن جب وہ اس سے بھی بڑھ کر جوان اور پختہ عقل ہو جاتا ہے۔ تو پھر اس وقت نہ تو ڈر کام دیتا ہے نہ لالچ۔ بلکہ اب تو اس سے

کام لینے کے لئے اس کو سمجھانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جو کام آپ اس سے کروانا چاہتے ہیں پہلے اس کے فوائد اُس کے ذہن نشین کر دیجئے۔ اور جس کام سے روکنا چاہتے ہیں اس کے نقصان اُسے پوری طرح پر سمجھا دیجئے۔ جب کسی چیز کا فائدہ ونقصان اس کی سمجھ میں آ گیا۔ تو جان لو کہ اب وہ آپ کا حکم ماننے کیلئے مستعد ہو جائیگا۔ اسی طرح اب اللہ تعالیٰ کے قوانین پر غور کرو۔ جب انسانی بچہ آدم علیہ السلام کی صورت میں دنیا میں بھیجا گیا تو جو کچھ اسے کہنا تھا صاف سیدھے الفاظ میں کہہ دیا گیا۔ حکم ہوا!

وَقُلْنَا يٰاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ص وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ○ (البقرۃ: ۳۵)

ترجمہ: اور ہم نے فرمایا اے آدم تو اور تیری بی بی اس جنت میں رہو اور کھاؤ اس میں سے بے روک ٹوک جہاں تمہارا جی چاہے مگر اس پیڑ کے پاس نہ جانا کہ حد سے بڑھنے والوں میں ہو جاؤ گے۔

چونکہ اس ممانعت کی کوئی عقلی دلیل نفع ونقصان کے متعلق نہ سمجھائی گئی۔ اسی واسطے شیطان حضرت آدم علیہ السلام کو عقلی دلیل بتا کر جادۂ استقامت سے لغزش دینے میں کامیاب ہو گیا۔

مردود نے کہا!

مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ○

(الاعراف: ۲۰)

یعنی تم کو اللہ تعالیٰ نے اس درخت کے کھانے سے اس لئے منع کیا تھا کہ کھا کر تم فرشتے یا ہمیشہ زندہ رہنے والوں میں سے نہ بن جاؤ۔

حضرت آدم علیہ السلام نے خیال فرمایا کہ اگر سب عمر زندہ رہینگے تو اور زیادہ معبودِ لایزال (**اللہ تعالیٰ کی ذات**) کا ذکر شکر کرینگے اور اگر فرشتے بن گئے۔ تو اس خاکی جسم سے رہائی مل جائیگی۔ چنانچہ آپ نے شجرہ ممنوعہ (**ممنوعہ درخت**) کا پھل کھایا اور آج دنیا کی چہل پہل اور رنج وخوشی اُسی کا نتیجہ ہیں۔

جب موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ آیا تو یہ انسانی بچہ بہت کچھ سمجھدار ہو چکا تھا۔ اب کہیں

"وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ط" (البقرۃ: ۶۳)

اور کوہ طور کو تمہارے سروں پر بلند کیا۔

کی کھٹ کی گئی، تو کہیں:

”فَاَرۡسَلۡنَا عَلَيۡهِمُ الطُّوۡفَانَ وَالۡجَرَادَ ۔(اعراف:۱۳۳)

تو بھیجا ہم نے ان پر طوفان“۔

کی چپت لگا دی گئی۔ کہیں من وسلوی کی مٹھائی کھلا کر راہ راست کی طرف آنے کی دعوت دی گئی۔ مگر جب تخلیق آدم پر کافی زمانہ گزر گیا۔ تو:

”اَرۡبَعِيۡنَ سَنَةً ۚ يَتِيۡهُوۡنَ فِى الۡاَرۡضِ ؕ ۔(المائدہ:۳۶)

چالیس برس تک بھٹکتے پھریں زمین میں“۔

کے ڈنڈے سے سزا دے کر صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت کی گئی۔ اور آدم زاد عہدِ طفولیت (**بچپن کا زمانہ**) سے گزر کر مراہق (**قریب البلوغ**) ہوگیا تو انجیل کا نزول ہوا۔ جس میں نقلی ترغیب وترھیب (**رغبت دلانا**) کے ساتھ:

”وَاٰتَيۡنٰهُ الۡاِنۡجِيۡلَ فِيۡهِ هُدًى وَّنُوۡرٌ ۔(المائدہ:۴۰)

اور ہم نے اُسے انجیل عطا کی جس میں ہدایت اور نور ہے“۔

کی رو سے دلائل عقلیہ سے بھی سے کام لیا گیا۔ مگر جب یہ انسانی بچہ بالکل جوان ہوگیا۔ اس کا عقل پختہ اور سمجھ تیز ہوگئی۔ تو اب اُسے امم سابقہ کی طرح بہلانا پھسلانا۔ ڈرانا اور دھمکانا کارآمد نہ رہا۔ بلکہ نقلیات کے ساتھ عقلی دلیلوں سے بھری ہوئی کتاب کے روانہ کرنے کی ضرورت ہوئی۔ چنانچہ انسان کی ضرورت کے مطابق قرآن پاک کو نازل کیا گیا۔ جس میں ہر عقلی فائدہ اور ہر نہی کا عقلی نقصان بیان کر کے لوگوں کو اطاعت خداوندی کی طرف بلایا گیا۔ مثلاً نماز کا حکم دیا تو ساتھ ہی فرمادیا:

اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنۡهٰى عَنِ الۡفَحۡشَآءِ وَالۡمُنۡكَرِ ؕ ۔(العنکبوت:۴۵)

اور نماز قائم فرماؤ بیشک نماز منع کرتی ہے بے حیائی اور بُری بات سے۔“

زکوۃ کا حکم دیا تو:

”وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ۔(البقرۃ:۲۷۲)

اورتم جو اچھی چیز دو تو تمہارا ہی بھلا ہے۔

کہہ کر سرمایہ داری کی لعنت سے بچنے کا فلسفہ سمجھایا۔ روزہ کے حکم کے ساتھ قوائے شہوانیہ (شہوت والے اعضاء) کے کمزور ہو جانے کے نتیجہ کو ”لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ“ تاکہ تمہیں تقویٰ کی دولت مل جائے۔ میں کہہ سنایا۔

حج کا حکم دیا تو تاجرانہ فوائد کا نقشہ:

”لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ “(الحج:۲۸)

تاکہ وہ اپنا فائدہ پائیں۔

کے دلکش الفاظ میں پیش کر دیا۔ جہاد کا حکم دیا تو فساد و بغاوت کی جڑ کاٹنے کے متعلق!

”حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ “(البقرۃ:۱۹۳)

تاکہ فتنہ نہ رہے۔

کی حکمت سمجھا دی۔

قصاص کا ارشاد فرمایا تو:

”وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰاُولِي الْاَلْبَابِ “(البقرۃ:۱۷۹)

ترجمہ: اور اے اہل عقل (حکم) قصاص میں (تمہاری) زندگانی ہے کہ تم (قتل وخونریزی سے) بچو۔

کہہ کر حیات انسانی کی حفاظت کا فلسفہ سمجھایا غرضیکہ کہاں تک بیان کیا جائے کہ اس انسانی بچہ کو راہ راست پر لانے کے لئے کیسے دلگداز اور مؤثر طرز پر دلائل عقلیہ کی روشنی میں اپنے احکام کو بیان فرمایا ہے۔

عقل اور فطرت کا فرق:

میں نے جو یہ عرض کیا ہے کہ قرآن پاک نے ہر حکم کے ساتھ عقلی دلیل بھی بیان کر دی ہے۔ اگر آپ غور کرینگے۔ تو وہ عقل وفطرت میں بہت بڑا فرق ہوتا ہے۔ فطرت کہتے ہیں۔ پیدائش کو یعنی وہ دلائل جس کی طرف ہر انسان کا طبعاً میلان ہو۔ ہاں وہ میلان بعض اوقات کسی خارجی اثر کی وجہ سے دب جاتا ہے۔ مگر جیسے ہی وہ خارجی اثر دور ہوتا ہے۔ وہ میلان اُبھر کر پھر فطرت کی طرف چلا آتا ہے۔ مثلاً یوں سمجھئے کہ آپ

ایک پتھر کو اوپر پھینکتے ہیں۔ پتھر کی فطرت کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ نیچے کی طرف آئے۔ مگر آپ کی قوت دافعہ یا پھینکنے کی طاقت نے اس پتھر کو اس کی فطری خواہش سے جدا کر دیا ہے۔ لیکن جونہی آپ کی قوت دافعہ کا اثر ختم ہو گا۔ وہ فوراً اپنی فطرت یا زمین کی طرف لوٹ آئیگا۔ لیکن عقل کا حال ایسا نہیں ہو سکتا ہے۔ کہ ایک کام عقلاً مفید نظر آتا ہو۔ مگر فطرتاً مضّر۔ اسی واسطے ایک عقلی چیز ایک زمانے میں مفید نظر آتی ہے مگر دوسرے زمانے میں جب عقل ماحول سے متاثر ہو کر متفاوت (جس میں فرق) ہو جاتا ہے تو زمانہ سابق کی وہ چیز جو سابقین کی عقلوں کے مطابق ہونے کی وجہ سے مفید نظر آتی تھی۔ حال یا آئندہ کے عقول کے مخالف ہونے کی وجہ سے مُضّر معلوم ہوتی ہے۔ مگر فطرت کا قانون بالکل اٹل اور قطعی ہوتا ہے۔ نہ زمانہ اس پر اثر کر سکتا ہے۔ اور نہ عقلوں کا تفاوت۔

مثال کے طور پر آپ ہندوؤں کی معاشرتی تقسیم پر نظر ڈالیں کہ انہوں نے کس طرح تمام قوم کو چار ذاتوں میں تقسیم کر کے ہر ایک کے متعلق ایک کام مقرر کر دیا ہے۔ اب یہ تقسیم عقلاً نہایت اعلیٰ معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ قوم کی قوم خاص خاص کام پر لگ گئی۔ جس سے کسی قسم کی گڑبڑی نہ رہی۔ اور ہر پیشہ اور خدمت کے لئے لوگ بافراط ملنے لگے۔ اور زندگی کی گاڑی نہایت سکون اور اطینان سے چلتی معلوم ہونے لگی۔ لیکن یہ تقسیم اگرچہ قانونِ عقل کے تو بالکل مطابق ہے۔ مگر قانونِ فطرت کے سراسر مخالف ہے۔ کیونکہ فطرتاً ایک طبقے کے انسان۔ مثلاً کھشتری ہی کو لیجیئے۔ الگ الگ طبیعت اور الگ الگ میلان کے ساتھ پیدا ہوتے ہیں۔ اب اگر ان سب کو لڑائی کے کام میں لگایا جائے تو یہ ظاہر ہے کہ یہ کام اُن میں سے بعض افراد کے فطری میلان کے مخالف ہو گا۔ کیونکہ اگر بعض اُن میں سے طبعاً ملازمت کے خواہاں ہیں۔ تو بعض آرٹ کے دلدادہ ہیں۔ کسی کو انجینئری کی طرف رغبت ہے۔ تو کوئی طبابت کو پسند کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہو گا کہ قوم اچھے لڑاکو اور دلیر سپاہی نہ پیدا کر سکے گی۔ کیونکہ اگرچہ فوج میں وہ سب کھشتری کے نام سے داخل ہونگے۔ مگر فطرتاً وہ سب کھشتری نہیں بلکہ فطرتاً کوئی شودر ہے۔ تو کوئی ویش کوئی کھشتری ہے۔ کوئی برہمن۔ یہ اسی عقلی ذات پات کی بندھنوں کا نتیجہ تھا کہ اسلام کے فطرتی قلیل غازیوں نے ہندوؤں کے کثیر مگر عقلی کشتریوں پر بڑی بڑی شاندار فتوحات حاصل کیں۔ اور آج ہندو خود اس عقلی قید کی جتنی مخالفت کر رہے ہیں وہ کسی ہندوستانی پر پوشیدہ نہیں۔

مسلمانوں کو سبق:

مسلمان جب تک ذات پات اور پیشوں کی بندھنوں سے آزاد تھے۔ جب تک وہ اپنی طبیعتوں کو دنیا کے میدان میں کھلا چھوڑتے تھے۔ اگر باپ عالم ہوتا تھا۔ تو بیٹا سپاہی۔ اگر پوتا درزی ہوتا تو پڑپوتا لوہار۔ تو فطرت نے ان کو دنیا میں ترقی کا بہت کچھ موقعہ دیا۔ لیکن جب ان پر بھی اپنے پڑوسیوں کا اثر پڑا۔ اور وہ ہمسایوں سے بھی سو گز آگے بڑھ کر مغل۔ پٹھان۔ شیخ۔ اعوان۔ گجر۔ قاضی۔ خوجے۔ اور خدا جانے کیا کیا بن گئے۔ تو قانونِ فطرت کے خلاف سے وہ بھی تنزل کے مہیب غار میں گرا دیئے گئے۔ ڈاکٹر اقبال علیہ الرحمہ نے کیا ہی اچھا کہا ہے۔

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں؟

عقل اور فطرت کے فرق کی وضاحت کے لیے دوسری مثال:

عقل اور فطرت کے فرق کی وضاحت کے لئے ایک دوسری مثال پیش کرتا ہوں تاکہ مطلب کے سمجھنے میں کسی قسم کا ابہام نہ رہے۔ دیکھو انسان غذا کے کھانے میں مختار ہے۔ خواہ گیہوں کھائے یا باجرا۔ چاول کھائے یا جوار۔ جو کچھ بھی وہ اپنی عقل۔ استطاعت اور صحت کے مطابق سمجھتا ہے۔ کھاتا ہے۔ مگر کیا ہوا کے متعلق اُسے اس قسم کے انتخاب کی اجازت ہو سکتی ہے کہ اگر ہوا نہ سہی تو پانی سے ہوا کا کام لے لے۔ نہیں۔ بلکہ اگر وہ اپنی زندگی کا قیام چاہتا ہے۔ تو اسے مجبوراً ہوا سے ہوا کا ہی کام لینا پڑیگا۔ بعینہ یہ حالت عقل و فطرت کی ہے۔ عقل کے معاملہ میں اختیار و انتخاب ہو سکتا ہے۔ مگر فطرت اختیار و انتخاب کے دخل کو پسند نہیں کرتی۔ بلکہ فطرت کی طرف ہر ایک انسان کا طوعاً یا کرہاً (خوشی یا ناخوشی سے) جھکنا لازمی ہے۔

اور اسی کو قرآن پاک یوں بیان فرماتا ہے!

''اَفَغَیْرَ دِیْنِ اللّٰہِ یَبْغُوْنَ وَلَہٗٓ اَسْلَمَ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَّ کَرْھًا وَّاِلَیْہِ یُرْجَعُوْنَ''
(آلِ عمران: ۸۳)

کیا دین الٰہی یعنی اسلام کے بغیر کچھ اور چاہتے ہیں۔ حالانکہ زمین و آسمان کی کل اشیاء خوشی یا جبر سے اُسی کی

فرمانبردار ہیں اور اُسی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔

یعنی اسلام دین فطرت ہے۔ اس کے احکام فطرتی۔ اس واسطے ہر ایک کا انجام کار خارجی اثرات کے دور ہونے کے بعد اس کی طرف لوٹنا لازمی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ایک بیمار کو میٹھا پانی کڑوا معلوم ہو۔ اور یرقان والے کو سفید چیز پیلی نظر آئے۔ مگر بیماری اور یرقان دور ہونے کے بعد وہ ضرور ان چیزوں کی مٹھاس اور بیاض کو محسوس کرے گا۔

قد تنکر العین ضوء الشمس من رمد۔ وینکر الظمٔ طعم الماء من سقم۔

ترجمہ: آشوبِ چشم کی وجہ سے سورج کی روشنی آنکھوں کو بری لگتی ہے اور پانی کا ذائقہ پیاسے کو اچھا نہ لگتا ہے۔

نسخِ شرائع پر اعتراض اور اس کا جواب:

اعتراض۔

اللہ تعالیٰ نے پہلے ہی سے کوئی ایسی کتاب کیوں نہ بھیج دی کہ پھر اُس میں تاقیامت کسی قسم کی تبدیلی کی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ کیا اس سے اللہ جل شانہ کے علم پر دھبہ نہیں آتا کہ بار بار کتابوں کو تبدیل کیا۔ اور پھر دوسرے احکام پہلوں کی جگہ نازل فرمائے۔

جواب:

جس طرح ایک حکیم مریض کی حالت۔ وقت اور مزاج کے مطابق اپنے نسخوں میں تبدیلی کرتا ہے۔ اور یہ تبدیلی اس کی حذاقت (عقلمندی) اور تجربہ پر کسی قسم کا دھبہ نہیں لگاتی۔ بلکہ اُلٹے اس کے کمال تشخیص اور مہارت فن کی دلیل سمجھی جاتی ہے۔ بلکہ اسی طرح اُس حکیم بے مثال کے رُوحانی مریضوں کے نسخوں میں تبدیلی کرنے سے علمِ بے منتہا پر کچھ حرف نہیں آتا۔

توضیح۔

اصلاح خواہ جسمانی ہو یا روحانی۔ بتدریج اور اصولی طریقہ سے کی جائے۔ تو دیرپا اور نافع ہوتی ہے۔ مثلاً جسمانی مریض کو لیجئے۔ پہلے مریض کو کوئی آسان طریق اصلاح بتایا جائے۔ جب کچھ دن گزر جائیں۔

اور طبیعت میں دوسرے علاج کے لئے مناسب استعداد پیدا ہو جائے۔ تو اب طریق علاج میں بھی تبدیلی کر دی جائے۔ اور یہ تبدیلی اس حد تک کرتے رہیں کہ جب تک طبیعت اپنے اصلی اعتدال پر نہ آجائے۔

اسی طریقہ پر روحانی اصلاح بھی قیاس کر لیجئے کہ جب قوم کی روحانی حالت خراب ہو جاتی ہے۔ تو اللہ جل شانہ اصلاح کیلئے کسی روحانی طبیب یعنی رسول کو بھیجتے ہیں۔ وہ قوم کی حالت اور ان کے مرض کے مطابق وحی کے ذریعہ نسخۂ ہدایت تجویز فرماتے ہیں۔ اب وہ نسخہ اگر تبدیل کرنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو وہی طبیب اس نسخہ میں تبدیلی فرما دیتے ہیں۔ ورنہ جب کوئی دوسری قوم مریض کی صورت میں پیش ہوتی۔ تو اس کے حالات کے مطابق اللہ رب العزت دوسرا نسخہ دے کر کسی دوسرے طبیب کو روانہ فرماتے ہیں۔ اسی فلسفۂ نسخ (**منسوخ کرنے کے فلسفہ**) کو اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں یوں بیان فرماتے ہیں!

وَاِذَا بَدَّلْنَآ اٰيَةً مَّكَانَ اٰيَةٍ ۙ وَّ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوْٓا اِنَّمَآ اَنْتَ مُفْتَرٍ ؕ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ

(النحل:۱۰۱)

یعنی جب ہم کسی آیت کے عوض میں دوسری آیت نازل کرتے ہیں۔ اور ہم جس چیز کو نازل کرتے ہیں۔ اس کی مصلحت کو خوب جانتے ہیں۔ تو مخالفین کہتے ہیں کہ اے رسول تو تو مفتری ہے۔

اے لوگو جان لو۔ ہمارا رسول بالکل افترا پرداز (**الزام تراش**) اور جھوٹا نہیں۔ بلکہ اکثر لوگ ہمارے کاموں کی حکمتوں سے جاہل ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ ایک قوم کیلئے جو اصلاحی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔ وہ تدبیر دوسری قوموں کے لئے زمانہ کے بدل جانے یا اختلاف مزاج یا اختلاف اسباب کی وجہ سے مفید نہیں ہو سکتی۔ اس لئے اللہ رب العزت نے قوموں کی اصلاح کیلئے جو شریعتیں روانہ فرمائیں۔ بسا اوقات ان کے احکام اور فرامین میں تنسیخ و ترمیم بھی فرماتے رہے۔ لہذا شرائع الٰہیہ (**اللہ کی شریعت**) میں نسخ (**منسوخ**) کا موجود ہونا کسی عیب و نقصان کا باعث نہیں۔ بلکہ اس سے ان کا حسن و کمال ظاہر ہوتا ہے

تحریف۔ بدا، اور نسخ کا فرق:

بعض لوگوں کو نسخ شرائع یا نسخ کتاب پر اس لئے بھی اعتراض ہوتا ہے کہ وہ نسخ کو تحریف (**تبدیلی**) اور بدا سے ممیز نہیں کرتے۔ ایک کو دوسرے کے ساتھ خلط کر کے اعتراض کر بیٹھتے ہیں۔ اس واسطے میں ان

تینوں کی تعریف بھی عرض کر دیتا ہوں تا کہ حاضرین میں سے کسی کو دھوکہ نہ لگ سکے۔

تحریف: یہ ہے کہ کسی مصنف کی کتاب میں اس کے حکم و مرضی کے خلاف کوئی بے جا تصرف کیا جائے۔

بدا: یہ ہے کہ ایک حکم دینے کے بعد حکم دینے والے کا علم بدل جائے۔ اور اس تبدیلی علم کی بناء پر وہ اپنے پہلے حکم کو واپس لے کر اس کی جگہ دوسرا حکم نافذ کرے

نسخ: یہ ہے ایک حکم کو خاص مدت کے لئے نافذ کیا جائے۔ اور جب اس کے نفاذ کی مدت ختم ہو جائے تو اس کے بعد دوسرا حکم جاری کر دیا جائے۔

اب اس سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ تحریف اور بدا، مذموم ہیں۔ اور ان کا شرائع یا کسی کتاب میں ہونا خرابی کا باعث ہے۔ برخلاف نسخ کے، کہ اس میں نہ تو علم پر دھبہ آتا ہے۔ اور نہ علم کے نتیجے پر۔ بلکہ نسخ دلیل ہے۔ غزارت علمی (علم کی زیادہ مقدار) اور حکیم کامل ہونے کی۔

قرآنی نسخہ پہلے نسخوں سے کیوں ممتاز ہے:

تو بیان یہ ہو رہا تھا۔ کہ جوں جوں زمانہ بدلتا گیا۔ انسانی بچہ بھی پختہ عقل ہو گیا۔ اسی واسطے آخر کار پہلی کتابوں کو منسوخ کر کے آخری مکمل اور ضروریات زمانہ پر حاوی کتاب قرآن مجید روانہ کی گئی۔ اب اس کے بعد اس نسخۂ ہدایت کے تبدیل ہونے کا کوئی امکان نہیں رہا۔ کیونکہ خود اس طبیب روحانی نے انسانی مریضوں کے لئے:

”وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ“ (یوسف: ۱۲)
اور بیشک ہم اس کے نگہبان ہیں۔

فرما کر اس نسخہ کا ابدی ہونا ظاہر کر دیا ہے۔ اور طریقہ بھی یہی ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کپڑوں کا سائز اور ہیئت تا بلوغ بدلتی رہتی ہے۔ مگر حدِ بلوغ پر پہنچ جانے کے بعد اب کپڑوں کی حد قائم ہو جاتی ہے۔ اور وہ جوانی کا لباس بشرطِ حفاظت بڑھاپے تک استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اسی طرح اب اس جوانی کے لباس تقوی کو تا قیامت استعمال کیا جائیگا۔ کیونکہ حفاظت کا وعدہ تو خود اللہ جل شانہ نے فرما دیا ہے۔

اسکے علاوہ اور بھی بہت سی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے قرآن پاک کو نازل فرمایا۔ مثلاً توریت کے احکام اس قدر سخت تھے کہ وہ بہت مدت تک زمانہ کا ساتھ نہ دے سکتے تھے۔ اگر کوئی کپڑا ناپاک ہو جاتا تو وہ دھلنے سے پاک نہ ہوتا۔ بلکہ اس کو وہاں سے کاٹ کر پاک کرنے کا حکم تھا۔ کبیرہ گناہوں کی توبہ قتلِ نفس کی صورت میں کی جاتی۔ اس کے برعکس انجیل کے احکام بہت نرم اور زمانہ دراز تک انسانی مصلحتوں کو پورا کرنے کے لئے ناکافی تھے۔ اس کا حکم کہ اگر تمہارے ایک گال پر کوئی تھپڑ مارے۔ تو دوسرا بھی اس کے سامنے کر دو۔ زمانۂ حال کی رو سے بالکل ناقابل عمل تھا۔ کیونکہ دنیا کا انتظام نہ تو زیادہ سختی سے قائم رہ سکتا ہے اور نہ زیادہ نرمی سے۔

اگر بادشاہ کے قوانین بہت سخت ہوں تو لوگ آخر کار تنگ آ کر باغی ہو جاتے ہیں اور اگر اسکے احکام بہت نرم ہوں تو عوام اس قدر دلیر ہو جاتے ہیں کہ بادشاہ تک کو بھی خاطر میں نہیں لاتے اس واسطے ضروری ہے کہ تمام قانون حدِ اعتدال کو مدِنظر رکھ کر بنائے جائیں۔ تاکہ وہ بہت عرصہ تک زمانہ کا ساتھ دے سکیں۔

توریت کے احکام کی سختی اور انجیل کے قوانین کی یہ نرمی ہی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے ان احکام پر عمل در آمد کروانے کے لئے ایک خاص قوم کو ایک نہایت قلیل ومحدود وقت کے لئے منتخب فرمایا۔ مگر آخر کار اللہ تعالیٰ نے ان کے زمانے کے اختتام پر قرآن پاک جیسی کتاب جس کا ہر ہر قانون اعتدال اور موزونیت کے ترازو میں تلا ہوا ہے روانہ فرمائی۔ اور اسے اپنے آخری پیغمبر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی طرح آخری کتاب وقانون ٹھہرایا۔ یہی وجہ ہے کہ آج اگلی کتابوں کے ماننے والے ''اگر تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو دوسرا بھی اس کے سامنے کر دو'' کے صریح مگر حدِ اعتدال سے متجاوز قانون کو چھوڑ کر قرآن پاک کی معتدل تعلیم!

''وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ'' (المائدہ:۴۵)

(اور زخموں کے بدلے زخم اور جو اس کو معاف کر دے گا تو وہ اس کے گناہوں کا کفارہ بن جائے گا۔)

پر عمل کرتے نظر آتے ہیں

تحریف کُتبِ سابقہ:

اس کے علاوہ توریت انجیل وغیرہ آج ہمیں محفوظ حالت میں بھی نہیں ملتیں۔ بلکہ جگہ جگہ سے محرف ہو چکی ہیں اور اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کتابوں میں رب العزت نے کہیں بھی قرآن پاک کے!

”اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ“(الحجر:۹)

(ہم نے قرآن پاک کو نازل فرمایا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں)

کے اعلانِ حفاظت کی طرح اُن کے محفوظ رکھنے کا وعدہ نہیں فرمایا۔ اسی واسطے مرورِ زمانہ (زمانے کے گزرنے) کے ساتھ اگلی کتابوں میں بہت کچھ خلط ملط کر دیا گیا۔ ان کے حروف میں تبدیلیاں کر کر کے اُن کے مطالب کو کچھ سے کچھ بنا دیا گیا۔ قرآن پاک اسی کے متعلق فرماتا ہے!

”یُحَرِّفُوْنَ الْکَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ“(المائدہ:۱۳)

(کلاموں کو اُن کی جگہ سے پھیرتے ہیں)

امتدادِ زمانہ (**زمانے کے طویل ہونے**) کے علاوہ یہود و نصاریٰ پر جو پہلے بادشاہوں نے ظلم وستم کئے۔ ان سے بھی ان کتابوں میں بہت کچھ فرق آ گیا۔ چنانچہ بخت نصر نے جب یہود پر چڑھائی کر کے ہزارہا یہود کو قتل کیا تھا تو ساتھ ہی بروئے تاریخ توریت کے نسخے کو بھی جلا دیا تھا اور اس وقت یہی ایک توریت کا اصلی نسخہ پایا جاتا تھا۔ اس کے بعد یہود نے اپنی یاد سے توریت کو لکھا اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد کے قصوں کو بھی اس میں ملا دیا۔ ساتھ ہی اپنے اغراض و مقاصد کا بھی خیال کر کے بہت کچھ تحریفات کر ڈالیں۔ پھر یہ ایسی ناقص حالت کی تیار کردہ بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بہت پہلے انٹیوکس نے حملہ کر کے غارت کر دی۔ اس کے بعد پھر مشائخِ یہود نے دوبارہ اپنی یاد سے موسیٰ اور ہارون علیہما السلام کے کچھ قصّے اور کچھ دینی قوانین جمع کر کے اس کا نام توریت رکھا۔

اسی طرح جب یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو گرفتار کیا تو انجیل کا صرف ایک نسخہ تھا۔ اس کو بھی یہود نے جلا دیا تھا۔ ان کے بعد حواریوں نے اپنی یاد سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کچھ حالات قلمبند کئے۔ جو متیٰ، مرقس، لوقا، یوحنا کے نام سے مشہور ہیں۔

چنانچہ لوقا کی انجیل اس طرح شروع ہوتی ہے!

> ”چونکہ بہتوں نے کمر باندھی کہ ان کاموں کو جو فی الواقع ہمارے درمیان انجام ہوئے بیان کریں جس طرح انہوں نے جو شروع سے خود دیکھنے والے اور کام کی خدمت کرنے والے تھے ہم سے روایت کی۔ میں نے بھی مناسب جانا کہ سب کو سرے سے صحیح طور پر دریافت کر کے تیرے لئے اے بزرگ تھیوفلس بہ ترتیب لکھوں“

لوقا کے یہ بالکل ابتدائی الفاظ جسے دیباچہ کہیں تو بجا ہے صاف بتا رہے ہیں کہ موجودہ انجیل کوئی اصلی انجیل نہیں بلکہ وہ تو یہود کے جلانے کی وجہ سے ناپید ہوگئی تھی۔ ہاں یہ انجیل ایک تاریخی حیثیت سے دوسری عام تواریخ کی طرح لکھی گئی۔ یہ چار انجیل کے پارے تو حواریوں کے تھے۔ جنہوں نے کم از کم حضرت عیسٰی علیہ السلام کو دیکھا اور ان سے مخاطبت کا شرف حاصل کیا۔ مگر پھر جب حواریوں کے دور پار والے شاگردوں نے بھی الہام کا دعوے کیا اور حورایوں کے کچھ خطوط اور تاریخی حالات مرتب کئے تو ان کو بھی موجودہ انجیل میں انجیل کی حیثیت سے داخل کر دیا گیا۔ پھر اس کے بعد بھی رومی شہنشاہوں نے عیسائی قوم اور مذہب پر جو ظلم وستم کئے وہ تاریخوں سے ظاہر ہیں۔ تو ایسے نازک وقت میں جبکہ نہ پریس تھا نہ حافظِ کتاب، کیوں نہ مضامین و حروف کو فاتح قوم نے بدل کر کیا سے کیا کر دیا ہوگا۔ ان واقعات و دلائل کی رو سے توریت و انجیل اپنی الہامی اصلیت پر نہیں رہیں۔ بلکہ موجودہ کتابوں کا اکثر و بیشتر بالکل خود ساختہ ہے۔

قرآن پاک تحریف سے پاک ہے اور پاک رہے گا:

مگر قرآن پاک کی شان ہی نرالی ہے۔ اوّل تو اللہ جل شانہ نے اسکی حفاظت خود اپنے ذمہ لی ہوئی ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں ”وَاِنَّا لَهٗ لَحَافِظُوْنَ“ صاف وعدہ موجود ہے اور پھر اس کے ساتھ ہی اس کے پیروؤں سے اس کی اس طرح حفاظت کروائی جاتی ہے کہ دنیا کی کسی اور کتاب کی حفاظت نہیں ہوتی۔ یعنی اسے بجائے کاغذ کے ورقوں میں محفوظ کرنے کے لوگوں کے صدری صندوقوں میں مقفل و مسدود **(پابند و محدود)** کر دیا گیا۔ مسلمان تو مسلمان غیر مذاہب کے مبلغ اور مشنری بھی قرآن پاک کا کثیر حصہ یاد کئے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔ انہیں اپنی کتاب کی تو ایک جزو تک یاد نہیں ہوتی۔ مگر قرآن پاک کے بیس بیس پارے

زبان پر ہوتے ہیں۔ جہاں کسی مولوی نے مناظرہ ومباحثہ کے وقت قرآن پاک کی کسی آیت کی غلط تلاوت کی تو فوراً اسے وہیں پکڑ لیا۔

دیکھا! اللہ تعالیٰ کس طرح اپنوں اور غیروں سے اپنے مقدس وعدہ کی سچائی کو پورا کروا رہے ہیں۔ مسلمانوں کے چھوٹے چھوٹے بچے جو بمشکل دنیا کی باتوں سے واقف ہوتے ہیں اُن کے سینہ بے کینہ میں اس امانتِ الٰہی کو الحمد سے لے کر والناس تک محفوظ دیکھ کر ایک انصاف پسند انسان بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے۔

وَاللّٰهُ غَالِبٌ عَلٰۤى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ۔ (یوسف:۲۱)

اللہ اپنے ہر کام پر بااختیار ہے لیکن لوگوں کی اکثریت اس حقیقت سے ناآشنا ہے۔

زمیں بدلے زماں بدلے نہ بدلے معجزہ ان کا
اسے دنیا میں اعجازِ کلام اللہ کہتے ہیں

ساڑھے چار سال کی لڑکی حافظ قرآن:

۱۹۳۳ء میں میں دہلی میں موجود تھا کہ ایک جمعہ کو نماز کے بعد ایک شخص نے اعلان کیا کہ میرے ساتھ ایک لڑکی عمر ساڑھے چار سال ہے اور وہ قرآن پاک کی حافظہ ہے۔ جن کو سننے کا شوق ہو وہ ٹھہر جائیں۔ چنانچہ بہت مخلوقات اس بات کے صدق وکذب کو معلوم کرنے کے لئے ٹھہر گئی۔ چنانچہ لڑکی کو حوض کے قریب اونچی جگہ پر کھڑا کیا گیا۔ مختلف جگہوں سے لوگوں نے فرمائشیں کرکے پڑھوایا۔ تو بالکل اس چھوٹی سی بچی نے صحیح پڑھ دیا۔

پھر اس کے باپ نے مختلف جگہ سے پڑھ کر بیچ میں سے بعض حروف چھوڑے تو اس نے صحیح لقمہ دیا۔ لڑکی کے قد وقامت سے یہی گمان ہوتا تھا کہ اس کی عمر ساڑھے چار سال سے زائد نہیں چنانچہ لوگوں کے لئے یہ ایک عجیب زندہ معجزہ تھا جو قرآن کے اعجاز اور من جانب اللہ ہونے کا کھلا ثبوت تھا۔ اس کے بعد میں نے اخبار میں پڑھا تھا کہ کسی والئے ریاست نے اس کا قرآن سُن کر تا زیست ایک معقول رقم بطور مشاہرہ مقرر کر دی ہے۔

حفاظ کی کثرت:

اس وقت دنیا میں قرآن پاک کے اس قدر حافظ موجود ہیں کہ اگر خزانہ قارون ہو اور اس سے ایک روپیہ فی حافظ تقسیم کرنے کا اعلان کیا جائے۔ تو خزانہ قارون جس کی کنجیوں کے متعلق!

''لَتَنُوٓأُ بِالْعُصْبَةِ أُولِي الْقُوَّةِ'' (القصص:۷۶)

جن کی کنجیاں ایک زور آور جماعت پر بھاری تھیں۔

وارد ہے۔ ختم ہو جائے مگر امانتِ الٰہیہ کے حاملین کا ختم ہونا مشکل ہے۔ اور یہ ایک ایسی چیز ہے کہ جو آج تک کسی کتاب کو حاصل نہ ہو سکی۔ تو پھر آپ ہی غور کریں کہ جس کتاب کی اس قدر حفاظت کی جائے اور جس کے اس قدر حافظ موجود ہوں۔ کس طرح اس میں تبدیل و تحریف کا احتمال ہو سکتا ہے۔ آپ کو کثرت سے ایسے حافظ ملیں گے کہ وہ الف کے نام بائے نہیں جانتے۔ وہ اپنا نام تک نہیں لکھ سکتے۔ مگر قرآن پاک الحمد سے لے کر والناس تک ایسا فراٹے کے ساتھ پڑھیں گے کہ ایک جگہ بھی ان کی گاڑی نہ رکے گی اور اگر غور کرو گے تو عالمول میں بہت ہی کم حافظ ملیں گے۔ اور اس میں اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا راز ہے اور انصاف ہے کہ معانی اور مطالب کی حفاظت تو علماء کے سپرد کی کہ وہ رات دن اس بحرِ بے پایاں **(وہ سمندر جس کا کنارہ نہ ہو)** میں غواصی (تیرنا) کر کے کیسے کیسے نایاب موتی نکالتے رہتے ہیں۔ مگر الفاظ کی حفاظت زیادہ تر ان پڑھوں کے حوالہ کی تاکہ وہ بھی قرآن پاک کے فیض سے محروم نہ رہیں۔ واللہ الحمد

مسلمانوں کا قرآن سے بے مثال عشق:

اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی حفاظت کا ایک یہ انتظام فرما دیا ہے کہ مسلمانوں کے دل میں اس کی وہ بے پناہ محبت اور بے انتہا عشق رکھ دیا۔ کہ ابتدائے آفرینش **(پیدائش کی ابتداء)** سے لے کر آج تک کسی قوم کو اپنی کتاب سے ایسا عشق نہ رہا۔ مسلمانوں نے اس کے حرف حرف کو گنا انہیں معلوم ہے کہ اس میں کونسا حرف کتنی تعداد میں آیا ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ اس میں کتنے رکوع اور کتنی سورتیں ہیں۔ اس میں کتنے حروف منقوط ہیں اور کتنے غیر منقوط۔ کون سی آیت مدنی ہے اور کون سی مکی۔ کون سی پیچھے نازل ہوئی اور کونسی آگے۔ اگلی کا پچھلی سے کیا تعلق۔ کون سی ناسخ ہے اور کون سے منسوخ۔ کتنی آئتیں ترغیب کے لئے

ہیں۔ اور کتنی ترھیب کے لئے۔ کتنی آیتوں میں وعدہ کیا گیا ہے۔ اور کتنی میں احکام و فرامین۔ غرضیکہ ذرا ذرا سی بات کو اسطرح گن کر معلوم کیا ہوا ہے کہ جس طرح ایک جوہری اپنے موتیوں کے ڈبے کے حساب سے پورے طور پر واقف ہوتا ہے۔ اور معمولی سے معمولی اور ادنیٰ سے ادنیٰ موتی کو اگر اپنی جگہ سے ہٹایا جائے تو وہ فوراً کہہ دیتا ہے کہ فلاں موتی اپنی جگہ پر موجود نہیں۔ اسی طرح مسلمان بھی اپنے جواہر خانے سے پورے آشنا اور واقف ہیں۔ اس واسطے کسی چور کو جرأت نہیں ہوسکتی کہ کسی موتی کو چرائے یا اپنی جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ رکھ سکے۔ کیونکہ اُمت محمدیہ کے نقادِ اغیار (غیروں پر تنقید کرنے والے) کی عیاری سے فوراً واقف ہوجاتے ہیں۔ چنانچہ مندرجہ ذیل ٹیبل آپ کو میری بات کے تصدیق کرنے میں مدد دیگا۔

بے مثال عشق کی تصدیق کے لیے ایک قیمتی ٹیبل:

اسمائے حروف	تعداد	اسمائے حروف	تعداد
ا	۴۸۸۷۲	ط	۱۲۷۶
ب	۱۰۴۲۸	ظ	۸۴۲
ت	۱۰۱۹۹	ع	۹۲۲۰
ث	۱۲۷۶	غ	۲۴۰۹
ج	۳۲۷۳	ف	۸۴۹۹
ح	۳۹۷۳	ق	۶۸۱۳
خ	۲۴۱۶	ك	۹۵۲۲
د	۵۶۴۲	ل	۳۶۶۳۲
ذ	۴۶۹۹۹	م	۲۶۵۰۰
ر	۱۵۷۹۳	ن	۴۵۱۹۰
ز	۱۵۷۰	و	۲۵۵۲۶
س	۵۸۹۱	ه	۱۹۰۷۰

ش	۲۲۵۳	لا	۴۷۲۰
ص	۲۶۱۳	ی	۳۵۹۱۹
ض	۱۶۰۷	--	--

آیات قرآنی کی تعداد اور اُن کی تقسیم کے متعلق کسی نے فرمایا ہے:

آیتِ قراں که خوب و دلکش اند
شش ہزار و شش صد شصت و شش اند
یک ہزارش وعدہ یک در وعید
یک ہزارش امرو یک نہی شدید
یک ہزار او مثال اعتبار
یک ہزارش قصہائے بے شمار
پانصد بحث حلال است و حرام
صد ازاں تسبیح صبح و ورد شام
شصت و شش زانست منسوخ از حساب
در عمل نه در قرات نه در کتاب
یکصد است و چاردہ سورہ دراں
چاردہ سجدہ دگردہ وقف داں

ترجمہ: آیتِ قرآں جو اچھی اور دل کو اپنی طرف کھینچنے والی ہیں۔ ان کی تعداد چھ ہزار چھ سو چھیاسٹھ ہیں۔ اس میں ایک ہزار ایک آیاتِ وعدہ ہیں۔ اس میں ایک ہزار ایک آیات ایسی ہیں جس میں امر و نہی کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک ہزار ایسی ہیں جس میں مختلف مثالوں سے بات کو بیان کیا گیا ہے۔ ایک ہزار ایسی ہیں جس میں بے شمار قصے بیان کیے گئے ہیں۔ پانچ سو آیات ایسی ہیں جس میں حلال و حرام کی بحث کی گئی ہے۔ اور ان میں ایک سو صبح و شام کی تسبیحات کا ذکر ہے۔ اس میں سے چھیاسٹھ آیات کو منسوخ قرار دیا گیا ہے جن کا تعلق عمل سے ہے نہ کہ پڑھنے اور لکھنے میں۔ اس قرآن میں ایک سو چودہ سورتیں ہیں۔ چودہ آیات سجدہ کی ہیں اس کے علاوہ دس آیاتِ وقف۔

اعراب اور حفاظت قرآن:

اس کے علاوہ چونکہ سامی زبانوں میں صرف بابلی اور عربی ہی ایسی دو زبانیں ہیں کہ جن میں اجزائے کلام کے ارتباط اور تعلق کو ظاہر کرنے کے لئے زبر زیر پیش یعنی اعراب کا استعمال کیا جاتا ہے۔ ان اعراب کی وجہ سے بھی عربی زبان میں عام طور پر تغیر و تبدل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ صرف زبر زیر کے فرق

کرنے سے معنیٰ کہیں کا کہیں چلا جاتا ہے۔

چنانچہ ایک دفعہ ولید بن عبد الملک کو جو عرب کی نسل سے پہلی صدی ہجری میں ایک مشہور خلیفہ گزرا ہے۔ اسی غلطی کے باعث اُسے سخت ندامت اُٹھانی پڑی۔ واقعہ یہ ہوا کہ ایک بدو نے دربارِ خلافت میں آ کر اپنے داماد کی شکایت کی۔ ولید نے بدو سے پوچھا۔

مَا شَانَكَ (تجھ میں کیا بُرائی ہے)

اُس نے متعجب ہو کر جواب دیا۔

اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْنِ (میں برائی سے خدا کی پناہ مانگتا ہوں)

یہ دیکھ کر ولید کے بھائی سلیمان نے کہا۔

خلیفہ صاحب فرماتے ہیں۔

مَا شَانُكَ (تیرا کیا حال ہے)

اُس نے کہا ظَلَمَ عَلَیَّ خَتَنِی (مجھ پر میرے داماد نے ظلم کیا)

ولید نے پوچھا مَنْ خَتَنَكَ (تیرا ختنہ کس نے کیا)

اس نے کہا صاحب کسی حجام نے کیا ہوگا۔

اس پر سلیمان نے پھر کہا کہ نہیں خلیفہ صاحب کا مطلب مَنْ خَتَنُكَ ہے (تیرا داماد کون ہے)

تو دیکھئے ذرا سے زبر پیش کے فرق سے مطلب کہاں کا کہاں چلا گیا۔ چنانچہ عربی زبان کے اعراب تو عام طور پر ہوتے ہی ہیں مگر مسلمانوں نے تو قرآن کے اعراب کے متعلق اس قدر اہتمام اور بندوبست کیا کہ صفحۂ دنیا پر کسی اور کتاب کا اتنا اہتمام نہ کیا گیا۔ قرآنِ پاک کے اعرابات کے متعلق متقدمین ومتاخرین نے اس قدر ضخیم ضخیم کتابیں لکھیں کہ ان کو دیکھ کر آج کل کے انسانوں کی عقل دنگ رہ جاتی ہے۔ مسلمانوں کے قرآنی عشق کو ذرا اور واضح کرنے کے لئے مشتے نمونہ از خروارے دو تین کتابوں کے نام بتا دیتا ہوں۔ ابو حاتم سہیل المتوفی ۲۴۸؁ء نے اعراب القرآن لکھی۔ اس کے بعد ابو مروان عبد الملک نے ایک کتاب ''اعرابُ القرآن'' لکھی۔ ابو طاہر اسمٰعیل ابن خلف نحوی نے جو ۴۵۵؁ھ میں فوت ہوا۔ ایک کتاب اسی فن میں ۹ جلدوں میں لکھی۔ یہ تو

میں نے چند ایک شخصوں کا ذکر کر دیا ہے ورنہ ہزاروں ایسے علماء ہوئے ہیں جو ایک نہیں کئی کئی کتابیں اعرابِ قرآنی پر مختلف حیثیتوں سے لکھ کر چھوڑ گئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ قرآن پاک کے الفاظ اعراب مطالب۔ تاریخی واقعات۔ تاریخی مقامات۔ مسائل۔ بلاغت غرضیکہ سینکڑوں شعبوں پر لاکھوں کتابیں لکھی گئیں اور لکھی جارہی ہیں۔ اور تاقیامت نہ معلوم کتنے محجوب پردۂ زنگاری **(سنہرے رنگ کے پردے)** سے کھینچ کر نکالے جانے والے ہیں۔

قرآن پاک کو علوم اور فنون کے لحاظ سے علماء نے تقسیم کر کے آج تک ہر فن کے متعلق اس قدر کتابیں لکھی ہیں۔ کہ صرف ایک فن کی کتابوں کو پورا بیان کرنے کیلئے ایک نہایت لمبی چوڑی فہرست کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور آپ اُن کتابوں کا اندازہ قرآنی علوم کے اقسام کو مدنظر رکھ کر اچھی طرح لگا سکتے ہیں۔ چنانچہ علماء نے قرآن کو علمی لحاظ سے بالاختصار یوں تقسیم کیا ہے:

رسومُ القرآن۔ اعرابُ القرآن۔ مصادرُ القرآن۔ جمع ومفرداتُ القرآن۔ غرائب القرآن۔ معانی القران۔ اعجازُ القران۔ تشبیۃ القران۔ امثالُ القرآن۔ بدائعُ القرآن۔ اسباب النزول۔ مبہمات القرآن۔ متشابہُ القرآن۔ اقسام القرآن مناسبتہ الا آیات و السور۔ مقاطعہ وفواتح السور۔ اعلام القرآن۔ ارض القرآن۔ ناسخ القرآن ومنسوخہ۔ مشکلاتُ القرآن۔ تجویدُ القرآن۔ احکامُ القرآن۔ جواہرُ القرآن۔ نجومُ القرآن وغیرہ وغیرہ

قرآن زندہ زبان میں نازل کیا گیا ہے:

اس کے علاوہ اگلی کتابوں کی سریانی اور عبرانی زبانیں قریباً قریباً مردہ ہو چکی ہیں۔ اور سنسکرت کی طرح وہ بھی کسی جگہ ملکی زبان کی حیثیت سے مروج نہیں۔ تو پھر انسان ان زبانوں کے دقیق محاوروں اور اختلافِ الفاظ سے جو معنوں میں فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ صرف چند کتابی اصول پڑھ لینے سے کماحقہ کیسے واقف ہو سکتا ہے۔ اسی واسطے آج توریت وانجیل کے سب ترجمے ایک دوسرے سے مخالف نظر آتے ہیں اور ان کے احکام میں صریح تضاد معلوم ہوتا ہے۔ مگر قرآنِ پاک کو ایک زندہ زبان میں نازل کیا گیا۔ تاکہ دنیا پر محاورات واختلافات کی وجہ سے فہمِ مطالب میں کسی قسم کی دقت پیش نہ آئے اور پھر زندہ زبانوں میں سے عربی کو چنا گیا۔ جو جامعیت شاملیت **(جو تمام کو جمع کرنے والا ہو)** اور ایجازِ الفاظ **(الفاظ کے مختصر ہونے)** کے

ساتھ اطنابِ مطالب (مختصر معانی) میں اپنا نظیر نہیں رکھتی۔ جو قدم اور وسعت کے لحاظ سے "اُم الالسنہ" یا تمام زبانوں کی ماں کہلاتی ہے۔ جو حد درجہ کی میٹھی اور مشکل سے مشکل مسائل کو مختصر اور سہل الفاظ میں ادا کر سکتی ہے۔

قرآن پاک کے من جانب اللہ ہونے کا ثبوت:

ابھی تک تو قرآن پاک کی ضرورت اور کے متعلق تقریر کی گئی مگر سب سے ضروری بات بالکل پیچھے رہ گئی یعنی کیا قرآن پاک خدا کی بھیجی ہوئی کتاب ہے یا انسان کی بنائی ہوئی؟۔ اسے اب مختصراً بیان کر دیتا ہوں کیونکہ جب تک قرآن کے من جانب اللہ ہونے کا یقین نہ ہو تب تک خواہ کتنا ہی ضروری اور ممتاز ہو الہامی کتابوں کی طرح انسانوں کے دلوں میں اسے جگہ نہیں دی جا سکتی۔

تمام تاریخیں اس بات پر متفق ہیں کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پڑھے لکھے نہ تھے بلکہ آپ اُمی محض تھے تو کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ ایک ناخواندہ شخص قرآن پاک جیسی فصیح و بلیغ اور روحانی و پاک مضامین سے بھری ہوئی کتاب از خود بنا کر دنیا کے سامنے پیش کر سکتا ہے اور پیش ہی نہیں بلکہ آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پہلے عام اعلان کرتا ہے کہ اے لوگو! اگر یہ میری خود ساختہ کتاب ہے اور اللہ تعالیٰ کی نازل کی ہوئی نہیں تو اس کی طرح تم بھی ایک آدھ سورت بنا کر میرے جھوٹ کو ثابت کر دکھاؤ اور وہ چیلنج آج تک قرآن پاک میں موجود ہے۔ مگر نہ کسی سے اس اعلان کا مقابلہ ہو سکا ہے اور نہ ہو سکے گا۔ چنانچہ اعلان کے الفاظ ملاحظہ ہوں!

وَاِنۡ كُنۡتُمۡ فِىۡ رَيۡبٍ مِّمَّا نَزَّلۡنَا عَلٰى عَبۡدِنَا فَاۡتُوۡا بِسُوۡرَةٍ مِّنۡ مِّثۡلِهٖ ص وَادۡعُوۡا شُهَدَآءَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ () (البقرة: ٢٣)

یعنی اے لوگو! اگر تم ہمارے قرآن کے متعلق کچھ شک میں ہو تو اس طرح کی کوئی سورت تو بنا لاؤ اور تم ہی نہیں بلکہ خدا کے سوا اپنے تمام مددگاروں کو اپنی سچائی ثابت کرنے کے لیے بلا دیکھو۔

پھر ساتھ ہی دیکھو کیسے پر زور الفاظ میں بیان کیا جاتا ہے کہ تم سے کبھی بھی اس کا مقابلہ نہ ہو سکے گا۔ اس واسطے اس کتاب کو الہٰی صحیفہ سمجھ کر ایمان لے آؤ تاکہ آخرت میں عذاب دوزخ سے بچ سکو۔

چنانچہ الفاظ یہ ہیں!

فَاِنۡ لَّمۡ تَفۡعَلُوۡا وَلَنۡ تَفۡعَلُوۡا فَاتَّقُوۡا النَّارَ الَّتِیۡ وَقُوۡدُهَا النَّاسُ وَالۡحِجَارَةُ اُعِدَّتۡ لِلۡكَافِرِيۡنَ۔ (البقرۃ:۲۴)

ترجمہ: پھر اگر نہ لاسکو اور ہم فرمائے دیتے ہیں کہ ہرگز نہ لاسکو گے تو ڈرو اس آگ سے جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔ تیار رکھی ہے کافروں کے لئے۔

عوام کا تو کیا ذکر عرب کے بڑے بڑے تیز زبان اور فصیح شاعر بھی اس اعلان کا جواب نہ دے سکے بلکہ اپنی عاجزی کا اقرار کر کے سلسلۂ اُمت میں داخل ہونے کو ہی اپنا شرف سمجھا۔

مَلکُ الشعراء عُتبہ بن ربیعہ اور قرآن:

میں آپ کو عرب کے ایک نامی گرامی شاعر عتبہ بن ربیعہ کا واقعہ سناتا ہوں جو شاعری کے علاوہ کہانت (**علمِ نجوم**) علم الانساب (**نسب کا علم**) سحر اور فصاحت و بلاغت میں اپنا مقابل نہ رکھتا تھا۔ جب حضور ﷺ کی تحریک دن بدن ترقی کرنے لگی اور کفار قریش نے اپنی دھمکیوں اور مخالفتوں کو ناکام ہوتے دیکھا تو ایک رات سب دار الندوہ میں جمع ہوئے اور بہت سی دیر بحث و مباحثہ کرنے کے بعد یہ رائے قرار پائی کہ عتبہ بن ربیعہ رئیس قریش کو محمد ﷺ کے پاس نمائندہ کی حیثیت سے بھیجا جائے تاکہ وہ جس طرح ہو سکے لالچ سے، رشوت سے، منت وسماجت سے، بتوں کی مذمت اور اسلام کی تبلیغ سے ان کو روک دے۔ چنانچہ عتبہ حاضر دربار ہوا اور آپ کو طرح طرح کے لالچ دے کر فرائض نبوت سے روکنے کی کوشش کی۔

آپ نے اس کی لمبی چوڑی تقریروں اور دنیوی لالچوں کے جواب میں قرآن پاک کی چند آیتیں تلاوت فرمائیں۔ قرآن کی آیتیں حضور ﷺ کی آواز پھر احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کی غرض سے اُن کی تلاوت عتبہ کے دل پر تیر سا لگا، غفلت کے پردے پھٹ گئے، ایسی رقت طاری ہوئی کہ بڑھ کر حضور ﷺ کے مبارک منہ پر ہاتھ رکھا اور قرابت کا واسطہ دے کر عرض کی کہ اے محمد ﷺ! اب بس کر۔ ورنہ میرا دل بھی آنکھوں کے رستے سے نکل آئے گا۔

حضور ﷺ نے تلاوت کو ختم کیا۔ عتبہ مسحور و مجنون سیدھا گھر آیا اور دروازہ بند کر کے گوشۂ خلوت میں جا بیٹھا۔ ابو جہل اور دوسرے کفار کو سخت پریشانی ہوئی اور وہ عتبہ کے گھر پر اُسے ملنے آئے۔ عتبہ نے کہا کہ ابو

الحکم تم جانتے ہو کہ میرا شاعری میں کیا پایہ ہے۔ سحر، کہانت اور فصاحت و بلاغت میں مجھے کس قدر کمال ہے۔ میں سچ کہتا ہوں کہ محمد کا کلام نہ تو سحر ہے نہ کہانت، نہ جادو ہے نہ شاعری۔ وہ تو ایسا کلام ہے کہ جس کو آج تک نہ سنا، نہ پڑھا۔ کانوں کے رستہ سے گزر کر شفاف قلب میں اس طرح داخل ہو جاتا ہے کہ تمام جسم کو سرور اور لذت سے بے خود بنا دیتا ہے۔ میری رائے تو یہ ہے کہ اُنھیں اُن کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر وہ عرب پر غالب آگئے تو اس میں ہماری ہی نیک نامی ہے اور اگر مغلوب ہوئے تو دوسروں کے ذریعہ اس بلا سے گلو خلاصی ہو جائے گی۔

یہ ایک ہی واقعہ اپنی نوعیت کا نہیں بلکہ ایسے سینکڑوں واقعات حدیث کی کتابوں میں موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن نے کس طرح اغیار کو بھی اپنی صداقت وحقانیت کے سامنے سر جھکانے پر مجبور کیا۔ سچ ہے!

الفضل ما شهدت به الاعداء۔
بزرگی وہ ہوتی ہے جس کی دشمن بھی گواہی دیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اُمی ہونے کی حکمت:

اسی جگہ اس بات کو بھی سمجھ لیجئے کہ حضور کو باوجود خاتم النبیین اور افضل الرسل بنانے کے اُمی کیوں بنایا گیا۔ اس کے متعلق قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے!

هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ ۔(الجمعہ:۲)
یعنی اللہ وہ پاک ذات ہے جس نے ان پڑھ لوگوں میں ان ہی سے ایک رسول بھیجا۔

”اُم“ عربی میں ماں کو کہتے ہیں تو ”اُمیّ“ جو ماں کی طرف منسوب ہو۔ یعنی دنیا میں اُس کی حالت ایسی ہو جیسے کہ ماں کے پیٹ سے نکلتے وقت۔ چونکہ اُس وقت بچہ ناخواندہ ہوتا ہے اس واسطے ہر ناخواندہ کو اُمی کہا جانے لگا۔ حضور ﷺ چونکہ ناخواندہ تھے اس واسطے آپ کو بھی اُمیّ کا خطاب دیا گیا۔ اب آیت کے معنوں پر غور کرو۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اُمیّ اُمت کی طرف اُمیّ پیغمبر بھیجا گیا۔ چونکہ عرب کے لوگ پڑھے لکھے نہ تھے اور اگر حضور ﷺ کو خواندہ بنا کر روانہ کیا جاتا تو آپ کا طرز کلام اُمیّوں سے بالکل الگ ہوتا۔ تو جب

الگ ہوتا تو نہ تو لوگوں کو آپ سے اُنس و محبت ہو سکتا اور نہ افادہ و استفادہ میں آسانی ہوتی۔ اس واسطے اُمت کی حالت کو ملحوظ رکھ کر اُن کے طرز کلام کے مطابق بولنے والا پیغمبر بھیجا گیا تا کہ اتحادِ مذاق کی وجہ سے رغبت بڑھے اور افادہ و استفادہ میں سہولت پیدا ہو جائے۔

ہر پیغمبر کو اُس کے زمانہ کے مطابق معجزات دیئے گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ساحرینِ زمانہ کے مقابل عصا عنایت کیا گیا جو پھینکنے سے سانپ بن کر جادوگروں کے شعبدات نگل جاتا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اطبائے وقت کے مقابلہ میں کوڑھیوں کو اچھا کرنے مادرزاد اندھوں کو شفا بخشنے اور مردوں تک کو زندہ کرنے کے معجزات سے نوازا گیا۔ مگر حضور ﷺ کے زمانہ میں فصاحت و بلاغت کا زور تھا۔ شعر و شاعری حد کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔

اس واسطے مصلحتِ وقت کا تقاضا یہ تھا کہ آپ کو ایک ایسی کتاب دی جائے جس کا فصاحت و بلاغت اور مضامین کی دقت و بلند پائیگی میں کسی انسان سے بھی مقابلہ نہ ہو سکے۔ چنانچہ آپ کو انہیں صفات سے موصوف کتاب قرآن حکیم کی شکل میں دی گئی۔ لیکن اگر آپ خواندہ ہوتے تو دشمن آپ کو متہم (تہمت) کرتے اور کہتے کہ نہیں اس نے مختلف کتابوں کو پڑھ کر یہ الفاظ اور خیالات مرتب کیے ہیں۔ اگرچہ تحدی (چیلنج) کے بعد جب مقابلہ سے عاجز آتے تو منصف مزاج ہستیوں کا شبہ زائل ہو جاتا۔ مگر تحدی سے پہلے عام و خاص سب کے لیے اعتراض کی گنجائش رہتی لیکن آپ کو اُمّی رکھنے کی صورت سے سب شبہات کا قلع قمع کر دیا گیا۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے!

”وَمَا كُنتَ تَتْلُوا مِن قَبْلِهِ مِن كِتَٰبٍ وَلَا تَخُطُّهُۥ بِيَمِينِكَ إِذًا لَّارْتَابَ الْمُبْطِلُونَ“
(العنکبوت:۴۸)

یعنی تو اس سے پہلے نہ تو کوئی کتاب پڑھتا تھا اور نہ اسے اپنے داہنے ہاتھ سے لکھتا تھا۔ اس صورت میں اس کو جھٹلانے والے شک کرتے۔

تو جب حضور ﷺ پڑھے لکھے نہ تھے تو اب مشککین (شکی) خواہ مخواہ کا شک کریں تو اُن کی گمراہی ہے ورنہ شک کی کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑی گئی۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے ۔

نگار من کہ بمکتب نہ رفت و خط نہ نوشت
بمغمزہ مسئالہا آموخت و صدر مدرس شد

ترجمہ: میرا محبوب جو کسی مدرسے میں نہیں گیا اور نہ ہی کوئی تحریر پڑھی، اشاروں میں مسائل کو یوں حل فرمایا کہ لوگوں کو مسندِ تدریس پر بٹھا دیا۔

اس کے علاوہ اگر آپ خواندہ ہوتے تو قرآن پاک آپ کو دفعتہً دیا جاتا۔ کیونکہ پڑھے لکھے شخص کو ایک ہی وقت میں پوری کتاب کا سنبھال سکنا کچھ مشکل نہیں۔ جیسا کہ حضور ﷺ سے پہلے لکھے پیغمبروں کو ایک ہی بار میں سب کی سب ہدایات دی گئیں تھیں۔ اور اگر آپ کو قرآن پاک دفعتہً دیا جاتا تو بہت ممکن تھا کہ عرب کے درشت مزاج اور تند طبیعت لوگ آپ سے چھین کر اُسے پرزے پرزے کر دیتے اور قرآن کا بھی اُن کے ہاتھوں وہی حال ہوتا جو توریت کا بخت نصر یا اور اینٹوکس یا انجیل کا جو دوشان اور ترجان وغیرہ کے ہاتھوں ہوا۔ اس واسطے حضور ﷺ کو اُمّی رکھ کر تھوڑا تھوڑا قرآن دیا گیا۔ تاکہ آپ کے قلب اطہر میں محفوظ رہے اور کسی شخص کا اُس پر قابو ہی نہ چل سکے۔ قرآن پاک میں آتا ہے!

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ () عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ ۔ (الشعراء: ۱۹۳، ۱۹۴)
یعنی جبرائیل امین اسے لے کر اترا ہے تیرے دل پر تاکہ تو ڈرانیوالوں میں سے ہو۔

تو گویا قرآن پاک کو حضور ﷺ کے قلب پر اتارا گیا۔ اسے کاغذ کے ورق میں نہ دیا گیا بلکہ قلبِ منور کے صفحہ میں منقش کیا گیا۔ اسی حکمتِ اُمیت میں کفارِ ناہنجار کا یہ شبہ بھی زائل ہو گیا کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل ہوتی ہے تو ایک ہی دفعہ سب کی سب کیوں نہیں دی جاتی۔ یہ کیا کہ ذرا ذرا نازل ہوتی ہے۔

قرآنِ پاک کے بتدریج نازل ہونے کی حکمت:

یہ شبہ اس طرح زائل ہوا کہ جب حضور ﷺ کا اُمّی ہونا مصلحت کے مطابق تھا۔ تو پھر اُمّی کو ایک دم اتنی بڑی کتاب کس طرح سے دی جا سکتی ہے۔ اُمّی کو پڑھانے کا طریقہ تو یہ ہے کہ اُسے تھوڑا تھوڑا یاد کروایا جائے۔ یہاں تک کہ وہ بتدریج سب کتاب کا حافظ ہو جائے۔ اگر ایک ہی دن میں اُسے سب کتاب دی جائے

تو وہ نہ تو اتنے بوجھ کو برداشت کر سکے گا اور نہ اُس کو دفعتاً اپنے عمل میں لے سکے گا بلکہ الٹا گھبرا کر اُس سے دور بھاگے گا۔ اسی واسطے تو اللہ تعالیٰ نے کفار کے اس اعتراض:

”لَوْ لَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً (الفرقان: ۳۲)

(اس پر قرآن سارا ایک ہی دفعہ کیوں نہ اتارا گیا۔)

کا جواب:

”كَذٰلِكَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلًا ۔(الفرقان: ۳۲)

(تا کہ اس طرح ہم تیرے دل کو مضبوط کریں۔ اور ہم نے بہترین ترتیب سے نازل کیا۔)

کے الفاظ میں دیا۔

تدریجی نزول میں تقویت قلب اور سہولت حفظ کے علاوہ قیامت تک کی ضروریات کا علاج بھی بہتر ین طریقے پر ہو سکتا ہے۔ کیونکہ جب کبھی تیئس ۲۳ سال کے عرصہ میں کفار کے ساتھ مسلمانوں کا کوئی ناگوار واقعہ پیش آیا۔ یا اُنہیں دشمنوں کے ہاتھوں کچھ اذیت پہنچی۔ یا کسی مشکل کے حل کی ضرورت پڑی۔ تو فوراً ضرورت کے مطابق ٹکڑا روانہ کر دیا گیا۔ اور اس میں یہ راز بھی سمجھایا گیا۔ کہ جس طرح اگلے پیغمبروں کو ایک دن میں کتاب دے دی گئی۔ اسی طرح آپ کے زمانہ نبوت کے مقابلہ میں ایک ہی دن میں ان کی نبوت کا خاتمہ بھی ہو گیا۔ مگر چونکہ آپکی کتاب کا نزول بہت زمانے میں ہوا ہے۔ جس میں طرح طرح کی ممکن ضروریات کا حل دے دیا گیا ہے۔ اس واسطے آپکی نبوت کا زمانہ بھی پہلی نبوتوں کو اگر ایک دن فرض کیا جائے۔ تو اسی تناسب سے ۲۳ سال تک ممتد (طویل) ہو گا۔ ساتھ ہی بار بار وحی کی وجہ سے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے زیادہ ملاقات کا موقعہ ملا۔ جس سے قویٰ ملکیہ (فرشتوں کی قوتیں) کی پوری پوری جلا ہوئی (روشن) اور مخاطبتِ الٰہیہ (اللہ کے خطاب) کا شرف بے شمار دفعہ بخشا گیا۔ مگر دوسرے پیغمبروں کو ایک ہی دفعہ کتابیں دے کر اس سلسلہ کو مسدود (پابند) کر دیا گیا ہے۔ کیوں نہ ہو جبکہ اللہ تعالیٰ نے خود تاجدارِ مدینہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وعدہ فرمایا ہے!

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰى ۔(الضحیٰ: ۳)

کہ تمہیں تمہارے رب نے نہ چھوڑا اور نہ مکروہ جانا۔

رجوع بمطلب:

بیان یہ ہو رہا تھا کہ قرآن اللہ تعالیٰ نے نازل فرمایا ہے۔ یہ آسمانی کتاب ہے انسانی نہیں۔ اس میں **ایک دلیل** تو حضور ﷺ کے اُمّی ہونے کی بیان کی گئی۔ **دوسری دلیل** یہ ہے کہ قرآن پاک میں کثرت سے غیب کی خبریں اور پیشن گوئیاں موجود ہیں جو آج تک حرف بحرف ثابت ہو رہی ہیں۔ مثال کے طور پر ابھی حال ہی کی تعبیر کو دیکھو۔ قرآن پاک میں سورۃ یونس میں آتا ہے کہ! جب فرعون غرق ہونے لگا۔ تو اس نے کہا۔ کہ میں بھی بنی اسرئیل کے رب پر ایمان لایا۔

یہ ایمانِ باس قبول نہ ہوا۔ ایمانِ باس یہ ہے کہ انسان نزع کی حالت میں اپنے کفر سے تائب ہو چونکہ اس وقت غفلت کے پردے اُٹھ جاتے ہیں اور عالمِ آخرت کے بعض واقعات کو عینی طور پر دیکھ لیتا ہے۔ اس لئے اس وقت کا ایمان قبول نہیں کیا جاتا کیونکہ یہ ایمان بالغیب نہیں رہتا۔ بلکہ بالحضور ہو جاتا ہے۔ اور ایک دیکھی ہوئی چیز پر ایمان لانا اور اس کا اقرار کر لینا کچھ بھی بڑی بات نہیں۔ ہاں توبہ باس قبول ہوسکتی ہے تو فرعون کا ایمان لانا بھی اسے اس وقت مفید ثابت نہ ہوا۔ اُس وقت اللہ تعالیٰ نے فرمایا!

”فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً وَ اِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ آيَاتِنَا لَغَافِلُونَ“۔ (یونس: ۹۲)

یعنی آج ہم تیری لاش کو باہر نکال دینگے تاکہ اپنے پیچھے والوں کے لئے نشان بنے۔ اور یقیناً بہت سے لوگ ہمارے نشانوں سے غافل ہیں۔

دیکھئے! اس آیت میں ایک تو اس بات کی پیشین گوئی ہے کہ ہم تیری لاش کو آئندہ نسلوں کیلئے اپنی قدرت اور قرآن کی سچائی پر ایک نشان بنائینگے۔ اور وہ اس طرح کہ تجھے ایسے وقت دنیا کہ سامنے نکال لائینگے جبکہ دنیا تجھے بھول چکی ہوگی اور امتدادِ زمانہ نے تجھ پر بالکل تاریکی اور بُعد کا پردہ ڈھانک دیا ہوگا۔

اب دیکھئے نہ تو توریت میں فرعون کی لاش کے نکلنے کا ذکر ہے اور نہ انجیل میں۔ دنیا کی ساری تاریخیں اس ہونے والے حیرت انگیز معاملہ کے متعلق خاموش ہیں۔ مگر عرب کے تیرہ و تار خطہ ○ میں ایک

امّی نبی فداہ ابی و امّی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبعوث ہوتا ہے۔ دعوٰی نبوت پر قرآن پاک کو اپنا معجزہ ٹھہراتا ہے۔ آج ساڑھے تیرہ سو برس اس پیشگوئی پر گزرتے ہیں کہ ۱۶ فروری ۱۹۲۳ء کو ھوارڈ کارٹر نامی شخص کے ہاتھوں اس کی تعبیر کو صفحۂ دنیا میں ظاہر کیا جاتا ہے۔ وہ شاہِ مصر کے حکم سے کھدائی کا کام کرتا تھا۔ مگر اس کھدائی کے ساتھ اُس نے ایک بہت بڑے راز کو بھی کھود نکالا۔ ایک کمرے سے بے انتہا زر و جواہر کے ساتھ ایک صندوق نکالا۔ جس پر لکھا ہے کہ یہ تابوت رمیسِ ثانی فرعونِ مصر کا ہے۔ جس نے موسیٰ علیہ السلام کو پالا تھا۔ لاکھوں امریکنوں اور یورپیوں نے اس ممی کردہ لاش کو دیکھا اور قرآن پاک کی اس آیت:

”لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً“ (یونس: ۹۲)

ہماری نشانیوں سے۔

کو عملی طور پر ثابت کر دکھایا۔

یہ ایک ایسی پیشگوئی ہے کہ جس کے ہوتے ہوئے ایک عادل اور منصف انسان قرآنِ پاک کی سچائی اور حقانیت کا صدقِ دل سے معترف ہو جاتا ہے۔ اور اس عجیب و غریب واقعہ کے دیکھ لینے کے بعد قرآنِ پاک کے من جانب اللہ ہونے کا تہہ دل سے قائل ہو جاتا ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ قرآنِ پاک کے الفاظ، معانی اور اسلوبِ بیان میں وہ اثر اور جاذبیت ہے کہ عرب کے جنگلی اور وحشی بدو بھی مسلمان ہو کر نہایت متقی اور پرہیزگار بن گئے۔ اور وہ ڈاکو اور لٹیرے جو دن دہاڑے لوگوں کو لوٹا کرتے تھے۔ قرآن پاک کے اثر سے لوگوں کے محافظ اور پیغامِ امن کے مبلغ بن گئے۔ مولانا حالی اپنی مسدس مدوجزرِ اسلام میں فرماتے ہیں ع

وہ قومیں جو ہیں آج غم خوار انسان   درندوں کی اور ان کی طینت تھی یکساں
جہاں عدل کے آج جاری ہیں فرماں   بہت دور پہنچا تھا واں ظلم وطغیاں
بنے آج جو گلہ باں ہیں ہمارے   وہ ہیں بھیڑیے آدمی خوار سارے
ہنر کا جہاں گرم بازار ہے اب   جہاں عقل و دانش کا بھوار ہے اب
جہاں ابر رحمت گہر بار ہے اب   جہاں ہُن برستا لگاتار ہے اب

تمدن کا پیدا نہ تھا، واں نشاں تک
سمندر کی آئی نہ تھی موج واں تک

چوتھی دلیل قرآن پاک کے منزل من اللہ ہونے کی یہ ہے۔ کہ دنیا کی چھوٹی سے چھوٹی کتاب بھی اگرچہ انسان ہزار کوشش کرے۔ حرف بحرف یاد نہیں کرسکتا۔ مگر قرآن کا یہ معجزہ ہے۔ کہ دنیا میں اس وقت اس کے لاکھوں حافظ موجود ہیں۔ جن میں ایسے چھوٹے بچے بھی کثیر تعداد میں شامل ہیں جو ابھی دنیا کی دوسری باتوں کو بمشکل سمجھ سکتے ہیں۔ کیوں نہ ہو جس کتاب کی حفاظت کا وعدہ اللہ تعالیٰ نے خود فرما دیا ہو۔ تو پھر اس کی حفاظت ایسے ہی معجز نما طریقوں سے کی جانی اُس کے شایان شان ہے۔ اسی واسطے حضور ﷺ کو رب العزت اظہارِ احسان کے طور پر مخاطب کر کے فرماتے ہیں!

وَاَنْزَلْتُ عَلَیْكَ كِتَابًا لَا یَغْسِلُهُ الْمَاءُ تَقْرَؤُهُ نَائِمًا وَیَقْظَانَ۔

(صحیح مسلم: الجز۸، رقم: ۷۳۸۶، دار الجیل بیروت)

یعنی اے حبیب ہم نے آپ پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے کہ جسے پانی تک بھی نہیں دھو سکتا۔ اور تم اسے سوتے جاگتے پڑھو گے۔

کیونکہ اُس کا نزول لوحِ قلب پر ہوا ہے اور لوحِ قلب تک پانی کی رسائی ممکن نہیں۔ اور آپ اس کو سوتے اور جاگتے ہر حالت میں پڑھ سکتے ہیں۔ یعنی یہ پہلی کتابوں جیسی نہیں کہ جن کے الفاظ پانی سے دھو کر مٹائے جاسکتے ہیں۔ اور جن کے نسخوں کو دریا میں ڈبو کر دنیا سے محو کیا جاسکتا ہے۔ اور جن کے پڑھنے کے لئے روشنی حالتِ بیداری اور ظاہری آنکھوں کا ہونا ضروری ہے۔ بلکہ یہ کتاب تو ایسی ہے کہ نہ اس کی تعلیم کو مٹایا جاسکے گا نہ اس کے پڑھنے کے لئے روشنی اور ظاہری آنکھوں کی ضرورت ہوگی۔ بلکہ یہ تو دن اور رات میں۔ روشنی اور تاریکی میں۔ سوتے اور جاگتے ہر حالت میں بلا تکلف پڑھی جایا کریگی۔

قرآن کے آسمانی کتاب ہونے کی **پانچویں دلیل** یہ ہے کہ اس کے ہر شعبے کے قانون خواہ سیاسی ہوں یا مذہبی۔ اقتصادی ہوں یا معاشرتی ایسے معتدل صحیح اور صائب (درست) ہیں کہ آج موجودہ زمانہ میں جسے علم وعقل کی روشنائی کا زمانہ کہا جاتا ہے۔ یورپ کے بہترین سے بہترین مفکرین اس کی تعریف میں رطب اللسان (تعریف کرتے) نظر آتے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر موریس کا وہ مقالہ جو انہوں نے لایا رول

فرانسس رومان میں دیا۔ اردو میں ملاحظہ کرنے کے قابل ہے۔ ڈاکٹر موریس علوم عربیہ کے ماہر اور فرانس کے ایک نہایت نامور مصنف ہوئے ہیں۔ انہوں نے ہی گورنمنٹ فرانس کے حکم سے قرآن پاک کا فرنچ ترجمہ کیا تھا۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں!

> ”قرآن کیا ہے؟ قرآن کی اگر کوئی ایسی تعریف ہوسکتی ہے کہ جس میں کسی طرح کا نقص نہ نکل سکتا ہوتو وہ مسلمہ فصاحت و بلاغت ہے۔ یہ عظیم الشان فضیلت ہے کہ جس پر آج دنیا کے چالیس کروڑ مسلمان بجا طور پر فخر کرتے ہیں۔ مقاصد کی خوبی اور مطالب کی خوش اسلوبی کے اعتبار سے یہ کتاب تمام آسمانی کتابوں پر فائق ہے۔ بلکہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ قدرتِ خداوندی نے انسان کے لئے جو کتابیں تیار کی ہیں۔ اُن سب میں قرآن کریم ایک بہترین کتاب ہے۔ جس کے نغمے فلاسفہ یونان کے نغموں سے کہیں اچھے ہیں۔ اس میں خالقِ حقیقی کی حمد وثنا بھری ہوئی ہے۔ خدا کی عظمت سے اس کا ایک ایک حرف لبریز ہے۔ (منقول از اخبارِ وحدت ۲ فروری ۱۹۲۵ء)

قرآنِ پاک کو اگر پڑھ کر ذرا بھی غور کیا جائے۔ تو اس کے قانون فطرت کے اس قدر بڑے ماہر کے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ کسی آدم زاد میں اس جیسے قانون بنا سکنے کی طاقت نہیں پائی جاتی۔ پارلیمنٹ کے قانونوں کو دیکھو۔ ملک کے چیدہ مفکرین اور مسلّمہ منتظمین **(تسلیم شدہ منتظم)** بیٹھ کر ایک بل بناتے ہیں۔ مگر وہ بل تین چار سال بھی زمانے کا ساتھ نہیں نبھاتا۔ بلکہ ہر سال اُس میں ترمیم و تنسیخ ہوتی ہی رہتی ہے۔ اور اگر پرانی تعزیرات ہند کے دیکھنے کا موقعہ ملے تو آپ دیکھیں گے کہ اس کا کوئی صفحہ بھی ترمیم کے سلپ سے خالی نہیں۔ مگر قرآن کے قوانین، فطرت کے موافق ہونے کے باعث آج بلا دغدغہ **(بغیر پکڑ دھکڑ)** ساڑھے تیرہ سو سال سے زمانہ کا ساتھ دیتے آئے ہیں اور تا قیامت ساتھ دینگے۔ کیونکہ انسان کا فطرتی کوڈ ہونے کی وجہ سے انسان کو اس طرف جھکنا پڑتا ہے نہ کہ انسان کی خود ساختہ مرضی کی طرف۔ اسی لئے آج دنیا بہت سی قوموں نے اپنی کتابوں کی تعلیم کو چھوڑ کر قرآنی تعلیم کو مسلک بنالیا ہے اگر چہ اس مسروقہ تعلیم **(چوری کردہ تعلیم)** کا نام انہوں نے کچھ اور رکھا ہے مگر سونے کے کشتے کو خواہ راکھ کے نام سے کھاؤ۔ پھر بھی وہ کشتہ طلا ہی ہے اور وہ اپنا لازمی نتیجہ باوجود تبدیلی نام کے بھی ضرور دیگا۔ اور سچ پوچھو تو آج اغیار کی ترقی انہی قرآنی

قوانین پر عمل کرنے کی وجہ سے ہے۔ مگر مسلمانوں نے اُن قوانین پر عمل کرنے کی بجائے صرف زبانی تعلق پر اکتفا کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے سرمایہ سے غیر قوموں نے فائدہ اُٹھانا شروع کیا۔ اور یہ خود سرمایہ کے ہوتے ہوئے اسے استعمال نہ لانے کے باعث بھکاری کے بھکاری رہے۔

ورنہ قرآن پاک تو فرماتا ہے!

”وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۔(آلِ عمران:۱۳۹)

ترجمہ: اور نہ سستی کرو اور نہ غم کھاؤ تمہیں غالب آؤ گے اگر ایمان رکھتے ہو۔

اس آیت میں مسلمانوں کو بشرط ایمانِ دین و دنیا کی عزت کا وعدہ دیا گیا ہے۔ مگر بھائی ایمان صرف اقرار باللسان (**زبانی اقرار**) ہی نہیں کہ صرف زبان سے اقرار کر دیا تو مومن ہو گیا۔ بلکہ اُس کے لئے تو لسانی اقرار کے ساتھ قلبی تصدیق اور عملی اظہار کی بھی ضرورت ہے۔ یعنی اقرار ایمان باللسان وتصدیق بالجنان وعمل بالارکان کا مجموعہ ہے۔

مگر ہمارے پاس تو صرف اقرار لسانی ہے اور بس۔ تو پھر وہ بشارات جو حالتِ ایمانی پر موقوف ہیں۔ ہم اُن کے مورد (**اہل**) کس طرح بن سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ علم و ادب کا جاننے والا قرآنِ پاک کو اگر پڑھے تو الحمد سے لے کر والناس تک وہ ایک ہی طرح کی دلکشی اور جاذبیت پاتا ہے یہ بھی قرآن کے آسمانی کتاب ہونے کی بین دلیل ہے۔ کیونکہ اتنی بڑی کتاب اگر کوئی انسان لکھے تو اس میں ہر جگہ ایک ہی طرح جاذبیت کا پیدا کر سکنا بالکل محال ہے۔ کیونکہ ایک طرح کی دلکشی ایک ہی حالت کی مقتضی ہے مگر انسان کی حالت کا گاہے چنیں (**کبھی اس طرح**) اور گاہے چناں (**کبھی اُس طرح**) والا معاملہ ہے۔ اس لئے ایسی طویل اور متوازن دلکشی کی اُمید ایک انسان سے رکھنا سراب کو آب سمجھنا ہے۔ مگر ذاتِ باری چونکہ تغیر وتبدل سے منزہ ہے اس واسطے کلام باری ہی میں ایک قسم کی جاذبیت امکاناً اور عملاً پائی جا سکتی ہے۔

پھر اگر یہ انسان کی مصنفہ کتاب ہوتی تو اس کے بیان میں کسی نہ کسی جگہ تضاد بھی پایا جاتا۔ مگر باوجود مخالفوں کی ہزاروں کوششوں کے آج تک نہ اس میں کوئی تضاد ثابت کیا جا سکا۔ اور نہ ہی کوئی ایسی بات جو خلافِ عقل یا ناممکن العمل ہو، ظاہر ہوئی۔ جگہ جگہ مکارم اخلاق (**اچھے اخلاق**) اور اعلیٰ روحانی تعلیم کے ایسے

دلکش مناظر انسانی فطرت کو مدِنظر رکھ کر کھینچے گئے ہیں کہ جس سے انسان بے ساختہ پکار اُٹھتا ہے۔ کہ ”ما ھذا کلام البشر “۔ یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔

اسی واسطے تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے!

”اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ ؕ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلٰفًا کَثِیْرًا ()۔

(النساء ۸۲)

یعنی کیا لوگ قرآن پاک میں غور نہیں کرتے کیونکہ اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں بہت کچھ اختلاف پایا جاتا۔

مگر چونکہ اختلاف تو ہے نہیں اس لئے ثابت ہوا کہ یہ غیر اللہ کی طرف سے بھی نہیں بلکہ اُسی رب العزت کی طرف سے ہے جو جمیع کائنات کا خالق و مالک ہے۔

یہ میں نے چند ایک دلائل قرآن پاک کے من جانب اللہ ہونے پر بیان کئے ہیں۔ اگر موضوع کے بدل جانے کا خوف نہ ہوتا۔ تو اسی معاملہ کے متعلق آپ لوگوں کا کچھ اور وقت بھی لیتا۔ مگر سر دست اسی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ کیونکہ پھر سورہ فاتحہ کی تفسیر شروع کرنے میں بہت زمانہ لگ جائے گا۔

قرآنِ پاک کی تلاوت:

لیکن تفسیر شروع کرنے سے پہلے قرآن پاک کی تلاوت کے متعلق بھی مختصر سا بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ اب جبکہ یہ ثابت ہو چکا ہے کہ قرآن پاک آسمانی کتاب ہے۔ تو اب یہ پھر سن لو کہ حضور ﷺ اس مقدس کتاب کے پڑھنے والے کے متعلق کیا فرماتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ!

> جو مومن قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے تو وہ نارنگی کی طرح ہے کہ جس کا مزا اور بو، دونوں اچھے ہوتے ہیں۔ اور وہ مومن جو قرآن پاک نہیں پڑھتا وہ کھجور کی طرح ہے کہ جس کا مزا تو میٹھا ہے مگر بو کچھ بھی نہیں۔ اور جو فاسق قرآن پاک کی تلاوت کرتا ہے اُس کی مثال ایسی ہے جیسے ریحاں یا نازبو، کہ جس کی بو تو اچھی ہوتی ہے مگر مزا سخت کڑوا ہوتا ہے۔ اور جو فاسق کہ قرآن پاک کی تلاوت نہیں کرتا۔ وہ اندرائن کی

طرح ہے کہ جس کی بو بھی نہیں ہوتی اور مزا بھی سخت کڑوا ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ فرمایا!

تم میں سے بہترین شخص وہ ہے جو قرآن پاک پڑھے اور پڑھائے۔

اور فرمایا کہ!

> جو شخص اس کو پڑھے اور حفظ کرے اور اُس پر عمل کرے تو وہ اپنے خاندان کے دس دوزخیوں کی شفاعت کرکے جنت میں داخل کر سکے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ!

جسے خواہش ہو کہ اللہ جل شانہ سے کلام کرے تو اسے چاہئے کہ قرآن پاک کی تلاوت کرے۔

گویا تلاوت کے وقت انسان تخاطب اللہ سے سرفراز کیا جاتا ہے۔

اسی واسطے ایک صحابی کے متعلق آتا ہے کہ!

> آپ نفلوں میں رات کے وقت نہایت بلند اور ترتیل کے ساتھ قرآن پڑھ رہے تھے۔ اُن کا دوسرا دوست اُن کے پاس ہی سویا ہوا تھا کسی کافر نے آواز پر نشانہ لگا کر تیر مارا۔ تیر آپ کی ران میں لگا اور لہو کا فوارہ جاری ہوگیا۔ مگر آپ نے قرآن پاک پڑھنا بند نہ کیا۔ جب سوئے ہوئے صحابی پر گرم گرم خون گرا۔ تو وہ گھبرا کر اُٹھے اور متنفل (78) صحابی کو خطرہ سے آگاہ کرنے کے لئے بلایا۔ اُنہوں نے جلدی جلدی نماز کو ختم کیا اور فرمایا کہ مجھے درد اور جریانِ خون کا تو معلوم تھا مگر اللہ جل شانہ سے اس معمولی سے دکھ کے لئے کلام کو قطع کر دینا شانِ عاشقی کے برخلاف دیکھا۔ مگر جب تم نے مجھے جھنجوڑا تو مجبوراً سلام پھیرنا پڑا۔

بنا کروند خوش رسمے بخاک وخون غلطیدن
خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را

ترجمہ: خدا ایسے پاکباز عاشقوں پر اپنی رحمت کا نزول فرمائے جنھوں نے خاک وخون میں غرق ہو جانے

کی رسم کی بنیاد رکھی۔

تو خلاصہ کلام یہ نکلا کہ قرآن پاک کی تلاوت کرنا گویا رب العزت سے ہمکلام ہونا ہے اس لئے ایسے احکم الحاکمین کے آدابِ ہمکلامی کو اثنائے تلاوت میں ضرور ملحوظ رکھے۔ ورنہ ایسا نہ ہو کہ ہمکلامی کے ثواب کی بجائے بے ادبی کا عذاب گلے میں آپڑے۔ مشہور ہے۔ بادب بانصیب۔ بے ادب بے نصیب۔

کسی نے کہا ہے ع

ادب تا جیست از لطف الٰہی　　　بنه برسر برو ہرجا که خواہی
از خدا خواہیم توفیق ادب　　　بے ادب محروم گشت از فضل رب

ترجمہ: ادب اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے ایک تاج ہے اس کو پہن کے جہاں چاہو جاؤ تمہیں اس کی دنیوی اور اخروی نعمتیں ملیں گی۔ ہم اللہ تعالیٰ سے ادب کی توفیق چاہتے ہیں کیونکہ بے ادب اللہ کے فضل و کرم سے محروم ہو جاتا ہے۔

اب اس کے بعد سورہ فاتحہ کی تفسیر کو شروع کیا جائیگا۔ اللہ تعالیٰ سے التجا ہے کہ اپنی رحمت و رافت کے واسطہ سے ہم پر سورہ فاتحہ کے دقائق و اسرار کو منکشف فرمائے۔ ہمارے دلوں کو اپنے حبیبِ لبیب اور اپنے قرآن مجید کے عشق و محبت سے لبریز فرمائے۔ ہم کو نیک کاموں کی توفیق دے اور بُرے کاموں سے بچائے۔

اور گزشتہ مجالس میں جو حاضر ہوئے ہیں یا آئندہ حاضر ہونے کا قصد رکھتے ہیں۔ اُن کے بمع تمام مسلمین و مسلمات کے صغیرہ و کبیرہ گناہ معاف فرمائے۔ اور آپ لوگوں کے شوق و رغبت کے طفیل اس سیہ کار کو بھی اپنی رحمت سے مالا مال فرمائے۔

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔ والصلوۃ والسلام علی سید المرسلین وعلی آلہ واصحابہ الطاہرین۔ اللھم نور قلبی بنور القرآن- واشرح لی صدری بعلوم الفرقان ولیسر لی امری بحرمۃ سید البرھان واغفر لنا ولوالدینا ولاخواننا الذین۔ سبقونا بالایمان۔ اعوذ باللہ من الشیطن الرجیم-

میں پناہ مانگتا ہوں۔ ساتھ باری کے دھتکارے اور راندے ہوئے شیطان سے۔

قرآنِ پاک پڑھنے کے آداب:

جب قرآن پاک پڑھنے کا قصد کیا جائے۔ تو چاہئے۔ کہ اوّل اپنے جسم کو ظاہری و باطنی نجاست سے پاک کر کے باوضو پاک جگہ قبلہ رو بیٹھ کر نہایت خُضُوع وخُشُوع سے تلاوت کو شروع کرے۔ قرآنِ پاک کو نہایت ادب سے اپنے سے اونچے مقام پر مثل رحیل وغیرہ کے رکھے۔ الفاظ کو صحیح ادا کرے اور خوف وخوشی کی آیات پر خوف وخوشی کا احساس کرے۔ اس کے بعد تلاوت کو شروع کرنے سے پہلے تعوذ وتسمیہ پڑھے یعنی آعوذ باللہ اور اس کے بعد بسم اللہ کیونکہ اللہ تعالیٰ جل شانہ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے!

”فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ۝۔ (النحل: ۹۸)

یعنی اے قاری جب تو قرآن پاک کی تلاوت کا قصد کرے تو تجھے چاہئے کہ شیطان مردود کے وسوسوں اور حملوں سے بچنے کے لئے ہماری پناہ میں آجا۔

کیونکہ یہ مردود ایسا دشمن ہے۔ کہ اس پر نہ تو تلوار کارگر ہوتی ہے اور نہ توپ۔ نہ اس سے کوئی قلعہ بچا سکتا ہے۔ اور نہ کوئی تہ خانہ۔

که با نفس شیطاں بر آید بزور
مصاف پلنگاں نیاید ز مور

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ!

شیطان انسان کی رگوں میں خون کی طرح گُھس جاتا ہے۔ اور پھر طرہ یہ کہ یہ ہم کو دیکھ کر حملہ کرتا ہے مگر ہم اسے دیکھ ہی نہیں سکتے کہ اس کے حملہ کا جواب ترکی بہ ترکی دے سکیں۔

اللہ تعالیٰ جل شانہ فرماتے ہیں!

”اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ۔ (الاعراف: ۲۷)

کہ وہ اس کے حواری اس طرح تمہیں دیکھتے ہیں کہ تم اُن کو نہیں دیکھ سکتے۔

تو پھر جب ہم ایک دشمن کو دیکھ ہی نہیں سکتے کہ اُس کا کچھ مقابلہ کر سکیں۔ تو پھر سوائے رحمتِ

خداوندی کے قلعہ میں اپنے آپ کو محفوظ کر لینے کے اور کیا علاج ہو سکتا ہے۔ چنانچہ اسی واسطے اللہ تعالیٰ جل شانہ کمال رحمت سے اپنی پناہ میں آنے کی دعوت دیتا ہے۔ اور فرماتا ہے!

”اِنَّهٗ لَيْسَ لَهٗ سُلْطٰنٌ عَلَى الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ۝ اِنَّمَا سُلْطٰنُهٗ عَلَى الَّذِيْنَ يَتَوَلَّوْنَهٗ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِهٖ مُشْرِكُوْنَ ۝“ (النحل: ۹۹۔ ۱۰۰)

یعنی اس کا داؤ ایمانداروں اور اللہ پر بھروسا کرنے والوں پر نہیں چلا کرتا۔ اس کا داؤ تو اس کے دوستوں اور چیلوں ہی پر کارگر ہوتا ہے۔

اس واسطے ایمانداری کے ساتھ مجھ پر توکل کر کے اس کے وسوسوں اور حملوں سے محفوظ رہ سکتے ہو۔

شیطان اور ملائکہ کے کاموں میں رات اور دن کا فرق ہے۔ دن چاہتا ہے کہ میں اجالا کروں اور اپنے نور سے دنیا چمکا دوں۔ رات چاہتی ہے کہ میں اندھیرا کر کے دنیا کی ہر چیز کو انسانی آنکھوں سے چھپا دوں۔ مگر جس کو خدا غالب کرتا ہے۔ وہی غالب ہو کر مغلوب کے اثر کو مٹا دیتا ہے۔

اسی طرح جب قاری قرآنِ پاک پڑھنا شروع کرتا ہے۔ تو ملاء اعلیٰ (عالم بالا) سے ملائکہِ رحمت کا نزول ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ فرشتے قاری کے ایک ایک حرف اور لفظ کو لے کر دربارِ خداوند میں حاضر ہوتے ہیں۔ اور قاری کے نامہِ اعمال میں رحمت وغفران کا انعام درج ہونے لگتا ہے۔

مگر دوسری طرف شیطان اپنے لشکر اور قوت کے ساتھ پڑھنے والے کے دل و دماغ اور آنکھوں کو اور طرف مشغول کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ تاکہ ملکوتی انوار، وسوسوں اور بُرے خیالات کے اندھیروں میں چھپ جائیں۔ مگر جب انسان اعوذ باللہ پڑھتا ہے۔ تو حدیثِ پاک کے مطابق شیطان اور قاری کے درمیان ایک پردہ حائل ہو جاتا ہے۔ جس سے قاری کا دل و دماغ شیطانی وساوس اور طاغوتی یورشوں سے مامون ہو جاتا ہے۔

اعوذ باللہ پر اعتراض:

ہم تو کئی دفعہ اعوذ باللہ پڑھ کر قرآن پاک کی تلاوت شروع کرتے ہیں۔ مگر پھر بھی اثنائے تلاوت میں شیطانی وسوسوں اور بُرے خیالوں کا شکار ہو جاتے ہیں۔

جواب:

اعوذ باللہ پڑھنے کا یہ مطلب نہیں کہ صرف زبان سے مقررہ الفاظ کو کہہ دیا اور بس۔ مگر دل اُن کے مطلب اور مقصود سے بالکل خالی ہو۔ نہیں۔ بلکہ زبان کے استفادہ کے ساتھ دل کا بھی پوری طرح شامل ہونا ضروری ہے۔ جب دل اور زبان دونوں استفادہ میں شامل ہوں تو پھر نہ تو غیرِ خدا کا خیال آسکتا ہے اور نہ ہی کسی عضو سے اُس کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ اور حقیقت میں یہی کامل استفادہ ہے۔

شیطان کا لغوی معنٰی اور اس کی توضیح:

شیطان شطن سے مشتق ہے۔ شطن کہتے ہیں رحمت سے دور ہونے کو۔ چونکہ اُس نے اللہ جل شانہ کی نافرمانی کی۔ باوجود حکمِ ربی کے آدم علیہ السلام کو سجدہ نہ کیا۔ اس لئے اسے اللہ جل شانہ نے اپنی رحمت سے محروم فرما کر مطرود (دور) کر دیا۔

فرشتے شیطان اور جن میں فرق:

نکتہ: اللہ تعالیٰ نے تین ایسی مخلوقات پیدا فرمائی ہیں کہ جو باوجود دنیا میں ہونے کے عام لوگوں کی نظروں سے غائب ہیں۔ ایک جن، دوسرے شیطان اور تیسرے فرشتے۔

فرشتوں، جنوں اور شیطانوں میں یہ فرق ہے کہ فرشتے نور سے پیدا ہوئے ہیں۔ وہ نہ مرد ہیں نہ عورت۔ ان کا کام رات دن تسبیح وتہلیل کرنا ہے۔ شیطان اور جنات دونوں ناریُ الاصل ہیں۔ چنانچہ جب رب العزت نے عزازیل کو حکم دیا۔ کہا آدم علیہ السلام کو جسے میں نے خلیفۃالارض کی حیثیت سے پیدا کیا ہے، سجدہ کر تو شیطان نے سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اور اپنے انکار میں حق بجانب ہونے پر یہ دلیل پیش کی کہ!

”قَالَ اَنَا خَیْرٌ مِّنْہُ ط خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّ خَلَقْتَہٗ مِنْ طِیْنٍ ()۔ (اعراف:۱۲)

یعنی میں آدم سے مرتبہ میں بڑا ہوں۔ کیونکہ میں آگ سے پیدا ہوا ہوں۔ اور آدم مٹی سے۔

آگ روشن۔ شفاف اور منور جبکہ مٹی کثیف۔ ذلیل اور حقیر۔ تو افضل مفضول اور عزیز ذلیل کے سامنے کس طرح جھکے۔ لیکن کم بخت نے یہ نہ سمجھا کہ افضل کون ہوسکتا ہے۔ افضل تو وہی ہے کہ جسے بنانے والا افضل ٹھہرائے نہ کہ وہ خود اپنے زعم (گھمنڈ) میں افضل بن بیٹھے۔

حکم ہوا!

قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُوْنُ لَكَ اَنْ تَتَكَبَّرَ فِيْهَا فَاخْرُجْ اِنَّكَ مِنَ الصّٰغِرِيْنَ ()۔

(اعراف: ۱۳)

یعنی اے مردود آسمان سے اتر جا۔ تو میرے حکم کے سامنے حجت بازی اور تکبر کرتا ہے۔ جا آج سے تجھ پر ذلت اور خواری کی مہر لگا دی جاتی ہے۔

جنات بھی آگ سے ہیں کیونکہ دوسری جگہ قرآن پاک میں شیطان کو قوم جن سے بیان کیا گیا۔

چنانچہ قرآن پاک میں آتا ہے!

كَانَ مِنَ الْجِنِّ فَفَسَقَ عَنْ اَمْرِ رَبِّهٖ ۔ (کہف: ۵۰)

کہ قومِ جن سے تھا تو اپنے رب کے حکم سے نکل گیا۔

مگر جنات اور شیطانوں میں فرق یہ ہے کہ جنات دنیا میں معینہ عمر گزارنے کے بعد مر جاتے ہیں۔ اور شیطان پر تا قیامت موت نہیں۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے شیطان کو اس کی التجا پر کہ!

”اَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ () ۔ (اعراف: ۱۴)

مجھے قیامت تک کے لیے ڈھیل دے۔

“فرما دیا تھا۔

”اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ“ (اعراف: ۱۵)

بے شک تجھے ڈھیل دی گئی ہے۔

اسی واسطے یہ اور اس کی ذریات بھی بالتبع قیامت سے پہلے پہلے نہیں مرتی۔ بلکہ اُس کی اولاد آج:

”مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ“ (الناس: ۶)

(انسانوں اور جنوں سے)

کے پاک لفظوں کے مطابق روز افزوں ترقی پر ہے۔ اور آج دنیا ذریاتِ ابلیس سے حقیقی و معنوی لحاظ سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔

لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم۔

الرجیم کی تفسیر:

یعنی دھتکارے، راندے ہوئے۔ دھتکارہوا اس لئے کہ عزازیل پہلے معلم الملکوت یعنی فرشتوں کا استاد تھا۔ اپنے القاء اور خدا پرستی میں ضرب المثل تھا۔ مگر حکم الٰہی کے سامنے حجت بازی کرنے کے باعث ایسے رفیع منصب سے معزول کر کے ذلت کے ساتھ آسمانوں سے نکال دیا گیا۔ اور پھر آسمانی دربار کو:

’’وَ لَقَدْ زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَ جَعَلْنٰهَا رُجُوْمًا لِّلشَّیٰطِیْنِ وَ اَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابَ السَّعِیْرِ ۝‘‘(الملک:۰۵)

اور بے شک ہم نے آسمانِ دنیا کو چراغوں سے زینت دی اور شیطانوں کے مار بھگانے کا ذریعہ بنایا اور ان کے لیے جہنم کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

کے مطابق ستاروں سے سجا کر اس مردود کے آنے کا رستہ بالکل بند کر دیا۔ تا کہ پھر اسے مدت العمر آسمان پر آنے کا موقعہ نہ مل سکے۔ چونکہ آدم علیہ السلام کی وجہ سے لعنت و راندش (دھتکارنے) کا طوق پڑا۔ اس واسطے یہ نسل آدم کا انتہائی دشمن ہے۔ وہ انہیں ہر طرح نیک راستے سے ہٹا کر برے راستے کی طرف مائل کرتا ہے۔ اور اُن کو اپنا یار و دوست بنانے میں کسی حیلہ کو باقی نہیں چھوڑتا۔

اسی لئے تو اللہ جل شانہ نے قرآن پاک میں بار بار ابنِ آدم کو متنبہ فرمایا!

’’وَلاَ تَتَّبِعُواْ خُطُوَاتِ الشَّیْطَانِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ‘‘(البقرۃ:۱۶۸)

یعنی اے لوگو شیطان کے قدموں پر نہ چلنا کیونکہ وہ تمہارا بالکل کھلا اور ظاہر دشمن ہے۔

’’اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ‘‘ کے متعلق ایک نکتہ:

شیطان آدم علیہ السلام کی نسبت ابنائے آدم کا زیادہ دشمن ہے۔ کیونکہ آدم علیہ السلام کو براہِ راست مٹی سے پیدا کیا گیا۔ مٹی اور آگ میں کچھ نہ کچھ اتحاد ہے۔ اگر آگ پر مٹی ڈالو تو فوراً نہ بجھے گی۔ بلکہ کچھ نہ کچھ دیر تک جل کر ختم ہو گی۔ اور حقیقت میں اسی جزئی اتحاد کے باعث آدم علیہ السلام نے ابلیس کی قسم پر اعتبار کر کے شجرۂ ممنوعہ سے کھایا۔

قرآن پاک میں آتا ہے!

”وَقَاسَمَهُمَآ اِنِّیْ لَکُمَا لَمِنَ النّٰصِحِیْنَ ()“ (اعراف: ۲۱)

یعنی ابلیس نے حضرت آدم وحوا علیہما السلام سے قسم اُٹھا کر کہا کہ میں آپ لوگوں کا خیر خواہ ہوں۔

اور آدم زاد چونکہ بالواسطہ مٹی سے مگر براہ راست بروئے:

”وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ کُلَّ شَیْءٍ حَیٍّ“ (الانبیاء: ۳۰)

پانی سے پیدا کئے گئے ہیں۔

اس واسطے شیطانی آگ ان کے پانی کی وجہ سے آدم علیہ السلام سے بھی زیادہ دشمن ہے۔ کیونکہ پانی آگ دونوں ضدیں ہیں۔ انکا اجتماع کسی طرح سے ممکن نہیں۔ اس واسطے ابلیس اپنی آگ کے ذریعے سے ان کا عدو مبین بنا ہوا ہے۔

آدم علیہ السلام اور ابلیس کی لغزش کا مقابلہ:

ہاں یہاں انسان کے دل میں یہ خیال بھی پیدا ہوسکتا ہے۔ کہ آدم علیہ السلام نے شجرۂ ممنوعہ کو کھایا اور ابلیس نے آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ نہ کرنے کا گناہ کیا۔ پھر یہ کیا کہ ایک کو تو ابدالآباد کے لئے لعنت کا طوق پہنا کر ذلت و بے عزتی کے ساتھ دھتکار دیا گیا۔ مگر اس کے برعکس آدم علیہ السلام کی لغزش کو تھوڑے ہی زمانہ کے بعد معاف کرکے پھر وحی وتخاطب کے شرف سے سرفراز فرمایا۔

بات یہ ہے کہ آدم علیہ السلام نے عمداً اور جان بوجھ کر شجرۂ ممنوعہ کو نہ کھایا تھا۔ بلکہ شیطان کے دھوکے اور جھوٹی قسموں کے باعث آپ سے اس فعل کا ارتکاب ہوا۔ اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جہاں کہیں آدم علیہ السلام کی اس ذلت کا ذکر فرمایا۔ تو کہیں:

”فَدَلّٰهُمَا بِغُرُوْرٍ۔

تو اتار لایا انہیں فریب سے“

کے الفاظ زیادہ کرکے حقیقت کو آشکارا فرمادیا۔

اور سورہ طٰہٰ میں صاف فرمادیا!

”وَلَقَدْ عَهِدْنَآ اِلٰٓى اٰدَمَ مِنْ قَبْلُ فَنَسِيَ وَلَمْ نَجِدْ لَهٗ عَزْمًا ۝“ (طٰہٰ: ۱۱۵)

اور یقیناً ہم نے آدم کو پہلے سے حکم دیا تھا۔ مگر وہ بھول گیا۔ اور اس کام کے کرنے میں اس کا عزم نہ پایا۔

تو معلوم ہوا کہ جو امر آدم علیہ السلام سے سرزد ہوا تھا وہ نسیان اور بھول کی وجہ سے۔ آپ کا اس میں کوئی ارادہ یا عزم نہ تھا۔ لہٰذا اس آیت کی رو سے آدم علیہ السلام کا یہ کام گناہ بھی نہ ٹھہرا۔ کیونکہ گناہ کہتے ہیں۔ حدودِ الٰہی کو بالعزم توڑ کر مستحقِ سزا ہونے کو۔ مگر یہاں چونکہ عزم نہیں۔ لہٰذا گناہ بھی نہیں۔ اسی واسطے پیغمبروں کی ایسی لغزشات کو شریعت گناہ کے لفظ سے تعبیر کرنے کو منع کرتی ہے۔ البتہ ذلت کے لفظ سے اس امر کا اظہار کیا جاسکتا ہے۔ ہاں اس پر سزا کا ترتب کہ آدم علیہ السلام کو جنت سے نکال دیا گیا۔ ایسا ہے جیسے کوئی شخص بھول کر زہر کھالے۔ تو وہ خودکشی کرنے والا نہ کہلائے گا۔ بھول کر کھانے سے بھی نتیجہ یعنی موت تو ضروری ہے۔ اس طرح آدم علیہ السلام سے اگرچہ اس امر کا ارتکاب بھول کر ہوا۔ مگر نتیجہ یعنی سزا کا ترتب تو ضروری تھا۔

دوسری طرف ابلیس نے آدم علیہ السلام کے سامنے سجدہ عمداً نہ کیا۔ اور اپنے اس انکار پر گستاخانہ دلیلیں پیش کرنی شروع کر دیں۔ اور حکمِ خداوندی پر نکتہ زنی شروع کی کہ میں ناری ہوں مجھے کثیف مٹی کے سامنے کس دلیل کی رو سے جھکایا جاتا ہے۔ پھر آدم علیہ السلام نے ارتکابِ ذلت **(ذلت کا ارتکاب)** کے بعد:

”رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا سکتہ“ (اعراف: ۲۳)

اے ربّ ہمارے ہم نے اپنا آپ بُرا کیا۔
کہہ کر اس جرم کو اپنی طرف منسوب کیا۔
مگر ابلیس نے اپنی جہالت کے عیب کو ”فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِيْ“ (اعراف: ۱۶)
قسم اس کی کہ تو نے مجھے گمراہ کیا۔
کہہ کر خدا کی طرف نسبت کی۔ اور پھر یہی نہیں کہ جرم کے بعد مخجول (شرمندہ) و شرمسار ہو کر معافی مانگے۔ بلکہ اُلٹا دوسرے لوگوں کو گمراہ کرنے کے لئے قیامت تک زندہ رکھے جانے کی التجا کو منظور کروایا مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ع

گفت شیطاں کہ بما اغو یتنی   کرد فعل خودنہاں دیودنی

گفت آدم که ظلمنا نفسنا   اوز فعل حق نه بد غافل چوما

ترجمہ: شیطان نے کہا کہ تو نے مجھے بہکایا اس سبب سے (میں بھی انہیں گمراہ کروں گا) گویا اس گھٹیا دیو (شیطان) نے اپنے فعل (کرتوت) کو چھپادیا۔ لیکن حضرت آدم علیہ السلام نے عرض کی کہ ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا وہ ہماری طرح فعلِ حق سے غافل نہ تھے۔

”إِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ“ کی مثال سے نصیحت:

اللہ جل شانہ نے فرمایا۔ ”إِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ“ (اعراف: ۱۵)
یعنی تو قیامت تک مہلت دیے ہوئے لوگوں میں سے ہے۔

اور یہ مہلت ایسی ہے جیسے کہ ایک بادشاہ کا نہایت اعلیٰ شکاری کتا ہو۔ بادشاہ نے ایک زمانہ اُس سے شکار کروایا ہو۔ مگر ایک دفعہ جب کہ اس کے ہوش وحواس مختل **(خلل آجانا)** ہو گئے۔ اور بادشاہ پر بھی حملہ کرنے کے لئے دوڑنے لگا۔ تو بادشاہ نے نوکروں کو حکم دیا کہ اسے جا کر فلاں جنگل میں چھوڑ دو۔ مگر یہ سنہری پٹہ اس کے گلے سے نہ اُتارو کہ اسے ہماری طرف سے اُس شکار کے بدلے میں جو یہ کرتا رہا ہے آخری انعام ہے۔ اب اس کے بعد اس کو ہم سے کسی قسم کے انعام کو توقع نہ کرنا چاہئے۔ اسی طرح شیطان بھی ایک زمانہ تک آسمانی جنگلوں میں یسوع وقدوس کا شکار کرتا رہا مگر جب تکبر کی وجہ سے اس کے حواس مختل ہو گئے۔ اور اپنے معبود پر نافرمانی کے رنگ میں حملہ آور ہونے لگا تو اللہ تعالیٰ جل شانہ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ اس کو صحرائے دنیا میں جا کر چھوڑ دو۔ اور ہماری طرف آنے کے سب راستے اس پر بند کر دو۔ ہاں ابدی عمر کا پٹہ جو اسے پہلے دیا جا چکا ہے۔ اب اسے نہ اتارنا بلکہ یہ ہماری طرف سے اسے یہ آخری انعام دیا جاتا ہے۔ اس کے بعد اس کو ہم سے کسی قسم کی توقع نہ رکھنی چاہیے۔

نصیحت:

عزیزو!! دیکھو آدم علیہ السلام سے ایک سہواً خطا ہوئی تو اس کے لئے بھی انھیں جنت سے نکال دیا گیا اور آپ اس ایک لغزش کے لیے کتنے زمانہ تک!

”رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا سکتہ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَ تَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ()“

(اعراف: ۲۳)

اے رب ہمارے ہم نے اپنا آپ بُرا کیا تو اگر تُو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم ضرور نقصان والوں میں ہوئے۔

روروکر پڑھتے رہے۔ تب کہیں جا کر وہ لغزش معاف ہوئی۔ اور ابلیس نے صرف ایک سجدہ کی نافرمانی کی تو اس کا کیا حال ہوا۔ آج ہم رات دن جان بوجھ کر شریعت کے قوانین کو توڑ رہے ہیں۔ خدا اور رسول کی کھلم کھلا نافرمانی کر رہے ہیں۔ مگر اس پر بھی جنت اور حور وقصور کی اُمیدوں میں فرق نہیں آتا۔ اور اللہ کی رحیمی پر ایسے جری ہو چکے ہیں کہ اس کی جباریت وقہاریت کا دم بھرنے کے لئے بھی خیال نہیں آتا حالانکہ ہمارا طریقہ یہ ہونا چاہئے تھا کہ:

"کار کن کار کن بعدۂ تکیہ بر جبار کن"۔
کام کر کام کر اس کے بعد اللہ جبار پر بھروسہ کر۔

حضرت آدم اور یونس علیہم السلام کی دعاؤں میں فرق ہونے کی وجہ:

کام کا نکتہ سن لیجئے۔ وہ یہ کہ جب آدم علیہ السلام سے یہ لغزش سرزد ہوئی تو آپ کو:

"رَبَّنَا ظَلَمْنَآ اَنْفُسَنَا سکتہ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْلَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ"

سکھایا گیا۔ مگر اس کے برعکس جب یونس علیہ السلام نے اپنی قوم سے عذاب کا وعدہ فرمایا اور وہ رحمتِ ربی سے ٹل گیا تو آپ خفا ہو کر اُس شہر سے چلے جانے کے لئے کشتی پر سوار ہوئے اور راستے میں کشتی سے اتار کر سمندر میں ڈالے گئے۔ جس کا قصہ مشہور ہے تو مچھلی نے جب آپ کو نگل لیا۔ تو آپ نے اُس کے پیٹ میں فرمایا!

"لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ صلے اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝"۔ (انبیاء: ۸۷)
کوئی معبود نہیں سوا تیرے پاکی ہے تجھ کو بیشک مجھ سے بے جا ہوا۔
جس کے متعلق قران پاک میں آتا ہے!

"وَذَا النُّوْنِ اِذْ ذَّهَبَ مُغٰضِبًا فَظَنَّ اَنْ لَّنْ نَّقْدِرَ عَلَيْهِ فَنَادٰى فِى الظُّلُمٰتِ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ

سُبْحٰنَكَ ق صلے اِنِّيْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَاسْتَجَبْنَا لَهٗ لا وَ نَجَّيْنٰهُ مِنَ الْغَمِّ ط وَ كَذٰلِكَ نُـْجِي الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ''۔(انبیاء:۸۷،۸۸)

یعنی ذوالنون جب قوم پر ناراض ہو کر چلا گیا۔ اور اسے یقین تھا کہ ہم اس پر تنگی نہیں کرینگے پس اس نے اندھیروں میں پکارا کہ تیرے سوا کوئی معبود نہیں تو پاک ہے۔ بیشک میں اپنے اوپر ظلم کرنے والوں میں سے ہوں۔ سو ہم نے اس کی دعا کو قبول کیا اور اُسے غم سے نجات دی اور اسی طرح ہم مومنوں کو نجات دیتے ہیں۔

دیکھئے!! اس دعا میں حضرت یونس علیہ السلام سے توحید کی تجدید کرائی گئی مگر ادھر آدم علیہ السلام سے ایسا نہ کرایا گیا۔ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ یونس علیہ السلام کو یہ دھوکا خواہشِ نفس سے لگا تھا۔ یعنی یہ کہ عذاب کے ٹل جانے سے آپ اپنی قوم کے سامنے جھوٹے ثابت نہ ہوں۔ مگر خواہشاتِ نفسانی کا شائبہ انبیاء کے کاموں میں:

''حَسَنَاتُ الْاَبْرَار سَيِّآتُ الْمُقَرَّبِيْن''

نیکوں کی نیکیاں مقرب بندوں کے گناہوں کا درجہ رکھتی ہیں۔

کے قبیل سے ہے اس لئے آپ کی زبان سے تجدیدِ توحید کرا کر پھر عرضِ مُدعا کرایا گیا۔ مگر آدم علیہ السلام کے معاملہ میں خواہشِ نفس نہیں بلکہ غلط فہمی اور نسیان تھا۔ اس واسطے وہاں تجدیدِ توحید نہ کرائی گئی۔

''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کے متعلق:

بسم اللہ الرحمن الرحیم قرآن پاک میں صرف سورہ نمل میں بطور جزوِ قرآن اور آیتِ فرقان آیا ہے۔ باقی تمام جگہوں پر دو سورتوں کے جدا کرنے کے لئے آتا ہے۔ اور صرف فصل کا کام دیتا ہے۔ سورہ نمل میں سلیمان علیہ السلام کے خط میں جو آپ نے ملکہ سبا کو لکھا تھا۔ اس طرح پر بسم اللہ استعمال کیا گیا ہے۔

''اِنَّهٗ مِنْ سُلَيْمٰنَ وَ اِنَّهٗ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ اَلَّا تَعْلُوْا عَلَيَّ وَ اْتُوْنِيْ مُسْلِمِيْنَ ۝ ''
(النمل:۳۰)

یعنی وہ خط سلیمان کی طرف سے ہے۔ اور وہ بے انتہا رحم کرنے والے اور بار بار رحمت کرنے والے اللہ کے

نام سے ہے کہ میرے برخلاف سرکشی نہ کرو۔ اور فرمابنردار ہو کر میرے پاس چلی آؤ۔

باقی جہاں پر بھی بسم اللہ آیا ہے۔ صرف نئی سورت کی ابتدا اور ما قبل کا اختتام بتانے کے لئے نازل ہوا ہے۔ وہاں یہ جزوِ قرآن کی حیثیت سے نہیں ہوتا۔

چنانچہ ابو داؤد میں ہے کہ!

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ كَانَ النَّبِیُّ -صلى الله عليه وسلم- لاَ يَعْرِفُ فَصْلَ السُّورَةِ حَتَّى تُنَزَّلَ عَلَيْهِ (بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ-

(سنن ابی داوٗد: جلد ۱، رقم: ۷۸۸، دار الکتاب العربی بیروت)

حضور ایک سورۃ کی علیحدگی کو نہ پہچانتے تھے یہاں تک کہ آپ پر ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' نازل ہوتی تھی۔

سورہ براۃ یا توبہ میں بسم اللّٰہ نہ ہونے کی وجہ:

ہاں سورہ برات جسے توبہ بھی کہتے ہیں۔ اس کے ابتدا میں بسم اللہ نہیں لکھی ہوئی ہوتی۔ اور بسم اللہ کی عدمِ کتابت کی ایک وجہ تو یہ مشہور ہے۔ کہ چونکہ اس سورت کی ابتدا غیظ و غضب سے شروع ہوتی ہے۔ اور کفار کے ساتھ جو اس سے قبل نرمی کا سلوک برتا جاتا تھا اُس کو ختم کر دینے کا حکم ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو رحمن و رحیم جیسے رحم و کرم سے بھرے ہوئے الفاظ سے معنون کا استعمال نہ کیا گیا۔ کیونکہ یہ الفاظ مقتضی ہیں۔ رافت و رحمت کے اور موقعہ ہے اظہارِ غضب کا۔ اسی واسطے جانور کو ذبح کرتے وقت بسم اللہ الرحمن الرحیم نہیں کہا جاتا بلکہ بسم اللہ اللہ اکبر کہا جاتا ہے۔ کیونکہ اوّل الذکر مظہر ہے رحمت کا اور یہاں ضرورت ہے اظہارِ کبریائی اور بڑائی کی کہ جس کے نام پر ایک ذی روح قربان کئے جانے کے قابل ہے۔

چنانچہ سورہ براۃ میں بھی قتل مقاتلہ کی اجازت دی جاتی ہے اور پرانے عہد ناموں کو کفار سے ختم کر دینے کا حکم دیا جاتا ہے۔ اس واسطے بسم اللہ الرحمن الرحیم سے اس سورۃ کو شروع نہ کیا گیا۔ بعض لوگوں نے قرآنی بسم اللہ کی بجائے سورۃ برات کیلئے ایک خانگی بسم اللہ بنائی ہوئی ہے۔ جو بعض قرآنوں میں بھی حاشیے پر چھپی ہوئی ہوتی ہے۔

”اعوذ باللہ من النار و من شر الکفار و من غضب الجبار العزۃ للہ و لرسولہ و للمومنین “۔ مگر یہ بسم اللہ نہ کسی حدیث میں آئی ہے اور نہ کسی اور مستند کتاب میں، ہاں بعد کی ایجاد ہے۔

سورہ براۃ پر بسم اللہ پڑھنے کا حکم:

سورہ براۃ پر بسم اللہ پڑھنے کے متعلق شرعی حکم یہ ہے۔ کہ اگر پیچھے سے سورۃ انفال کو پڑھتا ہوآتا ہے اور اُسی بیٹھک میں سورہ براۃ کو بھی شروع کرتا ہے تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اور اگر یہاں سے شروع کرے۔ یا وسط سورہ سے پڑھے۔ تو بسم اللہ پڑھنے میں کوئی حرج نہیں۔ کیونکہ سورہ براۃ پر بسم اللہ نہ لکھنے کی وجہ حضرت عثمان جامع القرآن رضی عنہ الرحمان نے یوں بیان فرمائی ہے۔ کہ بسم اللہ مستقل سورت پر لکھی جاتی ہے۔ اور سورہ توبہ مستقل سورت نہیں۔ بلکہ میرے خیال میں سورہ انفال کی جزو ہے۔ اور حضور ﷺ نے انتقال فرمانے تک اس کے متعلق کچھ بیان نہ فرمایا۔ اس لئے میں نے سورہ توبہ کو انفال کے قریب رکھ کر ان میں بسم اللہ نہ لکھا۔ تاکہ جن لوگوں کا گمان ہے کہ یہ مستقل سورت ہے۔ اُنہیں مستقل معلوم ہو۔ اور جن کا میری طرح ان دونوں کے ایک ہونے کا خیال ہے۔ وہ بسم اللہ کے فصل نہ ہونے کی وجہ سے ایک سمجھیں۔ چنانچہ ترمذی شریف میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے الفاظ یوں درج ہیں۔

وَكَانَتِ الْاَنْفَالُ مِنْ اَوَائِلِ مَا نَزَلَتْ بِالْمَدِيْنَةِ وَكَانَتْ بَرَاءَةٌ مِنْ آخِرِ الْقُرْآنِ وَكَانَتْ قِصَّتُهَا شَبِيهَةً بِقِصَّتِهَا فَظَنَنْتُ أَنَّهَا مِنْهَا ، فَقُبِضَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَلَمْ يُبَيِّنْ لَنَا اَنَّهَا مِنْهَا ، فَمِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ قَرَنْتُ بَيْنَهُمَا وَلَمْ اَكْتُبْ بَيْنَهُمَا سَطْرَ بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيمِ۔

(سنن ترمذی: الجزء ۵، رقم: ۳۰۸۶، دار الغرب الاسلامی)

یعنی انفال مدینہ شریف کی ابتدائی سورتوں میں سے ہے۔ اور براۃ آخر قرآن سے۔ مگر دونوں کا قصہ آپس میں ایک دوسرے سے ملتا ہے۔ اس سبب سے میں نے خیال کیا کہ براۃ انفال ہی کا جزو ہے اور حضور ﷺ رحلت فرما گئے۔ مگر آپ نے اس کے متعلق ہم سے کچھ بیان نہ فرمایا اس لئے میں نے دونوں کو ایک جگہ کر کے درمیان میں بسم اللہ الرحمٰن کی سطر نہ لکھی۔

تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ انہوں نے بسم اللہ اس وجہ سے نہ لکھی۔ کہ اُن کے خیال میں یہ دونوں صورتیں بوجہ تشابہ کے ایک ہیں۔ لہٰذا جو شخص اسے مستقل سمجھے یا بالاستقلال یہاں سے تلاوت شروع کرے تو پھر بسم اللہ الرحمن الرحیم پڑھنے میں کیا حرج ہو سکتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ سے سورۃ کو کیوں شروع کیا جاتا ہے:

بسم اللہ ہر سورت کے لئے دیباچہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح دیباچہ کتاب میں کتاب کے سب مضمون کو بالاختصار بتادیا جاتا ہے۔ تاکہ دیباچہ کے آئینہ میں آئندہ مفصل مضامین کی جھلک دکھا کر پڑھنے والے کو اُن سے فی الجملہ مانوس کرادیا جائے۔ بعینہ اسی طرح بسم اللہ بھی ہر سورت کے مضمون کو بالاختصار ظاہر کردیتی ہے کیونکہ قرآن پاک کی ہر سورت میں بالخصوص تین مضمونوں کو مختلف طریقوں سے بیان کیا گیا ہے۔ یعنی توحید رسالت اور مسئلہ مجازات یا جزاؤسزا کا مسئلہ۔ یہ تینوں باتیں ہر سورت میں مختلف تفصیلوں اور تشریحوں سے بیان کی گئی ہیں۔ مگر تسمیہ میں تینوں کی تینوں بالاختصار پڑی ہوئی ہیں۔ جو آئندہ بسم اللہ الرحمن الرحیم میں رحمن اور رحیم کی مکمل تفسیر کئے جانے کے بعد پوری طرح ذہن نشین ہو جائے گا۔

بعض تفاسیر میں لکھا ہے۔ کہ تمام قرآن پاک کا خلاصہ سورہ فاتحہ ہے اور تمام سورہ فاتحہ کا خلاصہ بسم اللہ الرحمن الرحیم ہے۔ اور تمام بسم اللہ کا خلاصہ حرف باے میں موجود ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں تمام قرآن پاک کا خلاصہ اور نچوڑ باے میں ودیعت کیا گیا ہے۔ اور اس بات کی تشریح یہ ہے کہ تمام قرآن پاک کا مطلب مختصر طور پر یہ ہے کہ ہر انسان کو اللہ تعالیٰ سے ملادے۔ اور چونکہ باے بھی عربی زبان میں الحاق یا ملانے کے لئے آتی ہے۔ تو گویا اتحاد مقصود میں قرآن پاک کی تعلیم کا نچوڑ ہے۔ اور بسم اللہ کی باے کے آئینہ میں قرآنی پہاڑ کا پورا پورا عکس نظر آتا ہے۔

ہر کام بسم اللہ کہہ کر شروع کرو:

بسم اللہ کے خلاصہ قرآن اور جلیل القدر آیت ہونے کی وجہ سے حضور سرور کائنات ﷺ فرماتے ہیں:

’’كُلُّ أَمَرٍ ذِي بَالٍ لا يُبْدَأُ فِيهِ بِالْحَمْدِ أَقْطَعُ أَوْ أَجْزَمُ۔

(معجم الکبیر: الجز ۱۳، رقم: ۱۴۱، مکتبہ ابن تیمیہ قاھرہ)

یعنی جو کام بسم اللہ کے ساتھ شروع نہیں کیا جاتا ہے تو وہ ناقص اور دم کٹا رہتا ہے۔

یعنی اُس میں برکت اور یمن نہیں پائی جاتی ایک دوسری حدیث میں آتا ہے کہ ایک بدو نے حضور ﷺ کے سامنے کھانا کھایا۔ کھانا اگر چہ بہت تھا مگر اعرابی کا پیٹ نہ بھرا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ اگر یہ شخص بسم اللہ کہہ کر کھانے کو شروع کرتا تو اسکا پیٹ بھر جانے کے بعد بھی اس کا کھانا بچ جاتا۔ مگر چونکہ اس نے بسم اللہ نہیں کہی اس واسطے اللہ تعالیٰ نے اس کے کھانے سے برکت کو سلب کر لیا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ہمارے رزقوں میں بھی برکت نظر نہیں آتی۔ پہلے ایک شخص کماتا تھا اور دس بیٹھ کر کھاتے تھے۔ اب دس کماتے ہیں۔ مگر ایک بھی بیٹھ کر نہیں کھا سکتا۔ کیونکہ پہلے ہمارے گھروں کے سب آدمی نمازی ہوتے تھے۔

جب عورت کھانا پکاتی تھی۔ تو بسم اللہ سے کام شروع کرتی تھی۔ جب آٹا گوندھتی تو بسم اللہ کہہ کر گوندھتی جب کھانا برتنوں پر ڈالتی تو بسم اللہ کہہ کر ڈالتی۔ اور جب کھانے والے کھاتے تو بسم اللہ کہہ کر کھانا شروع کرتے مگر آج حالت ہی بدل گئی۔ سینکڑوں گھروں میں ایک بھی پورا گھر نمازی نہ ملیگا۔ بسم اللہ سے کھانا شروع کرنا تو درکنار اگر کسی فحش بات سے شروع نہ کیا جائے۔ تو بھی غنیمت ہے۔ مگر آج کل تو کھانا شروع کرتے ہیں کسی فلم ایکٹرس کی تعریف سے کسی بےہودہ بات مثلاً چغلی۔ غیبت یا بدگوئی سے۔ تو پھر آپ ہی بتائیں کہ جب کسی کھانے کی ایسی مبارک ابتدا ہو تو اُس کی انتہا کتنی مسعود و میمون (مبارک) ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ آج اُس کھانے میں برکت نہیں۔ اُس کھانے کی قوت میں برکت نہیں اُس قوت کے نتیجہ میں برکت نہیں۔ گویا خط غلط۔ املا غلط اور کاغذ غلط۔

قرآن پاک کو بائے سے شروع کرنے میں حکمت:

قرآن پاک کو بسم اللہ الرحمن الرحیم سے اور تسمیہ کو بائے سے شروع کیا گیا۔ تاکہ قاری بائے کے اجمال سے آہستہ آہستہ تفصیل کی طرف جائے۔ اور قرآنی مضامین بتدریج پورے پورے ذہن نشین ہو جائیں۔ بائے کو اللہ تعالیٰ نے الف پر مقدم فرمایا۔ حالانکہ الف حروف تہجی میں سب سے پہلا حرف ہے۔ اور پھر یہ نہیں بلکہ بسم جو کہ اصل میں اسم تھا۔ اس کے الف کو گرا کر اُس کی جگہ بائے کو دے دی گئی۔ اس تقدیم

اور ترجیح کے متعلق علمائے کرام نے نہایت اعلیٰ اعلیٰ نکات بیان فرمائے ہیں۔ جن میں سے چند ایک عام فہم باتیں آپ کے سامنے بیان کر دیتا ہوں۔

(۱) بائے کو الف پر اللہ تعالیٰ نے اس لئے مقدم فرمایا۔ کہ الف میں تکبر اور ترفع (بڑائی) پایا جاتا ہے۔ اور اسکی شکل ایک متکبر انسان کی سی ہے۔ اس کی گردن اٹھی ہوئی ہے۔ اور اس کی ہیئت سے فخر وغرور کا اظہار ہوتا ہے۔ مگر بائے کی شکل ایک متواضع انسان کی سی ہے جو انکساری اور عاجزی کی وجہ سے زمین پر جھکا ہوا ہوتا ہے کیونکہ مثل مشہور ہے۔

”نہد شاخ پُر میوہ سر برزمین“

میوہ بھری شاخ اپنے سر کو زمین پر رکھ دیتی ہے

چونکہ اللہ تعالیٰ کو کسی کا فخر وتکبر پسند نہیں اور آپ کا صاف فرمان ہے!

”اَلْکِبْرِیَاءُ رِدَائِي، وَالْعَظَمَةُ إِزَارِی، فَمَنْ نَازَعَنِي وَاحِدًا مِنْهُمَا، قَصَمْتُهُ“

(سنن ابی داؤد: الجزء۴، رقم: ۴۰۹۰، کتاب الطب، دار الفکر بیروت)

یعنی تکبر تو میری چادر ہے اور بزرگی میرا تہہ بند۔ جو ان میں مجھ سے نزاع کریگا تو میں اُس کو توڑ کر رکھ دونگا۔

اس واسطے رب العزت نے بائے کی عاجزی پر نظر کر کے اُسے اس عظیم الشان انعام سے نواز۔

طریقت جز ین نیست درویش را

که افگنده دار تن خویش را

ایک درویش کی راہِ طریقت یہی ہے کہ وہ اپنے سر کو اللہ کے سامنے جھکائے رکھے۔

کُوہِ جُودِی کو اس کے انکسار کی وجہ سے عزت دی گئی:

کتابوں میں لکھا ہے کہ جب نوح علیہ السلام کے زمانے میں سخت طوفان آیا اور دنیا پانی پانی ہوگئی تو نوح علیہ السلام کو جو کشتی میں سوار تھے اپنی کشتی کو کسی پہاڑ پر لگانے کا حکم ہوا۔ اس حکم کی وجہ سے اونچے اونچے بڑے بڑے پہاڑ فخر کرنے لگے کہ اس طوفانی زمانہ میں ہمارے بغیر اور کونسا پہاڑ ایسا ہوگا جو کشتی نوح علیہ السلام کے لنگر انداز ہونے کے قابل ہو سکے گا مگر جودی جو ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی انکسار اور عاجزی کی زبا

ن سے کہنے لگی کہ میں کس قابل ہوں کہ مجھ پر حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی کو لگایا جائے اور ایسے اُلو العزم پیغمبر کے مقدس قدموں سے میرے پتھروں کو عزت بخشی جائے۔ اللہ جل شانہ کو جودی کی یہ عاجزی پسند آئی اور نوح علیہ السلام کو جودی ہی پر اپنی کشتی لگانے کا حکم فرمایا۔

براق کا انکسار اور اس کا نتیجہ:

اسی طرح جب لیلۃ المعراج ہوئی اور رضوان سے جنت کی آراستگی کا حکم ہوا اور ساتھ ہی جبرئیل امین کو تاجدار مدینہ کی عروجی سیر کے لئے جنت سے ایک نہایت اعلیٰ گھوڑا لے جانے کا ارشاد ہوا تو جب جنت کے گھوڑوں نے یہ خوشخبری سنی۔ تو سب کے سب ہنہنانے لگے۔ اور اپنے اپنے بخت پر فخر کرنے لگے۔ اور دل ہی دل میں کہنے لگے کہ ہم سے زیادہ کونسا گھوڑا سواریِ اقدس کے قابل ہوسکتا ہے۔ مگر براق جو کہ چھوٹے سے قد کا سفید رنگ کا گھوڑا تھا۔ اپنے قد کی چھوٹائی اور دوسروں کی خوبصورتی کو خیال کر کے دل ہی دل میں کہنے لگا کہ میں اس قابل کہاں ہوں کہ سرور کونین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مجھ پر سوار کیا جائے۔ اللہ جل شانہ کا حکم ہوا کہ اے روح الامین۔ رحمۃ اللعالمین کی سواری کے لئے اسی براق ہی کو لے جاؤ۔ کیونکہ اس کی عاجزی ہمیں بہت پسند آئی ہے۔ اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے!

مَنْ تَوَاضَعَ لِلّٰهِ رَفَعَهُ اللّٰهُ۔

(شعب الایمان، الجزء ۱۰، رقم: ۷۷۹۰، مکتبۃ الرشد ممبئی الھند)

یعنی جس نے خدا کے لئے تواضع کی اللہ تعالیٰ اُسے بلند کر دیتا ہے۔ مرتبہ اور عزت میں۔

رجوع بمطلب:

تو بھائیو اسی طرح جب بائے نے عاجزی کی تو اسے قرآن مقدس کی کتابت میں سب سے اوّل اور مقدم جگہ دی گئی۔

(۲) بائے کلام عربی میں جیسے کہ پہلے بیان کیا جاچکا ہے۔ ملانے کا کام دیتا ہے۔ مگر الف عموماً قطع کرنے کے لئے آتا ہے۔ جہاں پر یہ آتا ہے۔ تو دو لفظوں کو آپس میں جدا کر دیتا ہے۔ چونکہ وصال فصال سے اچھا تھا۔ اس لئے بھی بائے کو الف پر مقدم کر دیا گیا۔

مولانا روم صاحب نے موسیٰ علیہ السلام اور ایک چرواہے کا قصہ لکھا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام ایک دفعہ کسی جنگل سے گزر رہے تھے کہ آپ نے ایک گڈریے کو دیکھا کہ زور زور سے کہہ رہا تھا کہ اے اللہ تو اگر میرے پاس آتا تو میں تجھے بکریوں کا دودھ پلاتا۔ اگر تو تھک جاتا تو تجھے دباتا۔ اگر تجھے سردی لگتی تو تجھ پر یہ اپنی کمبلی اوڑھاتا۔ مولانا روم صاحب فرماتے ہیں ع

ایں نمط بیہودہ میگفت آں شباں　　گفت موسی علیہ السلام باکیستت اے فلاں
گفت با انکس که مارا آفرید　　ایں زمان و چرخ ازو آمد پدید
گفت موسی علیہ السلام ہاے خیرہ سر شدی　　خود مسلماں ناشدہ کافر شدی
گفت اے موسیٰ دہانم دوختی　　وز پشیمانی تو جانم سوختی
وحی آمد سوئے موسی علیہ السلام از خدا　　بندہ مارا زما کردی جدا
تو برائے وصل کردن آمدی　　نے برائے فصل کردن آمدی

یعنی وہ چرواہا اس قسم کے بے ہودہ اور لایعنی کلام میں مشغول تھا۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے یہ سب کچھ سنا تو آپ نے فرمایا! کہ اے گڈریے تو کس کے ساتھ یہ باتیں کر رہا ہے۔ گڈرئے نے جواب دیا اور کس کے ساتھ کر رہا ہوں اپنے خالق کے ساتھ کہ جس نے یہ سب آسمان و زمان پیدا فرمائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اے بیوقوف!! تو تو بجائے مسلمان ہونے کے کافر ہو گیا۔ کیونکہ یہ سب کے سب کفریہ الفاظ ہیں۔ گڈریے نے کہا۔ اے موسیٰ تو نے تو یہ بات کہہ کر میرے منہ کو سی دیا۔ اور شرمندگی اور پشیمانی کی وجہ سے تو نے مجھے جلا دیا۔ جب گڈرئے نے ڈر کر خدا کو یاد کرنا چھوڑ دیا۔ تو موسیٰ علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی آئی کہ اے موسیٰ تو نے ہمارے بندے کو ڈرا کر ہم سے جدا کر دیا۔ حالانکہ تیرا کام تو ملانا تھا نہ کہ جدا کرنا۔ تو گویا ملانے کا کام اللہ جل شانہ کو پسند ہے۔ اسی واسطے تو قرآن و حدیث صلہ رحمی کرنے والوں کی بہت تعریف کرتے ہیں۔ مگر قاطعُ الرحم کے متعلق نہایت غضب آلود الفاظ بیان فرماتے ہیں۔ لہذا بائے کو صفت الصاق (ملانے کی صفت) و اتصال کے باعث الف فاصل پر مقدم و مرجح (ترجیح دیا ہوا) کر دیا گیا۔

(۳) الف کو بوجہ اس کے تکبر اور غرور کے نقطہ تک سے محروم کر دیا گیا۔ مگر بائے کے انکسار اور عا

جزی کو دیکھ کر اللہ جل شانہ نے اسے نقطوں کی صورت میں انعام دینا چاہا۔ مگر اس کی وحدت پسندی کو دیکھو۔ کہ اس نے اتنے نقطوں سے صرف ایک ہی لیا۔ کیونکہ ایک سے محبت کرنا فقراء اور اولیا کی شان ہے۔ تو گویا دوسرے الفاظ میں بائے میں محبت و وحدت کا راز پڑا ہوا تھا۔ مگر اس پر بھی دیکھو۔ کہ اس نوازشِ ربانی سے اس میں کسی قسم کا غرور نہ آیا۔ بلکہ اس امتیازی نقطہ کو بجائے اوپر رکھنے کے پاؤں میں ڈال دیا تا کہ دنیا پر ظاہر ہو جائے کہ فقراء و اہل اللہ کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ کسی امتیاز و اعزاز کے دیئے جانے پر فخر نہیں کرتے بلکہ وہ نقطہِ امتیاز ان میں بھی انکساری پیدا کر دیتا ہے۔

(۴) بائے وہ حرف ہے جس کے ساتھ روزِ میثاق میں انسانوں کا منہ کھلا۔ جب اللہ جل شانہ نے سب روحوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ ”اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ؕ“ (اعراف: ۱۷۲)

یعنی میں تمہارا ربّ نہیں ہوں“۔

تو تمام روحوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔ ”بَلٰی“۔

کیوں نہیں۔

چونکہ ”بَلٰی“ کی ابتدا بائے سے ہے۔ تو گویا قرآن پاک کو بائے سے شروع کر کے انسان کو وعدہِ میثاق کی یاد بھی دلادی کہ اے انسان جب تو میری ربوبیت کو مان چکا اور مجھے اپنا معبود تسلیم کر چکا۔ تو تجھے اب چاہئے کہ میری تربیت کے احسان کا شکریہ بھی ادا کرے۔ اور یہ قرآن ادائے شکر کے طریقہ کی تفصیل ہے اسواسطے اسے پڑھ اور اس پر عمل کر۔

(۵) عربی زبان میں واؤ۔ الف اور یائے کو حروف علت کہتے ہیں۔ کیونکہ علت کا معنی ہے۔ بیماری۔ چونکہ یہ حروف بھی جس لفظ میں داخل ہوتے ہیں۔ اسے بیمار کر دیتے ہیں۔ اسی واسطے عربی میں ایسے لفظ کو معتل کہا جاتا ہے یعنی علت والا جس کی وجہ سے اس میں طرح طرح کی تعلیلیں ہو کر اس کی شکل بدلتی رہتی ہے۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

حرف علت نام کردند واؤ الف ویائے را
ہر کہ را درد ے رسد لاچار گوید وائے را

ترجمہ: حروف علت واو، الف اور یے ہیں کیونکہ جب کسی کو درد پہنچتا ہے تو لاچار وہ وائے ہی کہتا ہے۔

جب کوئی انسان بھی بیمار ہوتا ہے تو اس کی زبان سے وائے کا لفظ نکلتا ہے۔ جو مرکب ہے۔ واؤ الف اور یائے سے تو گویا بیمار کے لفظ بھی بیمار ہیں۔ مگر برعکس بائے حروف صحیحہ سے ہے اس لئے حرف صحیح سے قرآن پاک شروع کر کے اشارۃً یہ بتا دیا گیا کہ اس پاک کتاب کے پڑھنے والے ہمیشہ ہمیشہ صحیح العقیدہ ،صحیح العمل، صحیح الطریقہ رہیں گے۔ اور انہی لوگوں کو دین و دنیا کے عذاب و ذلت کی علت سے پورا پورا محفوظ رکھا جائے گا۔

(۶) اگرچہ الف بائے سے حروف تہجی میں مقدم ہے۔ مگر تلفظ کے لحاظ سے وہ اس سے موٴخر ہے۔ نام کے لحاظ سے اگرچہ متبوع (جس کی پیروی کی جائے) ہے۔ مگر کام کے لحاظ سے بائے کا تابع ہے۔ کیونکہ الف معناً اور ترکیباً بائے سے کبھی پہلے نہیں آسکتا۔ یعنی یہ نہیں ہوسکتا کہ اب ترکیباً آ کر الف الف رہ سکے۔ ہاں جب کبھی الف الف رہنے کی خواہش کرے گا۔ تو اسے با بن کر آنا پڑے گا۔ کیونکہ ’’اب‘‘ کی صورت میں بائے سے اوّل ہمزہ ہے الف نہیں۔ الف تو ہمیشہ خود ساکن ما قبل مفتوح ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف اگر کسی جگہ بھی شکل رکھے گا۔ تو وہ الف نہیں بلکہ ہمزہ ہوگا۔ تو گویا بائے کو مقدم کر کے یہ راز سمجھایا کہ اے تالی تجھے الف کی طرح نام میں متبوع ہونے کی ضرورت نہیں۔ بلکہ بائے کی طرح کام میں متبوع ہونیکی ضرورت ہے۔ اسی واسطے قرآن پاک نے جہاں کہیں ایمان کا ذکر فرمایا ہے۔ ساتھ ہی اعمالِ صالحہ کی قید کو بھی بڑھا دیا ہے۔ کہ صرف نام کا ایمان لانا مفید نہیں بلکہ کام کا ایمان لاؤ۔

اسی واسطے تو حضور نے فرمایا ہے!

لَا یُقْبَلُ اِیْمَانٌ بِلَا عَمَلٍ وَّلَا عَمَلٌ بِلَا اِیْمَانٍ۔

ایمان کے بغیر عمل قبول نہیں اور عمل کے بغیر ایمان قبول نہیں۔

(مجمع الزوائد: جلد ۱، رقم: ۹۵، مکتبہ القدسی قاھرہ)

مولانا فرماتے ہیں ؎

میم و واؤمیم ونوں تشریف نیست

لفظ مومن جزیئے تعریف نیست

یعنی لفظ مومن تو م،و،ن کے الفاظ کی طرح محض تعریف پیدا کرتا ہے۔ اور مومن کو غیر مومن سے جدا کر کے معرفہ بنا دیتا ہے۔

اعمال کے بغیر اس لفظ کو موجب شرافت سمجھنا تو ایسا ہے۔ جیسے ایک مفلس وقلاش کا نام سلطان الہند یا ایک کالے کلوٹے کا نام بدر منیر رکھ دیا جائے۔

ایمان بلا عمل کی مثال:

ایک ماسٹر صاحب بچوں کو سوال حل کرواتے تھے۔ اور بار بار لاکھوں روپوں کا حساب لکھاتے تھے۔ ایک فقیر کھڑا اتنی اتنی بڑی رقموں کے نام سن رہا تھا۔ آخر جب ماسٹر صاحب سوال لکھا چکے تو فقیر آگے بڑھا اور کہا! صاحب اللہ تعالیٰ نے آپ کو بہت مال دیا ہے۔ آپ مہربانی فرما کر مجھ دکھی کو بھی اس میں سے ہزار دو ہزار دے دیں۔ تا کہ مجھ غریب کا بھی بیڑا پار ہو جائے۔ ماسٹر صاحب ہنس پڑے اور کہا فقیر صاحب یہ تو سب رقمیں زبانی ہی زبانی ہیں۔ عملی صورت میں تو ہمارے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تو بھائی آج ہم اپنی ایمانداری کا زبانی جمع خرچ تو ماسٹر صاحب کی طرح بہت کچھ کرتے ہیں۔ مگر عملی صورت دیکھو تو صفر ہوتی ہے۔

(۷) بائے اپنے وجود میں کامل ہے۔ اور بغیر کسی دوسرے حرف کی مدد کے اکیلی بھی متلفظ (جو بولا جائے) ہو سکتی ہے۔ مگر الف اپنے وجود میں ناقص ہے۔ اور بغیر کسی دوسرے حرف کے ملانے کے اس کا تلفظ محال ہے۔ تو گویا تقدیم بائے میں انسان کو یہ بتایا کہ اے انسان جب تیرے اندر کچھ کمال اور معنی ہو تو اگر چہ لوگ تجھے ناقص لوگوں سے نیچے بٹھائیں اور ان کو اچھی جگہ اور اعلیٰ مرتبہ دیں تو غم مت کر۔ بلکہ اللہ تعالیٰ آخر کار تجھے تیرے کمالِ باطنی کی وجہ سے ناقص لوگوں کا سرتاج وسرخیل بنا دے گا۔

(۸) بائے خود ہمیشہ مکسور (ٹوٹا ہوا یا عاجز) ہوتا ہے اور جس کے ساتھ ملتا ہے اسے بھی مکسور بنا دیتا ہے۔ اور یہی اہل اللہ اور خدا رسیدہ لوگوں کی شان ہوتی ہے۔ کہ خود تو متواضع اور منکسر المزاج ہوتے ہی ہیں۔ مگر جو لوگ کہ ان کے ساتھ تعلق پیدا کرتے ہیں۔ انہیں بھی انکسار و عجز کا نمونہ بنا دیتے ہیں۔ تو گویا بائے کو

قرآن پاک کے سرے پر لا کر اشارہ فرمایا کہ اس کتاب کے ساتھ تعلق رکھنے والے لوگ بھی عجز و انکسار کا ایک اعلیٰ نمونہ بن جائینگے۔ اسی واسطے قرآن پاک فرماتا ہے!

"وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْأَرْضِ هَوْنًا۔ (الفرقان: ۶۳)

یعنی اللہ کے بندے وہ ہیں۔ جو زمین پر انکسار اور عاجزی سے چلتے ہیں۔

اور قرآن چونکہ اللہ تعالیٰ سے انسان کو ملا کر اس کا حقیقی بندہ ہونے کا سبق سکھاتا ہے۔ تو گویا دوسرے لفظوں میں مقدس کتاب ہم کو عباد الرحمن بنا کر انکسار کا مکمل نمونہ بنانا چاہتی ہے۔

یہ چند ایک وجوہات ہیں جن کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے بائے کو الف پر مقدم فرمایا اور مقدم ہی نہیں بلکہ اسم کے الف کو گرا کر اس کی جگہ بھی اسے دے دی۔ اسی واسطے کتابت میں باسم اللہ کی جگہ بسم اللہ لکھا جاتا ہے۔

بائے کی طرح صفات پیدا کرنے کی وصیت اور ایاز کا قصّہ:

تو بھائیو بائے کی طرح صفات پیدا کرو تو پھر دیکھو کہ دوسری قوموں کے غرور تکبر کو توڑ کر تمہیں کس طرح معزز و مکرم بنایا جاتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ رب العزت فرماتے ہیں!

"اَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوْبُهُمْ مِنْ أَجْلِي۔

(مرقاۃ المفاتیح: الجز۱، رقم: ۱۵۲۸، دار الفکر بیروت)

یعنی میں ان لوگوں کے ساتھ ہوں جن کے دل میری وجہ سے ٹوٹے ہوئے ہیں۔

کیا نہیں دیکھتے کہ جب باز و ٹوٹ جاتا ہے تو اسے پٹی باندھ کر گلے سے لگا لیا جاتا ہے مگر سینے پر رکھے جانے اور گلے میں لٹکائے جانے سے پہلے اس کا ٹوٹنا لازمی ہے صحیح و سالم ہاتھ کو گلے سے نہیں لٹکایا جاتا تو ایسے ہی جب اپنے دلوں کو عشق الٰہی سے توڑ دو گے تو پھر دیکھو گے کہ رب العزت اس ٹوٹے ہوئے دل کے کتنے قریب ہو جاتے ہیں۔ اور اس شکستہ دل کی قیمت قلبِ سلیم سے کس قدر بڑھ جاتی ہے۔ سچ ہے۔

عاشق نہ شد کہ یار بحالش نظر نہ کرد
اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب است

ترجمہ: وہ عاشق تو نہ ہوا جس کے حال پر یار (اُس کا محبوب) نگاہ نہ ڈالے اے خواجہ درد نہیں ہے وگرنہ طبیب موجود ہے۔

محمود کے غلام ایاز کے ہاتھوں ٹوٹنے والے شیشے کی قیمت:

شاید آپ نے ایاز و محمود کا قصہ تو سنا ہوگا۔ کتابوں میں لکھا ہے کہ ایاز جو محمود غزنوی کا چہیتا غلام تھا مگر حسن خلق، ذکاوت اور ذہانت کے باعث محمود اس کا غلام بن چکا تھا اور حالت یہ ہو چکی تھی۔

محمود غزنو ی کہ ہزاراں غلام داشت
عشقش چناں گرفت غلامِ غلام شد

ترجمہ: محمود غزنوی کہ ہزاروں غلام رکھتا تھا لیکن اس کے عشق نے اسے اپنے غلام کا غلام بنا دیا۔

یہ ایاز ایک دفعہ محل کی چھت پر کھڑا ہو کر کسی پرندے کو غلہ مار رہا تھا۔ محل کے نیچے ایک آئینہ فروش کی دکان تھی۔ غلہ اتفاق سے ایک نہایت قیمتی آئینہ پر جا کر لگا۔ جس سے شیشہ بالکل چکنا چور ہو گیا مالک دوکان شیشے کے ٹکڑوں کو چادر میں باندھ کر محمود غزنوی کے حضور پیش ہوا۔ اور تمام ماجرا کہہ سنایا۔ بادشاہ نے کہا کہ اچھا اگر ہمارے غلام کے ہاتھ سے تمہارا شیشہ ٹوٹ گیا۔ تو ہم اس کی قیمت ادا کرنے کو تیار ہیں۔ دکاندار نے شکریہ ادا کیا۔ اور قیمت لینے پر رضامندی ظاہر کی بادشاہ نے پوچھا کہ تمہارے شیشے کی کیا قیمت ہے۔ شیشہ فروش نے عرض کی کہ صاحب اس کی قیمت پانچ ہزار دینار ہے۔ بادشاہ نے کہا۔ جھوٹے ایسے شیشے تو آدھے دینار سے بھی کم قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔ اور تو دو نہیں چار نہیں اکٹھے پانچ ہزار دینار قیمت بتا رہا ہے۔ دیکھ میں ابھی تیرے صدق و کذب کو ظاہر کئے دیتا ہوں۔ چنانچہ بادشاہ نے حکم کیا کہ غزنی کے تمام شیشہ فروشوں کو اسی وقت دربار میں جمع کیا جائے۔ حکم کی دیر تھی جوق در جوق شیشوں کے تاجر دربار میں آنے لگے۔ جب سب آ چکے تو بادشاہ نے ان سب کو مخاطب ہو کر کہا کہ دیکھو تم سب لوگوں کا پیشہ شیشہ فروشی ہے۔ تم کھوٹے کھرے کو اچھی طرح پرکھ سکتے ہو۔ اس واسطے بلا کسی خوف و خطرہ کے مجھے سچ سچ بتا دو کہ اس ٹوٹے ہوئے شیشے کی بازار میں زیادہ سے زیادہ کیا قیمت ہو سکتی ہے۔ کسی نے آدھا دینار کسی نے دو کہے۔ مگر کہاں اصلی قیمت اور کہاں شیشہ فروش کا تقاضا۔ جب سب قیمت کا اندازہ لگا چکے۔ تو بادشاہ شیشہ فروش کی طرف متوجہ ہو کر کہنے لگا۔ کیوں تم کو اپنا سچ

جھوٹ معلوم ہوگیا یا نہیں۔ شیشہ فروش نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ حضور یہ سب سالم شیشے کی قیمت بتا رہے ہیں۔ مگر میں حضور سے ٹوٹے ہوئے شیشے کی قیمت طلب کرتا ہوں۔ میں خود کہتا ہوں کہ اگر یہ شیشہ سالم ہوتا تو ان لوگوں کی بتائی قیمت سے ایک پیسہ بھی زیادہ کا نہ تھا۔ مگر یہ ٹوٹنے کی وجہ سے اتنا قیمتی ہو چکا ہے۔ بادشاہ نے کہا۔ ارے دیوانے کہیں کوئی چیز ٹوٹ کر بھی صحیح و سالم ہونیکی حالت سے زیادہ قیمتی ہوسکتی ہے۔ ایسے تو یہ اب ایک دمڑی کا بھی نہیں۔ اس نے کہا حضور یہ سب کچھ سچ ہے۔ مگر یہ بیکار اور بے قیمت اسی وقت ہوتا۔ جب کہ یہ کسی معمولی شخص کے ہاتھ سے ٹوٹتا۔ مگر اب تو یہ ایاز کے ہاتھ سے ٹوٹا ہے جو کہ حضور کا پیارا اور چہیتا غلام ہے اور ایاز کے ہاتھ سے شیشے کا ٹوٹنا ایسا ہے کہ جس پر آئینہ کی ہزار سلامتی قربان کی جائے تو کم ہے۔ بادشاہ اس عاشقانہ رمز کو سمجھ گیا۔ اور حکم دیا کہ دکاندار کو اس کی منہ مانگی قیمت دے کر رخصت کیا جائے۔

تو بھائیو! جب ایک بادشاہ اپنے ایک پیارے غلام کے ہاتھ ٹوٹے ہوئے شیشے کی اس قدر عزت افزائی کرتا ہے۔ تو وہ مالک الملک اپنے عشق کے غلہ سے ٹوٹے ہوئے دل کو کیوں نہ قیمتی اور معزز بنا دے گا۔ اسی واسطے تو فرما دیا ہے۔

”اَنَا عِنْدَ الْمُنْكَسِرَةِ قُلُوبُهُمْ مِنْ أَجْلِي“۔

(مفاتیح الغیب: جلد ۲، صفحہ ۳۲۰، دار احیاء التراث العربی بیروت)

(المقاصد الحسنۃ: جلد ۱، رقم: ۱۸۸، حرف الھمزۃ، صفحہ ۱۶۹، دار الکتاب العربی بیروت)

یعنی ایسے ٹوٹے ہوئے دل والے کے ساتھ اللہ جل شانہ ہو جاتا ہے۔

تو جب وہ خود معشوق حقیقی شکستہ دل عاشق کے ساتھ ہو جائے۔ تو پھر اس عاشق کی کامیابی کا کیا پوچھنا۔ پھر ایسے عاشق کے آگے تو تمام دنیا کو جھکا دیا جاتا ہے۔ اور وہ عاشق جو سب کا خادم اور چاکر تھا۔ سب کا مخدوم اور آقا بنا دیا جاتا ہے۔ مگر یہ تب ہی ہوتا ہے۔ کہ جب عاشق بائے کے اوصاف اپنے وجود میں پیدا کر لیتا ہے۔

اِسم کی تفسیر:

اب بائے کے بعد اسم کا لفظ آتا ہے۔ اس کا معنی نام ہے ”بسم اللہ“ یعنی اللہ کے نام کے ساتھ۔

دیکھئے قاری قرآن پاک کو اللہ کے نام سے شروع کرتا ہے۔ خود لفظ اللہ سے شروع نہیں کرتا کیونکہ کسی کام کے اختتام اور نیک سر انجام کے لئے ذاتِ مقدس تو کجا صرف ذات مقدس کا نام ہی کافی ہے۔ تو خیال کرو کہ جس ذات کے پاک نام میں اس قدر برکت ہو۔ وہ ذات خود کس قدر بابرکت و باعظمت ہوگی۔ اور جب ایک کام صرف نامِ باری کیساتھ متصل ہونے سے بابرکت ہو جاتا ہے۔ تو پھر وہ انسان جو خود ذاتِ باری سے واصل ہو جائے۔ اس کے یمن و برکت اور فیض وافاضہ کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اے عزیز اگر تجھے کوئی ایسا واصل انسان ملے۔ تو اس کے وجود کو کیمیا سمجھ کر اس سے لگ جا اور پھر دیکھ کہ تیرے وجود کا زنگار آلود لوہا کس طرح زرِ خالص میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

گر تو چاہے وصلِ حق اے بیخبر   کاملوں کا خاکِ پا ہو سر بسر
جب تلک ان کا نہ ہوگا خاکِ پا   رازِ حق ہر گز نہ ہو گا تجھ پہ وا
ان کے ظاہر پر نہ کر ہر گز نظر   نورِ باطن ان سے حاصل کر پسر

انسان کا اللہ کے ساتھ اور اللہ کا انسان کیساتھ عاشق اور معشوق ہونے کا لطیف فرق:

لیکن یہ بھی یاد رہے۔ کہ انسان کا واصل باللہ ہونا یعنی انسان کا اللہ کے ساتھ ہونا اور اللہ کا انسان کے ساتھ ہونے میں ایک دقیق فرق ہے۔ جب انسان اللہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ تو انسانی درجۂ عاشقی میں اور ذاتِ باری درجۂ معشوقیت میں ہوتی ہے۔ اور انسان کی ایک عاشق کی طرح آزمائش کی جاتی ہے۔ اس پر مصیبتوں کے پہاڑ توڑے جاتے ہیں۔ اور اسے طرح طرح کی تکلیفوں میں مبتلا کر کے اس کے عشق کو پرکھا جاتا ہے۔ لیکن جب عاشق تمام مصیبتوں اور دکھوں کو خوشی سے برداشت کرتا ہے۔ اور معشوق کی رضامندی میں اپنی رضا سمجھتا ہے۔ تو اب درجہ عاشقیت سے ترقی کر کے درجہ معشوقیت کو حاصل کر لیتا ہے۔ اور

"عشق اول در دل معشوق پیدا میشود"

یعنی وہ پہلا عشق جو عاشق کے دل میں تھا اب معشوق کے دل میں پیدا ہو جاتا ہے۔

کے مقولہ کا صدق ظاہر ہو جاتا ہے۔ اور اس وقت ذات باری خود انسان کے ساتھ ہو جاتی ہے۔ اور جس طرح

عاشق معشوق کے تمام ناز برداشت کرتا ہے اور اس کی خواہشات و مطلوبات کو پورا کرنا نہایت ضروری سمجھتا ہے اسی طرح اللہ جل شانہ بھی اس وقت اس معشوق کی تمام باتوں کا خیال فرماتے ہیں۔ اور اسے تکلیفات و مصائب سے بچا کر محبت و عظمت کے تخت پر بٹھاتے ہیں۔ اسی واسطے بابا فرید صاحب علیہ الرحمۃ فرمایا کرتے تھے کہ کبھی ہم خدا کا حکم مانا کرتے تھے اور ان کی مرضی کے مطابق اطاعت کیا کرتے تھے۔ مگر آج رب العزت خود ہماری مرضی اور خواہش کو پورا فرماتے ہیں۔ اور خواجہ معین الدین اجمیری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ کبھی وہ زمانہ تھا کہ ہم خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے۔ مگر آج وہ زمانہ ہے۔ کہ خانہ کعبہ خود ہمارا طواف کرتا ہے۔ یہ کیا ہے۔ یہ ہی درجۂ عاشقی کا معشوقی میں تبدیل ہونا یا انسان کا خدا کے ساتھ ہونے کی بجائے خدا کا انسان کے ساتھ ہو جانا ہے۔

رجوع بمطلب:

بائے اور اللہ کے درمیان لفظ اسم کو داخل کرنے کی ایک وجہ بیان ہو چکی ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے۔ کہ اگر بائے اور اللہ کے درمیان اسم کو نہ لایا جاتا تو باللہ الرحمن الرحیم ہوتا تو باللہ کلام عربی میں قسم کے لئے ہوتا ہے۔ تو معنی یوں ہو جاتے کہ قسم ہے اللہ کی جو رحمن اور رحیم ہے۔ تو گویا اسے قسم اور استعانت میں فرق رکھنے کے لئے لایا گیا۔

اللہ اسم اعظم:

اب اس کے بعد لفظ اللہ آتا ہے۔ اللہ باری تعالیٰ کا اسم ذاتی ہے اس کے علاوہ باقی جس قدر نام ہیں سب کے سب صفاتی ہیں۔ یہ نام نہ تو اسلام میں اور نہ اسلام سے پہلے کبھی باطل معبودوں کے لئے مستعمل ہوا ہے اور پھر یہ بھی عربی کی خصوصیت دیکھو۔ کہ اس کے سوا دنیا کی کسی اور زبان میں اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام نہیں پایا جاتا۔ جس قدر دوسری زبانوں میں خدا کے نام پائے جاتے ہیں۔ وہ سب کے سب صفاتی ہیں۔ اور چونکہ یہ ذاتی نام ہے اس لئے کثیر فقراء و اولیاء سے اس نام کا ''**اسم اعظم**'' ہونا منقول ہے اور اسمِ اعظم کی خاصیت یہ ہوتی ہے کہ اس کے توسط سے دعا میں قبولیت پیدا ہو جاتی ہے۔

دعا کی قبولیت پر ایک اعتراض اور اسکا جواب:

آپ اس سے شاید یہ اعتراض کر بیٹھیں کہ ہم اپنی دعاؤں میں روز ایک دفعہ نہیں بلکہ سینکڑوں دفعہ اللہ کا نام لیتے ہیں۔ مگر پھر بھی ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں۔

کیونکہ جس طرح دوا کے لئے شرطیں ہوتی ہیں۔ آپ مثلاً ایک اعلیٰ قسم کا کشتہ کھائیں۔ کھلانے والے حکیم صاحب تمہیں کہیں کہ دیکھنا صاحب کھٹائی مرچ اور تیل سے پرہیز کرنا۔ ارہر کی دال کے ساتھ چپاتی کھانا، گرآپ حکیم کی ایک بات پر بھی عمل نہیں کرتے۔ آپ کھٹائی بھی کھاتے ہیں۔ مرچ بھی کھاتے ہیں۔ اور پھر آخر میں کشتہ کے مفید نہ ہونے کا شکوہ کرکے حکیم صاحب کو بدنام کرتے ہیں۔ تو اس میں اب نہ تو غلطی حکیم صاحب کی ہے۔ اور نہ کشتے کا قصور ہے بلکہ سب کی سب غلطی تمہاری اپنی ہے اگر آپ کشتے کو حکیم صاحب کی ہدایت کے مطابق استعمال کرتے اور پھر اثر نہ ہوتا۔ تو آپ کی شکایت بجا ہوتی۔ اسی طرح دعا کے لئے بھی چند ہدایتیں اس حکیمِ بے مثال نے دی ہیں۔ ان کے عمل کے بغیر دعا میں اسمِ اعظم کا داخل کرنا کچھ مفید ثابت نہیں ہوسکے گا۔ استجابتِ دعا کے لئے سب سے پہلی شرط اکلِ حلال ہے۔

حضور سرورعالم ﷺ فرماتے ہیں!

الدعاء مفتاح باب السماء وأسنانه لقمة الحلال

(روح البیان: جلد ۱، سورہ البقرہ، صفحہ ۲۴۲، داراحیاء التراث العربی بیروت)

(غرائب القرآن ورغائب الفرقان: جلد ۱، سورہ البقرہ، صفحہ ۵۰۹، دارالکتب العلمیہ بیروت)

یعنی دعا آسمان کی کنجی ہے مگر اس کنجی کے دندانے حلال کے لقمے ہیں۔

واخر شرائطه اصلاح الباطن و الخلوص“

اور دعا کی قبولیت کی آخری شرط یہ ہے کہ داعی کا باطن صاف اور اس کی دعا خلوص سے بھری ہوئی ہو۔

گر خورد لقمہ از اکلِ حلال

نور تابد بر دل از مہرِ کمال

اگر کوئی ایک لقمہ حلال کا کھائے تو پھر اس کا دل روحانیت کے چاند سے روشن ہوجاتا ہے۔

جو شخص بھی ہدایتِ خداوندی کے مطابق دعا کرے گا۔ اس کی دعا کا تیر ضرور ہی ہدفِ اجابت **(قبولیت کی**

نشانی) پر لگے گا مگر رزقِ حلال ۔ حضورِ قلب اور خلوصِ باطن کے سوا اسمِ اعظم کو شامل کر کے شور مچانا ایسا ہے۔ جیسے غافل چوکیدار رات کو شور مچاتا ہے۔ اس کے شور سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ جاگ رہا ہے۔ مگر اس کا دل غفلت کے باعث کہیں کا کہیں پھر رہا ہوتا ہے۔ تو گویا بلا شرائط کے دعا کرنے والے چوکیدار کی شب بیداری کی طرح داعیوں کی فہرست میں تو داخل ہو جاتا ہے۔ مگر جیسے اس کی شب بیداری اہل اللہ جیسی نہیں ہوتی۔ کہ جن کی بیداری کی وجہ سے رحمتِ الٰہی کی بارش برسائی جاتی ہے۔ اسی طرح اس داعی کی دعا بھی بلا نتیجہ وانجام ہی رہتی ہے۔

رحمت کی بارش اور اس پر مثنوی کے اشعار:

میں نے یہ کہا ہے کہ اہل اللہ جب رات کو جاگتے ہیں تو ان پر رحمتِ خداوندی کی بارش ہوتی ہے۔ اور یہ کچھ استعارہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ لکھا ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی صحابی کے جنازے میں تشریف لے گئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سر باندھنے کا رومال اپنے سر پر باندھا۔ رومال باندھنے کے بعد آپ نے دیکھا کہ نہایت باریک پھوار برس رہی ہے۔ چنانچہ آپ کو خیال ہوا کہ حضور تو سب بھیگ جائیں گے۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس گھر تشریف لائے تو آپ فوراً حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس گئیں اور کپڑوں کو محسوس کرنے لگیں کہ آیا زیادہ بھیگ گئے ہیں یا معمولی۔ مگر آپکی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی۔ جب کہ آپ نے دیکھا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مبارک لباس بالکل خشک ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا اے عائشہ رضی اللہ عنہ تو تعجب سے میرے کپڑوں کو کیوں ٹٹول رہی ہے۔ بی بی صاحبہ نے عرض کی کہ حضور باہر تو بارش ہو رہی ہے آپ باوجود باہر سے آنے کے کچھ بھیگے نہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے عائشہ رضی اللہ عنھا تو نے کیا دوپٹے کے نیچے بھی کچھ سر پر باندھا ہوا ہے۔ بی بی صاحبہ نے عرض کی کہ اور تو کچھ نہیں آپ کے سر پر باندھنے کا رومال ہے۔ بالوں کو تیل لگایا تھا۔ اس لئے آپ کا مستعمل رومال دوپٹہ کو بچانے کے لئے باندھ لیا۔ آپنے فرمایا۔ تو اے عائشہ پھر یہ اسی رومال کی برکت ہے کہ ناسوتی پردوں کو بالکل تیری آنکھوں سے اٹھا دیا گیا۔ اور آج میرے صحابی کی موت کی وجہ سے جو بارانِ رحمت کا نزول ہو رہا ہے۔ وہ تو نے دیکھ لیا ہے۔ اے عائشہ یہ عام بارش نہیں بلکہ یہ رحمت کی غیر محسوس بارش ہے۔ جسے وہی دیکھ سکتے ہیں۔ جن کی باطنی حسیات اس قدر طاقتور ہو جائیں کہ جو ناسوتی

پردوں کو پھاڑ کر عالمِ ملکوت کی سیر کر سکیں۔

چنانچہ میرے کہنے کا مطلب یہ تھا کہ رحمت کی بارش کچھ مجازی الفاظ نہیں بلکہ حقیقت سے بھرے ہوئے ہیں۔ ہاں اس کی حقیقت کو کاملین ہی سمجھ سکتے ہیں۔

مولانا روم صاحب باران رحمت کے واقعہ کو اشعار میں یوں بیان فرماتے ہیں۔

چوں زگورستان پیغمبر باز گشت　　سوئے صدیقه شدو ہمراز گشت

چشم صدیقه چوبروئش فتاد　　پیش آمد دست بردے مے نہاد

بر عمامه بر رخ دبر موئے او　　بر گریبان و بر بازوے او

گفت پیغمبر چه مے جوئی شتاب　　گفت باراں آمد امروز از سحاب

جا مہایت مے بجویم در طلب　　ترنمے بینم زباراں اے عجب

گفت چه بر سر فگند ی از ازار　　گفت کردم آں ردائے تو خمار

گفت بہر آں نمود اے پاک حبیب　　چشمِ پاکت راخدا بارانِ غیب

نیست آں باراں ازیں ابرِشما　　ہست ابرِ دیگر و دیگر سماء

ایں چنیں باراں زابرِ دیگرست　　رحمتِ حق در نزولش مضمرست

یعنی جب پیغمبر علیہ السلام قبرستان سے واپس تشریف لائے تو حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے پاس آ کر باتیں کرنے لگے۔ حضرت صدیقہ کی نگاہ جو آپ کے چہرہ مبارک پر پڑی۔ تو قریب آ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرے پر ہاتھ رکھا پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پگڑی، منہ، بال، گریبان اور بازوؤں پر ہاتھ پھیرنے لگیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پوچھا کہ اے حمیرا تم کیا دیکھتی ہو۔ بی بی صاحبہ نے عرض کی۔ حضور آج بارش ہوئی ہے۔ مگر تعجب ہے کہ آپکے کپڑے نہیں بھیگے۔ آپ نے فرمایا کہ اے عائشہ تو نے سر پر کون سا کپڑا اوڑھا ہوا ہے۔ عرض کی کہ آپ کی چادر کا سر بند بنایا تھا۔ اس پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اے عائشہ پھر یہی وجہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نے تیری پاک آنکھوں پر بارانِ غیب کو ظاہر فرمایا۔ ورنہ یہ بارش تمہارے اس ظاہری بادل سے کوئی تعلق نہیں رکھتی بلکہ اس کا ابر اور آسمان دوسرا ہی ہے۔ ایسی بارش ایک دوسرے بادل سے نازل ہوتی ہے اور اس میں رحمتِ

حق تعالیٰ مضمر اور پوشیدہ ہوتی ہے۔

اللہ کے حروف کے متعلق ایک لطیف نکتہ:

اس کے علاوہ اللہ کے اسم میں ایک اور ایسی خوبی پائی جاتی ہے کہ وہ خوبی کسی اور خدائی اسموں میں نہیں پائی جاتی اور وہ خوبی یہ ہے کہ اللہ کا ایک ایک جزو یا ایک ایک حرف ذاتِ باری پر دلالت کرتا ہے۔ مثلاً اگر اللہ سے الف کو دور کر دو تو باقی رہا ہوا لفظ بھی باری تعالیٰ کے لئے بولا جاتا ہے۔

چنانچہ قرآنِ پاک میں! لِلّٰهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ۔ (البقرۃ: ۲۸۴)

اب الف کے ساتھ اگر ایک لام کو بھی دور کر دو تو باقی لَہٗ رہ جاتا ہے۔ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کے لئے قرآنِ پاک میں استعمال ہے۔ جیسے

”لَهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ“ (طٰہٰ: ۶)

اب اگر الف لام کے ساتھ دوسرا لام بھی ہٹا لیا جائے تو وہ باقی ”ہٗ“ رہ جاتا ہے۔ اور یہ ”ہٗ“ بھی اللہ رب العزت کے لئے قرآنِ پاک میں آتا ہے جیسے!

”هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ“ (البقرۃ: ۲۹)

تو یہ نکتہ بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ ہو نہ ہو اللہ ہی اسم اعظم ہے۔ ساتھ ہی کسی صفاتی نام میں اتنا زیادہ اثر نہیں۔ جتنا اس میں پایا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص روزانہ اسم اللہ کا ایک ہزار دفعہ ورد رکھے اور قریباً چالیس روز تک پابندی کرے۔ تو انشاء اللہ وہ اس قلیل عرصہ میں اس کا اتنا زیادہ اثر محسوس کرے گا کہ دوسرے اسماء کے ورد پر سالوں مواظبت (ہمیشگی) کرنے پر بھی یہ چیز نہ حاصل کر سکے گا۔

تنبیہ:۔

”**اللّٰهٗ**“ یعنی الٹی پیش کے ساتھ یہ جلالی رنگ ذاکر میں پیدا کر دیتا ہے۔ اور ”**اللّٰهُ**“ یہ جمالی ہے۔ اور ذاکر پر بھی جمالی رنگ چڑھاتا ہے۔ جلالی اسم کا ذکر کرنے سے غصہ، وحشت اور اہل وعیال سے انقطاع کا جذبہ پیدا ہوتا ہے اور دنیوی معاملات سے دل سرد پڑ جاتا ہے۔ مگر اللہُ کے جمالی ذکر سے نہ تو دنیوی کاروبار میں فرق آتا ہے۔ اور نہ اہل وعیال سے متنفر ہوتا ہے۔ بلکہ دنیا کے اشتغال کے ساتھ ساتھ ہی

قربِ خداوندی بھی پیدا ہوتا جاتا ہے۔ اس واسطے عام لوگوں کو جمالی اسم کا ہی ورد رکھنا چاہیئے۔ ہاں خواصِ جلالی کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ مولانہ رومی فرماتے ہیں۔

اللہ اللہ اسمِ ذاتِ پاک دوست　　　اسمِ اعظم از برائے قربِ اوست
اللہ اللہ ایں چہ نامِ خوش مذاق　　　حرف حرفش مے دہد جاں را رواق

یعنی اللہ ذات باری کا نام ہے۔ اور اس کا قرب اور وصال حاصل کرنے کے لئے اسم اعظم ہے۔ اللہ اللہ یہ کیا خوش ذائقہ نام ہے کہ اس کا ہر ہر حرف جان کر ترقی دیتا ہے۔

کلمہ اللہ کے حروف سے بنا ہے:

اس کے علاوہ کلمہ کے حصہ توحید یعنی لاالہ الا اللہ کو لو یہ سب بارہ حروف ہیں۔ اس میں سے اگر لفظ اللہ کے حروف کہ الف لام اور ہائے ہیں۔ نکال دئے جائیں تو کلمہ کی یہ جزو بھی نہ رہے گی۔ اور دوسری جزو کہ حصہ رسالت ہے۔ یعنی محمد رسول اللہ وہ اس جزو پر موقوف ہے۔ اگر کوئی شخص جزو اوّل کو نہ مانے تو دوسرے جزو کا ماننا یا نہ ماننا سب برابر ہوتا ہے تو گویا اسلام کا بنیادی پتھر کہ کلمہ کا مفہوم ہے۔ اس کا ترکب بھی لفظ اللہ ہی سے ہوتا ہے۔ اس سے بھی اشارۃً یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ تمام اسمائے حسنیٰ میں اللہ ہی اسم اعظم ہے۔ جس پر اسلام کی عالی شان عمارت کو عقیدۃً قائم کیا گیا ہے۔

چلہ اور اس میں چالیس دن کی قید:

اطباء کہتے ہیں کہ انسان جو کچھ بھی کھائے چالیسویں دن وہ چیز جزو بدن ہو جاتی ہے۔ اور جو کام بھی کرے چالیس دن متواتر کرنے سے وہ عادت بن کر فطرت ثانیہ بن جاتا ہے۔ اسی طرح جب کسی ورد و وظیفہ کو چالیس دن تک اس کی تمام شرائط کے ساتھ پڑھا جاتا ہے۔ تو وہ چیز رگ و پے میں سرایت کر کے اپنا اثر ظاہر کر دیتی ہے۔ اسی واسطے حضور ﷺ نے فرمایا ہے!

”مَنْ اَخْلَصَ لِلّٰہِ الْعِبَادَۃَ اَرْبَعِیْنَ یَوْمًا ظَھَرَتْ یَنَابِیْعُ الْحِکْمَۃِ مِنْ قَلْبِہٖ عَلٰی لِسَانِہٖ۔
(الزھد لابن مبارک: رقم: ۱۰۱۴، باب، فضل ذکر اللہ، دار الکتب العلمیہ بیروت)

یعنی جو شخص خالص اللہ کے لیے چالیس دن تک عبادت کرتا ہے۔ اس کے دل اور زبان سے حکمت کے

چشمے پھوٹ نکلتے ہیں۔

شیخ سعدی نے گویا اسی حدیث شریف کی تشریح ان اشعار میں فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں ع

شنیدم رہر وے درسر زمینے ہمے گفت ایں معما با قیرینے
کہ اے صوفی شراب انگہ شود صاف کہ درشیشہ بما ندار بعینے

میں نے کسی کو یہ راز کہتے سنا کہ انگور کی شراب کو چالیس دن کسی شیشہ میں رکھو تو یہ صاف ہو جاتی ہے۔

تو پتہ چلا کہ اگر انگور کی شراب چالیس دنوں میں صاف ہو جاتی ہے تو اسی طرح اگر چالیس دن تک اپنے جسم کی شراب کو انسان گوشۂ خلوت میں بند رکھے تو اس شراب کا بہت کچھ تصفیہ اور تزکیہ ہو جاتا ہے اسی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ اسلام کو کوہ طور پر تیس دن پورے کرنے کے بعد دس دن اور ٹھہرا کر چلہ پورا کرایا گیا۔ چنانچہ قرآن پاک میں وارد ہے!

”وَوٰعَدْنَا مُوْسٰی ثَلٰثِیْنَ لَیْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِیْقَاتُ رَبِّهٖۤ اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً“

(اعراف:۱۴۲)

اور ہم نے موسیٰ سے تیس رات کا وعدہ کیا اور ان کا اتمام دس اور کے ساتھ کیا پس اس کے ربّ کا مقررہ کردہ وقت چالیس رات پورا ہو گیا۔

اس سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ پھر تو اللہ تعالیٰ نے وعدہ خلافی فرمائی کہ وعدہ تو تیس رات کا کیا اور رکھا چالیس رات تک۔ کیونکہ سورہ بقرہ میں صاف فرما دیا ہے!

”وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰۤی اَرْبَعِیْنَ لَیْلَةً“ (البقرة:۵۱)

یعنی جب ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے چالیس رات کا وعدہ کیا۔

تو معلوم ہوا کہ دل ہی سے وعدہ تو چالیس رات کا تھا۔ اور پورا بھی چالیس رات کو ہی کروایا۔ اس جگہ صرف ان چالیس راتوں کو ایک مہینہ اور دس دن کی صورت میں تعبیر کر کے بتایا ہے۔ اور اس سے امت محمدیہ کو ایک نہایت لطیف راز کی طرف اشارہ فرمایا کہ رمضان کی تیس راتوں کے بعد دس ذی الحجہ کی بھی ملا کر سال میں کم از کم عبادت و طاعت کا یہ چلہ پورا کر لیا کرو۔ تا کہ حق تعالیٰ کے ساتھ عبودیت کا رابطہ مضبوط

رہے۔

اس کے علاوہ بعض کتابوں میں یہ دس دن بڑھانے کی وجہ یوں بھی لکھی ہے کہ آپ نے تیس دن کے کامل ہونے پر مخاطبتِ الٰہیہ سے پہلے منہ کی بو کو دور کرنے کے لئے مسواک فرمائی اور چونکہ بمطابق حدیث پاک:

”رِيحَ فَمِ الصَّائِمِ أَطْيَبُ عِنْدَ اللهِ مِنْ رِيحِ الْمِسْكِ“

(معجم الکبیر: الجز ۳، رقم: ۲۸۸، مکتبہ ابن تیمیہ قاھرہ)

(معجم الصحابۃ: جلد ۲، صفحہ ۴۳، دار البیان الکویت)

(معرفۃ الصحابۃ: جلد ۲، صفحہ ۸۰۰، دار الوطن للنشر الریاض)

روزہ دار کے منہ کی بو اللہ تعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے زیادہ پسندیدہ ہے۔

اس واسطے اس بو کو دوبارہ پیدا کرنے کے لئے دس دن مزید ٹھہرنے کا حکم دیا گیا۔ اس تفسیر کے مطابق پھر یہ آیت ہمارے مطلب کیساتھ پوری چسپاں نہ ہوگی۔ تاہم اتنا تو پھر بھی ظاہر ہوگا کہ چلہ کشی کے لئے چالیس دن کا تعین بڑی حکمت اور راز سے بھرا ہوا ہے۔

اَلرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم کی تفسیر:

رحمن اور رحیم دونوں کا معنی ہے۔ رحمت کرنے والا۔ مگر رحمن کے معنی عموماً رحمان الدنیا یعنی دینا میں رحم کرنے والا اور رحیم کے رحیم الآخرۃ یعنی آخرت میں رحم کرنے والا لئے جاتے ہیں۔ رحمتِ رحمانی رحمتِ رحیمی سے بہت وسیع اور زیادہ ہے۔ یہی رحمتِ رحمانی انسان کی پیدائش کا باعث ہوئی اسی رحمتِ رحمانی کے باعث انسان کی پیدائش سے پہلے اس کے لئے ضروری سامان مہیا کر دیا گیا۔ یہ رحمت ایسی ہے جیسے دریا یا سورج کی رحمت جو بلا لحاظ مذہب وملت بلا قید رنگ وقوم فائدہ پہنچاتی ہے اسی طرح رحمت رحمانی بھی کافر و مسلم فرمانبردار اور عاصی سب پر شامل وحاوی ہے رحمت رحمانی کو امتنانی بھی کہا جاتا ہے کیونکہ منت کہتے ہیں احسان کو اور یہ رحمت بھی محض احسان ربی ہے کہ اوّل تو اسے پیدا فرمایا اور پھر اسے گوناگوں نعمتوں سے نوازا۔ مولانا روم فرماتے ہیں۔

ما نبودیم و تقاضا ما نبود
لطفِ تُو نا گفتۂ ما مے شنود

یعنی اے رب ہمارا نام ونشان تک نہ تھا۔ اور نہ دنیا میں ہمارا آنے کا کوئی تقاضا اور اصرار تھا۔ مگر آپ کی بیکراں رحمت نے ہماری نہ کہی ہوئی باتیں سن کر ہم پر طرح طرح کی مہربانیاں فرمائیں۔ ورنہ ہمارا کچھ قرض نہ تھا۔ کہ ہم پر آپ ضرور یہ نوازشیں فرماتے۔ یا آپ کوئی معمولی ہستی نہ تھے کہ ہم مجبوروں سے آپ مجبور کئے جا سکتے۔

رحمتِ خداوندی پر شبہ اور اس کا ازالہ:

اگر کسی شخص کے دل میں یہ شبہ گزرے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت میں عدل و انصاف نہیں۔ کیونکہ بعض کو مالدار اور بعض کو غریب بعض کو اندھا اور بعض کو بینا۔ بعض کو توانا اور بعض کو مریض بنا کر ایک ہی قسم کی مخلوق کے درمیان اس قدر فرق کر دیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ ہم پہلے کہہ چکے ہیں کہ انسان پر یہ جس قدر نوازشات ہیں یہ سب کی سب اللہ رب العزت کی مہربانیاں ہیں ہمارا اس پر کچھ قرض نہیں کہ وہ ہم کو ضرور ہی وہ چیز دے جو اس نے دوسرے کو دی ہے۔ مثلاً ایک سخی ایک سائل کو پچاس روپے دیتا ہے اور دوسرے کو پچاس آنے تو دوسرے سائل کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ جبراً اس کریم سے دوسرے سائل جتنا وصول کرنے کا تقاضا کرے۔ کیونکہ وہ ان کا کچھ قرضدار تو ہے نہیں۔ بلکہ یہ اس کا محض احسان ہے۔ بعینہ اللہ تعالیٰ کا دنیا میں بعض لوگوں کو بعض دنیوی لذتوں سے محروم رکھنا۔ بعض کو تھوڑا سا حصہ دینا اور بعض پر بہت کچھ نوازش فرمانا۔ کسی کو لنگڑا کرنا کسی کو بھینگا اور کانا بنانا یہ سب کچھ اس کی مرضی پر منحصر ہے۔ کسی انسان کو اس داد و ستد (**انصاف**) میں کسی قسم کی چوں و چرا کرنے کا حق نہیں پہنچتا وہ چاہے جو دے اور چاہے جو لے اس کی ذات:

”فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ“ ہے۔ (البروج:۱۶)
ہمیشہ جو چاہے کر لینے والا۔

گِل را چہ مجال ست کہ گوید بکلال
از بہرچہ سازی و چرامے شکنی

مٹی کی کیا مجال کہ وہ برتن بنانے والے سے کہے کہ تو کس لیے بنا رہا ہے اور کیوں بنا کر توڑ رہا ہے

ہاں اللہ تعالیٰ اگر محض صفت رحمانی پر اکتفا کرتے۔ تو اس کا مطلب تو یہ ہوتا۔ کہ پھر نیکیوں کی عبادتوں اور بروں کی برائیوں میں کسی قسم کا فرق نہیں جس طرح چاہے دنیا میں زندگی گزارے نہ نیکی کا ثواب ہے اور نہ بدی کا عذاب لیکن اگر چہ رب العزت نے:

”مَّا تَرَىٰ فِي خَلْقِ الرَّحْمَٰنِ مِن تَفَاوُتٍ“ (الملک: ۳)
تو اے دیکھنے والے تو رحمن کی پیدائش میں کوئی بے ضابطگی نہ دیکھے گا۔

فرما کر رحمتِ رحمانی کو مشرک و مسلم ہر دو کے لئے عام کر دیا ہے۔ اور صفتِ رحمانی ان میں کسی قسم کا فرق نہیں کرتی۔ مگر صفتِ رحیمی کو الرحمن کے ساتھ اسواسطے زیادہ کر دیا ہے۔ کہ یہ صفت آخرت میں مطیع و عاصی کے درمیان ضرور فرق کرے گی۔ اس صفت کا تقاضا یہ ہے کہ بروں کو برائی کی سزا دی جائے۔ اور نیکوں کو ان کی نیکی کی جزا۔ چنانچہ تسمیہ میں ان دونوں صفتوں کو اکٹھا لا کر بیان فرما دیا ہے کہ اگر صفتِ رحمانی کے دیئے ہوئے اسباب کو ٹھیک طور پر استعمال کیا تو صفتِ رحیمی کے نزدیک بھی قابلِ ستائش اور موردِ انعام ٹھہرو گے اور اگر صفتِ رحمانی کے عطا کردہ اسبابوں کو غلط طرح پر استعمال کیا۔ تو اس کا نتیجہ بھی آخرت میں بھگتنا پڑے گا۔

رحمن نام رکھنا:

تنبیہ۔

اسمِ رحمن اللہ جل شانہ کیلئے مخصوص ہے۔ غیر اللہ کے لئے سوائے اضافت کے استعمال نہیں کیا جاتا۔
اور جب غیر کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ تو عموماً رحمن کی میم کے بعد الف لکھ کر رحمان کی شکل میں جیسے رحمان الیمامہ میں میم کے بعد الف ہے۔ اور پھر رحمان کو یمامہ کی طرف مضاف کیا ہے۔ ”رحمان الیمامہ“ مسیلمہ کذاب کا لقب ہے۔ مگر رحیم ذات باری کے بغیر غیر اللہ کے لئے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ چنانچہ خود قرآن پاک نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رؤف رحیم کے لقب سے ملقب فرمایا ہے۔

بسم اللہ کے نکات وبرکات:

بسم اللہ الرحمن الرحیم میں اللہ تعالیٰ نے اپنے تین نام بیان فرمائے ہیں۔ ایک ذاتی اور دو صفاتی اللہ ذاتی ہے اور الرحمن اور الرحیم صفاتی ہیں۔ اگر غور کرو گے تو دنیا کی تمام چیزوں کا وجود انہی تین ناموں کی وجہ سے قائم ہے۔ کیونکہ کسی چیز کے وجود کے لیے تین باتیں ضروری ہوتی ہیں اوّل اسباب کا مہیا کرنا یعنی عدم سے وجود میں لانا دوسرے ان اسباب کا ابتدائے ضرورت سے انتہائے ضرورت تک باقی رکھنا تیسرے اسباب کے ذریعہ جو کام کیا گیا ہے اس سے کسی نتیجہ کا حاصل کرنا اگر سرے سے اسباب ہی نہ ہوں تو کام کبھی بھی نہ ہوگا۔ اور اگر اسباب تو ہوں مگر اثنائے استعمال میں فنا ہو جائیں تو بھی بیکار اور اگر اسباب بھی ہوں اور ابتدا سے انتہا تک باقی بھی رہیں مگر اس کا نتیجہ کچھ نہ نکلے تو یہ بھی بے سود۔ اسواسطے ان تینوں چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ اب تینوں چیزیں جو بقائے وجود کے لیے لازمی ہیں بسم اللہ الرحمن الرحیم کے تین ناموں اللہ الرحمن۔ الرحیم۔ کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں۔ کیونکہ اسباب کو عدم سے وجود میں لانا اسم اللہ کا خاصہ ہے اور اسباب کو باقی رکھنا صفتِ رحمانی کا مقتضی ہے۔ اور اسبابِ مستعملہ (دستیاب وسائل) پر نتیجہ کا مترتب کرنا صفتِ رحیمی کے متعلق ہے۔

اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے انسان کو سکھایا کہ تو اپنی تلاوت سے پہلے ان ناموں سے تمسک کر، تا کہ تیری تلاوت میں ان اسماء مبارکہ کا خاصہ ظاہر ہو اور تلاوت ہی پر کیا منحصر ہے مسلمانوں کو تو حکم ہے کہ ہر ایک کام بسم اللہ کہہ کر شروع کرو۔ تا کہ اٹھنا بیٹھنا۔ چلنا۔ پھرنا کھانا اور پینا غرضیکہ ہر کام ذاتِ باری کے سایۂ رحمت ہی کی ذیل میں شروع اور ختم ہو۔ مگر وہ مسلمان جنہیں رسول پاک ﷺ کا اسوۂ حسنہ!

”قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ“ (انعام: ۱۶۲)

تم فرماؤ بے شک میری نماز اور میری قربانیاں اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لئے ہے جو رب سارے جہان کا۔

کے رنگ میں سکھایا گیا تھا آج بھولے سے بھی اپنے کاموں میں بسم اللہ کو داخل نہیں کرتے اور یہی وجہ ہے کہ آج ان کے کام بے برکت ان کے افعال نا تمام اور ان کے اعمال ناقص ہو گئے ہیں۔

بسم اللہ کے ۱۹ حروف اور جہنم کے ۱۹ مؤکلات:

بسم اللہ کے ۱۹ حرفوں کا فلسفہ تفسیر کی کتابوں میں آتا ہے کہ بسم اللہ کے ۱۹ حروف ہیں۔ اور اسی طرح جہنم کے موکل بھی ۱۹ ہیں۔ تو جو شخص اٹھتے بیٹھتے ہر وقت بسم اللہ کا ورد رکھتا ہے۔ جہنم کے موکلین اس پر دوزخ کے دروازوں کو بند کر دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ رات دن میں چوبیس ساعتیں ہوتی ہیں۔ جوبیس میں سے پانچ کے مقابل میں تو شریعت نے پنجگانہ نماز قائم کی ہوئی ہے۔ مگر باقی کی ۱۹ ساعتوں کی عبادت کے لئے بسم اللہ کے ۱۹ حروف کفایت کر جاتے ہیں۔

بسم اللّٰہ شیطانی اذیت سے بچاتی ہے:

حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ تم میں سے جب کوئی پاخانہ جائے تو داخل ہونے سے پہلے اگر بسم اللہ پڑھے گا تو اس کے اور شیطان کے درمیان ایک آڑ ہو جائے گی۔ اور شیطان اسے کسی قسم کی اذیت نہ دے سکے گا۔ تو بھائیو غور کرو۔ جب بسم اللہ دنیا میں شیطان اور اس کی اذیت سے حضور سرور عالم ﷺ کے قول کے مطابق آڑ بن سکتا ہے تو آخرت میں پھر کیسے جہنم اور اس کے پڑھنے والے کے درمیان آڑ نہ بنے گا۔

کشتیِ نوح علیہ السلام کی نجات کا باعث بسم اللّٰہ ہی تھی:

یہ وہ بسم اللہ ہے جس کی برکت کی وجہ سے نوح علیہ السلام کی کشتی کوہِ جودی پر جا لگی۔ کیونکہ جب آپ سوار ہوئے تھے۔ تو آپ نے فرمایا تھا!

”بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّیْ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۝ (سورہ ہود:۴۱)

اللہ کے نام پر اس کا چلنا اور اس کا ٹھہرنا بیشک میرا رب ضرور بخشنے والا مہربان ہے۔

دیکھئے حضرت نوح علیہ السلام کی دعا میں پوری بسم اللہ بھی نہیں آدھی ہے۔ مگر اس آدھی نے بھی آپ کو اتنے طوفان سے صحیح وسلامت پار اُترنے میں پوری پوری مدد دی۔ تو جو شخص پوری بسم اللہ کو ورد میں رکھے تو یہ عظیم البرکت چیز کیسے نہ اسے دنیا و آخرت کے ورطہ میں مخذول ومخجول (ذلیل وشرمندہ) ہونے سے بچائے گی۔

عمل:

اسی واسطے بعض اوراد کی مستند کتابوں میں آیا ہے کہ جو شخص بعد نماز فجر ۷ دفعہ روزانہ بسم اللہ شریف

کاوردرکھے گا۔ وہ انشاء اللہ ضرور ہی دنیاو آخرت کی مصیبتوں سے محفوظ رہے گا۔

کفن پر بسم اللہ لکھنا اور اس کا شرعی حکم:

بعض بزرگان دین نے انتقال فرماتے وقت کفن پر بسم اللہ لکھنے کی وصیت کی اور بعد کے اولیاءنے انہیں کشفی طور پر دیکھا کہ ان کو اس وصیت سے بہت کچھ فائدہ حاصل ہوالیکن اس میں یہ بات یادرکھنے کے قابل ہے کہ کفن پر اگر بسم اللہ لکھی جائے۔ تو صرف انگلی سے ہوائی حروف لکھ دینا کافی ہیں۔ کیونکہ سیاہی یا مٹی سے باقاعدہ مستقل حروف لکھنا۔ مردے کے پھٹنے پھولنے کے بعد۔ اسماء الٰہیہ کے ملوث ہو کر بے ادبی ہونے کا خطرہ ہوتا ہے۔ احکم الحاکمین تو ہمارے خیالی و وہمی حروف کو بھی پڑھ سکتا ہے۔ اس کی ذاتِ اقدس کے سامنے سیاہی اور ہوائی حروف سب برابر ہیں۔

ایک حدیث اور اس پر ایک حکایت:

حدیث میں آیا ہے کہ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے ایک شخص نے بغیر بسم اللہ کہے کھانا شروع کیا۔ تھوڑا کھا چکنے کے بعد جب بسم اللہ یاد آیا۔ تو فوراً اس نے کہا ”بِسۡمِ اللّٰهِ فِیۡ اَوَّلِهٖ وَآخِرِهٖ“ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے ہنس پڑے اور فرمایا کہ شیطان تمہارے ساتھ کھانے میں شریک تھا۔ مگر تمہارے بسم اللہ کہنے سے اس نے کھایا ہوا بھی قے کر دیا۔

(المستدرک: جلد ۴، رقم: ۷۰۸۹، کتاب الاطعمة، دار الکتب العلمیہ بیروت)

(مسند احمد: جلد ۳۱، رقم: ۱۸۹۶۳، حدیث اُمیة بن مخشی، موسسة الرسالة)

(معجم الکبیر: جلد ۱۰، رقم: ۱۰۳۵۴، مکتبة ابن تیمیة)

اس پر مجھے ایک حکایت یاد آگئی۔ کہتے ہیں کہ ایک دفعہ دو شیطانوں کی آپس میں ملاقات ہوئی ایک نہایت وبلا کانحیف اور کمزور۔ دوسرا خوب موٹا اور فربہ۔ موٹے نے پتلے سے پوچھا۔ کہ بھائی سناؤ تمہارا کیا حال ہے۔ کیا کوئی دق یا سل کی مرض کا شکار ہو گئے کہ روزانہ سوکھ سوکھ کر کانٹا ہوتے جاتے ہو۔ اس نے کہا بھائی صاحب نہ دق ہے نہ سل۔ بات یہ ہے کہ جس شخص کے ساتھ مجھے لگایا گیا ہے۔ وہ ہر ایک کام شروع کرتے وقت بسم اللہ کہتا ہے۔ جس کی وجہ سے اس میں اور مجھ میں آڑ ہو جاتی ہے۔ اس واسطے میں اس کی

نعمتوں سے کچھ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ وہ کھاتا ہے تو بسم اللہ۔ پیتا ہے تو بسم اللہ سوتا ہے تو بسم اللہ پہنتا ہے بسم اللہ غرضیکہ ہر ایک کام اور بات میں بسم اللہ اس کا تکیہ کلام ہے۔ جس کی وجہ سے میں اس کے طعام و رزق سے محروم رہ جاتا ہوں۔ دوسرے نے کہا۔ بھائی ہمارا دوست تو کبھی بھولے سے بھی بسم اللہ نہیں کرتا۔ اس واسطے ہم تو ایک شریک کی طرح اپنا حصہ بانٹ لیتے ہیں۔

بیوی کے پاس جاتے وقت کیا پڑھے:

اسی واسطے حدیث شریف میں آیا ہے۔ کہ جب تم سے کوئی اپنی بیوی کے پاس جائے تو بسم اللہ الرحمن الرحیم کے بعد کہے:

’’اَللّٰھُمَّ جَنِّبْنَا الشَّیْطَانَ وَجَنِّبِ الشَّیْطَانَ مَا رَزَقْتَنَا‘‘

(صحیح بخاری: جلد ۱، کتاب بدا الوحی، رقم: ۱۴۱، باب التسمیۃ علی کل حال، دار الشعب القاھرۃ)

(صحیح مسلم: جلد ۴، رقم: ۳۰۰۶، باب ما یستحب ان یقولہ، دار الجیل بیروت)

تو شیطان کے اور اس کے درمیان پردہ ہو جاتا ہے اور اولاد صالح اور نیک پیدا ہوتی ہے۔

اولاد کو بسم اللہ سکھانے کا فائدہ:

کتابوں میں لکھا ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا ایک دفعہ ایک قبرستان سے گزر ہوا۔ تو دیکھا کہ ایک شخص پر نہایت شدت کے ساتھ عذاب کیا جا رہا ہے۔ لیکن جب چند دنوں کے بعد لوٹ کر پھر اسی قبرستان کے پاس سے گزرے تو اس شخص کو نہایت آرام اور راحت میں پایا آپ نے دربارِ خداوندی میں عرض کیا کہ یا الٰہی اس شخص کو اس آرام و آسائش میں کیوں تبدیل کیا گیا۔ وحی آئی اے روح اللہ مرتے وقت اس نے اپنی حاملہ عورت کو وصیت کی تھی کہ اگر بچہ صحیح و سالم پیدا ہوا اور وہ بولنا سیکھے تو سب سے پہلے اسے بسم اللہ الرحمن الرحیم سکھانے کی کوشش کرنا۔ چنانچہ اس کی عورت نے اس کی وصیت پر عمل کیا اور بچے نے آج چند دنوں سے صحیح طور پر بسم اللہ کہنی شروع کر دی ہے۔ اسلئے مجھے حیا آئی کہ ایک شخص جو ہماری محبت کی وجہ سے اپنے بیٹے کو سب سے پہلے ہمارا نام اور ہماری بات سکھانے کی وصیت کر کے آئے اور پھر اس کی وصیت کو پورا کیا جائے تو میں اسے کیسے عذاب میں مبتلا رکھوں۔ چنانچہ اے عیسیٰ ہم نے اس کو اس وصیت کی

خاطر معاف کر دیا۔

بسم اللہ شافی الامراض ہے:

بسم اللہ کے برکات کو ختم کرنے سے پہلے صولت فاروقی کے ایک واقعہ کو بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔ اور ان شاء اللہ اس کے بعد کوشش کرونگا کہ سورۂ فاتحہ کی تفسیر کا سلسلہ شروع ہو جائے۔

صولت فاروقی میں لکھا ہے کہ قیصر روم کو ہمیشہ سر کا درد رہتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اسے ایک سیاہ رنگ کی ٹوپی بھیجی جسے وہ جب تک پہنے رکھتا درد کا آرام رہتا۔ مگر جونہی اتارتا اسی وقت درد سر عود کر آتا۔ آخر کار اس نے خیال کیا کہ اسے اُکھیڑ کر دیکھنا چاہئے کہ اس کے اندر کیا ہے۔ جس کی وجہ سے ایسا شدید درد کہ جس کے علاج سے تمام اطباء اور ڈاکٹر تک لاچار ہیں فوراً مٹ جاتا ہے۔ چنانچہ جب اکھیڑا تو اندر سے ایک کاغذ نکلا۔ جس پر بسم اللہ الرحمن الرحیم لکھا ہوا تھا۔ سچ ہے۔

تسمیہ آمد علاجِ ہر مرض
شدروا ہر کس کہ خواند بر غرض

ترجمہ: بسم اللہ ہر مرض کا علاج ہے جو شخص جس غرض کے لیے پڑھے گا اس سے فائدہ حاصل کرے گا۔

نصیحت:۔

میرے عزیز بھائیو! اس سے زیادہ اس مقدس بسم اللہ کے فضائل اور کیا بیان کروں مختصر یہ سمجھو۔ کہ ایک ایسا خزانہ ہے۔ جو اُمتِ محمدیہ سے پہلے کسی اُمت کو نہ دیا گیا۔ اس خزانہ کو غنیمت سمجھو اور اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کرو۔ دریا کے کنارے پیاس سے مرنا حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ آج سے عہد کرلو کہ ہم اپنے ہر دنیا اور دین کے کام کو بسم اللہ سے شروع کریں گے اور پھر آزمائش کرلو کہ آپ کے کاموں میں اللہ تعالیٰ کیسے یمن و برکت کو پیدا فرماتے ہیں۔ اے اللہ ہم کو اس عہد کے باندھنے اور نباہنے کی توفیق عطا فرما۔ آمین۔

سورہ فاتحہ قرآن کا نچوڑ ہے:

جس طرح بسم اللہ الرحمن الرحیم تمام قرآن پاک کا خلاصہ و نچوڑ ہے۔ اسی طرح سورہ فاتحہ بھی تمام قر

آن کا خلاصہ ہے۔ ہاں بسم اللہ میں بہت ہی اجمال سے کام لیا گیا ہے۔ اور اس میں ذرا تفصیل کے ساتھ مطالب قرآنیہ کو بند کیا گیا ہے۔ اسی واسطے قرآن پاک میں تسمیہ کے بعد دوسرے درجہ پر سورۃ فاتحہ کو لایا گیا اور حضور ﷺ نے اسے ''اُم القرآن'' کا لقب عطا فرمایا ہے۔

سورۃ فاتحہ سورۃ المسئلہ ہے:

چونکہ انسان سراپا محتاج اور عاجز ہے۔ اسے قدم قدم اور چپہ چپہ پر تائیدِ غیبی کی ضرورت ہے۔ ورنہ اس کی زندگی کی گاڑی کا ایک منٹ کے لئے بھی چلنا مشکل ہے۔ اور تائیدِ غیبی کے حصول کے لئے اسے ہر وقت جنابِ باری میں سوال کرنے کی حاجت کا پڑنا ضروری ہے۔ مگر آپ جانتے ہیں کہ دنیا کے معمولی سے معمولی بادشاہوں کے پاس بھی عرضیاں ان کے مقررہ طریقوں پر بھیجی جاتی ہیں اور ان کے تخاطب کے لئے خاص خاص القاب اور خطاب ہوتے ہیں۔ بعض کے تو عرضی کرنے کے لئے چھپے ہوئے فارم ملتے ہیں۔ تاکہ عرضی کرنے والا کسی واجبی ادب میں کمی کر کے بجائے نوازش کے معتوبِ شاہی (**شاہ کے غصے کا نشانہ**) نہ بن جائے۔ اسی طرح جل شانہٗ بھی سورۂ فاتحہ میں بندوں کو اپنے القاب بتا کر عرضی کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ اسی واسطے حدیث شریف میں اس سورت کا ایک نام سورۃ المسئلہ بھی آیا ہے۔ یعنی سوال کرنے کی سورت۔

عرضی کے چار اجزا اور سورہ فاتحہ کا ان پر اشتمال:

یہ تو آپ کو معلوم ہی ہوگا کہ ہر عرضی یا خط میں چار چیزیں نہایت ضروری ہوتی ہیں۔ اور ان کے بغیر خط ناقص اور نامکمل کہلاتا ہے۔

(۱) سب سے پہلے جسے عرضی لکھی جاتی ہے اس کے ضروری القاب وخطابات کا خیال رکھا جاتا ہے۔

(۲) پھر ضروری آداب وکورنش کے بعد راقم مرقوم الیہ سے اپنا تعلق بیان کرتا ہے۔

(۳) پھر تیسرے درجہ پر عرضِ مدعا کیا جاتا ہے

(۴) اور سب سے آخر چوتھے درجہ پر فقط ''والسلام'' یا ''آداب'' یا اور کسی مناسب لفظ یا الفاظ پر عرضی کا خاتمہ کیا جاتا ہے۔

اسی طرح اس سورۃ المسئلہ میں بھی ان چاروں چیزوں کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ

الحمد سے لے کر مالک یوم الدین تک اللہ تعالیٰ کے القاب اور خطابات ہیں۔ پھر بندہ اللہ جل شانہ سے اپنا تعلقِ عبدیت ”اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ط“ میں ظاہر کرتا ہے۔

اس کے بعد ”اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ سے الضَّآلِّیْنَ“ تک اپنے مدعا اور مطلب کو دربارِ دُربار میں پیش کرتا ہے۔ اب چوتھے درجہ پر ”آمین“ کہہ کر زیادہ حدِ ادب یا فقط کی طرح عرضی کے مضمون کو ختم کر دیتا ہے۔ اور پھر مزا یہ کہ ہماری طرف سے عرضی کا ایک لفظ بھی نہیں بلکہ سب کا سب اس احکم الحاکمین کا سکھایا ہوا ہے۔

تو پھر جب اسکی سکھائی ہوئی درخواست پوری شرائط و آداب کے ساتھ جنابِ قدس میں گذاری جائے تو پھر قبولیت و استجابت میں کیسے اور کیوں شک ہو سکتا ہے۔ دیکھئے جب حضرت آدم علیہ السلام سے لغزش ہوئی تھی تو خود ہی انہیں سکھایا کہ اے آدم کہو:

”رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ“

اور پھر جب انہوں نے مالک الملک کے سکھائے ہوئے الفاظ دہرائے تو فوراً رحمت باری نے توجہ فرمائی اور فرمایا!

”فَتَلَقّٰى آدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمَاتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ“ (البقرۃ:۳۷)

یعنی آدم نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ لئے جس کی وجہ سے رب العزت نے رحم فرما کر معاف کر دیا۔

کیونکہ ان کی شان عالیشان درگذر ہی فرمانے والی ہے۔ آدم کو کلمات کا سکھانا اور پھر اس پر معاف کرنا تو ایسا ہے کہ جیسے کسی کا نوکر کچھ قصور کرے اور مالک اسے کہے کہ اے فلانے کان پکڑ اور کہہ کہ میں ایسا پھر کبھی نہیں کروں گا۔ چنانچہ نوکر ایسا ہی کرتا ہے اور معاف کر دیا جاتا ہے اور معافی کیسے نہ ہو۔ جب کہ مالک خود ایک مخصوص اور اپنے پسندیدہ الفاظ میں اس سے معافی منگوانا چاہتا ہے اور یہ اس کا اسے سکھانا اور پھر معافی مانگنے کا حکم دینا معافی کے یقینی ہونے کا زبردست قرینہ ہے اسی طرح جب کوئی شخص باری تعالیٰ کے پسندیدہ اور آموختہ الفاظ میں طریقِ ادب کو ملحوظ رکھتے ہوئے سوال کرتا ہے۔ تو

”اجابت از درِ حق بہرِ استقبال مے آید“

(قبولیت دعا کے لیے اللہ کی رحمت اس کا استقبال کرتی نظر آتی ہے)

کا نظارہ دیکھتا ہے۔ قبولیت کے مؤکلین اس دُعا کا استقبال کرکے دربارِ ربی میں پیش کرتے ہیں۔

سورہ فاتحہ کے ناموں کی کثرت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کثیر محبت کی علامت ہے:

اس سورت کے حدیث شریف میں بہت سے نام آئے ہیں۔ اور ناموں کی کثرت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس سورت پر زیادہ محبت ہونے کی نشانی ہے۔ اسی واسطے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے!

”لَا صَلَاۃَ اِلاَّ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ“

(سنن الکبریٰ بیہقی: جلد ٢، رقم: ٢٤٧٦، دار الکتب العلمیہ)

یعنی نہیں نماز مگر ساتھ سورہ فاتحہ کے۔

حنفی ”لا“ سے مراد نفی کمال لیتے ہیں۔ یعنی سورہ فاتحہ کے بغیر نماز کامل نہیں ہوتی۔

جیسے ایک دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا!

”لَا اِیْمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَۃَ لَہُ وَلَا دِیْنَ لِمَنْ لَا عَھْدَ لَہُ“

(مسند احمد: الجزء١٩، رقم: ١٢٣٨٣، موسسۃ الرسالۃ)

یعنی جو شخص امین نہیں وہ ایماندار بھی نہیں۔ اور جو وعدہ خلاف ہے وہ دیندار بھی نہیں۔

یہاں بھی ایمان و دین بالکل منفی نہیں بلکہ دین و ایمان کے کامل ہونے کی نفی مراد ہے۔ پھر ”لا“ سے مراد اگر یہاں مطلق نفی ہوتی تو یہ حدیث تو خبر واحد ہے۔ اور قرآن پاک میں:

”فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ“ (المزمل: ٢٠)

آتا ہے۔ یعنی نماز میں قرآن جہاں سے آسانی کے ساتھ پڑھ سکتے ہو پڑھو۔ تو کلام اللہ پر خبر واحد کے ذریعہ زیادتی لازم آجاتی ہے۔ جو شریعت کے رو سے جائز نہیں۔

فاتحہ خلف الامام اور امام صاحب کا کارآمد لطیفہ:

اس واسطے ہمارے امام ہمام ابوحنیفہ علیہ الرحمہ نے مطلق قرأت کو تو فرض ٹھہرایا مگر سورہ فاتحہ کی

تعین کو واجب کا درجہ دیا۔ جس سے ”لاَ صَلاَۃَ اِلاَّ بِفَاتِحَۃِ الْکِتَابِ“ پر بھی پورا پورا عمل ہوگیا۔ اور کلام اللہ پر بھی زیادتی لازم نہ آئی مگر امام شافعی صاحب وغیرہ اس اور اس جیسی اور احادیث کی رو سے مقتدی کے لئے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا فرض ٹھہراتے ہیں۔

اسی طرح ہمارے امام صاحب اور امام شافعی رحمۃ اللہ علیہما کے درمیان اس پر بھی اختلاف ہے کہ آیا امام کے ساتھ مقتدی بھی فاتحہ پڑھے یا نہیں۔ امام شافعی صاحب اسی حدیث کے رو سے مقتدی کے لئے بھی پڑھنا ضروری فرماتے ہیں۔ مگر امام صاحب اقتدا کی حالت میں امام کی قرأت کو مقتدی کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ اور اسے پڑھنے کی اجازت نہیں دیتے اور وہ دلیل میں حضور ﷺ کی حدیث:

”مَنْ صَلّٰی خَلْفَ الْاِمَامِ فَقِرَاءَۃُ الْاِمَامِ لَہٗ قِرَاءَۃٌ“

(سنن دار قطنی: الجز ۲، رقم: ۱۵۰۱)

کو پیش کرتے ہیں۔

یعنی جو امام کے ساتھ نماز پڑھے تو امام کی قرأت اسکے لئے بھی کافی ہے۔

نیز قرآن پاک میں آتا ہے!

”وَاِذَا قُرِیءَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَہٗ وَاَنْصِتُوْا“ (اعراف: ۲۰۴)

یعنی جب قرآن پاک پڑھا جائے تو سنو اور چپ رہو۔

بعض کتابوں میں آتا ہے۔ کچھ لوگ امام صاحب کے پاس آئے اور کہنے لگے کہ صاحب یہ کس طرح ہوسکتا ہے۔ کہ ایک امام کی قرأت سینکڑوں مقتدیوں لئے کافی ہو جائے۔ آپ نے فرمایا۔ میاں تم اس قدر زیادہ آدمی باتیں کرتے ہو میں کس کس کو جواب دوں۔ ایک آدمی بات کرے تو اس سے مسئلہ کا فیصلہ بھی ہوسکے چنانچہ ایک شخص جو نہایت فصیح وطرار تھا۔ امام صاحب سے بات کرنے کے لئے چنا گیا۔ آپ نے فرمایا کیا تم سب اس کی بات پر راضی ہو۔ سب نے کہا ہاں تو آپ نے فرمایا کہ پھر تو اعتراض کا جواب خود تمہاری زبان سے حل ہوگیا۔ انہوں نے پوچھا وہ کیسے۔ فرمایا کہ جب تم پچاس شخصوں کی طرف سے ایک شخص بات کرے اور اس کی بات تمہاری بات اور اس کو جواب تمہارا جواب ہوسکے تو پھر امام کی قرأت مقتدیوں کی

طرف سے کیسے کافی نہ ہوسکے گی۔ اس جواب سے سب لاجواب ہوگئے اور اپنا سا منہ سے کر روانہ ہوئے۔

مذاہب کے چار ہونے پر اعتراض اور اس کا جواب:

ہاں اس سے ایک خدشہ ضرور لکھے پڑھے لوگوں کے دلوں میں گزرتا ہوگا کہ دین ایک خدا ایک رسول ایک قبلہ ایک اور پھر مذہب جدا جدا انہی مذہبوں کی جدائی کی وجہ سے مسلمان آج پراگندہ (بکھرے ہوئے) اور منتشر ہے۔ کیونکہ ایک مذہب ایک چیز کو فرض ٹھہراتا ہے۔ تو دوسرا واجب تیسرا ایک چیز کے کھانے کا حکم کرتا ہے۔ تو چوتھا منع کرتا ہے۔ تو کیوں نہ ان مذہبوں کو چھوڑ کر سیدھا قرآن اور سنت رسول مقبول پر اکتفا کیا جائے اور پھر اگر مذہب ہی بنانے ہیں تو چار میں ان کا انحصار کس دلیل سے ہے کیوں نہ دس بیس پچاس سو مرضی کے مطابق بنالئے جائیں۔

جواب:۔

دین کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ایک عقائد یا اصول پر دوسرے احکام یا فروع پر۔ اصول تو قرآن وحدیث نے بالتفصیل بیان کر دیے ہیں۔ ان میں اب کسی قسم کی تبدیلی یا کمی بیشی کرنا صریح گمراہی ہے۔ لیکن کتاب وسنت نے احکام کو تفصیلاً بیان نہیں کیا۔ کیونکہ احکام کی تعداد اس قدر ہے کہ اگر ان کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جاتا تو اس کے لئے سینکڑوں جلدیں بھی ناکافی تھیں۔ اس کے علاوہ روزانہ کے نئے نئے واقعات پھر بھی تشنۂ تشریح ہی رہتے اس لئے عقائد کو کتاب وسنت نے بالتفصیل بیان کرنے کے ساتھ ساتھ احکام کے لئے ایسے کلیہ قواعد منضبط فرمائے ہیں کہ جس سے آئندہ قیامت تک کے احکام کا استخراج کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان قواعد سے احکام ومسائل کے استنباط کرنے کے لئے نہایت بڑی قابلیت کی ضرورت ہے۔ یہ ہر ایک کا کام نہیں کہ ان قواعدِ اصولیہ سے فروعات کے احکام اخذ کر سکے۔ کیونکہ سب سے پہلے اس شخص کو قرآن وحدیث کے لغوی اور شرعی معانی سے واقف ہونے کی ضرورت ہے۔ اب لغوی معنی جاننے کے لئے لغت، صرف۔ معانی اور بیان وغیرہ کی ضرورت ہے۔ ادھر شرعی مطالب سمجھنے کے لئے مشترک مادل مطلق مقید۔ عام۔ خاص۔ صریح۔ کنایہ وغیرہ تمام وہ باتیں جو علمِ اصول کے متعلق ہیں جاننا ضروری ہیں۔ اس کے علاوہ ناسخ ومنسوخ جو موقوف ہے آیات کی تاریخ نزول پر۔ پھر علم حدیث پر پورا پورا عبور ہو۔ احاد۔ متواتر

مشہور غریب وغیرہ کا علم رکھتا ہو۔ راویوں کے حالات سے باخبر ہو۔ اور مسائل اجماعیہ اور اختلافیہ سے واقف ہو۔ غرضیکہ قواعدِ اصولیہ سے احکام کے استنباط کرنے کے لئے بہت بڑے علم وعقل کی ضرورت ہے۔ اسواسطے اُمت کا ہر شخص اس قابل نہیں ہوسکتا۔ کہ وہ ان تمام منازل کو باحسن الوجوہ (اچھی طرح) عبور کر کے قرآن پاک کے دریائے ناپیدا کنار سے دُرِ مقصود کو حاصل کرے۔ بلکہ اس کام کو سرانجام دینے کے لئے اُمت میں سے معدودے چند ایسے اشخاص ہوئے۔ جنہوں نے فضلِ ایزدی سے اول ان تمام مشکلوں کو طے کیا اور پھر قرآن وسنت کے اصولوں سے امت کی ضرورتوں کا بہترین حل پیش فرمایا۔ ان قواعدِ کلیہ سے استنباطِ احکام کا نام شرعی اصطلاع میں اجتہاد ہے۔ اب جو لوگ ان مجتہدین کے قیاسات پر چلے وہ مقلد کہلائے۔

تقلید کیوں ضروری ہے؟:

تقلید کے بغیر عام لوگوں کو کسی طرح چھٹکارا نہیں۔ آپ دیکھیں دنیوی امور میں ہم کاروبار کے ہر شعبے میں اس کے ماہر کی تقلید کرتے ہیں۔ دواؤں میں ڈاکٹر کی۔ عمارات میں انجینئر کی اور قانون میں وکیل کی اتباع لازمی سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح دینی معاملہ اور دینی قواعد وضوابط کی تشریح وتوضیح میں بھی ائمہ دین کی تقلید ضروری ہے۔ قرآن پاک فرماتا ہے!

فَاسْئَلُوْٓا اَهْلَ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ۔ (النحل: ۴۳)

اگر تمہیں کسی چیز کا علم نہ ہو تو اہل علم سے دریافت کرو۔

ابتدائے اسلام میں صحابہ کرام وتابعین رضوان اللہ علیہم اجمعین میں کثرت سے مجتہدین تھے۔ ان کے علمی نور مشکاتِ نبوت سے مکتسب ہونے کی وجہ سے ظاہری علوم کی زیادہ ضرورت نہ تھی۔ مگر خیر القرون جوں جوں دور ہوتا گیا۔ اُدھر تو لوگوں کا دینی جوش اور قرآن وحدیث کا عشق کم ہونا شروع ہوا۔ ادھر رات دن اُمت کی زیادتی اور ملکی فتوحات کے باعث نئے نئے مسائل پیش آنے لگے اسواسطے ضروری ہوا کہ قرآن پاک کی طرح احادیث نبویہ کو بھی نہایت احتیاط کے ساتھ جمع کرلیا جائے اور ساتھ ہی آثارِ صحابہ اور انکے فتاویٰ کو بھی اکٹھا کر کے امت کی رہنمائی کے لئے کتابی شکل میں لایا جائے۔ چنانچہ بڑی احتیاط اور چھان بین

سے اس کام کو مدوّن کیا گیا۔ مگر صحابہ کرام میں جس قدر مجتہدین تھے۔ ان کے اتنی کثیر تعداد میں مقلدین منظم طریقہ سے پیدا نہ ہوسکے کہ اپنے اماموں کی تعلیم کو اُمت تک تواتر اور صحت کے ساتھ پہنچا سکیں۔ نتیجہ یہ ہوا۔ کہ ان کا نام تو نہ چل سکا۔ لیکن ان کا کام ضرور آج تک چلا آتا ہے۔ اور تا قیامت چلے گا۔ مگر وہ دوسرے مشہور اماموں کے کاموں کے ساتھ مل کر اس میں ایسا مدغم ہوگیا۔ کہ آج ان کے کام بھی ان ہی اماموں کی وساطت سے ہمارے کانوں تک پہنچ رہے ہیں۔ اور بغیر ایک جید عالم کے عام انسان اس کام یا بات کے صحیح مجتہد سے بالکل بے خبر ہیں۔

چار مشہور امام:

ان سب مجتہدین سے چار امام بہت مشہور ہیں۔ یعنی امام ابوحنیفہ نعمان بن ثابت جن کی ولادت ۸۰ھ اور وفات ۱۵۰ھ ہے۔ دوسرے امام مالک بن انس جن کی ولادت ۹۰ ہجری اور وفات ۱۷۹ھ میں ہے۔ تیسرے امام محمد بن ادریس شافعی جن کی ولادت ؁۱۵۰ء اور وفات ؁۲۰۴ء ہے چوتھے امام احمد بن حنبل جن کی ولادت ؁۱۶۴ء اور وفات ؁۲۴۱ء ہے۔ علامہ شامی نے ان چاروں اماموں کی ولادت، موت اور مدت حیات کو دو شعروں میں جمع کر دیا ہے۔ ابجد کے لحاظ سے پہلے لفظ کے اعدادی مجموعہ سے ولادت دوسرے سے موت اور تیسرے سے عمر کا پتہ چلتا ہے۔

چنانچہ وہ اشعار یہ ہیں۔

تاریخ نعمان یکن ۸۰ سیف ۱۵۰ سطا ۷۰   ومالک فی قطع ۹۰ جوف ۱۷۹ ضبطا ۸۹
والشافعی مین ۱۵۰ ببر ۲۰۴ ند ۵۴   واحمد بسبق ۱۶۴ امر ۲۴۱ جعد ۷۷
فاحسب علی ترتیب نظم الشعر   ملاھم فموتہم کالعمر

ان چار اماموں کا اجتہاد و استخراج دوسرے ائمہ سے اس قدر بڑھ گیا کہ وہ ان کے علم کے سورج کے سامنے چراغ کی طرح ماند پڑ گئے اور پھر ان کے مقلد اس قدر بڑے بڑے علماء و فضلا ہوئے کہ انہوں نے اپنے اماموں کے اقوال زبانی اور تحریری طریقہ سے اُمت محمدیہ کے گھر گھر پہنچا دئے اور ان کی کتابوں کو جمع کر کے درس و تدریس کا ایسا سلسلہ چلایا کہ آج تک یکے بعد دیگرے ایک نہ ایک گروہ ان کے اقوال کو

دوسروں سے نقل کرتا ہوا جا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ چار مذہب آج تمام اسلامی دنیا میں پھیل چکے ہیں۔

چاروں مذاہب ایک اور امت کیلئے باعثِ رحمت ہیں:

مگر یہ یاد رہے کہ یہ مذہب چار ہوتے ہوئے بھی حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ ان کا اختلاف صرف بعض بعض فروعات میں ہے نہ کہ اصول میں وہ عقائد میں پورے پورے متفق ہیں۔ صرف احکام میں کہیں کہیں اختلاف ہے۔ اور امت کے ہر فرد کو پورا پورا اختیار ہے کہ وہ جس امام کی چاہے پیروی کرے وہ سب آپس میں ایک امام کے پیچھے نماز پڑھتے ہیں۔ آپس میں شادی بیاہ کرتے ہیں۔ اور ان میں سے کوئی بھی ایک دوسرے کو گمراہ یا گنہگار نہیں سمجھتا۔

اگر غور کرو گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ فروعی اختلافات خرابی کا باعث نہیں بلکہ اُمت کے لئے اس میں بہت بڑے فائدے ہیں۔ یہ چار مذہب گویا منزل مقصود تک پہنچانے کے لئے چار راستے ہیں۔ اگر منزل مقصود کا ایک ہی رستہ ہوتا۔ تو منزل کے رہروں کو تنگی کی وجہ سے پریشانی ہوتی اور پھر اس قدر کثیر اُمت کہ مشتمل ہے مختلف طبائع۔ مختلف عقول اور مختلف امزجہ (**مختلف طریقوں**) پر ایک رستے پر چلنے میں متفق بھی نہ ہوتی۔ تو گویا منزل مقصود پر آسانی سے پہنچنے میں یہ رستے مدد دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بیج تب تک تناور درخت نہیں بن سکتا جب تک کہ اس کی ٹہنیوں، شاخوں، پتوں، پھلوں اور پھولوں میں اختلاف نہ ہو۔ جوں جوں اختلاف بڑھتا جائے گا۔ توں توں وہ درخت پھیلتا جائیگا۔ اسی طرح اختلافِ ائمہ کے باعث ہزاروں قرآن وحدیث کی باریکیاں نکلیں کتنے ہی نئے نئے علوم ان کے اختلاف کے باعث مدوّن ہوئے اور آج یہ دینِ محمدی کا تناور درخت جو دنیا میں پھیلا ہوا ہے وہ انہی ائمہ کے فروعی اختلاف کا نتیجہ ہے۔ اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے!

''اختلاف علماء امتی رحمة''

میری اُمت کے علماء کا آپس میں اختلاف بھی رحمت کا سبب ہے۔

ذوق نے کیا ہی اچھا کہا ہے۔

گلہا ئے رنگارنگ سے ہے زینتِ چمن

اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

باغ کی خوبصورتی رنگ برنگ پھولوں کی وجہ سے ہے اس باغ کی خوبصورتی اختلاف میں پوشیدہ ہے۔

اعتراض کی دوسری شق کا جواب:

اب اعتراض کی دوسری شق کہ اگر ایک سے زیادہ مذاہب بنانے تھے تاکہ منزلِ مقصود کی طرف جانے میں آسانی ہو تو پھر چار میں کیوں انحصار کیا کیوں نہ زیادہ بنا لئے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جب متقدمین کے بڑے بڑے فضلاء کا اجتہاد ان چار اماموں کے سامنے جڑ نہ پکڑ سکا اور ائمہ اربعہ کا استخراج جید بہترین اور مدلل ہونے میں بڑھ گیا۔ تو آج جب نورِ مجسم نبی مکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو دنیا سے پردہ فرمائے ہوئے طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ دنیا سر سے لے کر پاؤں تک مادیت میں پھنس چکی ہے۔ اتقا اور پرہیز گاری روئے زمین سے مفقود ہو رہی ہے۔ سود، زنا۔ شراب۔ اور فسق و فجور کی گرم بازاری نظر آتی ہے۔ اکلِ حلال جو تزکیہ قلب کے لئے سب سے پہلی اور ضروری چیز ہے۔ دنیا سے عنقا ہو رہا ہے۔ تو ایسی حالت میں اس فضلِ ربی کے بہترین حامل کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں۔ امام شافعی صاحب نے ایک دفعہ اپنے استاد وکیع سے سوءِ حافظہ کی شکایت کی تو اس کے جواب میں اس گرامی قدر استاد نے جو نصیحت فرمائی۔ آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے۔ امام شافعی صاحب فرماتے ہیں ع

شکوت الی وکیع سوء حفظی   فاوصانی الی ترك المعاصی
لان العلم فضل من الله   وفضل الله لا یعطی لعاصی

یعنی میں نے اپنے استاد وکیع سے اپنے حافظہ کی خرابی کی شکایت کی تو آپ نے مجھے ترک معاصی کی وصیت فرمائی اور فرمایا کہ علم رب العزت کا فضل اور احسان ہے اور عاصی اس انعام سے محروم رکھا جاتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ آج ان ائمہ جیسا یا ان سے بڑھ کر ہونا محالات سے ہے۔ ہاں ہو سکتا ہے کہ کوئی شخص ان کے بعد ہوا ہو اور اس نے کسی جزوی مسئلہ میں ان سے بہتر استخراج کیا ہو۔ مگر پھر بھی وہ اجتہادِ جزوی رہے گا نہ کہ مطلق اور یہاں مقابلہ میں اجتہادِ مطلق کی ضرورت ہے۔

رجوع بمطلب اور سورہ فاتحہ کے دوسرے نام:

بات یہ بیان ہو رہی تھی کہ اس سورت کے حضور ﷺ نے بہت نام ارشاد فرمائے ہیں۔ جن سے حضور ﷺ کی اس سورت سے کمال محبت کا پتہ چلتا ہے۔ سورۃ المسئلۃ اور اُم القرآن کی وجہ تسمیہ تو بیان ہو چکی۔ اس کے علاوہ فاتحہ بھی اس کا نام ہے کیونکہ قرآن پاک کا افتتاح اسی سے ہوتا ہے۔ اور اس کی ابتداء لفظ ''الحمد'' سے ہونے کی وجہ سے ''سورۃ الحمد'' بھی کہلاتی ہے۔ اس کے بے انتہا خزانے اور مخفی موتیوں کے باعث حضور ﷺ نے اسے ''سورۃ الکنز'' بھی فرمایا ہے۔ اس کی سات آیتیں اور نماز میں مکرر پڑھے جانے کی وجہ سے ''سبع المثانی''، بھی کہا جاتا ہے۔ غرضیکہ رسول مقبول ﷺ نے اس سورت کو اتنے ناموں سے یاد فرمایا ہے۔ کہ کسی اور سورت کو اتنے نام نہیں دیے اور افضل الرسل ﷺ کا اس سورت سے زیادہ پیار اس کے افضل السور ہونے پر دلالت کرتا ہے۔

قرآن معارف کا ناپیدا کنار سمندر ہے:

اس کے بعد اب اللہ جل شانہ پر توکل کر کے سورۂ فاتحہ کے معانی کو بیان کرتا ہوں اور یہ معانی جو میں بیان کروں گا۔ انہیں ایسا سمجھئے کہ جیسے کوئی شخص دور سے ایروپلین کو دیکھ کر اس کی کیفیت کو بیان کرے۔ کیونکہ قرآن پاک عرفان و معانی کا وہ ناپیدا کنار سمندر ہے کہ جس کے پیٹ سے لاکھوں کروڑوں موتی نکالنے کے باوجود اس کی تہہ کروڑ در کروڑ بے مثال موتیوں سے بھری ہوئی ہے۔ اس لئے اللہ جل شانہ فرماتا ہے!

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّي لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ أَن تَنفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّي وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهِ مَدَدًا ''(الکھف:۱۰۹)

یعنی اے حبیب کہہ دو کہ اگر سمندر بھی کلماتِ ربیہ کے لیے سیاہی بن جائے تو ان کے ختم ہونے سے پہلے ختم ہو جائے گا گو ہم اس جیسا اور سمندر اس کی مدد کے لئے لائیں۔

اگر جملہ دریا شود روشنائی   کند ملک اشجار مدحت سرائی
محال از ثنائے تو عہدہ برآئی   ازل تا ابد اے تو فرماں روائی
کراجز تو در ملک تو بادشاہی

ترجمہ: اگر تمام دریاؤں کی سیاہی بنا دی جائے اور تمام درخت اس کی تسبیح کریں پھر بھی اللہ کی تعریف کا

کماحقہ حق ادا نہیں ہوسکتا۔ اے اللہ ابتداء سے لے کر انتہاء تک ہر چیز پر تیری ہی حکومت ہے۔ اور تیری بادشاہت میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔

تو کلماتِ الٰہیہ کی تفسیر ہر مفسر کے حسب حال ہوتی ہے۔ مفسر کا شیشہ دل جتنا بھی ریاضت اور ذکرِ الٰہی سے صیقل ہوگا۔ اُسی تناسب سے قرآنی معارف ومطالب کا فوٹو اس میں اچھا دکھائی دے گا۔

الحمدلِلّٰہ کی تفسیر:

حمد اس تعریف کو کہتے ہیں۔ جو کسی کے بالاختیار کوئی اچھا کام کرنے پر کی جاتی ہے۔ اس پر الف لام زیادہ کیا گیا ہے۔ یہ الف، لام، کلامِ عربی میں مختلف معنوں کے لئے آتا ہے۔ جس کا مفصل ذکر علم نحو وصرف سے تعلق رکھتا ہے۔ تاہم میں مختصرًا بیان کردیتا ہوں تاکہ آپ کو کچھ نہ کچھ اس کے متعلق معلوم ہوجائے

الف لام کی چار قسمیں:

الف لام کی چار قسمیں ہوتی ہیں۔ عہد خارجی۔ عہد ذہنی۔ جنسی اور استغراقی اگر عام معنی والے لفظ پر داخل ہو کر اس کے معنوں میں خصوصیت پیدا کردے تو عہد خارجی کہلاتا ہے۔ جیسے ”رجل“ کہ عام مرد کو کہتے ہیں۔ خواہ زید ہو یا عمر۔ بکر ہو یا خالد۔ مگر ”اَلرَّجُلُ“ یعنی وہ مرد۔ یا ایک خاص فرد کے لئے استعمال ہونے کی وجہ سے معرفہ ہوگیا۔ اور اگر مدخول لفظ کی جنسیت یعنی ماہیت کو بلالحاظ تحقیق افراد پیش کرے جیسے:

”الرجل خیر من المرأۃ“
یعنی جنس مرد جنس عورت سے بہتر ہے۔

تو جنس کہلاتا ہے۔ اور اگر ماہیت کے ساتھ ساتھ افراد کی تحقیق پر بھی دلالت کرے تو اب یہ دلالت یا تو کل افراد پر ہوگی یا بعض پر اگر کل پر دلالت کرے تو استغراقی ہے۔ ورنہ عہد ذہنی۔

الحمد میں الف لام استغراقی ہے۔ یعنی حمد کے جمیع افراد۔ حمد کی تمام شقیں۔ حمد کی تمام اقسام اور انواع اللہ تعالیٰ ہی کی ذات والاصفات کے لئے ثابت ہیں۔ ازل سے ابد تک جو بھی تعریف ہوئی ہے۔ یا ہو رہی ہے۔ یا ہوگی۔ وہ اسی رب العٰلمین کے ساتھ مخصوص ہے۔ پھر تعریف انسان کی ہو یا غیر انسان کی۔ اسی مالک ذوالجلال کے لئے خاص ہے۔ انسان کے علاوہ دنیا کی تمام چیزیں زبان حال سے اللہ جل شانہ کی تحمید وتسبیح

میں مشغول ہیں۔ ہاں ان کے سننے کے لئے اہل اللہ کے کانوں کی ضرورت ہے۔ قرآن پاک فرماتا ہے!

وَاِنۡ مِّنۡ شَیۡءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمۡدِہٖ وَلٰکِنۡ لَّا تَفۡقَهُوۡنَ تَسۡبِیۡحَهُمۡ ؕ"(بنی اسرائیل: ۴۴)
یعنی ہر شے اس کی تسبیح کر رہی ہے مگر تم اس کی تسبیح کو سمجھتے نہیں۔

بذکرش ہرچہ بینی در خروش است　　ولے داند دریں معنی کہ گوش است
نہ بلبل بر گلش تسبیح خوانِ است　　کہ ہر خارے بہ تسبیحش زبانِ است

ترجمہ: اُس کے ذکر میں جس چیز کو بھی دیکھو جوش وخروش میں ہے لیکن اس معنیٰ وحقیقت کو وہی جان سکتا ہے جو صاحب گوش ہے یعنی سننے والے کان رکھتا ہے۔ نہ صرف بلبل پھول پر اس کی تسبیح خواں ہے بلکہ ہر کانٹا اس کی تسبیح میں زبان ہے۔

حمد کی تین قسمیں:

اسی واسطے علماء نے لکھا ہے کہ تعریف یا حمد صرف زبان سے الفاظِ مدحیہ کا بیان کرنا ہی نہیں ہوتا۔ بلکہ قولی حمد کے علاوہ حمدِ فعلی اور حمدِ حالی بھی ہوتی ہے۔ حمدِ قولی تو یہ ہے کہ انسان اپنی زبان سے اللہ تعالیٰ کی تعریف وتوصیف کرے اور حمدِ فعلی یہ ہے۔ کہ مخلوق اپنے افعال واشغال سے اللہ جل شانہ کی حمد کو ظاہر کرے اور حمدِ حالی یہ ہے کہ مخلوق کے حال سے حمدِ ربی کا اظہار ہو۔ اور اس کا روح۔ اس کا دل اور اس کا باطن خداوندی انعام کا معترف ہو۔ درختوں کو دیکھو تو وہ قیام میں کھڑے ہیں۔ جانوروں کو دیکھو تو ہر وقت رکوع میں جھکے ہوئے نظر آتے ہیں۔ مگر انسان کی عبادت بوجہ اس کے اشرف المخلوقات ہونے کے سب کا مجموعہ ہے۔

نماز حمد کی تینوں اقسام کے جامع ہے:

چونکہ نماز میں یہ تینوں حمدیں جمع ہو جاتی ہیں۔ اسی واسطے شریعت نے نماز کو تمام دوسری عبادتوں پر فوقیت دی ہے۔ اور شریعتِ مطہرہ نے اسکی اس قدر تاکید کی ہے۔ کہ اس کے مقابلے میں کسی دوسری عبادت کی اتنی تاکید نہیں کی۔ حضور سرورعالم فرماتے ہیں!

"الصَّلاۃُ عِمادُ الدِّینِ، مَنۡ أَقامَها فَقَدۡ أَقامَ الدِّینَ، وَمنۡ هَدمَها فَقَدۡ هَدَمَ الدِّینَ"

یعنی نماز دین کا ستون ہے تو جس نے اسے قائم کیا تو گویا اس نے دین کو قائم کیا۔ اور جس نے اسے چھوڑ دیا تو گویا اس نے دین کو گرا دیا۔

فقہ کا مسئلہ ہے کہ اگر کسی عورت کا بچہ پیدا ہوا اور آدھے سے کم بچہ پیدا ہو کر رک جائے اور نماز کا وقت ختم ہونے پر ہو تو اسے چاہئے کہ نماز قضا نہ کرے بلکہ اشارہ سے پڑھ لے کیونکہ ولادتِ تامہ (مکمل ولادت) سے پہلے وہ نفاس والی نہیں اور جب نفاس والی نہیں تو نماز معاف نہیں ہو سکتی۔ غور کرنے کا مقام ہے کہ دردِ زہ جو نزع کی تکلیف کا مثنی ہے۔ اس میں بھی شریعت اشارہ سے نماز پڑھنے کا حکم دے رہی ہے۔ تو کس قدر افسوس ہے ان لوگوں پر جو باوجود صحت کے بلا عذر نمازیں چھوڑ دیتے ہیں اور صرف کھانا کھانے کے بعد ڈکار آجانے پر الحمدللہ کہہ دینا کافی سمجھتے ہیں۔ یہ حمد تو ایسی ہے کہ کوئی شخص صبح سے شام تک حلوا حلوا کہہ کر زبانی اپنا پیٹ بھرنے کی کوشش کرے۔ مگر عملی کام کچھ بھی نہ کرے تو کیا آپکے نزدیک محض ان الفاظ سے اس کا پیٹ بھر جائے گا۔ اور صرف حلوے کی گردان رٹنے سے مقصود حاصل ہو جائے گا۔ اسی طرح صرف زبان سے الحمدللہ کہہ دینا اور دل اور جسم سے اس کا اظہار نہ کرنا ایسا ہی بے اثر جیسے غافل کی تسبیح وتہلیل۔

بر زباں تسبیح و در دل گاؤ خر

ایں چنیں تسبیح کے دارد اثر

زبان پر سبحان اللہ اور دل میں گائے اور گدھے کا خیال ایسی تسبیح کا کیا اثر ہوگا۔

لہذا چاہئے کہ اگر زبان قولی حمد میں مشغول ہو تو جسم حمدِ فعلی کو ظاہر کر رہا ہو اور دل پر ترغیب و ترہیب کی آیتوں سے خوف و رجا اور فرحت و ملال کی کیفیتیں طاری ہو رہی ہوں۔

اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کہا مگر اَلشُّکْرُ لِلّٰہ یا اَلْمَدْحُ لِلّٰہ کیوں نہ کہا:

یہ بھی ایک نکتہ یاد رکھئے کہ رب العزت نے الحمدللہ فرمایا ہے ”الشکر لِلّٰه یا المدح لِلّٰه“ نہیں فرمایا کیونکہ اگرچہ بادی النظر اور سطحی طور پر دیکھنے سے مدح، شکر اور حمد ایک ہی معنی پر دلالت کرنے والے الفاظ معلوم ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت میں ان کے معنوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کیونکہ مدح اختیاری اور غیر اختیاری دونوں کاموں پر کیجا سکتی ہے۔ مثلاً کسی شخص کے عالم، بہادر اور سخی ہونے پر مدح کرنا یہ

افعال اختیاریہ ہیں۔ یا کسی کے موٹا، پتلا یا خوبصورت ہونے پر اس کی تعریف کرنا یہ افعال غیر اختیاریہ ہیں۔ مگر حمد صرف اختیاری افعال ہی میں ہوتی ہے۔ غیر اختیاری یا اضطراری کاموں پر حمد نہیں ہوا کرتی۔ اور شکر صرف نعمت کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ یوں بلا عطاءِ نعمت کے شکر نہیں کیا جاتا۔ گویا مدح تو سب سے عام ہے۔ کہ اختیاری و اضطراری دونوں کاموں کو شامل ہے۔ حمد اس سے دوسرے درجہ پر ہے کہ صرف اختیاری افعال ہی کے مقابل میں ہو سکتی ہے۔ اور شکر سب سے خاص ہے کہ صرف نعمت کے مقابلہ میں ہوتا ہے۔ اسواسطے ہر شکر حمد ہو گا۔ مگر ہر حمد شکر نہ ہو گی۔ اسی طرح ہر حمد مدح ہے۔ مگر ہر مدح حمد نہ ہو گی۔

اب اگرچہ مدح کا لفظ تعریف کے اعتبار سے تو بہت عام تھا۔ مگر اللہ جل شانہ نے ''المدح لِلّٰہ'' نہ فرمایا۔ کیونکہ اس سے یہ وہم ہو سکتا تھا کہ شاید اللہ تعالیٰ اپنے افعال میں مضطر ہو اور یہ تعریف اس کے افعال اضطراریہ پر ہو رہی ہو۔ جیسے سورج اپنی روشنی کے دینے میں مضطر ہے۔ اسے اپنی روشنی کو کسی وقت بھی ذاتی طور پر روک لینے کا اختیار نہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کو بھی ان افعال کا جس کی وجہ سے ہم اس کی مدح کر رہے ہیں روکنے یا نہ کرنے کا اختیار نہیں بلکہ وہ ان کے کرنے پر مجبور ہے۔ چنانچہ فلاسفہ کا یہی عقیدہ ہے کہ وہ اللہ جل شانہ کے افعال کو سورج کی روشنی کی طرح افعال اضطراریہ مانتے ہیں۔ مگر رب العزت نے اس باطل وہم اور فلاسفہ کے غلط عقیدہ کی حمد کا لفظ لا کر جڑ کاٹ دی۔ کیونکہ حمد تو افعالِ اختیاریہ پر ہوتی ہے۔ تو گو یہ اللہ تعالیٰ کے مستحقِ حمد ماننے اور اسے محمود یقین کر لینے سے ضمناً دو باتوں کا یقین کرنا بھی ضروری ہو گیا۔ اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے افعال کے کرنے یا نہ کرنے میں مختار ہے۔ اس کی مرضی ہے خواہ کرے یا نہ۔ کوئی اسے مضطر اور مجبور نہیں کر سکتا۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کے سب کام اچھے ہیں۔ کیونکہ حمد ہمیشہ اختیاری اور اچھے کام پر ہوتی ہے۔ پہلی بات یعنی افعالِ اختیاریہ کی قید سے فلاسفہ کے فاسد عقیدہ کا ردّ ہو گیا اور دوسری یعنی اللہ تعالیٰ کے سب کام اچھے مان لینے سے رضا بالقضاء (تقدیر پر راضی ہونے) کا مادہ پیدا ہوا۔ کیونکہ جب انسان اپنے دکھ۔ تکلیف۔ عُسر و یُسر کو اللہ جل شانہ کی طرف سے سمجھتا ہے۔ اور پھر اس پر الحمد للہ کہتا ہے۔ تو گویا وہ اللہ تعالیٰ کے کئے کو مناسب اور اچھا سمجھ کر اس کا شکریہ ادا کرتا ہے۔ اگر بھوکا ہے تو کہتا ہے الحمد للہ، اگر پیٹ بھرا تو کہتا ہے، الحمد للہ اگر بیمار ہے تو کہتا ہے الحمد للہ، اور اگر تندرست ہے تو کہتا ہے الحمد للہ، اگر امیر ہے تو کہتا ہے الحمد للہ،

اور اگر غریب ہے تو کہتا ہے الحمدللہ غرضیکہ وہ قضاو قدر کے ہر کام سے راضی ہو کر خوشی کا اظہار کرتا ہے۔ اس رضا بالقضاء کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ جب وہ نہایت ٹھیک اور سچے معنوں میں غاسل کے ہاتھ میں مردہ یا دھوبی کے ہاتھ میں کپڑا بن جاتا ہے۔ اور غیر سے تعلق کو توڑ کر اس ایک سے رشتہ جوڑ لیتا ہے۔ اور اس کے کیے کو اگرچہ ناگوار خاطر ہی کیوں نہ ہو برضا ورغبت برداشت کر کے قولاً۔ فعلاً۔ اور حالاً الحمدللہ کہتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی خاص رحمتیں بھی اس طرف متوجہ ہو جاتی ہیں۔ اور اس پر وہ وہ انعام کئے جاتے ہیں۔ کہ انسان کا وہم وگمان بھی اس کا احاطہ نہیں کرسکتا۔ کیونکہ جب اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے کہ میرا بندہ ہر حال میں شاکر وصابر ہے اور میرے کئے پر راضی ہے اور امتحان وابتلا کی کسوٹی پر کھرا اُترتا ہے تو پھر درجہ ناز ومحبوبیت سے نواز دیتے ہیں۔ اور پھر ’’لَئِن شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ ‘‘ کے قرآنی وعدوں کے مطابق دنیا میں انعام ونوازشات میں تو اضافہ فرماتے ہی ہیں مگر آخرت میں بھی **الحمدللہ** کے آٹھ حرفوں کے مقابل جنت کے آٹھ دروازوں میں سے جس میں بھی قائلِ حمد داخل ہونا چاہے گا عام اجازت عطا فرمادیں گے۔

شکر نعمت نعمتت افزوں کند

کفر نعمت از کفت بیروں کند

نعمت پر شکریہ تیری نعمتوں کے اضافے کا ذریعہ اور کفرانِ نعمت تیرے رزق میں کمی کا سبب بنتا ہے۔

انسان اللہ جل شانہ کی کما حقہ حمد کرنے سے عاجز ہے:

اگر غور کرو تو انسان کیا ہوگا اور اس کی حمد وثناء کیا ہوگی۔ کیونکہ اس کا وجود اس کے افعال اس کی حرکات اس کی ضروریات سب کی سب اسی ربُّ الارباب کی دی ہوئی ہیں۔ اللہ کی حمد۔ اس کی طاقتِ حمد اس کا وقتِ حمد سب کا سب اسی کی طرف سے ہے۔ چنانچہ قرآن پاک ارشاد فرماتا ہے۔

’’وَمَا بِكُمْ مِّنْ نِّعْمَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ۔ (النحل: ۵۳)

یعنی تمہارے پاس جو کچھ بھی نعمت کے قبیل سے ہے وہ سب کا سب اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔

شیخ سعدی مرحوم نے فرمایا ہے۔

عطائیست ہر موئے از و بر تنم

چگونہ بہر موئے شکرے کنم

میرے بدن پر جو بال ہیں یہ اسی کا عطیہ ہیں تو پھر ہم کس طرح ہر بال کے بدلے اس کی نعمت اور عطا کا شکریہ کریں۔

اسی واسطے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے!

لَا اُحصِیْ ثَنَاءً عَلَیْكَ ''کہ اے اللہ میں آپکی پوری ثنا نہیں کرسکتا۔
(صحیح مسلم: جلد ۲، رقم: ۱۱۱۸، دارالجیل بیروت)

اور حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ایسا فرمانے کی وجہ حضرت داؤد علیہ السلام کے ایک واقعہ کے بالکل مشابہ ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے ایک دفعہ دربارِ ربی میں عرض کیا! ''یا رب کیف اشکرك'' کہ اے اللہ میں آپ کا کیسے شکریہ ادا کروں۔ کیونکہ ادائے شکر کی توفیق کا آپ کی طرف سے ملنا ضروری ہے۔ ورنہ ایک ضعیف انسان آپ جیسے عظیم الاحسان کا شکریہ کیسے ادا کرسکتا ہے۔ اور پھر یہ توفیقِ شکر بجائے خود ایک اور نعمت ہے اس کا شکر ادا کرنے کے لئے پھر توفیق کی ضرورت ہے۔ اور وہ توفیق ایک اور نعمت ہے۔ تو ایسی لامتناہی نعمتوں کا میں کس طرح شکریہ بجالاسکتا ہوں ارشاد باری ہوا۔ اے داؤد تیرا ادائے شکر سے عاجز ہونے کا اقرار کرنا خود ادائے شکر ہے۔

نیست انسان را کمالے بہتر از اظہار عجز
دست گیر ناشنا ور دست بالا کردن ست

انسان کا کمال عاجزی کے اظہار میں ہے کیونکہ وہ شخص جو تیرنا نہیں جانتا اس کا ہاتھ ہی اوپر کو اٹھتا ہے۔

جیسے ادائے شکر سے عاجز ہونے کا اقرار کرنا ادائے شکر ہے۔ ایسے ہی اپنے نقصان علم کا اقرار کرنا بھی کمالِ علم کی علامت ہے۔ کیونکہ جب عالمِ کامل اپنے سامنے علم کے بحرِ مواج کو دیکھتا ہے۔ تو وہ خواجہ خضر علیہ السلام کی طرح پکار اٹھتا ہے کہ اے موسیٰ تیرا اور میرا علم۔ علمِ خداوندی کے سامنے ایسا ہے۔ جیسا کہ اس پرندے نے اس سمندر سے چونچ کو ڈبو کر پانی لیا ہے۔

لاادری کمالِ علم کی علامت ہے:

لکھا ہے کہ ایک دفعہ قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سے ایک مسئلہ پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا ''لَا اَدْرِیْ'' کہ میں نہیں جانتا۔ لوگوں نے کہا کہ جب آپ اتنا مسئلہ بھی نہیں جانتے تو پھر بیت المال سے اس قدر ماہانہ کیوں لیا کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ وہ تنخواہ تو مجھے میرے علم کے مقابل میں دی جاتی ہیں۔ اگر مجھے میرے جہل کے مقابلے میں مشاہرہ دیا جاتا تو ''لم یسعنی مال الدنیا'' یعنی پھر تو تمام دنیا کا مال بھی کافی نہ ہوتا۔

ایک عالم صاحب نے اپنی علمیت و جہالت کا مقابلہ کیسے کیا:

اسی طرح کسی عالم سے منبر پر ایک مسئلہ پوچھا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ بھائی مجھے یہ مسئلہ سرِ دست معلوم نہیں کتابیں دیکھ کر عرض کروں گا۔ اس پر لوگ شور مچانے لگے کہ جب آپ سب مسائل نہیں جانتے تو پھر منبر پر کیوں چڑھ بیٹھے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ صاحبو! جتنا میرا علم تھا اتنا مجھے چڑھایا گیا۔ اگر میری جہالت کے خیال سے چڑھایا جاتا تو پھر تو ساتواں آسمان بھی میرے لئے نیچا ہی ہوتا۔

نیم ملاؤں کا تکبر ان کی جہالت کا نتیجہ ہے:

آج کل کے نیم ملاؤں کا تکبر ان کی جہالت کا نتیجہ ہے۔ ورنہ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ کوئی علم کے بحرِ مواج کو دیکھ کر پھر اپنے حقیر و ناقص علم پر اترانے کا خیال بھی کر سکے۔ مولانا روم فرماتے ہیں ع

این تکبر چیست غفلت از لباب   منجمد چوں غفلت یخ ز آفتاب

چوں خبر شد ز آفتابش یخ نماند   نرم گشت و گرم گشت و تیز راند

یعنی یہ تکبر کیا ہے؟ عقل کی کمی اور غفلت کا باعث ہے۔ جس طرح برف۔ جب سورج سے غافل ہوتی ہے۔ تو منجمد ہو جاتی ہے۔ مگر جونہی کہ سورج کی گرمی اس پر پڑی وہ انجماد اور سختی نرمی سے بدل کر تیزی کے ساتھ پانی کی روکی شکل میں بہنے لگتی ہے۔ اسی طرح جب متکبر پر عقل و علم کے آفتاب کی روشنی پڑ گئی تو پھر وہ متکبر نہیں رہ سکتا۔ بلکہ اس کا تکبر۔ تذلل اور انکسار کی صورت میں پگھل جاتا ہے۔

امام رازی کا ایک منکسرانہ قطعہ:

چنانچہ امام فخر الدین عبد اللہ شافعی جو امام فخر الدین رازی کے نام نامی سے شہرہ آفاق ہیں اور جن

کی غزارتِ علمی (علم کی زیادہ مقدار) پر مولانا روم کا یہ شعر ملاحظہ ہو فرماتے ہیں۔

گر زا ستدلال کار دیں بدے
فخر رازی راز دارِ دیں بدے

ترجمہ: اگر استدلال کرنے سے دین کا کام ہوتا تو امام فخر الدین رازی علیہ الرحمہ دین کے راز دار ہوتے۔

آپ کی تصانیف کثرت سے ہیں۔ خصوصاً ''تفسیر کبیر'' تو بے بہا موتیوں کا خزانہ ہے۔ مگر آپ اپنے اس قطعہ میں اپنے نقصان علم کو یوں اقرار کرتے ہیں ع

ہر گز دل من زعلم محروم نشد   کم ما نداسرار که مفهوم نشد
ہفتادودوسال فکر کردم شب وردز   معلومم شد که ہیچ معلوم نشد

یعنی میرا دل علم سے محروم نہیں رہا۔ بلکہ قریب تمام اسرار اور غوامض کو حل کیا اور ۷۲ سال تک رات دن غور فکر کیا۔ مگر آخر نتیجہ یہی نکلا کہ مجھے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ چنانچہ آپ کے یہ چار شعر بھی موتیوں کے ساتھ تولنے کے قابل ہیں۔ آپ فرماتے ہیں ع

آنکس که بداند و بداند که بداند   خود را بسر مسندِ اعزاز نشاند
وانکس که نداند و بداند که نداند   اونیز خرِ خویش بمنزل برساند
وانکس که بداند و بداند که نداند   اسپِ طلب از گنبد گردوں بجهاند
وانکس که نداند و بداند که بداند   درجهلِ مرکب ابد الدهر بماند

ترجمہ: وہ شخص جو کہ جانتا ہو (علم رکھتا ہو) اور جانتا ہو کہ وہ جانتا ہے اپنے آپ کو مسندِ اعزاز پر بٹھا دیتا ہے۔ اور وہ شخص جو نہ جانتا ہو (علم نہ رکھتا ہو) اور وہ یہ جانتا ہو کہ میں نہیں جانتا وہ بھی اپنی سواری کو منزل پر پہنچا دے گا۔ اور وہ شخص جو جانتا ہو اور جانتا ہو کہ میں نہیں جانتا وہ بھی اپنے طلب کی سواری کو آسمان سے دوڑا دے گا۔ اور وہ شخص جو نہ جانتا ہو اور یہ خیال کرتا ہو کہ میں جانتا ہوں وہ ہمیشہ جہلِ مرکب میں رہے گا۔

چنانچہ حضور ﷺ کے:

''لَآ اُحۡصِیۡ ثَنَآءً عَلَیۡكَ''

(صحیح مسلم: جلد ۲، رقم: ۱۱۱۸، دار الجیل بیروت)

میں تیری صفات شمار نہیں کر سکتا۔

فرمانے کا بھی یہی راز ہے۔

استحاقِ جنت رحمت سے ہوگا نہ عمل سے:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ!

قیامت کے دن ایک شخص کا نامۂ اعمال دربارِ ربُّ العزت میں پیش ہوگا۔ اللہ تعالیٰ اعمال نامہ کی جانچ کروانے کے بعد ارشاد فرمائے گا۔ کہ اچھا اے فرشتو! اسے میری رحمت کی وجہ سے جنت میں لے جاؤ۔ وہ شخص عرض کرے گا باری تعالیٰ آپ کی رحمت کا یہاں کیا سوال ہے۔ یوں آپ کیوں نہیں فرماتے کہ اس کو اس کے حق کی وجہ سے جنت میں لے جاؤ۔ کیونکہ میں نے آپ کے تمام احکام کو مانا۔ آپ کی نعمتوں کا شکر یہ ادا کیا۔ فرائض۔ واجبات اور سنن وغیرہ کا خیال رکھا اطاعتِ رسول سے ذرا بھی سر نہ موڑا۔ اب تو میرا حق ہے کہ میں جنت میں جاؤں۔ حکم ہوگا اے فرشتو! اچھا اس کا حساب کرو اور ہمارے احسان وانعام کے مقابلہ میں اس کے شکر کو جانچو۔ چنانچہ پڑتال شروع ہوگی اور اس صاحب کے تمام اعمالِ حسنہ شکر اور حمد صرف ایک آنکھ کی نعمت کا بھی پورا بدلہ نہ ہوسکیں گے۔ آنکھ کا کھلنا۔ اس کا بند ہونا۔ پلکوں سے اس کی حفاظت اس کے مختلف حیرت انگیز پردے۔ اسکی قوت۔ اس کا سکڑنا۔ اسکی رطوبت وغیرہ انعامات کے مقابلہ میں اس کی تمام عبادات وطاعات ختم ہوجائیں گی۔ مگر ایک آنکھ کی نعمت کا شکریہ پورا نہ ہوگا۔ حکم ہوگا اچھا اے فرشتو۔ اس شخص کو اس کے حساب کی وجہ سے دوزخ میں لے جاؤ۔ اس وقت وہ فریاد وزاری کرے گا۔ کہ اے رب مجھے جنت میں ہی لے جانے کا حکم دیجئے۔ خواہ وہ آپ کی رحمت ہی کے باعث ہو۔ اللہ تعالیٰ اس کی فریاد وزاری پر رحم فرما کر دوبارہ جنت میں پہنچانے کا ارشاد فرمائے گا۔ اور کہے گا۔ کہ اے شخص تو پہلے ہی ہمارے فیصلہ پر راضی ہوجاتا تو تجھے اتنی کوفت نہ پہنچتی۔ سچ ہے۔

”اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ۙ“ (المعارج: ۱۹)

بے شک انسان بے صبر پیدا ہوا ہے۔ اسے اس کروٹ چین نہ اس پہلو آرام۔

شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ع

بندہ ہماں بہ کہ ز تقصیر خویش   عذر بدرگاہ خدا آورد
ورنہ سزاوار خدا وندیش   کس نتو اند کہ بجا آورد

ترجمہ: بندہ وہی بہتر ہے جو اپنی کوتاہی کا عُذر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرے، ورنہ اُس کی خدائی کے لائق اور شایانِ شان کوئی نہیں کرسکتا کہ (اپنے فرائض و بندگی) بجالائے۔

ہماری ناقص حمد کے مقبول ہونے کی وجہ:

اور جب پیغمبروں اور بزرگانِ دین کی حمد وثنا کا یہ حال ہے۔ کہ وہ خود اپنی دُرِّفشاں زبانوں سے اپنے قصورِ حمد اور عجز اور شکر کا اعتراف کریں تو پھر ہم کیا اور ہماری حمد وثنا کیا۔ ہماری حمد وثنا بھی سچ پوچھو تو طریقِ ادب اور تعظیمِ واجبہ کی کمی کو دیکھ کر ایک قسم کی بے ادبی معلوم ہوتی ہے۔

ہزار بار بشویم دہن بمشک و گلاب
ہنور نام تو گفتن کمال بے ادبی ست

اگر میں ہزار مرتبہ اپنے منہ کو مشک اور عرقِ گلاب سے دھولوں پھر بھی آپ کا نامِ نامی زبان سے ادا کرنا بے ادبی تصور کرتا ہوں۔

مگر یہ رب العزت کی کریمی ہے کہ ہمارے ناقص اور ہیچپر ز محامد (کسی کی تعریف نہ کرنا) کو بھی قبول فرما کر ہمارے وہم و گمان سے بھی زیادہ بدلہ عنایت فرماتے ہیں اور یہ قبولیت بعینہ ایسی ہے۔ جیسی کہ متحاضہ (حیض والی) کی نماز باوجود جریانِ خون کے وہ رحیم معبود قبول فرماتا ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں۔

ایں قبول ذکر تو از رحمت است
چوں نمازِ مستحاضہ رخصت ست

عبادت کی قبولیت رحمت الٰہی ہے جس طرح متحاضہ کی نماز میں سہولت ہے۔

الحمد کا لفظ مسلمانوں کو علومِ جدیدہ اور قدیمہ سیکھنے کی تلقین کرتا ہے:

اس کے علاوہ حامد کی ہر حمد اسکے مرتبہ علم کے مطابق ہوتی ہے۔ جس قدر کسی شخص کو اللہ تعالیٰ کی حکمتوں اور اسرار سے زیادہ واقفیت ہوگی۔ اسی قدر اس کی حمد کا درجہ بھی زیادہ ہوگا۔ مثلاً ایک شخص شہد کی مکھیوں کو دیکھتا ہے۔ اور ان سے شہد حاصل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی حمد کرتا ہے۔ دوسرا مکھیوں کو دیکھتا ہے۔ اور ان سے شہد حاصل کر کے شہد کے مختلف رنگوں کو بھی ذہن میں رکھ کر حمد کرتا ہے۔ تیسرا مکھی۔ شہد اور الوانِ مختلفہ (**مختلف رنگ**) کے علاوہ اس کے طریقہ رہائش۔ اس کے دور دراز جانے اور پھولوں سے خوراک حاصل کر کے پھر ٹھیک اپنے مقام پر واپس آنے کے عجائبات کا مطالعہ کرنے کے بعد حمد کرتا ہے۔ اور چوتھا تیسرے کی تمام باتوں کے ساتھ مکھی کے مسدس گھر۔ اس کے چھتے اور اس کی کاریگری کو دیکھ کر رب العزت کی حمد بیان کرتا ہے۔ تو کیا آپ اب یوں سمجھیں گے کہ حمد کے لحاظ سے ان چاروں کا درجہ برابر ہے۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ پہلے سے دوسرے اور دوسرے سے تیسرے اور تیسرے سے چوتھے کی حمد کا مرتبہ اعلیٰ ہے۔ کیونکہ حمد کرتے وقت چوتھے کا ذہن دوسروں سے حمد کے پہلو بہت زیادہ ملحوظ رکھ رہا ہے۔ اس واسطے ان چاروں کی حمد کا اتحاد اور فرق بعینہ اس طرح ہے۔ جس طرح قرآنِ پاک پیغمبروں کے متعلق ایک جگہ تو فرماتا ہے:

”لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهٖ قف“ (البقرۃ: ۲۸۵)

ہم اس کے کسی رسول پر ایمان لانے میں فرق نہیں کرتے۔

مگر دوسری جگہ:

”تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ “ (البقرۃ: ۲۵۳)

یہ رسول ہیں کہ ہم نے ان میں ایک کو دوسرے پر افضل کیا۔

اب پہلی آیت سے تو معلوم ہوتا ہے کہ رسالت اور پیغمبری میں سب رسول برابر ہیں۔ یعنی ان کے منجانب اللہ اور خدا کی طرف سے رسول ہونے میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن دوسری میں بتایا ہے کہ ہاں مراتبِ رسالت میں وہ ایک دوسرے سے متفاوت ہیں اور بعض کو بعض پر فضیلت حاصل ہے۔ جیسے دال ہونے میں ارہر۔ مسور۔ چنا۔ مونگ وغیرہ سب برابر ہیں۔ مگر مرتبہ غذا اور قیمت میں وہ ایک دوسرے سے مختلف

ہیں۔ اسی طرح نفس حمد کے لحاظ سے ان چاروں کی حمد کہلائے گی۔ مگر مرتبہ کے لحاظ سے ان حامدین کے حمدوں میں ایک اور ہزار کا فرق ہوگا۔

مسلمانوں کی جہالت کا افسوسناک مظاہرہ:

یہ بحث میں نے اس جگہ کیوں چھیڑ دی اور اس نکتہ کو بیان کرنے کی مجھے کیا ضرورت پیش آئی۔ اس کی ضرورت یہ تھی کہ آپ کو معلوم ہو جائے۔ کہ قرآنِ پاک اُمتِ محمدیہ کو تمام علوم کے حاصل کرنے اور دقائقِ قدرت کے کھودنے کی کس قدر ترغیب دیتا ہے۔

مگر افسوس کہ آج وہ قوم جسے پیشوائے امم اور دنیا کا رہنما بنا کر بھیجا گیا تھا۔ دنیا تو خیر۔ دین کی تعلیم سے بھی ایسی بے خبر ہے کہ جس کا بیان زخمی دل پر نمک چھڑکنے سے کم نہیں۔

آج چند دن ہوئے کہ یہاں ہی کے جنگل سے ایک استفتا آیا۔ جس میں سائل نے پوچھا کہ اگر کسی مسلمان کو بلا جنازہ دفن کر دیا جائے۔ اور اب جنازہ پڑھنے کا خیال ہو تو کیا کیا جائے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ایک مسلمان کو انہوں نے بلا جنازہ کیوں دفن کیا ہوگا۔ اور پھر اب تین چار دن کے بعد اس پر پڑھنے کا خیال کیوں پیدا ہوا ہوگا۔ جواب کے ساتھ میں نے ان سے یہ بھی پوچھا کہ ایسا معاملہ کیوں ہوا۔ چنانچہ ان لوگوں نے لکھا کہ ہمارے مولوی صاحب گاؤں سے باہر کسی کام کو گئے ہوئے تھے۔ اور یہ معلوم نہ تھا کہ کب آئیں گے۔ اسواسطے مردہ کو گھر رکھنا مناسب معلوم نہ ہوا۔ اب چونکہ مولوی صاحب واپس آگئے ہیں۔ اس لئے مسئلہ پوچھنے کی ضرورت ہوئی۔

مسلمانو! غور کرو۔ ہم دین و دنیا کے علوم میں کس قدر پیچھے رہ گئے۔ دنیا تو جا ہی چکی تھی۔ اب جو تھوڑا سا دینی تعلق تھا۔ وہ بھی رخصت ہونے کو ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج ہماری حمد ایسی سطحی اور بے معنی ہے کہ دربارِ قبولیت میں اسے باریاب ہی نہیں ہونے دیا جاتا۔ ورنہ یہ محال ہے۔ کہ مقبولیت کے بعد محامد کا اثر ہمارے جسم و جان اور رگ و ریشہ پر ظاہر نہ ہوتا۔

علمائے متقدمین نے علوم کو کس طرح تقسیم کیا:

جب کامل حمد کرنے کے لئے یہ ضروری ہے۔ کہ ہم سے جس قدر بھی ہو سکے دقائقِ قدرت کا احاطہ

کریں۔ اور تمام قدیم و جدید علوم کو حاصل کریں کہ جس سے ہماری حمد میں کچھ جان پیدا ہو۔ ورنہ تصویر بلا روح کی طرح ہماری حمد کسی کام کی نہیں لہٰذا میں مختصراً یہ بھی عرض کئے دیتا ہوں کہ اگلے مسلمانوں نے جن کا جھنڈا اس وقت کی معلوم شدہ دنیا کے کونے کونے پر لہرا رہا تھا۔ دقائق قدرت کی تفتیش کے لئے کیا کیا علوم ایجاد کئے اور متاخرین کے لئے انہوں نے کیا اسوہ چھوڑا۔ ان لوگوں نے اس سب عالم کو دو حصوں پر تقسیم کیا۔ عالمِ مجردات۔ یعنی وہ چیزیں جو عناصر اور مادہ سے پاک ہیں۔ جیسے فرشتے اور ارواح دوسرے عالمِ جسمانیات۔ یعنی وہ چیزیں جو مادی ہیں۔ پھر عالمِ جسمانیات کو دو حصوں پر تقسیم کیا۔ عالمِ علوی یعنی اوپر کا جہاں۔ جس میں چاند سورج تارے اور سیارے وغیرہ آ گئے۔ اور دوسرے عالمِ سفلی یعنی نیچے کا جہان۔ جس میں دریا۔ چرندے پرندے۔ انسان اور زمین کی سب چیزیں آ گئیں۔ پھر اس کے بعد عالمِ سفلی کی دو قسمیں بنائیں۔ ایک عالم بری یعنی خشکی کا جہاں اور دوسرا عالمِ بحری یعنی دریائی۔ جہاں پھر عالمِ بری کو تین حصوں پر تقسیم کیا۔ عالم جمادات۔ جس میں مٹی پتھر۔ چاندی۔ سونا۔ لعل وغیرہ سب آ گیا۔ دوسرا عالمِ نباتات یعنی درخت گھاس سبزیاں وغیرہ۔ تیسرا عالمِ حیوانات یعنی تمام جانداروں کا جہان جس میں انسان گھوڑا۔ گدھا۔ درندے وغیرہ سب آ گئے۔

یہ ایک بالکل موٹی اور نہایت بھدی سی تقسیم کر کے بتائی ہے۔ ورنہ اگر دقتِ نظری اور باریک بینی سے تقسیم کر کے تفصیل کی جائے۔ تو اس کے لئے بہت سے وقت کی ضرورت ہے۔ آپ صرف اس موٹی ہی تقسیم پر غور فرمائیں تو معلوم ہو گا۔ کہ مسلمانوں نے وقائقِ قدرت کے سمجھنے کیلئے اسی تقسیم کے لحاظ سے کس قدر علوم ایجاد کئے ہوں گے۔ مگر افسوس کہ آج جو ہم ان کی اولاد ہیں کسی علم کو ایجاد کرنا تو درکنار دوسروں کے ایجاد کئے ہوئے علوم سے فائدہ تک بھی نہیں اٹھا سکتے اور اسی بے اعتنائی کا باعث ہے کہ آج ہم ذلت و رسوائی کی چکیوں میں پسے جاتے ہیں۔ غور تو کرو کہ کس طرح قرآن پاک کا پہلا لفظ ہی مسلمانوں کو دنیا جہاں کے علوم حاصل کرنے کی دعوت دیتا ہے اور کس طرح منہ سے حمد کا لفظ کہلا کر حمد کی حقیقت میں غور کرنے اور محامدِ ربی کی باریکیاں سوچنے کی رغبت دلاتا ہے۔ مگر ہم ہیں کہ:

”وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ“ (اور انہوں نے ایسی قدر نہ کی جیسا کہ قدر کرنے کا حق ہے (انعام: ۹۱)

کی آیت کا مصداق بن رہے ہیں۔

لفظ حمد سے ابتدا اور انتہا ہے:

حمد کے لفظ سے ابتدا کر کے انسان کو اس بات پر بھی متنبہ کیا گیا کہ اے انسان تیرے ساتھ جو کچھ میں کر رہا ہوں۔ یا آئندہ کروں گا وہ سب کا سب میری رحمت اور نوازش کا باعث ہے۔ تیرا مجھ پر کچھ قرض یا حق نہیں۔

سچ ہے۔

ما نبودیم و تقاضا ما نبود
لطف تو ناگفتۂ ما مے شنود

ترجمہ: ہم بھی نہیں تھے اور ہمارا تقاضا بھی نہ تھا اور تیری مہربانی ہماری نہ کہی ہوئی باتوں کو بھی سن لیتی تھی۔

اسواسطے تجھے چاہئے کہ ان انعامات ونوازشات کا شکریہ ادا کرتا رہ۔ تاکہ دنیا میں زیادتی انعام کے علاوہ آخرت میں تیرا مقام اس جگہ ہو۔ جہاں کی کلام کا خاتمہ بھی انہی الحمدللہ رب العلمین کے الفاظ پر ہوگا اور وہ مقام کونسا ہوگا۔ وہ مقام جنت ہے۔ جہاں جنتی کہیں تو!

''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ هَدٰىنَا لِهٰذَا''(اعراف: ۴۳)

سب خوبیاں اللہ کو جس نے ہمیں اس کی راہ دکھائی کہیں گے۔

تو کہیں ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ''۔ سب خوبیاں اللہ کو جس نے اپنا وعدہ ہم سے سچّا کیا۔

(الزمر: ۷۴)

اور ان کے کلام کا خاتمہ:

''وَقِیْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ''۔ (الزمر: ۷۵)

اور کہا جائے گا کہ سب خوبیاں اللہ کو جو سارے جہان کا رب۔

کے الفاظ پر ہوگا۔ تو کیسی پاک ہونگی وہ ہستیاں جن کے کلام کی ابتدا اور انتہا الحمدللہ رب العلمین پر ہوگی۔ اے اللہ ہم سبھوں کو بھی اپنے حبیب لبیب ﷺ کے صدقے سے اسی پاک گروہ میں جگہ عنایت فرمانا۔ آمین

ذاتِ باری کیلئے تمام تعریفوں کے خاص ہونے کیوجہ "لِلّٰہ":

لام بمعنی واسطہ یعنی تمام تعریفیں ثابت ہیں۔ واسطے اللہ کے۔ اللہ کے متعلق بسم اللہ کی تفسیر میں بہت کچھ بیان ہو چکا ہے۔ ہاں اتنا یہاں اور سمجھ لینا چاہئے کہ **الحمدلِلّٰہ** میں سب تعریفیں اللہ تعالیٰ کیلئے خاص ہونے کا دعویٰ کیا گیا ہے اور ہر دعوے کے لیے دلیل کی ضرورت ہے کیونکہ دعویٰ بغیر دلیل کے قابلِ سماعت ہی نہیں۔ اور جب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے دعوے کو بلا دلیل قبول نہیں فرماتے تو خود اپنے اتنے بڑے دعوے کو بلا دلیل کیسے چھوڑ سکتے تھے۔ مفصل دلیل تو "رب العالمین" اور "الرحمن الرحیم" میں آتی ہے۔ مگر غور کرنے سے اسی دعویٰ "الحمدللہ" ہی میں ثبوت بھی پایا جاتا ہے۔ اور یہ ایسی بات ہے کہ انسانی کلام ہزار فصاحت و بلاغت سے بھرا ہوا ہونیکے باوجود ایسے اسرار و نکات سے معرا ہوتا ہے۔ دیکھئے اللہ کے متعلق آگے بیان ہو چکا ہے۔ کہ اللہ نام ہے اس ذات کا جو مجمع ہے۔ تمام صفات کمالیہ جمالیہ اور جلالیہ کا اور جب اللہ نام ہوا ایسی ذات کا کہ جس کا مقابلہ عالم کا کوئی فرد بھی نہ کر سکے۔ تو پھر حمد کا ثبوت اس کے لئے نہ ہو تو اور کون اس عزت و وقار کا مستحق ہو سکتا ہے۔

انسانوں کی حمد کرنے پر اعتراض اور اس کا جواب:

ہاں اس سے ایک اعتراض یہ ہو سکتا ہے۔ کہ جب کوئی غیر اللہ حمد کے لائق نہ رہا۔ پھر انسانوں کی حمد کیوں کی جاتی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت میں وہ حمد نہیں ہوتی۔ بلکہ مدح کو حمد سمجھ لیا جاتا ہے۔ کیونکہ تعریف کا نام اختلافِ محمود سے مختلف ہو جاتا ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کی حمد کی جاتی ہے۔ تو اسے حمد کہا جاتا ہے جب کسی پیغمبر کی تعریف کی جاتی ہے۔ تو اس کا نام نعت ہو جاتا ہے۔ جب کسی ولی یا صالح کی تعریف کی جاتی ہے تو وہ منقبت کہلاتی ہے اور جب عام انسانوں کی تعریف کی جاتی ہے تو اسے مدح کہتے ہیں۔ مگر عام طور پر لوگ اس میں تمیز نہیں کرتے اور ایک لفظ کو دوسرے کے لئے غلط طور پر استعمال کر لیتے ہیں۔

اس کے علاوہ اگر غلط العام صحیح کا لحاظ رکھا جائے۔ یا حمد کے استعمال کو عام مانا جائے تو بھی غیر اللہ کی حمد سے ہماری تقریر پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ کسی غیر اللہ کی حمد بھی حقیقت میں اللہ ہی کی حمد ہے۔ کیونکہ اس محمود انسان اور اس کے محمود افعال کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے۔ اسی نے اس کو افعال حسنہ کے کرنے پر

قدرت دی ہے۔ اس کے لئے اسباب کو جمع فرمایا ہے۔ اسی واسطے کسی غیر اللہ کی تعریف درحقیقت اللہ تعالیٰ ہی کی تعریف ہے۔ جیسے ایک کھلونے کی تعریف کی جائے اور اس کو سراہا جائے تو حقیقت میں یہ تعریف کھلونے بنانے والے کی ہے اور پھر کھلونے کے بنانے والے کی بھی تعریف سے بڑھ کر وہ اللہ تعالیٰ کی تعریف ہے۔ کیونکہ اس کا خالق اس کو اس کام کی قدرت دینے والا اس کے بنانے کے اسباب دینے والا اور پھر اس کے اس کام پر نتیجہ مرتب کرنے والا اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ اس واسطے جہاں جس جگہ اور جو بھی حمد ہوگی وہ حقیقتاً ذات باری ہی کی حمد کہلائے گی۔

چھینک کے متعلق:

''الحمد'' کی تفسیر میں یہ مسئلہ بھی یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں!

اِذَا عَطَسَ اَحَدُکُمْ فَلْیَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِینَ وَلْیَقُلْ لَہُ مَنْ یَرُدُّ عَلَیْہِ یَرْحَمُكَ اللّٰہُ وَلْیَقُلْ یَغْفِرُ اللّٰہُ لَنَا وَلَکُمْ۔

(سنن ترمذی: الجز ۴، رقم: ۲۷۴۰، دار الغرب الاسلامی)

یعنی جب تم میں سے کوئی چھینک مارے تو چاہیے کہ کہے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' اور چاہئے کہ جواب دینے والا کہے ''یَرْحَمُكَ اللّٰہُ'' پھر عاطس (چھینکنے والا) کہے ''یَغْفِرُ اللّٰہُ لَنَا وَلَکُمْ''۔

امام ابوحنیفہ کے نزدیک چھینک کا جواب واجبِ کفایہ ہے۔ یعنی مجلس سے ایک کا ''یَرْحَمُكَ اللّٰہُ'' کہہ دینا جواب کے لئے کافی ہے۔ مگر بعضوں نے اسے سنتِ کفایہ اور بعضوں نے مطلق سنت کہا ہے۔ مگر یہ جواب اسی وقت ہے۔ کہ چھینکنے والا ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ'' کہے اور اس کی حمد سنی جائے اگر وہ حمد نہ کہے یا کہے مگر اتنی آہستہ کہ بالکل سنی ہی نہ جائے تو وہ جواب کا بھی مستحق نہ ہوگا۔

ترمذی شریف میں آتا ہے کہ!

یہودی لوگ حضور کے پاس آ کر چھینک مارتے اور اس امید پر زور سے الحمدللہ کہتے کہ حضور جواب میں ''یَرْحَمُكَ اللّٰہُ'' فرمائینگے۔ مگر آپ یہود کی چھینک کا جواب ''یَھْدِیْکُمُ اللّٰہُ وَیُصْلِحُ بَالَکُمْ'' (اللہ تعالیٰ تم کو ہدایت دے اور تمہارے دلوں کی اصلاح فرمادے) کے الفاظ سے دیتے۔

مسلمانوں کے لئے غور کرنے کا مقام:

مسلمانو! غور کرو۔ اسلام نے ایک مسلمان کو دوسرے کا کس قدر خیر خواہ بنایا ہے۔ چھینکتا تو کوئی ہے مگر اس کے لئے رحمت کا مطالبہ کوئی کر رہا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک مسلمانوں کی یہ حالت تھی۔ کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کے لئے اپنے نفس اپنے اہل وعیال اور خویش واقارب سے زیادہ بہتری چاہتے تھے۔ تو مسلمانوں کے اتفاق، اتحاد اور یگانگت کی دنیا میں دھاک بندھی ہوئی تھی۔ مگر جب سے یہ خود غرض ہو گئے۔ مسلمان مسلمان کا دشمن بن گیا۔ اگر ایک مسلمان گرتا ہے۔ تو دوسرا اس کو لتاڑنے کی کوشش کرتا ہے۔ تو اس کا نتیجہ آج ہم اپنے خسرانِ ذلت اور بے وقعتی کی صورت میں دیکھ رہے ہیں۔

ایک مسلمان کے دوسرے پر چھ حقوق ہیں:

حضور رسید المرسلین ﷺ فرماتے ہیں کہ! ایک مسلمان کے دوسرے پر چھ حق ہیں۔

"يُسَلِّمُ عَلَيْهِ اِذَا لَقِيَهُ ، وَيُجِيْبُهُ اِذَا دَعَاهُ ، وَيُشَمِّتُهُ اِذَا عَطَسَ ، وَيَعُوْدُهُ اِذَا مَرِضَ ، وَيَتْبَعُ جِنَازَتَهُ اِذَا مَاتَ ، وَيُحِبُّ لَهُ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهِ۔

(سنن ترمذی: جلد ۴، رقم: ۲۷۳۶، دار الغرب الاسلامی)

یعنی جب اسے ملے تو سلام دے۔ جب اس کی دعوت آئے تو قبول کرے۔ جب وہ چھینکے تو "يَرْحَمُكَ اللّٰهُ" کہے۔ جب وہ بیمار ہو تو عیادت کرے جب اس کا انتقال ہو جائے تو جنازہ پر جائے۔ اور جو اپنے لئے پسند کرتا ہے وہ اس کے لئے بھی پسند کرے۔

سلام اور اس کی خوبیاں:

دیکھو اللہ کے پیارے رسول نے کیسے اخلاق اور اتفاق کے اصول ہم کو سکھائے۔ مگر افسوس کہ ہم نے اس رحمۃ للعالمین کے پڑھائے ہوئے سبق کو بھلا ڈالا۔ آج ہم میں سلام کا رواج بہت کم ہو رہا ہے۔ بہت ہوا تو کہیں آداب عرض کہہ دیا۔ اور کہیں گڈ مارننگ کہہ دیا۔ کہیں تسلیمات کہہ کر سلام کیا تو کہیں صرف ہاتھ اٹھا دینا کافی سمجھ لیا۔ مگر وہ دعائیہ کلمات جو تاجدار مدینہ کے سکھائے ہوئے مبارک الفاظ۔ وہ عربی کا میٹھا۔ شیریں اور قربان ہو جانے کے قابل السلام علیکم جیسا جملہ چھوڑ دیا۔ غور تو کرو۔ ان دو لفظوں میں کتنے بڑے

اہم راز کو ودیعت کیا گیا ہے۔ ایک تو دوسرے مسلمان کے لئے سلامتی کی دعا کہ اے بھائی خدا تجھ پر سلامتی نازل فرمائے۔ جس کے جواب میں دوسرا مسلمان وعلیکم السلام کہہ کر ایسی ہی دعا اس کے لئے بھی کرتا ہے۔ گویا ہر مسلمان کو وصیت کی جا رہی ہے کہ تو اپنے دوسرے مسلمان بھائی کی تن من دھن اور ہر اعتبار سے سلامتی کی خواہش کر۔ اس کا نتیجہ کیا ہو سکتا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ پہلے پہلے تو محض الفاظ رہیں گے۔ مگر جیسے اللہ اللہ کرنے سے انسان مع اللہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح زبانی سلامتی کی دعا سے قوم کا رجحان عملی سلامتی کی طرف مائل ہو گا۔ ایک مسلمان دوسرے کو اپنے سے زیادہ سلامت اور مامون دیکھنا عملاً پسند کرے گا۔ اور جب ہر مسلمان میں یہ قابل افتخار جذبہ پیدا ہو جائے گا۔ تو پھر کون سی قوم ہے۔ جو مسلمان کو نیچا دکھا سکتی ہے۔

مگر افسوس آج عمل تو درکنار الفاظ بھی نہیں رہے۔ کہ دوسرے مسلمان کے لئے زبانی ہی سلامتی کی دعا کریں۔ آج تو محکوم اور غلام ہونے کے باعث حاکم اور آقا کی ہر ہر حرکت و سکون ہمارے دلوں کو مسخر کئے ہوئے ہے۔

مغربی رنگ و روش پر کیوں نہ آئیں اب قلوب
قوم ان کے ہاتھ میں تعلیم ان کے ہاتھ میں

آج ہمارا لباس ہماری چال۔ ہماری روش اور ہماری نشست و برخاست تک سب غیروں کی محکوم نظر آتی ہے۔ اور وہ اس قدر ہمیں مرغوب و محبوب ہے کہ اس کے لئے اسلام کی اہم سے اہم چیز کو قربان کر دینا بھی ایک معمولی سا کام دکھائی دیتا ہے۔

جنگِ بدر میں ایثار کامل کا مظاہرہ:

جنگ بدر میں چند صحابہ سخت زخمی ہوئے۔ ایک نے پانی مانگا جب اس کے پاس پانی لایا گیا۔ تو اس نے دیکھا۔ کہ اس کا دوسرا مسلمان بھائی قریب ہی زخموں اور پیاس میں شدت سے کراہ رہا ہے۔ اس نے پانی لانیوالے سے اشارہ کیا۔ کہ وہ شخص مجھ سے پانی کا زیادہ مستحق ہے۔ میں اپنی سلامتی پر اس کی سلامتی کو ترجیح دیتا ہوں۔ وہ جب اس کے پاس پہنچا۔ تو اس نے اپنے قریب والے مسلمان کی طرف جو اسی طرح مجروح اور پیاسا تھا۔ اشارہ کیا۔ کہ اس کو پانی پلا۔ کیونکہ اس کی زندگی خدمت اسلام کے لئے مجھ سے زیادہ قیمتی

اور ضروری ہے۔ چنانچہ جب پانی والا اس کے پاس پہنچا۔ تو اس نے دوسرے کی طرف اشارہ کیا۔ یہاں تک کہ چالیس جاں بلب انسانوں کے پاس پانی کا پیالہ پھرایا گیا۔ مگر ان خدا کے بندوں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پروانوں نے اپنی زندگی اور سلامتی پر دوسرے کی سلامتی حیات کو ترجیح دی۔ اور سب کے سب اسی پاک جذبہ سے بھرے ہوئے دلوں کیساتھ جام شہادت پی گئے۔ دیکھا مسلمان اس طرح دوسرے مسلمان کی صحت وسلامتی کی خواہش کیا کرتے تھے۔ اور پھر یہ بھی معلوم ہے کہ انہیں اس ایثار کا بدلہ کیا ملا۔ اس کا معاوضہ انہیں یہ دیا گیا کہ ایک مٹھی بھر صحابہ نے قیصر وکسری کے محلات کو لرزا دیا۔ ایران وروم کی مسلح فوجوں کو ایسی شکست دی کہ ایرانی نہایت تعجب سے کہتے تھے۔

زشیرِ شتر خوردن سوسمار   عرب را بجائے رسید ست کار
کہ تخت کیاں را کنند آرزو   تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو

یعنی اے آسمان یہ ہم کیا دیکھ رہے ہیں۔ کہ اونٹ کا دودھ پینے والے اور گوہ کا گوشت کھانے والے عربوں کے حوصلے اس قدر بڑھ گئے ہیں۔ کہ آج وہ کیقباد وخسرو جیسے کیانی خاندان کے پُر رعب و باوقار بادشاہوں کے تاج وتخت کی آرزو کرنے لگے ہیں۔

آج مسمان باوجود کثیر التعداد ہونے کے کیوں زبوں حالی کا شکار ہیں:

مگر آج جب کہ ہماری تعداد پانی کے جراثیم سے بھی زیادہ ہے۔ ہم صدیوں کے حاکم ہونے کے باوجود محکوم بنا دیئے ہیں۔ تہذیب وتمدن میں تمام دنیا کی استاد قوم آج ذلت ونکبت، افلاس ویاس کا شکار رہے کیوں؟ اس لئے کہ آج ہمیں اپنی جان بھائی کی جان سے اور اپنا آرام بھائی کے آرام سے زیادہ عزیز ہے۔ اور اگر صرف اسی پر اکتفا کی جاتی۔ تو پھر بھی شاید ہمارے حالات کچھ نہ کچھ روبۂ اصلاح نظر آتے مگر آج تو جس طرح ہیرے کو ہیرا کاٹتا ہے۔ ہم اپنی قوم کے بیری ہو گئے ہیں۔ اپنی قوم کے غدار بنے اور خود اپنے ہاتھوں اپنی قوم کو گڑھے میں دھکیلا۔ اسلام کہتا ہے۔

من از بیگانگا ہرگز ننالم

که با من ہر چه کرد آن آشنا کرد

یعنی میں کسی بیگانے کی شکایت نہیں کرتا۔ میرے ساتھ جو کچھ کیا ہے انہی نام نہاد اپنوں نے کیا ہے۔ دنیا کی کوئی قوم مسلمانوں کی جرات وشجاعت اور تدبر وتفکر کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ مگرہاں غداری کا کوئی علاج نہیں۔

اپنوں کی عداوت پر ایک دلچسپ حکایت:

کہتے ہیں کہ ایک صاحب حال شخص ایک جنگل سے گزر رہے تھے۔ آپکے ہاتھ میں کلہاڑی کا پھل تھا۔ آپ نے دیکھا کہ جنگل کے درخت جھوم جھوم کر خوشی کے ترانے گا رہے ہیں۔ اور اللہ جل شانہ کی تسبیح و تقدیس میں مشغول ہیں۔ غم اور ملال کا جنگل میں نشان تک نہیں آپ کو خیال آیا کہ جلانے کے لئے لکڑیوں کا ایک گٹھا بھی ساتھ لے جانا چاہئے۔

چنانچہ آپ نے ایک لکڑی کا ڈنڈا لیا اور اسے دستہ بنا کر کلہاڑی کے پھل میں ٹھونکا۔ کلہاڑی کے پھل میں دستے کا لگانا تھا۔ کہ تمام جنگل سے زار و فریاد کی آوازیں آنے لگیں۔ آپ کو نہایت تعجب ہوا کہ ابھی تو سب جنگل خوشیاں منا رہا تھا۔ اور ابھی تھوڑی ہی دیر میں وہ سب خوشی غم کے ساتھ بدل گئی۔ چنانچہ آپ نے درختوں سے اس فوری انقلاب کا سبب پوچھا۔ تو ایک بوڑھے درخت نے آپ کے ہاتھ کی طرف اشارہ کیا۔ کہ ہمارا سب غم اس کی وجہ سے ہے۔ آپ نے فرمایا اے درخت یہ تو جب سے میں جنگل میں داخل ہوا ہوں میرے ہاتھ میں تھا۔ مگر اس پر بھی تم تو خوشیاں منا رہے تھے۔ بوڑھے درخت نے عرض کی۔ حضرت آگے آپ کے ہاتھ میں صرف لوہے کا پھل تھا جو کہ غیر جنس سے تھا اور ہم غیر جنس سے بالکل نہیں ڈرتے۔ کیونکہ وہ ہم کو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ مگر اب یہ دستہ جو ہماری جنس کا ہے۔ اس غیر جنس لوہے کے ساتھ مل گیا ہے۔ اس واسطے اب ہم کو غم ہے کہ یہ اپنا ہم جنس غداری کر کے ہماری بربادی وتباہی کا باعث بنے گا۔ تو بھائیو! بات یہ ہے کہ آج مسلمان اور اسلام بھی مسلمانوں ہی کے ہاتھوں سے برباد ہو رہا ہے۔

دل کے پھپھولے جل اٹھے سینے کے داغ سے
اس گھر کو آگ لگ گئی ، گھر کے چراغ سے

مسلمان ہی مسلمان کو کاٹتا ہے:

آج دنیا میں مسلمانوں کا زوال انہی بے غیرت مسلمانوں کی وجہ سے ہے۔ جنہوں نے غیروں کو اپنے دین وطن اور قوم پر ترجیح دی۔ اور اجنبیوں کے ساتھ مل کر اپنے ایک خدا۔ ایک رسول ایک کتاب پر ایمان رکھنے والے بھائیوں کے دلوں کو چور چور کیا۔ اپنے وطن عزیز کو خود غیروں کے سپرد کیا۔ اپنی غداریوں سے اپنے بھائیوں کو خود ذلت، پستی اور محکومیت کے جال میں پھنسایا۔

اللہ جل شانہ تو فرماتا ہے!

”وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرَى بِظُلْمٍ وَاَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ“ (ہود:۱۱۷)

یعنی رب العزت کبھی بھی کسی بستی کو ظلم سے تباہ نہیں کرتے جب تک کہ ان کے رہنے والے نیک اور صالح ہوں۔

پس حکم ربی کے مطابق ہم اس ذلت وخواری کے مستحق تھے جو ہمیں دی گئی اور ہم اس ظلم کے خود ذمہ دار ہیں جو آج ہمارے سروں کو چکیوں میں پیس رہا ہے۔

مسلمانو! حضور ﷺ کے فرمان کو دل وجان سے پکڑ لو اس پر عمل کرو۔ سچے مسلمان بن جاؤ۔ دوسرے مسلمان بھائیوں کی سلامتی کو اپنی سلامتی پر مقدم سمجھو۔ پھر دیکھو کہ قوم کیسی سرسبز وشاداب ہوتی ہے۔ پھر دیکھو کہ مسلمانوں کے ایثار اور قربانیوں کا کس قدر شاندار نتیجہ نکلتا ہے۔ اللہ جل شانہ فرماتا ہے!

وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ۔ (المنافقون:۸)

یعنی عزت تو اللہ اس کے رسول اور مسلمانوں کے لئے ہے۔

مگر آہ! مسلمان کہاں۔ قرآن وحدیث کی تعریف کے مطابق آج مسلمان کا ملنا کبریت احمر کا حکم رکھتا ہے۔ مسلماناں در گور و مسلمانی در کتاب۔ بھائی جلے ہوئے دل کی فریاد لمبی ہوتی ہے۔ اسی واسطے کہاں سے کہاں نکل گئے۔

اندکے باتو بگفتم وبدل تر سیدم
کہ دل آزردہ شوی ورنہ سخن بسیا راست

ترجمہ: آپ کے ساتھ تھوڑی سی بات میں نے کہہ دی اور دل میں ڈرتا رہا کہ تو آزردہ دل ہو جائے گا (تیرا دل خفا ہو جائے گا) ورنہ کہنے کے لیے تو باتیں بہت سی ہیں۔

پھر آپ کی توجہ اصلی مطلب کی طرف منعطف کراتا ہوں۔ یعنی بیان یہ ہو رہا تھا کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ ایک مسلمان کے دوسرے پر چھ حقوق ہوتے ہیں۔ سلام دینا، دعوت قبول کرنا، چھینک کا جواب دینا، عیادت کرنا، جنازہ پر حاضر ہونا، اور خیر خواہی کرنا۔

دعوت کے قبول کرنے کے متعلق تفصیل:

دعوت کے قبول کرنے کے متعلق بھی تھوڑی سی تفصیل سن ہی لیجئے۔ دعوت قبول کرنے کو کیوں اسلامی حقوق میں داخل کیا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ اسلام ہی دنیا میں ایک ایسا مذہب ہے۔ جس نے ذات پات، گورے کالے، امیر غریب کی تمیز کو اٹھا کر اپنے پیروؤں میں اخوت، مؤدّت۔ یگانگت اور مساوات کو قائم کرنے کے لئے ہر بہترین اصول کو ضروری قرار دیا ہے۔ چونکہ دعوت کا قبول کرنا بھی اس مساوات و مؤدّت کو قائم رکھنے میں مدد دیتا ہے۔ اس لئے اسے بھی حقوق اسلام میں شامل کیا گیا۔ دیکھو جب دو آدمی ایک جگہ مل کر کھائیں گے۔ تو ان میں محبت پیدا ہوگی۔ پھر اگر غریب نے امیر کو یا کالے نے گورے کو دعوت دی۔ اور وہ اس کو منظور کر کے اس کے گھر جاتا ہے۔ تو گویا امارت اور رنگ کے امتیاز کو دور کر کے جو آج تمام دنیا کی بے چینی کا باعث بنا ہوا ہے۔ برادری اور بھائی چارے کی بنیاد ڈالتا ہے۔

اسی واسطے حضور ﷺ نے ایک حدیث میں فرمایا ہے!

‘‘تَهَادُوْا وَتَحَابُّوْا’’

یعنی ایک دوسرے کو ہدیہ دیا کرو۔ اس سے محبت پیدا ہوگی۔

مگر آج یہ رواج بھی مسلمانوں میں مفقود ہو رہا ہے۔ اور اگر ہے بھی تو شادی و بیاہ اور موت مرگ کی فضول خرچیوں کی صورت میں جس سے محبت تو درکنار افلاس احتیاج اور نفرت بڑھتی ہے۔ کیونکہ افلاس ایسی چیز ہے کہ اس کے باعث کتنا ہی عزیز کیوں نہ ہو ذلیل ہو جاتا ہے اور اپنے پرائے اس کے سائے سے ڈرتے ہیں۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

بوقت تنگدستی آشنا بیگانہ میگردد
صراحی چوں شود خالی جدا پیمانہ میگردد

مشکل وقت میں اپنے بھی پرائے ہو جاتے ہیں دیکھو جب صراحی خالی ہو جائے تو پیالہ اس سے علیحدہ رکھ دیا جاتا ہے۔

قرض کے مقراضِ محبت ہونے کی مثال:

لکھتے ہیں کہ ایک پیر صاحب سے کسی مرید نے شکایت کی کہ حضرت مخلوقات کے رجوع اور ملاقاتیوں کے ہجوم سے میری عبادتوں اور ریاضتوں میں بڑا خلل آتا ہے۔ آپ مجھے کوئی ایسی تجویز بتائیں کہ ان لوگوں کی آمد و رفت سے خلاصی مل جائے۔ پیر صاحب نے فرمایا کہ اگر تجھے لوگوں سے چھوٹنے کی خواہش ہے تو مالداروں سے تو قرضہ مانگ۔ وہ پھر کبھی بھی تیری طرف رخ نہ کریں گے۔ اور غریبوں کو قرضہ دے وہ بھی ادائیگی کے ڈر سے تیرے پاس نہ پھٹکیں گے۔ کیونکہ اَلْقَرْضُ مِقْرَاضُ الْمُحبة یعنی قرض کا کاروبار خواہ لینا ہو یا دینا محبت کی قینچی ہے۔

چنانچہ مرید صاحب نے جو اسے چند روز آزمایا تو نسخے کو تیر بہدف پایا۔

تو بھائی اسراف اور ان رسمی خرچوں سے محبت تو کجا الٹی نفرت بڑھتی ہے۔ اور اپنے پرائے خیال کرتے ہیں۔ کہ کم بخت فضول خرچیوں کی وجہ سے بنیوں کا شکار ہو چکا ہے۔ اب خواہ مخواہ ہم سے قرض مانگے گا۔ سچ ہے۔

سیہ بختی میں کب کوئی کسی کا ساتھ دیتا ہے
کہ تاریکی میں سایہ بھی جدا انسان سے رہتا ہے

افلاس میں دوستوں سے کیا توقع ہوسکتی ہے:

ایک بات یاد آگئی۔ شیخ سعدی صاحب نے فرمایا ہے کہ

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشاں حالی و در ماندگی

یعنی دوست وہ ہوتا ہے جو دوست کے ہاتھ پریشانی اور تکلیف کے وقت پکڑتا ہے۔ اور اس کی مال وجان سے مدد کرتا ہے۔

چنانچہ کسی جگہ دو شخص آپس میں لڑ رہے تھے کہ اتنے میں ایک کا دوست آ گیا۔ اور اس نے آتے ہی اپنے دوست کے ہاتھ مضبوطی سے پکڑ لئے۔ اب دوسرا ہے کہ تڑا تڑ ااس کے دوست کے سر پر جوتے لگا رہا ہے۔ اس شخص نے اپنے دوست سے کہا کہ کمبخت یہ تو کیا کر رہا ہے کہ میرے ہاتھوں کو مضبوط پکڑے ہوئے ہے نہ تو مجھے چھوڑتا ہے اور نہ میری مدد کرتا ہے۔ اور الٹا پٹوا رہا ہے۔ اس نے فوراً جواب دیا کہ بھائی شیخ سعدی کہہ گئے ہیں۔

دوست آں باشد کہ گیرد دستِ دوست
در پریشاں حالی و در ماندگی

میں ہاتھ نہ پکڑوں تو پھر دوستی کیا رہی۔ اس نے کہا۔ یار تو نے شیخ سعدی صاحب کا مطلب ٹھیک سمجھا۔ تو بھائی اس طرح جب آج کل انسان اسراف وتبذیر (فضول خرچی) کیوجہ سے اگر گر جاتا ہے تو پھر اوّل تو دوست ہاتھ ہی نہیں پکڑتے اور اگر پکڑتے بھی ہیں تو ایسے دوست کی طرح۔

خیال رکھو کہ سنت کی ادائیگی میں فرض نہ چھوٹ جائیں:

اس کے علاوہ یہ بھی یاد رکھو کہ آج کل دعوت کے قبول کرنے کی سنت تو بہت خوشی سے پوری کی جاتی ہے۔ کیونکہ اس میں کچھ کھانے کو مل جاتا ہے۔ مگر فرضوں کا لحاظ قطعاً نہیں رکھا جاتا۔ آپ پوچھیں گے کہ فرض کیا ہیں۔ میں آپ کو بتاتا ہوں۔ دیکھئے۔ رزقِ حلال کھانا ضروری ہے اور رزقِ حلال کی دعوت کو قبول کرنا سنت ہے۔ یہ نہیں کہ میزبان سود خور ہو۔ شراب کا بیچنے والا ہو یا سرکہ کا بیوپار کرتا ہو۔ اور پھر آپ محض سنت کی آڑ میں ایسے لوگوں کی دعوتوں میں دوڑ جائیں۔ یا دعوت ایسی جگہ ہو۔ جہاں منہیاتِ شرعیہ کا ارتکاب ہو رہا ہو۔ ایسا نہ ہو کہ شادی کی دعوت ہے۔ طوائف رقص کر رہی ہے۔ دید بازی ہو رہی ہے۔ طبلہ پر تھاپ پڑ رہی ہے۔ ستار و رباب اپنے جوہر دکھا رہے ہیں۔ مگر آپ سنت کو لئے ہوئے زیبِ مجلس بنے بیٹھے ہیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ

تیسرا حق چھینک کا جواب دینا ہے۔ اس کے متعلق پہلے کافی بیان ہو چکا ہے۔

عیادت کے متعلق:

چوتھا حق عیادت کرنا ہے۔ یعنی جب کوئی مسلمان بیمار ہو جائے تو اس کی بیمار پرسی کے لئے جانا۔ اسے بھی مسلمانوں میں اتفاق اتحاد اور مساوات کو قائم کرنے کیلئے حقوق اسلامیہ میں داخل کیا گیا۔ لیکن آج ہم مسلمانوں نے اس کو بھی دوسرے حقوق کی طرح چھوڑ دیا ہے پہلے جب غریب سے غریب مسلمان بیمار ہوتا تھا تو ادنیٰ درجے کے لوگوں کا تو کیا ذکر۔ بڑے بڑے لوگ محض اسلامی حق کے ادا کرنے کے لئے اس کے دیکھنے کو جاتے تھے۔ اس کی جا کر دلجوئی کرتے۔ تسلی آمیز الفاظ میں اس کی ڈھارس بندھاتے اور اسکی تکلیف کو حتی الامکان دور کرنے کی کوشش کرتے۔ مگر آج تو غریب کے سائے سے بھی ڈرتے ہیں۔ پوچھنے ہی نہیں جاتے۔ کہ کہیں کسی قسم کا سوال نہ کر بیٹھے مگر یہ نہیں سوچتے کہ اگر چند قدموں کے بدلے جنت جیسا عالی شان مقام خرید ا جا سکتا ہے۔ تو کس قدر سستا اور پر منفعت سودا ہے۔ مولانہ روم فرماتے ہیں۔

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را　　　کہ بیک گل میخری گلزار را
نیم جاں بستاند صد جان دہد　　　آں چہ در وہمت نیا ید آں دہد

یعنی پھر ایسا بازار کسی کو کہاں ملے گا کہ جہاں ایک پھول کے عوض سب باغ خرید ا جا سکے۔ آدھی جان لے کر رب العزت سو جان عطا فرماتے ہیں۔ اور وہ انعامات دیتے ہیں کہ تیرے وہم وگمان میں بھی نہیں آسکتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں!

مَنْ عَادَ مَرِيْضًا اَوْ زَارَ اَخًا لَهُ فِيْ اللهِ نَادَاهُ مُنَادٍ اَنْ طِبْتَ وَطَابَ مَمْشَاكَ وَتَبَوَّأْتَ مِنَ الْجَنَّةِ مَنْزِلاً۔

(سنن ترمذی: جلد ۳، رقم: ۲۰۰۸، دار الغرب الاسلامی)

یعنی جب کوئی محض اللہ جل شانہ کی رضا مندی کے لئے کسی مریض کی عیادت یا اپنے بھائی کی زیارت کرتا ہے۔ تو ایک منادی کرنے والا ندا کرتا ہے کہ تو خوش ہو۔ کیونکہ تیرا چلنا باعث خوشی ہے۔ اور تو نے جنت میں اپنی جگہ بنا لی۔

تو پھر اس فضل کے بازار سے اور کس جگہ سستا سودا مل سکنے کی امید ہو سکتی ہے کہ انسان اپنی غلطی کے باعث اس سے فائدہ نہ اٹھائے۔

سیدة النساء بی بی فاطمة الزاہرا رضی اللہ عنہا کا ایک رقت خیز واقعہ:

لکھا ہے کہ ایک دفعہ بی بی فاطمۃ الزہراء رضی اللہ عنہا پندرہ دن تک بخار میں مبتلا رہیں۔ جس کی وجہ سے نہایت کمزور اور نحیف ہو گئیں۔ جب کچھ افاقہ ہوا تو حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے پوچھا کہ اے بی بی اگر آپ کا جی کچھ کھانے کو چاہے تو میں لے آؤں۔ بی بی صاحبہ نے فرمایا۔ کہ میرا دل کوئی چیز نہیں چاہتا۔ پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اصرار کیا کہ بی بی کچھ نہ کچھ کھانا چاہئے۔ کیونکہ اس قدر بخار اور فاقہ سے آپ بہت کمزور ہو چکی ہیں۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بار بار کے اصرار سے بی بی صاحبہ نے فرمایا کہ میرا اور تو کسی چیز کو دل نہیں چاہتا۔ ہاں کہیں سے انار مل جائے تو شاید میں کچھ کھا سکوں۔ چنانچہ جب آپ نے بی بی صاحبہ کی اس خواہش کے متعلق سنا تو آپ بازار تشریف لے گئے۔ اگر چہ اناروں کا زمانہ تو نہ تھا اور نہ ہی مدینہ شریف میں کوئی ایسے باغات تھے۔ جہاں انار دستیاب ہو سکتا۔ مگر اللہ کا کرم کہ ڈھونڈھنے سے آپ کو ایک دوکاندار سے ایک انار مل گیا۔ آپ اسے آستین میں چھپا کر گھر کو روانہ ہوئے۔ رستے میں آپ نے ایک بیمار شخص کو گلی کے کنارے پر لیٹا ہوا پایا۔ جو نہایت زور زور سے فریاد کر رہا تھا اور مدینہ کے لوگوں پر عدمِ مہمان نوازی اور عدمِ عیادت کا شکوہ کر رہا تھا۔ آپ نے سوچا کہ اگر میں اس وقت اس کی عیادت کروں گا۔ تو شاید وہ کچھ مانگ بیٹھے اور شاید وہ کچھ انار ہی نہ ہو۔ پھر اس کے سوال کرنے پر نہ دیتے بنے گی۔ اور نہ انکار کرتے چھٹکارا ہو گا۔ اسواسطے آپ نے جلدی جلدی دوسرے کنارے سے گھر کی طرف قدم اٹھائے۔ ابھی چند ہی قدم چلے تھے کہ خیال آیا کہ اگر قیامت کے دن باری تعالیٰ نے مخاطب فرما کر یوں سوال کیا۔ کہ اے علی رضی اللہ عنہ ہمارے ایک بیمار بندے کو دیکھ کر تم نے اس کا حال تک نہ پوچھا۔ اور کیا ہمارے مہمان سے تجھے اپنی بیوی اتنی پیاری تھی کہ انار کے مطالبہ کے خوف سے تو اس کے پاس تک نہ گیا۔ تو میں اس وقت کیا جواب دوں گا۔ چنانچہ اس سے آپ پر خشیتِ الٰہی طاری ہو گئی۔ اور آپ کا دل اس مہیب تصور سے کانپ گیا۔ آپ انہیں قدموں پر لوٹے اور پوچھا اے شخص تجھے کیا تکلیف ہے۔ اور تو کیوں کراہ رہا ہے۔ اس نے کہا صاحب

میں مسافر ہوں ۔ آج کتنے دنوں سے بخار میں مبتلا ہوں ۔ یہاں کے لوگ نہ تو میرا حال پوچھتے ہیں ۔ اور نہ ہی اچھی طرح سے خدمت کرتے ہیں ۔ آپ نے پوچھا کیا تجھے کسی چیز کی ضرورت ہے کہ لیکر دے جاؤں ۔ اس نے کہا صاحب مجھے کسی اور چیز کی تو ضرورت نہیں ہاں اگر مجھے کہیں سے ایک انار مل جائے تو شاید میں دو چار دانے کھا سکوں ۔ انار کا نام لینا تھا ۔ کہ آپ کا ماتھا ٹھنکا وہی خطرہ پیش آیا ۔ جس کی وجہ سے دامن بچا کر آپ جا رہے تھے ۔ مگر واہ رے ایثار ۔ ایسوں ہی کی تو شان میں قرآن فرماتا ہے!

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلَىٰٓ اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ۔(الحشر :۹)

کہ اے حبیب ۔ تیرے صحابہ ایسے ہیں کہ باوجود اپنی محتاجی اور ضرورت کے اپنے نفسوں پر ایثار کرتے ہیں ۔ یہ وہ مقام تھا ۔ کہ جہاں معمولی تو کیا متوسط کے بھی قدم لڑکھڑا جاتے ۔ ایک طرف بیوی اور بیوی بھی فاطمہ الزہراؓ جیسی جو خاتون جنت جو حسنین جیسے قابل فخر ہستیوں کی والدہ حضور پرنور ﷺ ختم المرسلین کی لخت جگر اور پھر پندرہ دن کی بیمار اور بھوکی دوسری طرف ایک اجنبی مسافر ۔ نہ دیدہ نہ شنید ۔ مگر آپ نے ان سب رکاوٹوں کا مقابلہ کرتے ہوئے فوراً انار آستین سے نکال کر بیمار کے حوالے کر دیا چنانچہ بیمار نے آپ کے سامنے ہی کھولا اور مزے لے لے کر آخری دانے تک سب کا سب کھا گیا ۔ آپ خالی ہاتھ گھر کو چلے ۔ دل تفکرات سے بھرا ہوا ۔ دماغ تر ددات سے پریشان ۔ ابھی آپ مکان سے دور ہی تھے کہ ایک شخص نو (۹) انار لے کر حاضر خدمت ہوا اور عرض کی کہ یہ نو (۹) انار حضور ﷺ نے آپ کے لئے بھیجے ہیں اور فرمایا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں ۔ آپ نے وہ انار واپس فرما دئے اور فرمایا کہ یہ کبھی بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہو سکتے لانے والے نے پوچھا کہ حضرت اس کی کیا دلیل ہے کہ یہ خدا کی طرف سے نہیں بھیجے گئے ؟ ۔ حالانکہ میں حضور ﷺ کی زبانِ فیض ترجمان کے الفاظ دہرا رہا ہوں ۔ آپ نے فرمایا ۔ میاں اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے!

مَنْ جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهٗ عَشْرُ اَمْثَالِهَا ۔(انعام:۱۶۰)

یعنی جو ایک نیکی کرتا ہے تو ہم اسے اس کا بدلہ دس دیتے ہیں ۔

اگر جناب باری سے یہ عطیہ آیا ہے تو نو نہ ہوتے ۔ بلکہ دس ہوتے ۔ اس شخص نے آستین سے دسواں بھی نکال کر

پیش کیا اور عرض کی کہ میں تو محض آپ کی قرآنی یاداشت کا امتحان کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ حضور ﷺ نے کئی دفعہ فرمایا ہے! اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا ۔ یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علی اس کا دروازہ ہے۔ آج سابقہ یقین کے ساتھ اس عینی واقعہ نے مل کر پورا پورا اطمیان کر دیا۔ چنانچہ آپ نے وہ انار لے کر بی بی صاحبہ کو دیئے جو انہوں نے اچھی طرح سے کھائے۔

''اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا'' کے متعلق دلچسپ واقعہ:

یہاں مجھے ''اَنَا مَدِیْنَۃُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُھَا'' کی حدیث کے متعلق ایک واقعہ یاد آگیا۔ جس کا بیان خلاف موقع نہ ہوگا۔ اور وہ یہ کہ جب حضور سرورعالم ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ الفاظ ارشاد فرمائے۔ تو وہ لوگ جن کے دل میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی طرف سے بغض تھا اور جو بعد میں خوارج کے نام سے مشہور ہوئے۔ ان میں سے دس آدمی حضرت علی کے پاس ایک سوال لے کر آئے اور امتحان کرنا چاہا کہ آیا واقعی وہ دروازۂ علم ہیں یا نہیں۔ چنانچہ ان میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور اس نے پوچھا کہ! حضرت مال بہتر ہے۔ یا علم۔ آپ نے فرمایا علم بہتر ہے۔ کیونکہ علم میراث انبیاء ہے اور مال میراثِ عوام دوسرے نے بھی یہی سوال کیا۔ آپ نے فرمایا علم بہتر ہے۔ کیونکہ تو مال کی حفاظت کرتا ہے۔ اور علم تیری حفاظت کرتا ہے۔ تیسرا بڑھا اور اس نے بھی پوچھا آپ نے فرمایا۔ علم بہتر ہے۔ کیونکہ مال خرچ کرنے سے گھٹتا ہے۔ مگر علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔ چوتھے نے بھی یہی سوال کیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ علم بہتر ہے کیونکہ مال کے دشمن زیادہ ہیں۔ اور دوست کم۔ مگر علم کے دوست زیادہ ہیں۔ اور دشمن کم۔ پانچوں نے بھی یہی سوال کیا۔ تو آپ نے فرمایا کہ علم بہتر ہے۔ کیونکہ مال چھپا کر رکھا جاتا ہے۔ پھر بھی لٹنے کا خوف لگا رہتا ہے۔ مگر علم کو مسجد و بازار میں با آواز بلند ظاہر کیا جاتا ہے۔ پھر بھی لٹنے کا خوف نہیں چھٹا آگے بڑھا۔ اور اس نے بھی یہی سوال پوچھا۔ آپنے فرمایا۔ علم بہتر ہے۔ کیونکہ مال دل کو مکدر کر دیتا ہے۔ مگر علم دل کو منور اور مطمئن کرتا ہے۔ ساتویں کو آپ نے فرمایا۔ علم بہتر ہے۔ کیونکہ مالداروں ہی نے ربوبیت اور الوہیت کا دعوی کیا۔ اور قارون ہامان وفرعون نے مال ہی کے زور پر ''اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی'' کا اعلان کیا۔ مگر علم انسان میں شان عبودیت پیدا کر دیتا ہے۔ اور عالم اپنی عاجزی محتاجی اور بے کسی کے فلسفہ کو سمجھ کر اس بے نیاز کے

سامنے سر نیاز جھکا دیتا ہے۔ آٹھویں کو آپ فرمانے لگے کہ علم بہتر ہے۔ کیونکہ صاحبِ مال کا حساب ہوگا کہ تو نے کیسے کمایا اور کیسے خرچ کیا۔ فلانے کو دیا اور فلانے کو کیوں نہ دیا۔ زکوٰۃ اور دوسرے خداوندی احکام پورے کئے یا نہیں۔ مگر صاحبِ علم کو علم کے حاصل کرنے۔ اس کے صرف کرنے اور اس پر عمل کرنے کا ثواب ملے گا۔ اور ان میں سے اکثر پنجۂ حساب میں گرفتار ہونے کے بجائے مرتبۂ شفاعت سے ممتاز کئے جائیں گے۔ نویں کو آپ نے سمجھایا کہ علم بہتر ہے۔ کیونکہ اگر صاحبِ مال اپنے مال کو خرچ نہ کرے۔ تو لوگ اسے کنجوس مکھی چوس۔ بخیل اور ممسک وغیرہ کے برے ناموں سے یاد کرتے ہیں۔ مگر صاحبِ علم اگر اپنے علم کو خرچ نہ بھی کرے اور اپنے علم سے کسی کو فیض نہ بھی پہنچائے تو بھی اپنے نفس میں کامل ہونے کی وجہ سے قابلِ احترام ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ اور دسویں سے آپ نے فرمایا کہ علم مال سے بہتر ہے۔ کیونکہ مال میں اگر کچھ باہر سے نہ آئے اور خرچ ہوتا رہے تو آخر کار کم ہوتے ہوتے ختم ہو جاتا ہے۔ مگر حاصل شدہ علم میں اگرچہ باہر سے کچھ نہ ڈالا جائے۔ اور اسے ہی خرچ کیا جائے۔ تو وہ مرورِ زمانہ پر اور پختہ اور ٹھوس ہوتا جاتا ہے۔ اور پھر آپ نے فرمایا۔

رضينا قسمة الجبار فينا　　لنا علم وللجهال مال
لا ن المال يفنى عن قريب　　وان العلم باق لا يزال

یعنی ہم اللہ جل شانہ کی تقسیم پر راضی ہیں۔ جس نے ہم کو علم سے نوازا اور جاہلوں کو مال سے۔ کیونکہ مال عنقریب فنا ہو جانے والا ہے۔ مگر علم باقی اور لازوال ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اگر یہ لوگ قیامت تک میرے سامنے اسی سوال کو دہراتے رہتے تو ہر دفعہ تائیدِ غیبی سے میں نیا ہی جواب دیتا۔

آج کل کی عیادت:

تو بات یہ بیان ہو رہی تھی کہ حضور ﷺ نے عیادت کو بھی حقوقِ اسلام سے ٹھہرایا تا کہ مسلمانوں میں مساوات و اخوت پیدا ہو۔ لیکن اب اول تو یہ چیز مسلمانوں میں ناپید ہے۔ اور اگر کہیں ہے بھی تو اس میں اتباعِ رسول ﷺ یا رضائے ربی کا کوئی دخل نہیں۔ کیونکہ یا تو رشتہ داری کے ناموس کی خاطر حاضری دی جاتی ہے۔ یا اور کسی فائدے کو مدِنظر رکھ کر۔ اور اس کا امتحان یوں ہو سکتا ہے۔ کہ جب ایک غریب بیمار ہوتا ہے

تو سوائے اس کے نہایت قریبی رشتہ داروں کے اور کوئی شخص غریب خانہ میں نظر نہیں آتا۔ لیکن اگر کوئی نواب صاحب یا امیر صاحب بیمار ہو جاتے ہیں۔ تو پھر خوشامدیوں اور جی حضوریوں کا تانتا لگ جاتا ہے۔ کوئی قربان جاتا ہے تو کوئی واری۔ کوئی صدقے جاتا ہے۔ تو کوئی گھولی۔ کیا اسی کا نام اسلامی عیادت ہے کیا اسی پر اسلامی اُخوت و مودت کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔ حاشا وکلا۔ مسلمانو! اپنی نیتوں کو ٹھیک کرو۔ کام وہی ہوتا ہے۔ مگر نیت کے پھیر سے پھر جاتا ہے۔ اسی واسطے حضور ﷺ نے فرمایا ہے!

''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ۔ یعنی اعمال نیت پر موقوف ہیں۔

یہی عیادت اگر اتباع سنت کے لیے کی جاتی تو بے حساب اور بے انتہا ثواب دلاتی، یہی عیادت جو خوشامد اور غرض کے لئے کی گئی ہے ثواب تو درکنار الٹی خرابی کا باعث بن گئی۔

مسلمان کے جنازے پر جانے کا ثواب:

اس کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا کہ مسلمان کا مسلمان پر پانچواں حق یہ ہے کہ جب وہ انتقال کر جائے تو اس کے جنازے پر جائے اس کے لئے مغفرت کی دعا کرے اور اس کی چار پائی کو اٹھا کر کم از کم چالیس قدم چلے اس کے متعلق بھی میں ذرا تفصیل بیان کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ یہ معاملہ ایسا ہے کہ آج ایک سے ہے تو کل دوسرے سے۔ اس سے کسی کو چھٹکارا نہیں۔ کوئی کسی کی موت پر خوش نہ ہو کہ وہ مر گیا اور میں رہ گیا۔ کیونکہ

اے دوست بر جنازۂ دشمن چو بگذری
شادی مکن کہ با تو ہمیں ماجرا رود

اے دوست جب تیرا گزر کسی دشمن کے جنازے پر ہو تو خوش نہ ہونا کہ تیرے ساتھ بھی یہی معاملہ ہوگا۔

تو آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ جنازہ کی نماز فرضِ کفایہ ہے۔ یعنی اگر جماعت سے ایک شخص اُٹھ کر نماز جنازہ کے لئے چلا گیا تو سب سے فرضیت ساقط ہوگئی۔ اور اگر ایک بھی نہ گیا تو سب کے سب گناہ گار ہوئے۔ مسلمان کے جنازے پر جانا۔ اس پر جنازہ پڑھنا اور اس کے دفن ہو جانے تک انتظار کرنا بے انتہا ثواب کا باعث ہے۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں!

مَنْ صَلّٰی عَلٰی جَنَازَۃٍ وَلَمْ یَتْبَعْھَا فَلَہٗ قِیرَاطٌ فَاِنْ تَبِعَھَا فَلَہٗ قِیرَاطَانِ قِیلَ وَمَا الْقِیرَاطَانِ قَالَ اَصْغَرُھُمَا مِثْلُ اُحُدٍ۔

(صحیح مسلم: جلد ۳، رقم: ۲۲۳۵، باب، فضل الصلاۃ، دار الجیل بیروت)

یعنی جو شخص کسی مسلمان کا جنازہ پڑھتا ہے تو اس کو ایک قیراط کے برابر ثواب ملتا ہے۔ ایک ان میں سے چھوٹی اُحد کے پہاڑ کی مانند ہوتی ہے۔

جنازہ اُٹھانے کا طریقہ:

اور جب جنازہ کے ساتھ جائے تو چاہئے کہ مردہ کی چار پائی کو کندھا دے اور کندھا دینے میں دو چیزیں ہیں۔ ایک تو مطلق سنت اور دوسرے کامل سنت۔ مطلق سنت تو یہ ہے کہ کم از کم چار شخص چار پایوں کو پکڑ کر دس دس قدم چلیں اور کامل سنت یہ ہے کہ اٹھانے والا پہلے مردہ کے سرہانے کے داہنے پایہ کو پکڑ کر اپنے دائیں کندھے پر رکھے اور دس قدم چلے پھر پائنتی کے دائیں پائے کو اسی طرح اٹھا کر دس قدم چلے اور پھر پائنتی کے بائیں پایہ کو اسی طرح اٹھا کر دس قدم چلے۔ اسطرح مردہ کو اٹھا کر چلنے کا بے حد ثواب ہے۔ اور اس ہیئت سے اٹھانے والے کے چالیس بڑے بڑے گناہوں کو ان چالیس قدموں کے بدلے میں معاف کیا جاتا ہے۔

دینی اور دنیوی فوائد کا مقابلہ:

لیکن افسوس کہ آج ہم نے عام طور پر اس ثواب کو چھوڑ دیا ہے۔ غرباء کے جنازوں پر تو ان کے رشتہ دار بھی بمشکل نظر آتے ہیں۔ ہاں امراء کے جنازوں میں کچھ نہ کچھ رونق ہوتی ہے۔ مگر یہ رونق دنیوی اغراض کے لحاظ سے ہوتی ہے نہ کہ مسلمان بھائی کا حق ادا کرنے اور رضائے ربی کو حاصل کرنے کے لئے۔

حضور ﷺ تو فرماتے ہیں کہ جنازہ پڑھنے والے کو ایک قیراط اور پڑھ کر تا دفن انتظار کرنے والے کو دو قیراط کا ثواب دیا جاتا ہے۔ اور ادنیٰ قیراط کا وزن جبلِ احد جتنا ہوتا ہے۔ اب دیکھو اگر ہم کو کسی تجارت میں معمولی سے معمولی فائدے کا بھی خیال ہوتا ہے۔ تو ہم اس کے لئے دن رات ایک کر دیتے ہیں۔ مال

باپ بہن ۔ بھائی ۔ اہل وعیال سب سے جدا ہو کر اس موہوم، خیالی اور فانی فائدے کے پیچھے ایسے پڑ جاتے ہیں کہ غیر تو غیر اپنے نفس تک کی بھی پروا نہیں رہتی اور یہ فائدہ موہوم اور خیالی اس لئے ہے کہ اس میں فائدہ کا ہونا کچھ یقینی نہیں ۔ اعلیٰ سے اعلیٰ تجارت جب کروٹ بدلتی ہے ۔ تو ہزاروں امیدوں پر پانی پھیر دیتی ہے ۔ اور اگر یہ خیال حقیقت کی شکل بھی اختیار کر لیتا ہے تو پھر بھی فانی اور چند روزہ ہی ہوتا ہے ۔ ہم خود دیکھتے ہیں کہ بڑے بڑے سلاطین بڑے بڑے تجار اور کروڑوں پتی ہستیاں آج نہایت کسمپرسی کے عالم میں فرشِ خاک پر لیٹے ہوئے ہیں ۔ ان کا پیسہ ۔ وہ مال و دولت وہ محلات و باغات ان سے منتقل ہو کر دوسرے کے ہو چکے ہیں ۔

کسی نے کیا ہی رقت آمیز اشعار کہے ہیں ؎

کل ہوس اسطرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے　　خوب ملکِ روس اور کیا سر زمینِ طوس ہے
گر میسر ہو تو کیا عشرت سے کیجئے زندگی　　اس طرف آوازِ طبل اور رواں صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام چلتا ہو مئے گلگوں کا دور　　شب ہوئی تو ماہرویوں سے کنار و بوس ہے

اس پر عبرت بول اٹھی ؎

سنتے ہی عبرت یہ بولی اک تماشہ میں تجھے　　چل دکھاؤں تو جو قید آز کا محبوس ہے

وہ تماشا کیا تھا ؎

لے گئی یکبار گی گورِ غریباں کی طرف　　جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے　　یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ وحشمتِ دنیا سے آج　　کچھ بھی ان کے ساتھ غیر از حسرت و افسوس ہے

تو بھائیو! اس دنیوی چند روزہ اور عارضی فائدہ کے لئے تو اس قدر جاں فشانیاں کی جائیں مگر وہ نفع جو حقیقی نفع ہے ۔ جو دوامی اور سچا ہے ۔ اور جس کے ذریعہ ہماری اخروی زندگی کہ جس کے مقابلہ میں یہ دنیوی زندگی ایک خواب ہے ۔ کامیاب بن سکتی ہے ۔ اس سے غافل ہو جانے کا کیا سبب ہے ۔ جسے دیکھو ہائے دنیا، ہائے دنیا کی رٹ لگا رہا ہے ۔

حضرت آدم اور دنیا کی بے ثباتی کے متعلق:

حضرت آدم علیہ السلام سے آپ کے کسی بیٹے نے عرض کی کہ بابا آپ ایک جگہ پر کچھ اچھا سا مکان بنا کر کیوں نہیں رہتے۔ یہ کیا کہ کبھی ایک درخت کے نیچے ڈیرا اور کبھی دوسرے کے نیچے مقام بہتر ہے کہ آپ بھی ہماری طرح ایک مستقل جھونپڑا بنا کر رہیں۔ آپ نے فرمایا۔ بیٹا زیادہ سے زیادہ ہزار برس کی عمر ہوگی۔ اس چندروزہ دنیا کے لئے کہاں جھونپڑے اور مکان بنائے جائیں۔ ؎

گزرگئی گذران کیا جھونپڑی کیا میدان

مگر آج جب کہ ہماری عمروں کی انتہا ساٹھ ستر ہے۔ دس منزلے پانچ سو سال تک مضبوط حالت میں رہنے کی گارنٹی والے مکان بناتے ہیں۔ مگر وہ دنیا میں جس میں ابداً ابداً رہنا ہے۔ ان کیلئے نہ تو کچھ تیاری ہے۔ اور نہ اہتمام۔ مسلمانو! اپنے مردوں کی قبروں سے عبرت پکڑو۔ ایک دن جانا ہے۔ اس لمبے سفر کا بھی کچھ انتظام کرو۔ زادِ راہ اور خرچہِ سفر ضروری ہے کیونکہ وہ منزل بہت کٹھن اور بھاری ہے۔

اگر مردی بگورستان گزر کن مقامِ منزل ہرکس نظر کن
تہیدستی صاحبِ دولتاں بیں زدل ذوقِ زراندوزی بدرکن

فرماتے ہیں کہ اے شخص تو بہادر ہے۔ تو قبرستان میں جا کر لوگوں کے مقام اور ٹھکانے پر نظر ڈال۔ امیروں کے افلاس کو دیکھ اور اس فانی مال کے جمع کرنے کے ہی پیچھے نہ پڑ جا۔ بلکہ دوامی اور پائیدار مال کو بھی ساتھ ساتھ جمع کر۔ اور قرآن پاک کی اس آیت پر ٹھنڈے دل سے غور کر:

’’اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِیْنَۃُ الْحَیَاۃِ الدُّنْیَا وَالْبَاقِیَاتُ الصَّالِحَاتُ خَیْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَیْرٌ اَمَلاً۔ (الکھف:۴۶)

مال اور بیٹے یہ جیتی دنیا کا سنگھار ہے اور باقی رہنے والی اچھی باتیں ان کا ثواب تمہارے رب کے یہاں بہتر اور وہ امید میں سب سے بھلی۔

مسلمان کی خیر خواہی:

اس کے بعد حضور ﷺ نے اسلام کا چھٹا حق یہ بیان فرمایا ہے۔ کہ ایک مسلمان دوسرے کی پوری

پوری خیرخواہی کرے۔ یعنی جو اپنے لئے پسند کرتا ہے۔ وہ اپنے بھائی کے لئے بھی پسند کرے اور جو اسے اپنے لئے اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ اسے چاہئے کہ وہ اپنے بھائی کے لئے بھی پسند نہ کرے۔

مسلمانو! غور کرو۔ حضور ﷺ نے کس طرح دو لفظوں میں مذہب وملت کی ترقی کا راز بتا دیا ہے۔ اب عمل کرنا یا نہ کرنا یہ اُمت کا کام ہے۔ حضور پرنور نے تو ”وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلاَغُ“ ۔ اور ہمارے ذمہ تو صرف پہنچا دینا ہے) کا حق ادا فرما دیا۔ ذرا اس چھوٹے سے جملے کے فلسفہ پر غور تو کرو کہ جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان کا خیرخواہ ہوگا۔ تو دوسرے الفاظ میں ہر مسلمان اپنی قوم کا خیرخواہ ہوگا۔ اور جب قوم کو اس کی خیرخواہی سے فائدہ حاصل ہوگا۔ تو اسے بھی قوم کا فرد اور ممبر ہونے کی حیثیت سے اس فائدہ سے حصہ ملے گا۔ قوم اگر سرسبز وشاداب ہوگی۔ تو اس کی ٹہنی کو بھی طراوت کا پہنچنا لازمی ہے۔ قوم اگر پھلے پھولے گی تو اس پر بھی بہار کا اثر ہونا ضروری ہے اور اگر خیرخواہی نہ کرے گا بلکہ بدخواہی کر کے کچھ نقصان پہنچانے کی کوشش کرے گا تو گویا وہ اپنے آپ کو نقصان پہنچا رہا ہے۔ کیونکہ اگر قوم ہلاک وتباہ ہوگی تو اس کی ہلاکت وتباہی سب سے اوّل ہوگی۔

شاخِ بریدہ سے سبق آموز ہو کہ تو! نا آشنا ہے قاعدۂ روزگار سے
ملت کے ساتھ رابطہ استوار رکھ پیوستہ رہ شجر سے اُمیدِ بہار رکھ

قوم کی تباہی سے ہر فرد تباہ ہو جاتا ہے:

دیکھو اگر چند شخص ایک کشتی میں بیٹھے ہوئے ہوں۔ اور ایک شخص غداری کر کے کسی ایک یا تمام مسافروں کو تباہ کرنے کے لئے کشتی میں سوراخ کرے تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ان کے تباہ ہونے کے بعد یہ بچ جائے گا۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ اس کا بھی حشر انھیں جیسا ہوگا۔ مثلاً آج اگر اپنے غداروں کے طفیل تمام اسلامی مقبوضات غیروں کے ہاتھوں میں چلے گئے۔ تو کیا ان غداروں کو محکوم قوم میں سے مستثنیٰ کیا گیا۔ کیا وہ اپنے تمام ہم وطنوں اور ہم مذہبوں کے ساتھ ایک شکنجے میں نہ کسے گئے کیا ان کی امیدوں کے کھلیان قوم فروشی اور اسلام دشمنی کے باعث ذلت ورسوائی کی بجلیوں سے محفوظ رہے۔ نہیں بلکہ انہوں نے تو قوم کی دشمنی میں اپنے آپ کو بھی تباہ وبرباد کر دیا۔

اعضا کا دلچسپ مکالمہ اور اس کا انطباق تقریرِ سابق پر:

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ تمام اعضاء اکٹھے ہوئے اور کہنے لگے کہ ہم میں سے ہر ایک کچھ نہ کچھ کام کرتا ہے۔ مثلاً ہاتھ پکڑتے ہیں پاؤں چلتے ہیں۔ آنکھ دیکھتی ہے۔ کان سنتے ہیں۔ اور پھر ان سب کی مجموعی کوشش سے ہم لوگ کچھ کھانا پانی جمع کرتے ہیں۔ مگر کم بخت پیٹ کچھ کام وغیرہ تو کرتا نہیں اور صرف ہماری محنت کے پھل سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ گویا ہمارا مفت کا بادشاہ بنا ہوا ہے کہ ہم تو کما کما کر تھک جائیں اور یہ مفت کا فائدہ اٹھاتا رہے اور پھر نہ چلنا نہ پھرنا بیچاری ٹانگوں پر رات دن سواری کرتا ہے۔ اس کا آج سے کچھ نہ کچھ انتظام کرنا چاہئے ورنہ اس کا ظلم روزانہ ترقی ہی کرتا جائے گا۔ چنانچہ بڑی بحث وتمحیص اور نظر و مناظرہ کے بعد یہ قرار پایا۔ کہ آج سے ہر ایک عضو اپنا کام کرنا چھوڑ دے اگر پیٹ کو اپنے بھرنے کی فکر ہو گی۔ تو وہ بذات خود اس کا انتظام کرے گا۔ چنانچہ ہاتھوں نے کمانا۔ پاؤں نے چلنا۔ کانوں نے سننا اور آنکھوں نے دیکھنا چھوڑ دیا۔ اور وہ اپنی اس ہڑتال پر بڑے استقلال سے چند دن تک جمے رہے۔ آخر انہوں نے محسوس کیا کہ ہم دشمنی تو کرتے ہیں پیٹ کے ساتھ مگر اس کا اثر الٹا ہم پر پڑ رہا ہے اور ہم خود روزانہ نحیف اور کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ انہوں نے پیٹ سے کہا۔ بھائی صاحب ہڑتال تو ہم نے تیرے ساتھ کی ہے اور کھانا تیرا بند کیا ہے۔ مگر تعجب کا مقام ہے کہ تیرے ساتھ ہم بھی کمزور ہوتے جاتے ہیں پیٹ نے کہا۔ بھلے مانسو۔ ہم سب اگرچہ الگ الگ ہیں۔ مگر حقیقت میں ایک ہی ہیں۔ ایک کی کمزوری کا دوسرے پر ضرور اثر پڑے گا۔ اور ایک کی تازگی سے دوسروں کو بھی ضرور حصہ ملے گا۔ مجھے آباد کرو۔ تم آباد ہو جاؤ گے۔ مجھے طاقتور بناؤ۔ تم طاقتور ہو جاؤ گے۔

شیخ سعدی فرماتے ہیں ؎

بنی آدم اعضائے یک دیگرند　　که در آفرینش زیک جوهرند
چو عضوے بدرد آورد روزگار　　دگر عضوها را نماند قرار

یعنی بنی آدم بھی ایک دوسرے کے لئے اعضاء اور اندام ہیں۔ کیونکہ پیدائش اور اصل ایک ہی جوہر سے دیکھو جب ایک اندام کو درد پہنچتا ہے۔ تو دوسرے اعضا بھی بیقرار ہو جاتے ہیں۔ تو بھائیو غور کرو جب تمام بنی

آدم محض پیدائش کے اتحاد سے انداموں کی طرح ایک دوسرے سے متعلق ہوں۔ تو پھر مسلمان جو پیدائش کے اتحاد کیساتھ مذہب و دین کا بھی اتحاد رکھتے ہیں۔ کس طرح انداموں کی طرح ایک دوسرے سے وابستہ ہونے چاہئیں۔

دینی اتحاد ہی سچا اتحاد ہے:

اور یہ دینی اتحاد تو وہ اتحاد ہے۔ جس کے سامنے دنیا کے دوسرے اتحاد لاشی اور عدم محض ہیں۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو دیکھئے کہ جب مسلمان ہوئے تو اپنے کافر بھائیوں اور رشتہ داروں کو مسلمانوں کے ساتھ ہو کر قتل کیا۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہجرت فرما کر مدینہ شریف تشریف لائے۔ تو انصار و مہاجرین صرف اسلامی رشتہ کی بنا پر ایسے بھائی بنے کہ انصار نے اپنے کھیتوں اور مکانوں تک سے ان کو برابر کا حصہ دیا اور حد درجہ کا ایثار یہ کہ اپنی چہیتی بیویوں کو اگر ایک سے زیادہ تھیں تو طلاق دے کر اپنے مہاجرین بھائیوں کے نکاح میں دے دیا۔ عزیز بھائیو! دیکھو اسلام کا رشتہ تمام دنیا کے رشتوں سے نرالا اور پکا ہے۔ اس کا خیال کرو۔ اور اس کا حق ادا کرو۔ قوم تباہ ہو رہی ہے۔ جس سے قوم کا ہر فرد بھی برباد ہو رہا ہے۔ قوم ذلیل ہو رہی ہے۔ اور اس کی ذلت کا اثر قوم کے سب افراد پر پڑ رہا ہے۔ خدارا جاگو۔ خواب غفلت سے چونکو پرانی شان پیدا کرو۔ اور پھر دنیا کو بتا دو۔ کہ مسلماں مردہ نہیں بلکہ زندہ ہیں۔ جس طرح ترکی کا مردِ بیمار آج تندرست اور توانا نظر آ رہا ہے۔ اسی طرح ہر مسلمان کو اپنے کینے۔ قوم کی غداری۔ وطن فروشی۔ ملت کشی کی بیماری کا علاج اتباعِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کرنا چاہئے تاکہ مسلمانوں کی پھر گزشتہ طاقت و شوکت اور وقار عود کر آئے۔

اسلامی اخوت کا ایک زبردست مظاہرہ:

ایک اور مثال بھی میں آپ کو سناتا ہوں جس سے آپ بخوبی اندازہ لگا سکیں گے کہ اسلام کا رشتہ غرب و شرق اور جنوب و شمال کے مسلمانوں کو کس طرح یگانہ بناتا ہے۔ اور کس طرح اگر مغرب میں ایک مسلمان کی انگلی درد کرتی تھی۔ تو مشرق میں دوسرے مسلمانوں کو اس کا درد محسوس ہوتا تھا۔ شمال میں اگر مسلمان کو ٹھوکر لگتی تھی۔ تو کسی طرح جنوب کے مسلمانوں کے آنسو نکل آیا کرتے تھے۔ ایک شخص نے خلیفہ معتصم باللہ کو آ کر خبر دی۔ کہ میں نے عموریہ میں ایک لونڈی کو دیکھا ہے کہ عیسائی اسے پیٹ رہے تھے اور وہ ہر ضرب پر بغداد کی

طرف منہ کرکے" وامعتصما " کے الفاظ پکارتی تھی۔ عیسائی ہنس ہنس کر اسے مارتے تھے اور کہتے تھے کہ ابھی معتصم تیری مدد کو آتا ہے۔ تو کچھ فکر اور غم نہ کر۔ اس بات کے سنتے ہی معتصم باللہ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔ وہاں ہی سے عموریہ کی طرف منہ کرکے کہا! "لبیك ایتها الجاریة لبیك هذاالمعتصم بالله قداجابك " یعنی ہاں! اے لونڈی یہ دیکھ معتصم باللہ تجھے جواب دے رہا ہے۔ فوراً لشکر کو تیاری کا حکم دیا۔ اور ایک معمولی سی مسلمان لونڈی کے لئے کثیر خرچ اور بے انتہا تکلیفوں کے ساتھ وہاں پہنچ کر عموریہ کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور ثابت کردیا کہ ایک مسلمان لونڈی بھی اسلامی برادری کے ساتھ تعلق رکھنے کی وجہ سے حفاظت اور خیرخواہی کی اتنی ہی مستحق ہے جتنا کہ ایک بادشاہ یا شہزادہ مستحق ہوسکتا ہے۔

چیست انسانی تپیدن از تپ ہمسائگاں
وز سموم نجد در باغ عدن پژمان شدن

ترجمہ: انسانیت کیا ہے پڑوسی کی تپش سے تپش محسوس کرنا ہے یعنی ہمسائیوں کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھنا ہے اور وادیٔ نجد کی بادِ سموم اور گرم لو سے عدن کے ٹھنڈے و سرسبز باغ میں مرجھا جانا اور جھلس جانا ہے۔

اسلام کی بے نظیر مساوات:

چنانچہ جب مسلمانوں نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی زیر قیادت ایران پر حملہ کیا اور ایرانی لشکر کو شکست پر شکست ہوتی ہے۔ تو ایرانی لشکر کا سردار جابان نامی مسلمانوں کے معمولی سے سپاہی کے ہاتھ آتا ہے۔ اور اپنے آپ کو ایک معمولی سپاہی ظاہر کرکے مسلمان سپاہی سے امن کا وعدہ لے لیتا ہے۔ عربی لشکر کو جب جابان کے دھوکے کا حال معلوم ہوتا ہے۔ تو سب چھوٹے بڑے غصے سے بھر جاتے ہیں۔ اور مسلمان سپاہی کے وعدۂ امن کو ٹھکرا کر جابان سے بدلہ لینے کا مشورہ کرتے ہیں۔ جب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سالارِ فوج کو یہ حال معلوم ہوتا ہے۔ تو فرماتے ہیں۔ نہیں۔ اب جابان کو امن مل ہی چکا ہے۔ ہم میں کوئی چھوٹا بڑا نہیں اسلام نے ہم کو مساوات اور اخوت کے رشتے میں پرو دیا ہے۔ ہمارے ایک معمولی سپاہی کا وعدہ دینا تمام دنیا کے مسلمانوں کے وعدہ دینے کے برابر ہے۔ اور فرمایا ؎

گفت اے یاراں مسلمانیم ما　　تازیک چنگیم ویک آہنگیم ما

نغمۂ عثماں نوائے بُوذر است   گرچہ از حلق بلال و قنبر است
ہر یکے ازما امین ملت است   صلح و کینش صلح و کین ملت است
ملت ارگردد اساس جا ں فرد   عہد ملت میشود پیماں فرد
گرچہ جا باں دشمن ما بودہ است   مسلمے اوراماں بخشو دہ است
خون او اے معشر خیرالانام   بر دمِ تیغِ مسلماناں حرام

ترجمہ: فرمایا اے دوستو ہم مسلمان ہیں اور ایک رباب کی تار اور ہم آواز ہیں۔ عثمان کا نغمہ ابوذر کی صداو آواز ہے گرچہ حضرت بلال وقنبر کے حلق سے ہو۔ ہم میں سے ہر ایک ملت کا امین ہے، اس کی صلح اور کینہ اُمت کی صلح اور کینہ ہے۔ اگر پوری ملت ایک فرد کی جان کی بنیاد ہوسکتی ہے تو ایک آدمی کا عہد و پیمان بھی پوری ملت کا عہد ہوسکتا ہے۔ اگرچہ جابان ہمارا دشمن ہوا ہے لیکن ایک مسلمان نے اس کو امان دی ہے۔ اے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بہترین جماعت مسلمانوں کی تلوار سے اس کا خون حرام ہے۔ ہم میں سے ہر کوئی ملت کا امین ہے اس کا صلح کرنا اور اس کی دشمنی پوری قوم کی صلح اور دشمنی تصور کی جائے گی۔

دیکھو کس طرح ایک معمولی سپاہی کی بات کو قوم کی بات قرار دیا جاتا ہے۔ اور حضرت ابوعبیدہ سردارِ لشکر ہو کر کس خلوص سے فرمارہے ہیں۔ کہ ہمارے ایک مسلمان کی صلح سب قوم کی صلح ہے۔ اور ہمارے ایک مسلمان کا کینہ سب مسلمانوں کا کینہ ہے۔ اسی واسطے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے!

مَثَلُ الْمُؤْمِنِيْنَ فِيْ تَوَادِّهِمْ، وَتَعَاطُفِهِمْ، وَتَرَاحُمِهِمْ، مَثَلُ الْجَسَدِ، اِذَا اشْتَكَى مِنْهُ عُضْوٌ () تَدَاعَى سَائِرُ الْجَسَدِ بِالسَّهَرِ وَالْحُمَّى۔

(صحیح مسلم: الجز ۸، رقم: ۶۷۵۱، باب، تراحم المومنین، دارالجیل بیروت)

یعنی سب مسلمان ایک جسم کی طرح ہیں۔ جس کا اگر ایک اندام درد کرے تو باقی کے تمام جسم کو بھی بخار اور بے آرامی ہو جاتی ہے۔

مگر آہ۔ آج کہاں کی خیرخواہی اور برادری قیامت کے قیام سے پہلے ہی قیامت کا منظر دیکھ رہے ہیں۔ نفسی نفسی کا بازار گرم ہے۔ اپنا بھلا جگ بھلا سمجھا جارہا ہے۔ نہ محبت نہ ہمدردی۔ خون سفید ہوگیا۔ اور اخوت و مودّت

کی پریم ندی پایاب ہوگئی۔

نالہ را ہر چند میخواہم کہ پنہاں میکنم
سینہ مے گوید کہ من تنگ آمدم فریاد کن

یعنی میں نے بہت کوشش کی کہ میرے دل میں درد ہے اسے دل ہی میں رکھوں مگر میرا دل کہتا ہے کہ نہیں اس کو ظاہر کرو کیونکہ میں تنگی محسوس کر رہا ہوں۔

رَبُّ الْعٰلَمِیْن کی تفسیر:

رب بمعنی تربیت کرنے والا۔ اور عالم کا معنی جہاں۔ عالمین اس کی جمع ہے۔ یعنی جہانوں کا تربیت کرنے والا۔ تربیت لغت میں کسی چیز کے آہستہ آہستہ بتدریج بڑھانے اور اس کی پرورش کے ضروری سامان مہیا کرنے کا نام ہے۔ ربّ اصل میں رابٌّ تھا۔ مگر کثرت استعمال کی وجہ سے الف گر کر ربّ رہ گیا۔ ربّ پر جب الف لام کو داخل کر کے الرب بنایا جائے۔ یا صرف بغیر اضافت ہو تو بغیر ذات باری کے اور کسی مخلوق کے لئے استعمال نہیں کیا جاتا۔ وہاں بغیر الف لام یا بصورت اضافت کے مخلوق کے لئے استعمال ہو سکتا ہے۔ جیسے رب الدار، مالکِ مکان۔

رَبُّ الْعٰلَمِیْن۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰہ کے دعوے کی دلیل ہے:

الحمدللہ میں اس بات کو دعوی فرمایا تھا کہ تمام صفتیں اللہ تعالیٰ ہی کے لئے خاص ہیں۔ اور اللہ کے لفظ میں اس دعوے کا اجمالی ثبوت بھی پیش کر دیا جو صاف دل اور عقلِ سلیم والوں کے لئے اشارۃً کافی تھا۔ مگر عوام کے لئے رب العالمین فرما کر تفصیلی ثبوت پیش فرماتے ہیں۔ تا کہ ذاتِ باری کے مختص بجمیع محامد ہونے میں کسی قسم کا شک نہ رہ جائے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ چونکہ میں ہر ہر جہان اور عالم کی پرورش کرتا ہوں۔ اور ان کی زندگی کی تمام ضروریات اُن کے لئے مہیا کرتا ہوں اور ان پر میرے طرح طرح کے احسان و انعام ہیں۔ اسواسطے میری ہی ذات تمام تعریفوں کی مستحق ہے۔

لفظ ربّ میں دو دقیق اشارے:

رب فرما کر اللہ تعالیٰ نے اس میں دو چیزوں کی طرف دقیق اشارہ فرما دیا ہے۔ ایک تو یہ کہ اے

انسان تیرا رزق۔ تیرا الباس۔ تیری زندگی کی سب ضروریات میری ہی طرف سے ہیں۔ میں اگر نہ دوں تو ہزار کوشش کرنے سے بھی کچھ نہیں ہوسکتا۔ اور میں اگر دوں۔ تو ہزاروں کی کوشش کرنے سے بھی نہیں رک سکتا۔ سچ ہے:

”وَاِن یَّمۡسَسۡكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗۤ اِلَّا هُوَ وَاِنۡ یُّرِدۡكَ بِخَیۡرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضۡلِهٖ۔

(انعام:۱۷)

یعنی اگر اللہ تجھے تکلیف پہنچائے تو اس کے سوا اسے دور کرنے والا کوئی نہیں۔ اور اگر وہ کسی سے بھلائی کا ارادہ کرے تو اس کے فضل کو رد کرنے والا کوئی نہیں۔

ہر ایک ضرورت کے لئے میرا ہی دروازہ کھٹکھٹا کیونکہ میرے بغیر حقیقی معطی دوسرا کوئی بھی نہیں غیر اللہ سے امیدوں کو توڑ کر مجھ سے توقعات کو جوڑ۔ تو مجھے نہ بھلا تا کہ تو بھی نہ بھلایا جائے۔

فَاذۡكُرُوۡنِیۡۤ اَذۡكُرۡكُمۡ۔ (البقرۃ:۱۵۲)

تو مجھے یاد کر میں تجھے یاد کروں گا۔

ربّ العالمین پر اعتراض اور اس کا جواب:

ہاں اس پر ایک اعتراض ہوسکتا ہے۔ کہ ہم نے تو کبھی نہ دیکھا کہ اللہ جل شانہ نے بذات خود کسی کو کھانا دیا ہو یا کپڑا پہنایا ہو یا اور کوئی ضرورت کی چیز ہاتھ لمبا کر کے دی ہو۔ ہم تو ہمیشہ دیکھتے ہیں کہ تمام مخلوقات اپنے گاڑھے پسینے کی کمائی پر گزراوقات کرتی ہے۔ ایک تاجر صبح سے شام تک تجارت کرتا ہے۔ تو تب کہیں جا کر بال بچوں کی خوراک گھر لاتا ہے۔ بعض زراعت کر کے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ تو بعض اور کسی شغل کے ذریعے اپنے اور اپنے کنبہ کی نگرانی کرتے ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ رب العالمین کیسے ہوا۔ کیونکہ ظاہراً ہماری تربیت میں اس کا کوئی ہاتھ نظر نہیں آتا۔

مجمل جواب:

اللہ جل شانہ نے دنیا کا ایک قاعدہ مقرر کیا ہے کہ ہر مخلوق کو اس کی ضرورت اور شان کے مطابق کچھ اسباب اور ذریعے دیے ہیں۔ جب وہ ان ذرائع اور اسباب کو استعمال کرتی ہے۔ تو ان کی وساطت سے اس

کی ضروریات کو پورا کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ ان اسباب کا معطی وہی کریم ورحیم اللہ ہے۔ تو گویا ان اسباب کے نتائج بھی اسی کی طرف سے ہیں۔ اگر ہم کو وہ اسباب نہ دیتا۔ تو ہم ان کو استعمال کیسے کرتے اور اگر استعمال نہ کرتے۔ تو وہ ضرورت اور نتیجہ جو ان آلات کے استعمال پر موقوف ہے کیسے پیدا ہوتا۔ تو جب ضروریات زندگی ہمیں میسر نہ آتیں تو ہماری تربیت کیسے ہوسکتی تو معلوم ہوا کہ ہماری تربیت و پرورش اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہے۔

مفصل جواب:

میں اس جواب کو ذرا تفصیل سے بیان کرتا ہوں تا کہ آپ میرے مطلب اور جواب کو پوری طرح سمجھ سکیں۔ دیکھئے اللہ تعالیٰ نے درخت کو ہاتھ پاؤں اور زبان وغیرہ نہیں دی کہ وہ کام کر کے یا چل پھر کر اپنی ضروریات کو مہیا کر سکے۔ اس کو صرف جڑیں دیں تا کہ وہ ان جڑوں کے ذریعے زمین سے اپنی خوراک کو حاصل کرے۔ مگر چونکہ اسے ہاتھ پاؤں اور زبان وغیرہ نہیں دی۔ اس واسطے اس کے رزق کو بھی ان چیزوں پر موقوف نہ ٹھہرایا۔ اب جانوروں کو لو، انہیں اللہ جل شانہ نے پاؤں یا پر عطا فرمائے۔ مگر چونکہ ان کو ہاتھ اور زبان سے محروم رکھا گیا۔ اس لئے ان کو اپنی روزی اور ضروریات کے بارہ میں کسب کرنیکی یا بات کر کے حاصل کرنے کی تکلیف نہ دی۔ بلکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے یا اڑنے سے ان کو روزی دی جاتی ہے۔ اب پرندہ یا گدھا۔ درخت کی طرح ایک ہی جگہ پر بیٹھا رہے۔ اور ضروریات زندگی کا وہاں بیٹھے بٹھائے مل جانے کا خواہشمند ہو تو یہ کبھی بھی نہ ہوسکے گا۔ بلکہ اُسے دیے ہوئے اسباب کے استعمال کے بعد ضروریات زندگی عطا فرمائی جائیں گی۔ اسی طرح اللہ جل شانہ نے انسان کو دنیا کی تمام مخلوقات سے زیادہ اسباب عنایت فرمائے۔ چلنے کو پاؤں کام کرنے کو ہاتھ۔ دیکھنے کو آنکھیں سوچنے کو دماغ اور سننے کو کان دئے۔ اب انسان جب ان سب آلات سے کام لیتا ہے۔ کہیں تجارت کرتا ہے تو کہیں زراعت۔ کہیں ملازمت ہے تو کہیں صنعت۔ تو اب ذات باری اس انسان کو ان اسباب کے ذریعہ مصلحت کے مطابق روزی پہنچاتے ہیں۔ لیکن اگر کوئی شخص ہاتھ پاؤں توڑ کر بیٹھ جائے اور پھر روزی نہ ملنے کا اللہ جل شانہ سے شکوہ کرے۔ تو یہ اس کی حماقت اور بیوقوفی ہوگی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہ ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضاء بے کار نہیں دیے ان کو

معطل کر کے انہیں بے کار سمجھنا باری تعالیٰ پر فعلِ عبث کا الزام لگانا ہے۔ جس سے شانِ خداوندی پاک اور مبرا ہے۔

ہاں مثلاً اسباب نہ دیتے اور پھر روزی کمانے کے لئے مجبور کرتے تو البتہ یہ صریح ظلم ہوتا مثلاً درخت کو چل پھر کر یا پرندوں اور دوسرے جانوروں کو کما کر روزی مہیا کرنے کا حکم فرماتے تو یہ حکم ضرور حکمت کے خلاف سمجھا جاتا۔ مگر وہ تو ایسی بے نیاز ذات ہے کہ اگر ایک ہی نوع میں سے کسی فرد کو کوئی سبب کم دیا ہے یا بالکل نہیں دیا۔ تو اس کی روزی کو بھی اس سبب پر موقوف نہیں رکھا۔ مثلاً انسانوں میں ہی دیکھ لیجئے کہ جس کو مجنوں یا پاگل بنا دیتے ہیں۔ تو پھر اسے کسب واکتساب کیلئے بھی مجبور نہیں فرماتے۔ بلکہ عقل نہ ہونے کی وجہ سے چونکہ وہ جانوروں کے زمرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس واسطے اسے بھی ان جانوروں کی طرح اسباب استعمال کرنے پر رزق دیا جاتا ہے۔ یعنی صرف چلنے پھرنے یا زبان ہلانے سے اس کی روزی کہیں نہ کہیں غیب سے مہیا کروا دی جاتی ہے۔ شیخ سعدی فرماتے ہیں ۔

بناداں آں چناں روزی رساند
کہ دانا اندراں حیراں بماند

یعنی نادان اور مجنون کو اس طرح روزی دی جاتی ہے۔ کہ دانا اس میں حیران وسرگردان رہ جاتا ہے۔ یہ کیوں اس لئے کہ نادان کو دانستن یعنی علم وعقل کا مادہ نہیں دیا گیا۔ جو کہ دانا کو دیا گیا ہے۔ اس واسطے رزق کے دئے جانے میں بھی دانا اور نادان میں فرق رکھا گیا۔

دیکھئے ایک چھوٹا بچہ جب چل نہیں سکتا اور اس کے پاؤں نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں۔ تو لوگ اسے اُٹھائے پھرتے ہیں مگر جب یہ قوی ہو کر استعمال کے قابل ہو جاتے ہیں تو پھر اگر وہ خود بھی اٹھائے جانے کی خواہش کرتا ہے تو چپت لگا دیا جاتا ہے۔ اور کہا جاتا ہے کم بخت کیا تو خود لنگڑا ہے جو چلتا نہیں۔

مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

طفل با گیراؤتا پویا نبود   مرکبش جز گردنِ بابا نبود
چوں فضولی کرد و دست و پا نمود   درعنا افتاد و در کور و کبود

یعنی بچہ جب تک نہ پکڑ سکتا تھا۔ اور نہ دوڑ سکتا تھا۔ اس وقت تک اس کی سورای باپ کی گردن تھی۔ مگر جب کہ بے ہودگیاں کرنے لگا۔ اور لگا ہاتھ پاؤں نکالنے تو گردن کی سواری سے اتار کر تکلیفوں میں ڈال دیا گیا۔ اور یہ بڑا ہونے پر اسے گردن کی سواری سے کیوں محروم کیا جاتا ہے۔ اسلئے کہ وہ دئے ہوئے اسباب سے باوجود قدرت استعمال کے فائدہ نہیں اٹھاتا۔ اسی طرح جو بھی دیئے ہوئے اسباب کو معطل کر کے طالبِ رزق ہوتا ہے۔ تو آخرکار اسے بھی فقر وفاقہ کی چپت لگا دی جاتی ہے۔

اس تفصیل سے آپ بالوضاحت سمجھ چکے ہوں گے کہ رزق موقوف ہے اسباب پر اور اسباب کا معطی ہے اللہ جل شانہ۔ تو گویا رزق کا معطی اللہ جل شانہ ہوا۔ تو ثابت ہوا کہ باری تعالیٰ ہی تمام جہانوں کو تربیت فرماتا ہے۔ اور باری تعالیٰ کو نہ دیکھنا اور پھر بھی تربیت کو ان کی طرف منسوب کرنا ایسا ہے۔ جیسے بادشاہ کسی کے لئے ایک ہزار روپیہ دئے جانے کا حکم دے۔ اور وہ شخص جا کر شاہی خزانہ سے فرمان کے مطابق خزانچی سے روپیہ وصول کرے تو اگرچہ اس شخص کو انعام بواسطہ خزانچی ملا اور بادشاہ کی شکل تک نہ دیکھی مگر پھر بھی یہ انعام بادشاہ ہی کا کہلائے گا نہ کہ خزانچی کا۔

خوارق کے متعلق:

یہ تو اللہ جل شانہ کا ایک قاعدہ ہے جسے سنت اللہ کہا جاتا ہے۔ چونکہ ہر ایک قاعدے میں بعض مستثنیٰ امور بھی ہوتے ہیں۔ اسی طرح اللہ جل شانہ بھی بعض دفعہ بعض باتیں اپنی عادت اور قاعدے کے خلاف بھی کرتے ہیں۔ جن کو خارق عادت اُمور کہا جاتا ہے۔ جیسے بنی اسرائیل پر من وسلویٰ کا نزول۔ حضور سرور عالم ﷺ کی انگلیوں سے پانی کا چشمہ جاری ہونا وغیرہ وغیرہ۔ اور یہ خلاف عادت کام کا ظہور اس لئے فرماتا ہے کہ کہیں کوہ تابین انسان انہی اسباب میں نہ پھنس جائے اور انہی کو علتِ حقیقی سمجھ کر ذات باری سے بے نیاز نہ ہو جائے بلکہ اسے معلوم رہے کہ ان اسباب کے اوپر ایک اور بڑی قادر و جابر ہستی ہے جس کے سامنے ان اسباب کا وجود اور عدم دونوں برابر ہیں۔ اس کی شان تو:

”وَاِذَا قَضٰۤى اَمۡرًا فَاِنَّمَا يَقُوۡلُ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ“ (البقرة:۱۱۷) ہے۔

یعنی وہ جب کسی بات کا ارادہ فرماتا ہے۔ تو ارشاد ہوتا ہے ہو جا۔ تو وہ ہو جاتی ہے۔

ارہاص، معجزہ، کرامت، معونت اور قضائے حاجت کا فرق:

اگر یہ خارق عادت یا خلاف سنت کام کسی پیغمبر کے ذریعے اسکے دعوٰی نبوت سے پہلے ظاہر کیا جائے۔ تو “ارہاص” کہلاتا ہے۔ اور اگر اس کا ظہور نبوت کے بعد ہو تو “معجزہ” کہلاتا ہے۔ اور اگر ایسا ہی خلاف عادت کام کسی ولی کے ذریعے سے ظاہر ہو۔ تو “کرامت” کہلاتا ہے۔ اور اگر کسی عام مومن صالح سے ظاہر ہو تو اسے “معونت” کہتے ہیں۔ اور اگر کوئی خارق عادت بات کسی کافر سے ظاہر ہو تو اسے “قضائے حاجت” کہتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ ان کو ان کی ریاضت اور نفس کشی کے بدلے میں ایک کرامت کے مشابہ طاقت دیتا ہے۔ جس سے ان کی بہت کچھ دنیوی مرادیں حسب خواہش پوری ہو جاتی ہیں۔ اور اس سے وہ اور زیادہ مغرور ہو کر گمراہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ اس طاقت کے ذریعے بڑی حد تک اس کی دنیوی مرادیں پوری ہو جاتی ہیں۔ اس لئے اس کو قضائے حاجت کہا جاتا ہے۔ اس کے سوا آخرت میں انہیں ان تکلیفوں کا کچھ معاوضہ نہ دیا جائے گا۔ کیونکہ اعمال کے آخرت میں کارآمد ہونے کے لئے ایمان باللہ و بالرسول کی ضرورت ہوتی ہے۔

لفظ ربّ کا دوسرا اشارہ:

ابھی میں نے بیان کیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے رب کے لفظ میں دو چیزوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

ایک تو یہ کہ اے انسان تیری تمام ضروریات کا دینے والا میں ہی ہوں۔ اسلئے تو میرے ساتھ تعلق کو مضبوط کر۔

اب دوسرا راز جس کی طرف ربّ اشارہ کرتا ہے یہ ہے کہ اے انسان جب میں عالمین کی تربیت کی وجہ سے مستحقِ محامد بنا ہوں تو تجھے بھی اگر دین و دنیا کی تعریف اور مدح کی ضرورت ہے۔ اور تو چاہتا ہے کہ تیرا نام تیری زندگی میں اور تیرے بعد محمود اور پسندیدہ طریقہ سے لیا جائے۔ اور لوگ تیری ہستی کو قابلِ ستائش اور لائقِ فخر سمجھیں تو تو بھی دنیا کی تمام مخلوق کی خدمت کر جو بدل ہے تربیت کا اور یہ تیری خدمت صرف تیرے عیال یا رشتہ داروں یا ہمسایوں یا ہموطنوں یا بنی نوع ہی تک محدود نہ ہو بلکہ میری عام تربیت کی طرح تیری خدمت و خیر خواہی بھی عام ہو۔ حتیٰ کہ دنیا کی ادنیٰ سے ادنیٰ جاندار مخلوق تیری خیر خواہی و خدمت سے مستفید ہو شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے۔

شنیدم که مردانِ راهِ خدا
دلِ دشمناں ہم نکردند تنگ

میں نے سنا کہ وہ لوگ جو خدا کے راستے پر چلتے ہیں وہ دشمنوں کے دلوں کو بھی تنگ نہیں کرتے ۔

مقربین ادنیٰ مخلوق کو بھی رنجیدہ نہیں کیا کرتے:

دشمنوں کے دلوں کو چھوڑیے خدا کے بندے تو چیونٹی کے دل تک کو بھی رنجیدہ کرنا گناہ سمجھتے تھے کہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ شہر سے باہر رہا کرتے تھے ۔ ایک دفعہ آپ غلے کے لئے شہر میں آئے ۔ ایک دکان سے آپ نے غلہ خریدہ اور چادر میں باندھ کر اپنے گھر کو روانہ ہوئے ۔ آپ شہر سے خاصے فاصلہ پر رہا کرتے تھے ۔ اسواسطے گھر پہنچتے پہنچتے سورج بالکل غروب ہوگیا۔ مغرب کے جھٹ پٹے میں گھر پہنچ کر غلہ کی جو گٹھڑی کھولی تو اناج کے اندر آپ کو ایک موٹا سا چیونٹا نظر پڑا۔ جو نہایت پریشانی سے ادھر اُدھر گھومنے لگا۔ آپ کو اس کی تنہائی مصیبت اور فراق احباب پر بہت رحم آیا۔ اپنے دل میں سوچا کہ اسے اس وقت تو شہر میں پہنچانا مشکل ہے ہاں صبح ہوتے ہی اسے اسی دکان پر جا کر چھوڑ آؤں گا چنانچہ آپ نے چیونٹے کو پکڑ کر ایک ڈبیہ میں بند کر دیا اور اپنے معمولات میں مشغول ہو گئے ۔ مگر چیونٹے کی تکلیف سے نہ تو آپ کو وظائف میں روز مرہ جیسا لطف ملا اور نہ ہی رات بھر نیند آئی ۔ آخر انہوں نے تنگ آ کر صبح ہونے سے بہت پہلے ڈبیا اُٹھا کر شہر کا رستہ لیا۔ جب شہر میں پہنچے تو اس دکان کو سویرا ہونے کے باعث بند پایا۔ انھیں خیال آیا کہ اگر میں اسے یہیں چھوڑ دوں گا تو شاید وہ غلطی سے کسی اور دکان میں چلا جائے اور وہاں پر بھی اسے وہی پریشانی پیش آئے لہٰذا آپ نے دکان کے کھلنے تک انتظار کرنا ہی بہتر سمجھا۔ جب مالک دکان آیا تو آپ کو دروازے کے پاس کھڑا پایا۔ پوچھا! حضرت کیا بات ہے کہ آج آپ نے اس قدر سویرے سویرے مہربانی فرمائی ۔ آپ نے فرمایا بھائی ذرا تو اپنی دکان کھول مجھے اندر کچھ کام ہے ۔ اس نے پوچھا! کیا صاحب آپ کا اندر کچھ رہ گیا ہے؟ آپ نے فرمایا نہیں رہ نہیں گیا بلکہ اندر سے کچھ لے گیا تھا اسے رکھنے آیا ہوں اس دکاندار کو حیرت ہوئی کہ اندر سے آپ جیسے شخص کیا چیز لے جا سکتے ہیں چوری کرنا تو ان کی شان سے بہت بعید ہے ۔ پھر وہ کیا ہو سکتا ہے جو آپ ساتھ لے گئے اس نے کہا حضرت وہ مجھے دے دیجئے آپ نے فرمایا نہیں

بلکہ میں نے جہاں سے لیا ہے وہاں ہی رکھوں گا۔ چنانچہ وہ شخص اور زیادہ حیران ہوا اور آخر کار دکان کو کھولا۔ آپ اندر گئے اور غلہ کی بوریوں کے پاس جا کر ڈبیا کو کھول کر چیونٹے کو نکالا۔ چیونٹا دوڑ کر بوریوں کے اندر گھس گیا۔ آپ اس کے دوڑ کر چھپ جانے سے بہت خوش ہوئے پھر اس شخص کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا بھائی مجھے تو اس غریب کی مصیبت کے باعث رات بھر نیند نہیں آئی۔ اللہ کا شکر ہے کہ اس کی مصیبت میرے ہاتھوں دور ہوگئی۔ دیکھا خدا کے بندوں کو کہ وہ چیونٹیوں کی تکلیفوں کو بھی برداشت نہ کر سکتے تھے۔

شیخ سعدی اسی واسطے فرماتے ہیں۔ ع

میازار مورے که دانه کش ست
کہ جاں دارد و جاں شیریں خوش است

یعنی اے شخص تو دانہ کھینچنے والی چیونٹی کو بھی نہ ستا کیونکہ وہ جان رکھتی ہے اور جان ہر ایک کو میٹھی اور پیاری ہے۔

مگر بھائی آج چیونٹی تو درکنار ہم اپنے سگے بھائیوں اور بہنوں کے خون کے پیاسے نظر آتے ہیں غیر سے دوستی کریں گے مگر اپنوں سے دشمنی، ماں باپ کی نافرمانی کریں گے مگر دشمنوں کی اطاعت۔ دوستوں کی مجلسوں اور رنگ رلیوں میں سینکڑوں اڑائیں گے مگر والدین کی خدمت کے لئے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہ دینگے۔

اولاد کی تربیت میں والدین کا قصور:

اور اس میں ایک لحاظ سے تو والدین کا بھی قصور ہے کیونکہ آج ماں باپ شاذونادر ہی اپنی اولاد کو دینی تعلیم دلاتے ہیں۔ ذرا بات چیت سیکھی تو دنیوی علوم میں لگا دیا۔ اب جبکہ اس غریب نے دینی علوم پڑھے ہی نہ ہوں اسے نہ معلوم ہو کہ والدین کے شرعی حقوق کیا ہوتے ہیں۔

اسے خبر ہی نہ ہو کہ صلہ رحمی کے دینی و دنیوی کیا کیا فوائد ہیں تو وہ کیسے ماں باپ کا خیال رکھ سکتا ہے چونکہ وہ دنیا کا علم پڑھتا ہے اور دنیا کی زینت بیوی بچوں اور احباب سے ہے اس واسطے وہ انہی مادیات میں پھنس کر روحانیات کو چھوڑ دیتا ہے۔

اولاد کی گستاخیاں ان کے علمِ دین سے بے بہرہ ہونے کا نتیجہ:

ایک دفعہ ایک شخص نے امیر المؤمنین حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے شکایت کی کہ مجھے میرے بیٹے نے مارا ہے۔ آپ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ کہیں ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ بیٹا باپ کو مارے۔ اس نے عرض کی صاحب میرے پاس اس واقعہ کے بہت سے گواہ بھی ہیں۔ اگر حکم ہو تو حاضر کروں آپ نے فرمایا نہیں پہلے تو اپنے بیٹے کو حاضر کرتا کہ مجھے حقیقت حال معلوم ہو۔ چنانچہ اس شخص کے بیٹے کو بلایا گیا۔ آپ نے اس لڑکے سے پوچھا کہ کیا تو نے اپنے باپ کو مارا ہے اس نے اقرار کیا اور کہا کہ یہ خواہ مخواہ میرے معاملات میں دخل دیتا تھا۔ اس لیے میں نے آج اس کی ذرا مرمت کر دی۔ آپ نے اس سے پوچھا کہ کیا تو نے قرآن شریف بھی پڑھا ہے اس نے کہا نہیں، تو آپ نے اس کے باپ کی طرف مخاطب ہو فرمایا کہ جب تو نے اپنے بیٹے کو قرآن پاک کی تعلیم تک نہیں دی تو وہ تیرے حقوق کو کیا سمجھے اسے کیا معلوم کہ باپ اور گدھے میں کیا فرق ہوتا ہے۔ یہ سب تیرا اور تیری تربیت کا قصور ہے۔ اگر تو اسے کچھ بھی شرعی امور سے واقف کرتا۔ تو وہ کتنا ہی خراب ہو جاتا۔ مگر نوبت اس معاملہ تک نہ پہنچتی حقیقت میں قصور تیرا ہے تیرے بیٹے کا نہیں۔

بیٹے کی لیاقت سے باپ کی قابلیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

ایک شخص نے مجھے یہ بات سنائی کہ ایک حجام نے اپنے بیٹے کو دینی تعلیم دی اور اچھا عالم بنایا۔ ایک دن یہ عالم صاحب کسی مجلس میں وعظ فرمانے کے لیے گئے وہاں پر ان کا باپ گاؤں کا کمیں ہونے کی حیثیت سے مجلس کے سب انتظامات میں لگا ہوا تھا بیچارے سے کچھ قصور ہوا تو گاؤں کا نمبر دار اسے کہنے لگا کہ تو بہت بڑا نالائق انسان ہے۔ اگر تیرا بیٹا یہاں نہ ہوتا تو میں تجھے اس حماقت کا مزا چکھاتا۔ عالم صاحب نے فرمایا نمبر دار جی میرا باپ نالائق نہیں بلکہ بہت بڑا لائق انسان ہے۔ اگر یہ لائق نہ ہوتا تو آج میری اس لیاقت کا کہیں وجود نہ ہوتا۔ یہ سب کچھ اسی کی دانائی اور لیاقت کا طفیل ہے کہ مجھے تعلیم و تربیت دلائی ہاں اگر آپ میرے دادا کے متعلق یہ الفاظ استعمال کرتے تو مجھے کچھ رنج نہ ہوتا۔ کیونکہ میرے والد کی جہالت میرے دادا کی نالائقی کا نتیجہ ہے۔

تو اسی طرح آج ہم اپنی اولاد کی گستاخیوں، بدکاریوں اور نافرمانیوں کے بڑی حد تک خود ہی ذمہ

دار ہیں اے اللہ ہم کو صراطِ مستقیم کی ہدایت دے۔ اور ہمارے دلوں کو اپنی طرف متوجہ فرما۔ ہمیں طاقت دے کہ ہم اپنی اولاد کو دینی تعلیم دیں۔ اور ان کی تربیت دینی احکام کے ماتحت کریں۔ تاکہ یہ ہونہار پودے بڑے ہو کر اسلام کے تناور درخت بنیں اور یہ چھوٹی نسل آئندہ دین کی خادم بن سکے۔ آمین۔

رَبّ اور اَبّ کا فرق:

رب کا لفظ فرما کر اس قوم کی بھی تردید فرمائی۔ جو اللہ تعالیٰ کو لفظ ''**اَبّ**'' بمعنی باپ سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ کیونکہ اَب کا تعلق اولاد سے بہت محدود اور کم ہوتا ہے۔ مگر رب کا تعلق اپنی مخلوق سے نہایت وسیع اور زیادہ ہوتا ہے۔ باپ اپنی اولاد سے سب سے زیادہ پیار اس وقت کرتا ہے جبکہ اسے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جوں جوں ضروریات میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ باپ کی محبت بھی کم ہوتی جاتی ہے۔ دیکھیے جب بچہ پیٹ میں ہوتا ہے اور کچھ مانگتا نہیں بلکہ ماں کا خون اس کی خوراک ہوتی ہے اس وقت والدین کی خوشی بے اندازہ ہوتی ہے۔ نومولود کے بخیر و عافیت دنیا میں آنے کی گھڑیاں گنی جاتی ہیں نذر و نیاز دی جاتی ہے۔ اور اس کی صحت و سلامتی کے ساتھ پیدا ہونے کے لیے علاج معالجہ، تعویذ گنڈے اور قبر و زیارت کسی چیز کو نہیں چھوڑا جاتا۔

چنانچہ خدا خدا کر کے بچہ پیدا ہوتا ہے۔ خوشی کے شادیانے بجتے ہیں۔ مبارک سلامت ہوتی ہے۔ تحفے تحائف دیئے جاتے ہیں اور ڈوموں میراثیوں کی خوب آؤ بھگت کی جاتی ہے مگر یہ سب اس قدر محبت کا اظہار کیوں کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہ ابھی تک بچہ کچھ مانگتا نہیں۔ وہی غلیظ خون جو پہلے پیٹ میں کھاتا تھا۔ اب سفید ہو کر دودھ کی شکل میں پستانوں میں آ کر اس کی خوراک بن جاتا ہے۔ اب بچہ جب ذرا بڑا ہوتا ہے اور چلنے پھرنے لگتا ہے۔ تو اب محبت میں بھی کچھ کمی آجاتی ہے۔ ان پہلے کی طرح اسے ہر وقت نہیں اٹھایا جاسکتا۔ بلکہ ماں جو حد درجہ شفیق ہوتی ہے۔ وہ بھی کسی وقت چپت لگا دیتی ہے۔ کہ کم بخت ہر وقت سوار رہتا ہے۔ جا اپنا کھیل کود بار بار دودھ مانگتا ہے۔ تو اس پر بھی مرمت کی جاتی ہے۔ اب صاحب ذرا اس سے بڑے ہوئے تو ٹوپی، جوتا، کوٹ، قمیص وغیرہ کی ضرورت پڑی اب والدین کی محبت سو درجے سے ساٹھ ستر درجے پر پہنچ جاتی ہے۔ اس کے بعد جب منگنی ہوتی ہے تو محبت میں نمایاں فرق ہو جاتا ہے۔ اس کے

بعد جب شادی ہوتی ہے۔ تو باپ سخت بے مہری سے کہہ دیتا ہے کہ جا اور کما کھا۔ میں نے کچھ تیرا ساری عمر کا ٹھیکہ نہیں لیا، تو ایک تھا تو گاڑی چل رہی تھی اب بانو صاحبہ کو کون کھلائے۔ اب اگر گھرانہ ذرا شریف ہے تو دبے دبائے شور و فساد میں کچھ زمانہ اور بھی نکل جاتا ہے۔ مگر جب پوتے صاحب تشریف لے آتے ہیں تو اب باپ جب بیٹے کی روزانہ بڑھتی ہوئی ضروریات پر نظر ڈالتا ہے۔ یا تو اسے کمانے کو کہتا ہے۔ ورنہ ہاتھ پکڑ کر گھر سے نکال دیتا ہے۔ اور جب پانچ سات بچے ہو جائیں تو پھر والدین غریب بیٹے کا منہ تک دیکھنا گوارا نہیں کرتے۔ ہاں اس کی ان سے کچھ حاجت نہ ہو تو محبت و مودّت کا ظاہری رشتہ قائم رہتا ہے۔ لیکن ربّ کا یہ حال نہیں۔ وہ تو جس قدر ضروریات بڑھتی جاتی ہیں۔ اسباب رزق کو اور زیادہ وسیع کرتا جاتا ہے یا دوسرے الفاظ میں وہ اسی قدر اس کو زیادہ دینا شروع کر دیتا ہے۔ اب اگر پانچ بچوں سے گھبراتا ہے تو رب پچاسوں کو پالتا ہے۔ مولانا روم اللہ تعالیٰ کی رحیمی و کریمی کو یوں بیان کرتے ہیں ۔

صد پدر صد مادر اندر حلم ما　　　ہر نفس زائد در افتد در فنا
حلم ایشاں کف بحر حلم ماست　　　کف رود آید ولے دریا بجا ست

یعنی اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ہماری حلیمی میں سینکڑوں والدین سمائے ہوئے ہیں یعنی ہماری حلیمی سو ماں باپ سے بھی زیادہ ہے۔ جو ہر گھڑی سمندر کی جھاگ کی طرح صفحۂ ہستی پر نمودار ہو کر فنا ہو جاتے ہیں۔ اور اُنہیں کے ساتھ ان کا علم بھی ختم ہو جاتا ہے۔ لیکن ہماری حلیمی کا دریائے مواج ہر وقت موجود ہے۔

اس کے علاوہ اب بہ نسبت غیروں کے اپنی اولاد سے زیادہ محبت کرتا ہے۔ اور اسی واسطے وہ دوسروں سے زیادہ توجہ کے ساتھ اپنی اولاد کی پرورش کرتا ہے۔ اب اگر کوئی یتیم یا بے بس بچہ اس کے گھر پلے تو وہ کبھی بھی اس بچے کی نگہداشت اپنے بچے جیسی نہ کریگا۔ مگر رب ایسا نہیں۔ اس کا تعلق سب سے مساوی ہے۔ ہر ایک کو ایسی شفقت، توجہ اور نوازش سے پالتا ہے کہ گویا وہ کسی دوسرے کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا۔ جسے جو کچھ ضرورت ہو اسے وہ مناسب طور پر حسبِ مصلحت عنایت فرما دیتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اب اور رب میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اب کی محبت اور تربیت کا تعلق خاص اور محدود ہے۔ مگر رب کی تربیت اور نوازش عام اور غیر محدود ہے۔

پیغمبر اُمت کی محبت کی وجہ سے میراث نہیں چھوڑتے:

چونکہ رب کا تعلق مخلوقات سے بحیثیت مخلوق بلا امتیاز ہوتا ہے۔ اس لئے اس کا احسان بھی بلا امتیاز مگر حسب حال ہوتا ہے۔ اب چونکہ انبیاء علیہم السلام کا گروہ تمام مخلوقات سے برگزیدہ اور پسندیدہ ہوتا ہے۔ اس واسطے وہ بھی سر سے پاؤں تک خدائی صفات میں رنگا ہوا ہوتا ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ اس مقدس طبقہ کا تعلق بھی اولاد یا رشتہ کی حد تک محدود نہیں ہوتا بلکہ ان کا تعلق بھی اپنی امت سے بحیثیت امت کے بلا امتیاز ہوتا ہے۔ اسی واسطے حضور ﷺ فرماتے ہیں!

''نَحْنُ عُصْبَةُ الْاَنْبِيَاءِ لَا نُوْرَثُ مَا تَرَكْنَا صَدَقَةٌ''۔

یعنی ہم انبیاء کا گروہ کسی کو وارث نہیں بناتے ہیں وہ صدقہ ہوتا ہے۔

یعنی صدقہ کی طرح اس میں تمام مسلمانوں کا حق ہے۔ اس لئے اس کو ایسے امور میں خرچ کیا جائے جس سے سب اسلامی برادری کو فائدہ پہنچ سکے۔ کیونکہ اگر انبیاء علیہم السلام کے مال میں میراث جاری ہوتی اور ان کا ترکہ ان کے ورثاء ہی کو ملتا تو اس سے ان کا تعلق اپنے ورثاء سے مخصوص سمجھا جاتا۔ لیکن جب تمام امت وارث قرار پائی تو کیا ثابت ہوا کہ پیغمبر تمام امت کے روحانی باپ ہیں۔ اور اس رشتہ میں اُمت کے ادنیٰ سے لے کر اعلیٰ تک سب افراد شامل ہیں۔ مگر اب یعنی باپ کا ترکہ ہمیشہ اس کی اولاد ہی کو ملتا ہے۔ تو اب اور پیغمبر میں اس قدر فرق ہوتا ہے تو ربّ اور اب میں کس قدر فرق ہونا چاہیے

ببیں تفادت راہ از کجاست تا کیجا

راستے کے فرق کو تو دیکھ کہ کہاں سے کہاں تک ہے۔

اسلامی دعا کے ''رَبَّنَا'' سے شروع ہونے کی وجہ اور داعی کا اپنی دعا میں غیروں کو ملانے کی حکمت:

لفظ ربّ کے اس قدر ممتاز وسیع اور بحر معانی ہونے ہی کی وجہ سے مسلمانوں کی ہر دعا ربنا کے لفظ سے شروع ہوتی ہے۔ مثلاً:

''رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الْخَاسِرِيْنَ''۔ (اعراف: ۲۳)

اے رب ہمارے ہم نے اپنا آپ بُرا کیا تو اگر تُو ہمیں نہ بخشے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم ضرور نقصان والوں میں ہوئے۔

رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الآخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۔(البقرۃ:۲۰۱)

اے ربّ ہمارے ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور ہمیں آخرت میں بھلائی دے اور ہمیں عذاب دوزخ سے بچا۔

رَبَّنَا لاَ تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ إِذْ هَدَيْتَنَا ”(آلِ عمران:۸)

اے رب ہمارے دل ٹیڑھے نہ کر بعد اس کے کہ تو نے ہمیں ہدایت دی۔

وغیرہ وغیرہ۔ اور پھر اس میں ایک اور لطف یہ ہے کہ دعا کرنے والا ربّ کے عام تعلق کو مدِنظر رکھ کر یوں نہیں کہتا۔ رَبِّیْ۔ یعنی اے میرے رب۔ بلکہ رَبَّنَا ۔ اے ہمارے رب کہہ کر دعا کرتا ہے۔ اور پھر وہ جیسا ربنا کہہ کر دعا شروع کرتا ہے اسی طرح رب کی دوسری مخلوقات کو بھی دعا میں شامل کرتا ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ اگر کوئی بہتری صرف اپنے لیے مانگوں گا تو شاید رب العزت ناراض نہ ہو جائیں کہ اے شخص تو نے میری اور مخلوقات کو اپنے سوال میں کیوں شامل نہ کیا۔ شاید ان کی وجہ سے تجھ پر بھی نوازش کی جاتی۔ اور پھر میرا خزانہ تو اتنا وسیع وعظیم ہے کہ اگر تیری دعا کی وجہ سے ان کو کچھ دوں گا بھی تو یہ دینا تیرے حصہ سے کچھ کمی نہ کرے گا۔ اس لئے خواہ مخواہ پھر کاہے کو بخل کرتا ہے۔

اسی واسطے تو اللہ جل شانہٗ نے رب کے ساتھ عالمین کا لفظ لگا دیا تا کہ ربوبیت کے تعلق عمومی میں کسی قسم کا شک وشبہ نہ رہے۔ فرمایا۔ رب العالمین یعنی سب جہانوں کا رب ہوں میں رب المسلمین یا رب المومنین ہی نہیں بلکہ میری ربوبیت کا تعلق تو اٹھارہ ہزار جہانوں سے ہے۔ میں ہی سب کی پرورش کرتا ہوں اور ان کو ان کی سب ضروریات حسب حال اور مناسب شان دیتا ہوں۔

ضروریات کے دئیے جانے کو حسبِ مصلحت سے مقید کرنے کی وجہ:

آپ خیال کریں گے کہ جب میں ضروریات کے دئیے جانے یا تربیت عامہ کا ذکر کرتا ہوں تو ساتھ ہی حسبِ مصلحت حسبِ حال یا مناسب شان بھی کہہ دیتا ہوں یہ لفظ میں یونہی نہیں کہتا بلکہ اس کے کہنے

میں ایک راز ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان بعض دفعہ بعض چیزوں کو دیکھ کر ان کی ضرورت کو اپنی سمجھ میں مناسب نہیں سمجھتا۔ جس سے وہ اپنے خیال میں خداوندی تربیت کا کچھ نقصان سمجھ بیٹھتا ہے حالانکہ یہ اس کی سمجھ کی غلطی ہوتی ہے۔ حسبِ مصلحت سے مصلحتِ الٰہی مراد ہے یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ بہتر سمجھتا ہے ویسے ہی اسے ضروریات عنایت فرماتا ہے۔ اور حقیقت میں بالکل اس کے مناسب حال ہوتی ہیں اگرچہ ظاہر بین انسان اس راز کو ظاہری طور پر نہ سمجھ سکے۔

حسبِ مصلحت پر ایک لطیف حکایت:

لکھا ہے کہ کوئی بزرگ صاحب سفر پر روانہ ہوئے۔ رستے میں دھوپ اور تھکاوٹ کی وجہ سے ایک بڑ کے درخت کے نیچے آرام کرنے کو لیٹ گئے۔ لیٹے لیٹے خیال آیا کہ اللہ جل شانہ نے اتنے بڑے درخت کو اتنا چھوٹا پھل کیوں دیا۔ اس کی جسامت اور قد وقامت کے لحاظ سے تو یہ چھوٹا سا پھل حکمت کے مطابق نظر نہیں آتا۔ چاہیے تو یہ تھا کہ اس کا پھل تربوز کی ننھی منی بیل کو دیا جاتا اور اس کا پھل اس عظیم الجثہ درخت کے ساتھ لگایا جاتا۔ ابھی سلسلہ خیالات یہیں تک پہنچا تھا کہ درخت کے اوپر سے ایک پھل ٹوٹ کر سیدھا آپ کی آنکھ پر آ کر لگا۔ درد تو ہوا مگر تھوڑا۔ فوراً اٹھ کر سجدے میں گر گئے اور عرض کی کہ اے رب العزت تو واقعی حکیم ہے۔ اور ”فعل الحکیم لایخلو من الحکمة“ حکیم کا کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا) کے مطابق آپ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ اب میں اس حکمت کو سمجھ گیا۔ اگر آج تو اس درخت کو اس کے قد جیسا پھل دیے ہوتا تو میری آنکھ کا خاتمہ ہی تھا۔ پروردگا، تیرا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ تیری بے مثال حکمت سے میری آنکھ سلامت رہ گئی۔ سچ ہے۔

آنکس کہ تونگرت نمے گرداند

او مصلحت تو از تو بہتر داند

وہ شخص جس کو امارت نہیں ملی اللہ تعالیٰ بہتر جانتا ہے کہ اس میں اس کی کیا حکمت ہے۔

تو بھائیو مجھے بار بار حسبِ مصلحت اور حسبِ حال کے الفاظ اسی غرض سے کہنے پڑتے ہیں کہ مصلحت سے مراد مصلحتِ خداوندی سمجھو اور کوتاہ بین عقل کے دھوکے میں نہ آجاؤ۔

رَبُّ العالمین کے لفظ سے اسلام کے عالمگیر ہونے کا ثبوت:

تو بات یہ بیان ہو رہی تھی کہ اللہ جل شانہ نے اپنی تعریف میں رب العالمین فرمایا۔ رب المسلمین یا مومنین نہیں کہا تا کہ سب مخلوقات کو معلوم ہو جائے کہ وہ ان سب کا رب ہے۔ اور ان سب کی تربیت وہی کرتا ہے۔ اب کی طرح کسی کے ساتھ مخصوص تعلق نہیں رکھتا کہ اُن کی تربیت میں مشغول ہو کر دوسروں کو چھوڑ دے یا کم توجہ کرے۔ رب العالمین نے ایک بات یہ بھی سکھائی کہ اے انسانوں تم سب ایک ہی رب کے مربوب (پروردہ) ہو اور تم سب بندے اور مخلوق ہونے میں بالکل برابر ہو۔ اس لیے تم کو نسب، رنگ اور مال کے لحاظ سے ایک دوسرے پر فخر نہ کرنا چاہیے بلکہ ہر ایک سے مساویانہ سلوک کرو اور دنیا کے امتیازات کو ایک دوسرے کی تحقیر کا باعث نہ سمجھو۔

اسلام کے عالمگیر اور تمام دنیا کے مذہب ہونے پر اس سے بڑی دلیل اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا معبود اور خدا وہ ہے جو تمام جہان کا پالنے والا ہے۔ اور جس کے سامنے تمام کے تمام انسان مخلوق ہونے کی حیثیت سے برابر ہیں وہ اسلام کہ جس کا معبود اگر رب العالمین ہے تو اس کا پیغمبر رحمۃ العالمین ﷺ ہے یعنی وہ پیغمبر ﷺ جو تمام جہانوں کے لئے رحمت ہے۔ اس کی رحمت اس کی خیر خواہی کسی قوم یا ملک سے مختص نہیں۔ بلکہ اللہ جل شانہ کی ربوبیت عامہ کی طرح اس کے حبیب حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی رحمت بھی عام ہے۔

پھر یہی نہیں بلکہ اگر اسلام کا معبود رب العٰلمین اور پیغمبر رحمۃ العٰلمین ہے تو اس کی کتاب قرآن پاک بھی ذکر العٰلمین ہے۔ یعنی تمام جہاں والوں کے لئے نصیحت، اس میں بھی کسی قوم یا ملک کی کوئی خصوصیت نہیں۔ بلکہ دنیا کا ہر ایک انسان خواہ وہ کسی ملک یا قوم سے تعلق رکھتا ہو قرآن اُس کے لیے نصیحت نامہ اور ہدایتِ تامہ ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ اُس کا قبلہ جس کی طرف تمام دنیا کے مسلمان منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں ہدی للعالمین ہے۔ یعنی تمام جہان والوں کے لیے ہدایت ہے تو آپ بتائیے کہ اسلام سے زیادہ عالمگیر وسیع اور دنیا کا مذہب اور کون سا ہو سکتا ہے کہ جس کے ماننے سے اسلام کے نام کی طرح دنیا میں سلامتی اور چین کا دور دورہ ہو جائے۔ کیونکہ دنیا کے لوگ ایک خدا کے بندے ایک رسول کی اُمت ایک کتاب کو

ماننے والے اور ایک قبلہ کی طرف منہ کرنے والے ہوں، وہ خدا اور رسول وہ کتاب اور قبلہ جو خود تمام جہان کے لیے ہونے کا دعوی کرتے ہیں تو پھر دنیا میں موجود کشمکش اور بے چینی کس طرح رہ سکتی ہے۔

عالمین کے لفظ کی تشریح:

رب کے بعد عالمین کا اک لفظ قابل غور ہے عالم ماسوی اللہ کو کہا جاتا ہے یعنی اللہ جل شانہ کے بغیر تمام چیزوں کے مجموعے کا نام عالَم ہے۔ لیکن بعض دفعہ مخلوقات کی ہر ہر جنس کو بھی مستقل طور پر عالم کہہ دیا جاتا ہے۔ مثلاً عالم انسان، عالم ملائکہ، عالم جن وغیرہ وغیرہ۔ اور اسی معنی کے لحاظ سے اس جگہ عالمین کو جمع لایا گیا ہے کہ میں مخلوقات کے ہر ہر جنس اور ہر ہر قسم کا رب ہوں۔ ایک روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اٹھارہ ہزار عالم پیدا فرمائے، قرآن پاک میں آتا ہے!

وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ ط۔ (المدثر:۳۱)

یعنی اللہ کے لشکروں کو اس کے بغیر اور کوئی نہیں جانتا۔

کون ہے جو اس کی تمام مخلوقات کا احاطہ کرسکے۔ اس کی عجیب وغریب مخلوقات سے زمین، تحتُ الثریٰ، دریا، سمندر، ہوا ہر ایک دنیا بھری پڑی ہے۔

بعض نے عالمین کو عالم کی جمع تو کہا ہے مگر عالم کو ”عَلَمٌ“ سے مشتق مانا ہے۔ ”عَلَمٌ“ عربی زبان میں جھنڈے یا نشان کو کہتے ہیں اس صورت میں معنی یہ ہوجاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام نشانوں یا علامتوں کو جو وجودِ باری کے ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ بتدریج پرورش فرماتے ہیں دنیا کا ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ اللہ تعالیٰ کے وجودِ باجود پر دلالت کرتا ہے۔

ففی کل شی لہ آیۃ
تدل علی انہ واحدہ
ہر چیز میں اللہ کی نشانی ہے جو اس کی وحدانیت کی دلیل ہے۔

تربیتِ انسانی کی دلچسپ اور حیرت انگیز تفصیل:

اب جب اس بات کی پوری تشریح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ پاک ہی تمام صفتوں کی مستحق ہے

کیونکہ وہی جہانوں کا پالنے والا ہے۔ تو اب میں آپ کو اللہ جل شانہ کی تربیت کا ایک نمونہ بھی بیان کر کے تفصیل کر دیتا ہوں۔ تا کہ آپ کو معلوم ہو کہ باری تعالیٰ کس طرح اپنی مخلوق کی پرورش فرماتے ہیں اور کس طرح اس کے مناسب حال اور ضرورت کے مطابق چیزوں کو مہیا فرماتے ہیں۔ یوں تو تربیت کی کتاب کا ہر ایک باب حد درجہ حیرت انگیز ہے۔ مگر وقت کے خیال سے میں صرف آدمی کی تربیت کے متعلق اختصار کے ساتھ عرض کر دیتا ہوں۔ کیونکہ اس کی تربیت کے متعلق اللہ تعالیٰ نے خود بار بار قرآن پاک میں توجہ دلائی ہے اور فرمایا ہے!

”وَفِیۡۤ اَنۡفُسِکُمۡ ؕ اَفَلَا تُبۡصِرُوۡنَ ○ (الذریات:۲۱)

یعنی کیا تم اپنے نفسوں میں غور نہیں کرتے۔

کیونکہ انسانی تربیت اس کی پرورش، اس کی بناوٹ میں غور کرنے کے بعد انسان حیرت زدہ ہو کر بے ساختہ کہہ اٹھتا ہے:

فَتَبٰرَکَ اللّٰہُ اَحۡسَنُ الۡخٰلِقِیۡنَ ○ (المومنون: ۱۴)

بڑی برکت والا ہے اللہ سب سے بہتر بنانے والا ہے۔

مسلمانوں کی غفلت کا دکھڑا:

دہد نطفہ را صورتے چوں پری
کہ کرداست بر آب صورت گری

اس نے نطفہ کو خوبصورت صورت عطا کی اور پانی پر انسانی تصویر بنا دی

تربیتِ انسانی کے متعلق عرض کرنے سے پہلے میں آپ سے اتنا سوال کئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ کیا آپ میں کبھی کسی نے قرآنِ پاک کے اُن الفاظ پر بھی غور کیا ہے کہ جس میں قرآنِ پاک نے انسان کے وجود کی تشریح فرمائی ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک پانی کے قطرے سے درجہ بدرجہ تربیت کر کے پیدا فرمایا کس طرح اس کے جوڑوں میں پُرحکمت تناسب رکھا۔ کس طرح اس کی جسمانی مشین کو تمام ضروریات سے نوازا۔ مگر افسوس کہ آج جس قدر قرآنی علوم تھے غیر قوموں نے لے لیے۔ مسلمان سوائے

طوطے کی طرح پڑھنے کے اور کوئی اس سے تعلق ہی نہیں رکھتے۔ ۹۹ فیصد مسلمانوں کا علم صرف قرآن پاک کے حروف تک محدود ہے۔ وہ اس کو سر ہلا ہلا کر پڑھتے ہیں۔ مگر افسوس وہ اس سے قطعاً ناواقف ہوتے ہیں کہ قرآن پاک ان سے کیا مانگ رہا ہے۔ وہ قرآن پاک کی عبارت کی لذت تو اٹھاتے ہیں۔ مگر اس کے قیمتی اور نایاب معنوں سے بالکل بے خبر ہوتے ہیں۔ اور قرآن پاک کو نہ سمجھنا ہی آج ہماری تمام خرابیوں اور پریشانیوں کا باعث ہے۔

قرآن کو کیونکر سمجھ کر پڑھنے کی ضرورت ہے:

میں یہ نہیں کہتا کہ قرآن پاک بغیر سمجھ کے پڑھنا کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ دیتا ہے اور ضرور دیتا ہے پڑھنا تو بجائے خود اس کا دیکھنا۔ اس کا چھونا۔ اس کا سننا اس کو گھر میں رکھنا تک باعث برکت اور یمن ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں!

مَنْ قَرَاَ حَرْفًا مِنْ كِتَابِ اللهِ فَلَهٗ بِهٖ حَسَنَةٌ ، وَالحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا ، لَاۤ اَقُوْلُ الٓم حَرْفٌ ، وَلَكِنْ اَلِفٌ حَرْفٌ وَلَامٌ حَرْفٌ وَمِيْمٌ حَرْفٌ۔

(سنن ترمذی: الجزء ۵، رقم: ۲۹۱۰، دار الغرب الاسلامی)

یعنی جس نے قرآن پاک سے ایک حرف پڑھا اس کے لئے بھی نیکی ہے اور نیکی کا بدلہ دس گنا ہوتا ہے۔ اور پھر فرمایا میں یہ نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے، لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے۔

تو گویا صرف ”الم“ کے پڑھنے سے تین نیکیاں ملیں اور پھر تین کا دس گنا ہوئیں تو تیس بنیں۔ میرا اس وقت کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے صرف اس کی سطحی برکت کو لے لیا اور اس کے مطالب کو بوجہ نہ جاننے کے پس پشت ڈال دیا۔ قرآن پاک کو کلام اللہ کیوں کہتے ہیں اس لئے کہ گویا قرآن پاک کا پڑھنے والا اس محبوب حقیقی سے باتیں کر رہا ہے۔ اب اگر تم اپنی کسی دنیوی محبوبہ سے بات چیت کرو۔ مگر تم اس کی بات کو نہ سمجھو اور تمہارا حال ”زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم“ (میرے دوست کی زبان ترکی ہے اور میں ترکی نہیں جانتا)۔ کا سا ہو تو آپ سوائے لذتِ آواز۔ سوائے لذتِ سماع اور سوائے لذتِ دید کے کس

چیز سے متمتع ہوسکو گے۔

چیست قرآن اے کلامِ حق شناس　　رو نمائی ربِ ناس آمد به ناس
حرف حرفش راست در بر معنئ　　معنئ در معنئ در معنئ

ترجمہ: قرآن پاک کیا چیز ہے؟ اے کلام حق کو پہچاننے والے۔ لوگوں کے رب کی رونمائی اور جلوہ افروزی لوگوں پر آئی اس کے ہر ہر حرف کے اندر معنیٰ پوشیدہ ہے۔ معنی کے اندر معنی اور پھر اس معنی کے اندر معنی کے موتی چھپے ہوئے ہیں۔

تو پھر افسوس نہیں کہ ہم آج صرف حروف کی لذت پر ہی اکتفا کئے ہوئے ہیں۔ اور ان حروف کی تہ میں معانی ومطالب کے جو دُرِّ یگانہ پڑے ہوئے ہیں ان سے قطعاً بے خبر اور ناواقف ہیں۔

فرض کرو کہ آپ کے گھر سے ایک خط آئے۔ جس کا آپ مطلب نہیں سمجھ سکتے۔ کیونکہ وہ ایسی زبان میں ہے کہ جسے آپ سوائے حروف پڑھ سکنے کے اور کوئی معنی حاصل نہیں کر سکتے۔ تو کیا آپ اس کے صرف الفاظ پڑھ کر مطمئن ہو جائینگے، ہرگز نہیں۔ بلکہ آپ تمام شہر کا چکر لگائینگے۔ یار و اغیار کو وہ خط دکھا کر اس کے مطلب کو سمجھنے کہ کوشش کرینگے۔ اور اس وقت تک آپ کو چین نہیں پڑے گا جب تک کہ آپ کو اس کا پورا پورا مطلب معلوم نہ ہو جائے۔ مگر افسوس تو یہ ہے کہ ہم ایک دو پیسے کے کارڈ کے سمجھنے کے لئے جو ایک انسان کی طرف سے آتا ہے۔ اور جس میں اس خسیس دنیا کی باتوں کے سوا شاذ و نادر ہی اور کوئی ذکر ہوتا ہے، سمجھنے کے لیے اس قدر تکلیف بطیبِ خاطر برداشت کرتے ہیں مگر وہ خط جو رب العزت کی طرف سے آیا جس کے لانے والے سیدنا و مولانا حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اور جس کے ساتھ ہماری ترقی و زوال، دین و ایمان اور مال و عیال تک وابستہ ہیں۔ ان کے صرف الفاظ پڑھ لینے ہی کافی سمجھنے جائیں۔ اگر ہماری اولاد یا ہم خود صرف قرآن پاک کے الفاظ پڑھ کے کتاب اللہ کو ختم کر لیتے ہیں۔ تو گویا ہم نے بہت بڑا معرکہ سر کر لیا اور یہی ہماری انتہا اور منزلِ مقصود ہوتی ہے۔ مسلمانو! غور کرو۔ قرآن پاک کو سمجھو اور دوسروں کو سمجھاؤ، اس کے الفاظ کی تہ میں بے بہا اور بے منتہا خزانہ ہے۔ غیر اس خزانہ سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ مگر ہم مالکِ خزانہ ہو کر خزانہ کے اندر سے بالکل ناواقف ہیں۔ خدارا جاگو۔

جا گنا ہے جاگ تو افلاک کے سایہ تلے
حشر تک سوتا رہے گا خاک کے سایہ تلے

دنیا میں انقلاب آگیا دنیا کی دنیا نے کروٹ بدل دی وہ جو کل ہمارے دست نگر اور غلام تھے آج ہماری بداعمالیوں اور غفلت شعاریوں کے باعث ہمارے حاکم اور سردار بن گئے۔

درسِ قرآن نہ اگر ہم نے بھلایا ہوتا   یہ زمانہ نہ زمانے نے دکھایا ہوتا
ہم نے قرآن کو مسلک جو بنایا ہوتا   قوم کے خفیہ نصیبوں کو جگایا ہوتا
چاٹ لیں تم نے کتب فلسفہ اور منطق کی   ہاتھ بھولے سے بھی قرآن کو لگایا ہوتا
لائی ہر ڈاک ترے واسطے لندن سے کتاب   گھر سے ہمسایہ کے قرآں بھی منگایا ہوتا
وہ جو انجیل یہاں تجھ کو سنانے آئے   تو نے قرآن وہاں جا کے سنایا ہوتا
قوم کے درد کا درماں ہے تو یہ قرآن ہے   مفلسی میں کوئی ساماں ہے تو یہ قرآن ہے

رجوع تربیت انسانی:

تو خیر یہ دکھڑا طویل ہے اسے چھوڑ کر پھر اصل مطلب کو بیان کرتا ہوں۔ بیان یہ ہو رہا تھا کہ قرآن پاک نے انسانی تربیت کا مختصر اور جامع فوٹو کس طرح پیش کیا ہے۔ اور اسی انسانی تربیت کے متعلق ''وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ'' فرما کر یوں توجہ دلائی ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں انسانی تربیت کے متعلق فرماتے ہیں!

''فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّ غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ ؕ وَ نُقِرُّ فِي الْاَرْحَامِ مَا نَشَآءُ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ ۚ وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى وَ مِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا''۔ (الحج:۵)

یعنی ہم نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نطفہ سے۔ پھر لوتھڑے سے۔ پھر گوشت کے ٹکڑے سے جو کبھی پورا بن جاتا ہے۔ اور کبھی ادھورا رہ جاتا ہے۔ تاکہ تمہارے لئے کھول کر بیان کر دیں۔ اور ہم جو چاہتے ہیں رحموں

میں ایک مقررہ وقت تک ٹھہرائے رکھتے ہیں۔ پھر تمہیں بچہ بنا کر نکالتے ہیں۔ پھر تم اپنے کمال کو پہنچتے ہو یعنی جوان ہوتے ہو۔ اور تم میں سے کوئی تو وفات پا جاتا ہے۔ اور کوئی تم میں سے بیکار عمر کو لوٹایا جاتا ہے تاکہ جاننے کے بعد پھر نادان بن جائے۔

دیکھیے اللہ تعالیٰ نے اس جگہ انسان کی تربیت کے مختصراً بڑے بڑے دس درجے بیان فرمائے ہیں۔ ۱۔**تراب**، ۲۔**نطفه**، ۳۔**علقه**، ۴۔**مضغه**، ۵۔ **مخلقه**، ۶۔**غير مخلقه** ۷۔**طفل**، ۸۔**بلوغ الاشد**، ۹۔**الشيخوخته**، ۱۰۔**وفات**۔ اب سب سے پہلے تراب یعنی مٹی کو لیں۔ فرماتے ہیں کہ ہم نے انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ چونکہ آدم علیہ السلام جو تمام انسانوں کے باپ ہیں مٹی سے پیدا ہوئے۔ اس لئے سب انسانوں کی ابتداء اور آغاز بھی مٹی سے ہے۔ اس کے علاوہ قرآنِ پاک میں:

"وَلَقَدۡ خَلَقۡنَا الۡاِنۡسَانَ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ طِيۡنٍ"۔ (المومنون: ۱۲)

یعنی ہم نے انسان کو مٹی کے خلاصہ اور نچوڑ سے پیدا کیا۔

چونکہ انسان کی سب خوراک اور ضروریات زمین سے پیدا ہوتی ہیں۔ اور وہی پھر انسان کے جسم میں غذا کی صورت میں داخل ہو کر خون پیدا کرتی ہیں۔ جس سے منی نطفہ بنتا ہے۔ چونکہ وہی نطفہ یا زمین کا نچوڑ انسان کی ظاہری پیدائش کا سبب ہوتا ہے۔ اس لئے بھی انسان کی پیدائش کو مٹی کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے۔

نطفه۔ جب زمین کا کثیف اور گدلا نچوڑ انسانی مشین میں فلٹر ہو ہو کر بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ تو اس سے منی یا نطفہ بنتا ہے۔ پھر اس میں یہ حکمت بھی دیکھ کہ خوراک کیسی تھی۔ اس سے سرخ خون بنایا۔ اور پھر سرخ خون کو سفید منی میں بدل دیا۔ نہ معلوم قدرت کا کونسا رنگساز اندر ہی اندر کام کر رہا ہے کہ بغیر ہمارے محسوس کئے ہوئے یہ سب کی سب حیرت انگیز تبدیلیاں ہوتی جاتی ہیں۔ اب جب نطفہ بنتا ہے اور مرد عورت کے ساتھ جمع ہوتا ہے۔ تو یہ نطفہ عورت کے رحم کے اندر داخل ہو کر اس سے تعلق پکڑتا ہے۔ جسے علقہ کہتے ہیں۔ تھوڑا عرصہ گزرنے پر یہ علقہ مضغہ کی شکل اختیار کر لیتا ہے یعنی گوشت بن جاتا ہے۔ اب مضغہ بننے کے بعد کبھی تو بچہ پورا ہونے سے پہلے ہی گر جاتا ہے۔ جسے قرآن پاک نے غیر مخلقہ کے ساتھ تعبیر فرمایا ہے۔ اور کبھی مخلقہ یعنی

پورا ہو کر مقررہ مدت کے بعد دنیا میں آتا ہے۔ حمل کی حالت میں وہ ماں کا خون جو ماہواری کی صورت میں خارج ہوا کرتا تھا کھا کر بڑھتا ہے۔ پھر اس کی پیدائش بھی کچھ کم حیرت انگیز نہیں ہوتی کہ ایک ایسے مقام سے جو بچے کے جسم اور قد وقامت کے لحاظ سے بالکل تنگ اور چھوٹا ہوتا ہے، پیدا کیا جاتا ہے۔

پھر یہ بھی تو غور کرو کہ یہ تمام انسانی جسم کا نقش ونگار کس چیز پر بنایا جاتا ہے، پانی پر۔ کیا دنیا کا کوئی کاریگر پانی پر بھی نقش ونگار بنا سکتا ہے اور پھر ایسے۔ اور پھر لطف تو یہ ہے کہ یہ نقش ونگار کسی آلہ یا ہتھیار کے ذریعے سے نہیں بنائے گئے بلکہ نقاشِ قدرت نے آلات کے بغیر ہی بنایا ہے اور پھر آلات کے بغیر تو ٹھیک نہ وہاں روشنی نہ ہی اجالا، کتنے تہ در تہ اندھیروں کے اندر بغیر آلات کے۔ پانی پر نقش باندھے جاتے ہیں اور پھر ایسے اندھیرے میں نہ خطا نہ غلطی۔ پھر ایسا تناسب اور اندازہ ہے کہ سبحان اللہ۔ پھر اسی ذرا سے پانی میں گوشت پوست اور ہڈیاں پیدا کرنا۔ پھر اس کو اندر ہی اندر نر اور مادہ بنانا۔ پھر ان کی طبیعتوں میں اختلاف ڈالنا پھر کسی کو سلطنت کے قابل بنانا تو کسی کو زراعت کے۔ کسی کو خوبصورت بنانا تو کسی کو بدصورت۔ پھر ۳۶۰ جوڑ بنانا۔ ان میں کوئی ٹیڑھا تو کوئی سیدھا۔ کوئی کانٹے دار۔ کوئی پتلا کوئی موٹا۔ کوئی سخت کوئی لچک دار اور پھر ان کو، رگوں پٹھوں اور نسوں سے باندھنا اور پھر وہ رگوں کی رسیاں بھی کوئی گول کوئی چوڑی، کوئی چپٹی کوئی تکونی، کوئی پتلی کوئی لمبی اور کوئی چھوٹی۔ پھر اس انسانی مکان کے اندر اس کی صفائی اور ضرورت کے لیے ۹ کھڑکیاں رکھنا دو سننے کے لیے، دو دیکھنے کے لیے دو سونگھنے کے لیے ایک کھانے پینے بولنے اور سانس لینے کے لیے دو فضلہ نکالنے۔ پھر اس کے جوڑوں کی مساحت جو نہایت باقاعدہ اور مضبوط ہوتی ہے۔ اور بھی قابل توجہ ہے کہ ہر انسان کی کلائی سے لے کر انگلیوں کے سرے تک کی لمبائی۔ دو پستانوں کا فاصلہ۔ ناف اور عانہ کی دوری اور دل کے سرے سے لے کر ہنسلی تک کا بُعد ایک بالشت ہوتا ہے۔ دو کانوں کا درمیانی فاصلہ اور پاؤں کا طول سوا بالشت ہوتا ہے۔ ناک اور ہونٹوں کی لمبائی۔ منہ کا طول پاؤ بالشت ہوتا ہے۔ ایک انگلی کا دوسری سے فرق۔

اور آنکھوں کی لمبائی ۸ / ۱ بالشت کے برابر ہوتی ہے۔ پھر اس کے ایک ایک جوڑ کو لے کر مستقل تشریح پر غور کرو۔ تو وہ اور بھی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے۔ آنکھوں کی پتلی ہی کو دیکھو کہ کتنی ذرا سی چیز ہے

مگر زمین و آسمان، پہاڑ و میدان کو اپنے اندر لے لیتی ہے۔ پھر اس کے لیے سات پردے اور تین رطوبتوں کے خزانے بنائے کہ ہمیشہ نرم رہے اور ہر طرف پھر سکے۔ ان میں سے اگر کوئی پردہ بھی ذرا سا خراب ہو جائے تو اس قدرتی کیمرے میں فوراً فرق آجاتا ہے۔ پھر ایک بات یہ بھی دیکھو کہ رب العزت نے آنکھ کے دونوں پٹھوں کو ماتھے پر ایک دوسرے کو قینچی کی طرح کاٹتا ہوا بنایا۔ اور یہ اس لئے کہ دونوں آنکھوں کی دیکھی ہوئی چیز اس مقام پر مل کر ایک دکھائی دے۔ ورنہ دو آنکھوں کے ہونے کی وجہ سے ہر ایک چیز دو عدد دکھائی دیا کرتی۔ گو اسی قینچی کے بگاڑ سے ہر چیز دو عدد نظر آتی ہے۔ آنکھوں پر پپوٹوں کے کواڑوں کو ملاحظہ کرو کہ خطرہ کے وقت خود بخود بند ہو کر آنکھ کو بیرونی اذیت سے بچا لیتے ہیں۔ اور پھر اگر دروازے کھلے ہوئے ہوں تو اندر کو گرد و غبار سے بچانے کے لیے پلکیں عطا فرمائیں، ماتھے اور سر وغیرہ کے میل اور پسینے سے بچانے کے لیے ان پر ابروؤں کے چھجے باندھے اور پھر اس کا دل کے ساتھ ایسا تعلق رکھا کہ ادھر کسی چیز کو دیکھا اور ادھر دل کو خبر ہو گئی۔ یہی نہیں بلکہ اپنی دیکھی ہوئی چیز کے خفیہ رنج و غم اور پوشیدہ احساسات تک بھی دل کو پہنچا دیتی ہے۔

کان کو دیکھو کیسی مناسب جگہ پر ان کو لگایا نہ آگے نہ پیچھے۔ بلکہ دائیں بائیں تاکہ چوطرفہ آوازوں کو سن سکیں۔ پھر ان کے اندر ایسے پیچ رکھے کہ کتنی ہی تند ہوا کیوں نہ ہو جھلی کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ کیونکہ اس کا جوش اس کے مروڑوں میں ٹھنڈا ہو جاتا ہے۔ پھر ان کے ساتھ باہر کی طرف چھاج کی سی دیوار بنا دی کہ وہ ہوا کو روک کو کان میں گھسنے کے لئے مدد دے۔ اگر یہ دیوار نہ ہوتی تو ہوا کا بہت بڑا حصہ ادھر ادھر چلا جاتا اور بیرونی ہوا کا کان کے اندر والی ہوا کے ساتھ ٹکرا کر اچھی حرکت نہ پیدا کرتی۔ جس سے اندر کی ہوا بہت نرمی کے ساتھ کان کی جھلی سے ٹکراتی اور اس سے ثقلِ سماعت کی شکایت ہمیشہ ہمیشہ کے لئے رہتی۔

ناک کی قوتِ ممیزہ **(فرق کرنے کی قوت)** بھی سبحان اللہ کا ورد کرنے کے قابل ہے۔ اس کا خوشبو اور بدبو میں فرق کرنا۔ پھر مختلف خوشبوؤں اور بدبوؤں میں اِسے اس کی قسم کا الگ کرنا کچھ کم حیرت انگیز نہیں۔ پھر انسانوں کی اس قدر کثرت کہ اللہ اکبر۔ مگر جسے دیکھو صورت اور نقش و نگار میں ایک دوسرے سے ممتاز اور الگ۔ غرضیکہ جتنا اس معاملہ کو کھودتے اور کریدتے جاؤ گے اتنے ہی عجائباتِ قدرت اور زیادہ حیران

بناتے جائیں گے۔ جس طرح دنیا کے عجائبات ختم نہیں ہوتے اسی طرح انسانی جسم کے عجائبات کا ختم ہونا بھی مشکل ہے۔

انسان عالمِ صغیر ہے اور اس کا مقابلہ عالمِ کبیر سے:

انسان کے مخزنِ عجائبات ہونے ہی کی وجہ سے صوفیائے کرام نے اس کو عالمِ صغیر یا چھوٹا جہان کہا ہے۔ کیونکہ اگر غور کیا جائے تو جو کچھ اس عالمِ کبیر یا دنیا میں پایا جاتا ہے۔ وہ سب کچھ اس انسانی عالم میں مختصر طور پر ملتا ہے۔ مثلاً جس طرح اللہ جل شانہ کی قدرت کاملہ اس جہان کی حاکم ہے اور اسی کے حکم سے اس جہان کا نظام چلتا ہے۔ اسی طرح اس عالمِ صغیر کا سب نظام روح سے متعلق ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ باوجود ہر جگہ موجود ہونے کے نظر نہیں آتا۔ اسی طرح روح بھی سب جسم میں موجود ہونے کے باوجود کسی جگہ نظر نہیں آتی۔ یہ جہان یا عالمِ کبیر چار چیزوں سے بنا ہوا ہے۔ مٹی، پانی، ہوا اور آگ۔ پانی مٹی کے ارد گرد ہے۔ ہوا پانی پر محیط ہے اور سب سے اوپر کرۂ ناری ہے۔ اسی طرح انسانی جسم یا عالمِ صغیر میں انسانی ٹانگیں زمین سے متصل ہونے کی وجہ سے زمین ہیں۔ اس کے اوپر معدہ اور مثانہ پانی سے بھرا ہوا ہے۔ اس کے اُوپر سینہ ہوا کا مقام ہے اور پھر اس کے اوپر سر ہے جو عقل، بصارت، ذکاوت اور حواس کا گھر ہے۔ اور یہ روشنی و حرارت میں مشابہ ہیں آگ کے۔ یا اس طرح بھی یہ چاروں چیزیں انسان کے جسم میں ثابت کی جاسکتی ہیں کہ جب انسان کھجلاتا ہے۔ تو مٹی کے ذرات نکلتے ہیں۔ جب روتا ہے۔ تو پانی نکلتا ہے جب کودتا ہے۔ تو ہوا اپنا اثر دکھاتی ہے۔ اور جب غصے میں ہوتا ہے تو آگ کے وجود کو تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس جہاں میں بخارات ہوتے ہیں۔ بادل آتے ہیں۔ بارش ہوتی ہے۔

اس میں حیوانات، نباتات اور جمادات (پتھر) پائی جاتی ہے۔ اسی طرح عالمِ صغیر میں آنسو، پیشاب، تھوک اور دوسری رطوبتیں ہیں۔ گوشت اگر زمین ہے تو ہڈیاں پہاڑ، پیٹ اگر سمندر، انتڑیاں دریا، رگیں نہریں اور ڈولیں۔ جہاں بالوں کی سبزی اگی ہوئی ہے۔ وہ جگہ مزروعہ زمین کے مشابہ ہے۔ اور جہاں بال نہیں اُگتے وہ بنجر کا نمونہ ہے۔ انسان کا سانس لینا ہوا کا چلنا ہے اس کی بات بادل کی گرج ہے۔ اس کا ہنسنا بجلی کا کوندنا اس کا رونا بارش کا برسنا ہے۔ اس کی خوشی دن اور غمی رات ہے۔ اس کی نیند موت اور بیداری

حیات ہے۔ اس کا بچپن فصلِ ربیع ہے اور شباب بہار ہے۔ اس کی پختہ عمر فصلِ خریف ہے تو بڑھاپا خزاں ہے۔ اس کے اخلاق میں کبھی شیر کی سی بہادری ہوتی ہے اور کبھی گیدڑ جیسی بزدلی۔ کبھی بلی جیسی خوشامد کرتا ہے تو کبھی لومڑی جیسا مکر۔ کبھی مرغے جیسا سخی بن جاتا ہے تو کبھی کتے جیسا بخیل۔ اس کے حواسِ خمسہ یعنی سامعہ، باصرہ، ذائقہ، شامہ اور لامسہ۔ پانچ جاسوسوں کی طرح اسے تمام مفاد و مضار **(فائدہ ونقصان)** سے مطلع کرتے رہتے ہیں۔ وہ تمام دنیا کے حالات کی چھان بین کر کے قوت متخیلہ کے حوالے کر دیتے ہیں۔ قوت متخیلہ اپنے سردار قوت حافظہ کے حوالے کرتا ہے۔ اور قوت حافظہ شاہ عقل کا بیدار مغز وزیر ہے۔ اور یہ ظاہری و باطنی قویٰ کا سلسلہ دنیا کے بادشاہی سلسلہ کے مماثل ہے۔

ستم است اگر ہوست کشد کہ بسیر سرو سمن درآ
تو زغنچۂ کم ند میدۂ در دل کشا بچمن درآ

ترجمہ: یہ ستم ہے اگر ہوس تجھے کھینچے اور مائل کرے کہ سرو وسمن کی سیر کی طرف آ۔ تو نے غنچے کو نہیں دیکھا ہے دل کا دروازہ کھول اور چمن میں آ۔

دیکھئے بات کہاں سے کہاں چلی گئی۔ میں تو انسانی تربیت کے دس درجے بیان کر رہا تھا۔ جس سے سلسلہ دوسری طرف چلا گیا۔ تو خیر بیان یہ ہو رہا تھا کہ مخلقہ پوری مدت کے بعد ایک نہایت تنگ مقام سے ایک نہایت حسین وجمیل بچے کی صورت میں صفحۂ دنیا پر لایا جاتا ہے۔ جس کے مختصر سے جسم میں وہ وہ عجائبات ہیں جن کا ایک ذرہ بھر ابھی بیان کیا جا چکا ہے۔ اب یہ طفلِ نومولود جوں جوں بڑا ہوتا جاتا ہے۔ اسی تناسب سے دودھ کا سلسلہ بھی کم دیا جاتا ہے۔

کچھ عرصہ بعد اس کے نرم اور نازک مسوڑھوں میں سخت دانت پیدا کر کے اس کو روٹی اور سخت غذا کھانے کے قابل بنا دیا جاتا ہے۔ اور ساتھ ہی ساتھ بتدریج دوسری قوتوں کو بھی بڑھایا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ بچپن سے نکل کر عالمِ جوانی میں جا پہنچتا ہے۔ اسی وجہ کا نام قرآنِ پاک نے بلوغ الاشد رکھا ہے۔ کیونکہ اس وقت اس کے تمام اعضاء اور قوتیں انتہائی زور اور جوش میں ہوتی ہیں۔ وہ دوسروں کی مدد سے بے نیاز ہو کر اپنے زورِ بازو سے کماتا ہے۔ خود کھاتا ہے اور دوسروں کو کھلاتا ہے۔ قوتوں کے اُٹھان اور خون کے

ہیجان کے باعث وہ زمین پر اکڑ کر چلتا ہے اور اپنے جیسا کسی دوسرے کو نہیں سمجھتا۔

حضرت علیؓ کی زبان دُرِّفشاں سے تکبر کا بہترین علاج:

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ وہ انسان کیا فخر کرسکتا ہے جو تین دفعہ پیشاب کے نجس مقام سے نکل چکا ہو۔ دوستوں نے پوچھا حضرت وہ کیسے؟ فرمایا ایک دفعہ وہ باپ کی پیٹھ سے چل کر اس کے پیشاب کے مقام سے نکل کر ماں کے پیشاب کے مقام سے ہوتا ہوا رحم میں داخل ہوتا ہے۔ اور تیسری دفعہ جب وہ پیدا ہوتا ہے۔ تو پھر وہی مقام اس کا مخرج اور مصدر بنتا ہے۔ اس لئے ہر جوان کو جبکہ وہ تکبر وغرور کے مرض میں مبتلا ہو جائے تو اپنی اصل کو یاد کر کے اس نامراد مرض کا ازالہ کرے، نامراد اس لئے کہ

تکبر عزازیل را خوار کرد
بزندان لعنت گرفتار کرد

تکبر نے شیطان کو جو بڑی عزت والا تھا ذلیل کر دیا اور لعنت کا طوق اس کے گلے میں ڈال دیا۔ اسے یاد کرنا چاہیے کہ میرا یہ متکبر وجود تو وہ ہے جو ایک قطرۂ منی سے بنا، تین دفعہ غلیظ مقام سے نکالا گیا۔ حالت حمل میں نو مہینے تک حیض کا خون کھایا، اس یاد اور تدبیر سے انشاالله تعالیٰ تکبر کا بھوت اتر جائے گا۔ الله جل شانہ فرماتے ہیں!

وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّكَ لَنْ تَخْرِقَ الْاَرْضَ وَلَنْ تَبْلُغَ الْجِبَالَ طُوْلًا ۔
(بنی اسرائیل:۳۷)

یعنی زمین میں اکڑتا ہوا نہ چل کیونکہ نہ تو زمین کو پھاڑ ڈالے گا اور نہ طول میں پہاڑوں کو پہنچ سکے گا۔

کسی عربی شاعر نے کہا ہے ع

ولا تمش فی الارض الا تواضعا   فکم تحتها قوم هم منك ارفع
فان کنت فی عز وحر زد رفعة   فکم مات من قوم هم منك امنع

تو مطلب یہ ہے کہ جب جوانی کا سورج عین نصف النہار پر ہوتا ہے۔ تو اس کی تمازت اور گرمی بہت تیز ہوتی ہے اور اس میں انسان وہ کچھ کر بیٹھتا ہے جو اسے نہ کرنا چاہیے تھا تھوڑے ہی عرصے بعد

آفتابِ جوانی ڈھلنا شروع ہو جاتا ہے اور بالآخر بڑھاپے کی عصر آجاتی ہے۔ جس میں جوانی کے سورج کی شعائیں بالکل پھیکی اور ماند پڑ جاتی ہیں۔ اور یہی زمانہ شیخوختہ کا ہوتا ہے۔ اس زمانہ میں جولانی کے کمال کا ردِّعمل شروع ہو جاتا ہے۔ روز بروز قویٰ میں انحطاط اور زوال آنا شروع ہو جاتا ہے۔ کرتے کرتے یہ تنزل کی حالت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ انسان پھر ایک بچہ کی طرح ہو جاتا ہے۔ سب کچھ حاصل کیا ہوا پھر نسیاً منسیا ہو جاتا ہے۔ یہ زمانہ بھی کچھ ہی عرصہ تک رہتا ہے اس کے بعد جلدی یہ سورج بالکل غروب ہو جاتا ہے اور اندھیری رات کا سماں بن جاتا ہے۔ اسی کو قرآن پاک نے وفات کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔

’’مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ‘‘ کا تربیت انسانی کے علم پر انطباق:

دیکھا قرآن پاک نے کس طرح منی کے ابتدائی نقطہ سے لے کر وفات کے آخری نقطہ تک دو سطروں میں جامع ومانع الفاظ میں سب کچھ بیان کر دیا اور پھر میں نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ وقت وموضوع کو مدنظر رکھ کر نہایت ہی مختصر بیان کیا ہے اگر صرف انسانی جسم کے عجائب وغرائب کو تفصیل سے بیان کیا جائے تو ایک طویل عرصہ کی ضرورت ہے حقیقت تو یہ ہے کہ انسان قدرت کا ایک عجوبہ اور اس کے رازوں کا ایک مقفل صندوق ہے کسی شاعر نے کہا ہے ع

نظر سوئے خود کن کہ تو جانِ دلربائی   مفگن بخاک خود را کہ تو روحِ جانفزائی
توز چشم خود بہائی تو کمال خود چہ دانی   چُو دراز صدف بروں آ کہ تو از بلند جائی

فرماتے ہیں کہ اے انسان تو اپنی طرف نظر کر، کیونکہ تو ہی دلربا ہے اور اپنے آپ کو ذلیل نہ کر کیونکہ تو روح جانفزا ہے۔ چونکہ تو اپنے آپ سے چھپا ہوا ہے۔ اس لئے تجھے اپنے اندرونی کمال کی خبر نہیں۔ تجھے چاہیے کہ سیپ سے موتی کی طرح باہر نکل۔ اور اس جہالتِ نفس کو دور پھینک کر عرفانِ نفسی کا مادہ پیدا کر۔ کیونکہ تو نہایت بلند مقام سے تعلق رکھتا ہے۔

اسی واسطے حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

’’مَنْ عَرَفَ نَفْسَہٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّہٗ‘‘

(مرقاۃ المفاتیح: الجز۱، رقم: ۸۲، باب الایمان بالقدر، دار الفکر بیروت)

یعنی جو اپنے آپ کو پہچان لیتا ہے وہ اپنے رب کو پہچان لیتا ہے۔

اور اپنے پوشیدہ کمالات پر مطلع ہوتا ہے اور نفس کے سربستہ صندوق کو کھول کر عرفان و معرفت کو حاصل کر لیتا ہے تو وہ اس اطلاعِ نفس کے بعد اپنے رب اپنے مالک و خالق کو بھی پہچان جاتا ہے۔

تسمیہ کا" الرحمٰن الرحیم "فاتحہ کے "الرحمٰن الرحیم "سے الگ ہے:

الرحمٰن الرحیم یعنی جو نہایت مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔ اس کا مفصل بیان تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم میں ہو چکا ہے۔ مگر پھر بھی اس وقت نئے طور پر کچھ مختصراً بیان کرتا ہوں۔ اور اگر سچ پوچھو تو یہ بیان کچھ نیا نہ ہوگا۔ بلکہ ایک دوسری چیز کا دوسرا بیان ہوگا کیونکہ سورہ فاتحہ کے الرحمٰن الرحیم کا بسم اللہ کے الرحمٰن الرحیم سے بہت فرق ہے۔ اور اگر فرق نہ ہوتا تو پھر تو محض تکرار بلا فائدہ تھا۔ اور تکرار بلا فائدہ کلام خداوندی کے ساتھ کیسے مناسب اور زیبا ہے۔

رحمت کا معنی اور اس کی اقسام:

لیکن اس سے پہلے کہ میں تسمیہ کے الرحمٰن الرحیم اور فاتحہ کے الرحمٰن الرحیم کا فرق بیان کروں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ آپ کو اس کے معنی اور اقسام بھی بتا دوں کیونکہ اس کے معنی اور نام معلوم کر لینے کے بعد آپ آئندہ فرق کو بلا تکلف سمجھ سکیں گے۔ رحمت لغت میں رقت قلب اور دل کے میلان کو کہتے ہیں۔ مگر چونکہ ذاتِ باری قلب اور رقت جیسے الفاظ کے تعلق سے پاک ہے۔ اس واسطے یہ سمجھ لیجیے کہ جب ایسے الفاظ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کئے جائیں تو اُن سے مراد ان الفاظ کی غائیت اور مقصود ہوتا ہے۔ جیسے رحمت کا مقصود اور غائیت احسان اور مہربانی ہے۔ تو رحمتِ الٰہی سے مراد اللہ تعالیٰ کا احسان کرنا اور کسی مخلوق پر مہربان ہونا ہے۔ اور رب العزت کا یہ احسان کبھی تو ایصالِ خیر کی صورت میں ہوتا ہے اور کبھی دفعِ شر کی شکل میں۔

اب رحمت کے معنی اور اللہ جل شانہ کی طرف منسوب ہونے کا مطلب سمجھنے کے بعد یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت دو قسم کی ہے۔ ایک ذاتی اور دوسرے صفاتی۔ پھر یہ دونوں رحمتیں یعنی ذاتی اور صفاتی ہر ایک اپنی جگہ پر دو دو قسم کی ہیں۔ ایک عام اور ایک خاص۔ تو گویا رحمت خداوندی کی چار اقسام

ہوئیں۔ ذاتی عام۔ ذاتی خاص۔ صفاتی عام۔ صفاتی خاص۔ اب ذاتی عام وہ رحمت ہے کہ جس سے عام مخلوقات کے وجود موجود ہوئے۔ اور ان کی ذات عدم سے ظہور میں آئی۔ ذاتی خاص وہ رحمت ہے کہ جس سے بعض مخلوقات کے وجود کو باری تعالیٰ نوازتے ہیں۔ اور اپنی ولایت کا معزز درجہ عطا فرماتے ہیں صفاتی عام وہ رحمت ہے کہ جس کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے ہر موجود کو اس کی ضرورت کے مطابق چیزیں عطا فرمائی ہیں۔ اور صفاتی خاص وہ رحمت ہے کہ جس کے سبب سے ہر موجود کو کچھ ایسی چیز یا چیزیں عنایت فرمائی ہیں کہ جس کی وجہ سے وہ باقی موجودات سے ممتاز اور ممیز ہو جاتا ہے۔

تسمیہ اور فاتحہ کے الرحمٰن الرحیم میں کیا فرق ہے؟:

اب اس تمام بیان کو سمجھ لینے کے بعد آپ کو کوئی دقت یا شبہ نہ رہے گا کہ تسمیہ کا الرحمٰن الرحیم فاتحہ کے الرحمٰن الرحیم سے الگ ہے کیونکہ تسمیہ میں الرحمٰن الرحیم کا ذکر اللہ کے بعد ہے اور اللہ اسم ذات ہے اور یہ ظاہر ہے کہ اسم ذات کے ساتھ رحمتِ ذاتی کا ہی تعلق ہوتا ہے مگر فاتحہ میں الرحمٰن الرحیم رب العٰلمین کے بعد آیا ہے اور رب العٰلمین اسم صفاتی ہے اس واسطے اسمِ صفاتی کی متعلقہ رحمت بھی صفاتی ہی ہوگی۔ تو معلوم ہوا کہ تسمیہ کا الرحمٰن الرحیم ذاتی رحمت پر دلالت کرتا ہے اور فاتحہ کا الرحمٰن الرحیم صفاتی رحمت کے متعلق ہے اس واسطے دونوں الرحمن الرحیم میں بہت بڑا فرق ہے اور اس کا تکرار بلا فائدہ نہیں بلکہ عین حکمت سے بھرا ہوا ہے۔

تسمیہ فاتحہ کا جز نہیں:

اس کے علاوہ اس تکرار میں یہ فائدہ بھی ہے کہ پڑھنے والے کو معلوم ہو جائے کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سورہ فاتحہ کا جز نہیں جیسا کہ امام شافعی اور امام احمد بن حنبل رحمہما اللہ کا قول ہے بلکہ امام اعظم علیہ الرحمہ کے قول کے مطابق بسم اللہ الگ ہے سورۂ فاتحہ سے۔ اگر جز فاتحہ ہوتی اور پہلے فرق کو نظر انداز کر دیا جائے تو پھر یہ اعادہ بلا ضرورت ہو جاتا ہے۔

اسلام کی بنیاد رحمتِ خداوندی پر ہے:

اسلام کی بنیاد رحمتِ خداوندی پر ہے ساتھ ہی تکرار سے یہ فائدہ بھی ہے کہ قرآنِ پاک پڑھنے

والے کو معلوم ہوتا رہے کہ مذہب اسلام کی بنیاد زیادہ تر رحمتِ خداوندی پر ہے وہ بے مثال ہستی بار بار انسان کو اپنی رحمت کی طرف توجہ دلاتی ہے کہ اے انسان تو گناہوں کے ارتکاب سے عبادات کے نقصان سے میرے احسان و انعام سے مایوس نہ ہو بلکہ ''رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ'' پر نظر کر کے ''لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ'' کا مصداق بن۔ دیکھ میری رحمت تو ہر چیز کو گھیرے ہوئی ہے اس واسطے تو میری رحمت سے نا اُمید نہ ہو بلکہ اپنے کیے پر نادم ہو کر میرے دربار میں جھک۔ گزشتہ کو چھوڑ کر آئندہ کو سنبھل جا۔ تو میں تیرے تمام گناہوں اور قصوروں کی آلودگی کو دریائے رحمت سے صاف کر دوں گا۔

شیخ سعدی فرماتے ہیں ع

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ　　گر کافرو گبرو بت پرستی باز آ
ایں درگہ مادرگہ نومیدی نیست　　صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

فرماتے ہیں کہ اے انسان اگر چہ تو کافر، گبر، یا آتش پرست ہی کیوں نہ ہو۔ سچے دل سے توبہ کر کے اپنے کئے سے باز آجا۔ تو تو ہماری رحمت کا مستحق ہو جائیگا۔ کیونکہ ہماری سرکار میں ناامیدی اور مایوسی کا کوئی گذر نہیں۔

وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖٓ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ۝ (الحجر:۵۶)

اپنے رب کی رحمت سے کون ناامید ہو مگر وہی جو گمراہ ہوئے۔

اگر چہ تو نے سو بار توبہ کیوں نہ توڑی ہو۔ باز آجا۔ ہم تجھے معاف کر دیں گے۔

انسان کیا اور اس کی عبادت کیا:

اور سچ پوچھو تو انسان کیا ہوگا اور اس کی عبادت اور اس کا ذکر و شکر کیا ہوگا۔ انسان ہزار کوشش کرے۔ مگر وہ حقِ عبادت کو کبھی بھی ادا نہیں کر سکتا۔ کیونکہ رب العزت کے اس پر اس قدر انعام اور احسان ہیں کہ ان کا شمار و احاطہ انسان کی طاقت سے باہر ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا۔ (ابراہیم:۳۴)

اگر تم اللہ کی نعمتوں کو شمار کرو تو ایسا ناممکن ہے۔

کسی نے کہا ہے۔

لو عشت الف عام فی سجده لربی   شکر الفضل یوم ، لم اقض بالتمام
والعام الف شهر ، الشهر الف یوا   والیوم اف حین والحین الف عام

یعنی اگر میں رب العزت کے ایک دن کے انعامات کا شکر ادا کرنے کے لیے ہزار سال تک سجدہ میں پڑ ارہوں تو ایک دن کے احسانات کا شکریہ بھی پوری طرح ادا نہ ہوگا۔ اور ہزار سال یہ دنیوی معمولی سال نہیں بلکہ ایک سال ہزار مہینے کا ہو۔ اور ہر مہینہ ہزار دن کا اور ہر دن ہزار گھڑی کی اور ہر گھڑی ہزار سال کی تو بھی اس کے حق شکر کو پوری طرح ادا کرسکنا قطعاً محال ہے۔ ہاں اتنا ہوسکتا ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق کرتا جائے۔ اور اپنے افعال کی ابتداء اثنا اور انتہا پر اللہ تعالیٰ سے اس کی رحمت کا طلبگار رہے۔ باری تعالیٰ اپنی کریمی سے اس کے افعال کے نقائص وعیوب کو اپنی رحمت کی چادر سے ضرور ڈھانک دینگے۔

حمدِ ربی اور رحمتِ خداوندی لازم وملزوم ہیں:

اس الرحمٰن الرحیم کو یہاں لاکر اللہ تعالیٰ نے انسان کو ایک نہایت لطیف اور پاکیزہ سبق سکھایا۔ اور وہ سبق یہ ہے کہ رب العزت کی حمد وثنا کرنے سے اس کی رحمت لازم وملزوم کی حیثیت سے بندے کی طرف متوجہ ہوجاتی ہے۔ اس لئے الحمدللہ رب العٰلمین میں حمدِ ربی کو بیان کرنے کے بعد الرحمٰن الرحیم کو لایا گیا۔

دیکھئے جب آدم علیہ السلام کا قالب بنا کر روح کو ان کے قالب میں پھونکا گیا تو آپ کی روح جب دماغ میں پہنچی تو آپ کو چھینک آئی، چھینک کے آنے پر آپ نے ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' فرمایا۔ باری تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کی اس ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کا جواب ''يَرْحَمُكَ'' کے الفاظ میں عنایت فرمایا۔ کہ اے آدم آپ پر میری رحمت ہو اور پھر رحمت کیسی ہوئی۔ جنت کی نعمتوں سے نوازے گئے۔ خلیفۃ اللہ کی حیثیت سے دنیا میں بھیجے گئے۔ صفی اللہ کے مقدس خطاب سے مشرف کئے گئے۔ کروڑوں انبیاء علماء صلحا اور اولیاء کے باپ ہونے کا فخر عطا کیا گیا۔ اسی لئے آپ کی اولاد میں بھی آج تک یہی سلسلہ چل رہا ہے کہ جب کوئی چھینک مار کر ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ'' کہتا ہے تو سامع ''يَرْحَمُكَ اللّٰهُ'' کے الفاظ میں جواب دیتا ہے۔ جس سے ظاہر ہے کہ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ یعنی خدا کی تعریف وتوصیف کرنے والے کا بدلہ لازمی طور پر رحمت خداوندی ہے۔ اس لئے یہاں بھی جب نمازی نے الحمدللہ کے الفاظ منہ سے نکالے تو الرحمٰن الرحیم کہلا کر دنیوی واخروی رحمت کا وعدہ کردیا گیا۔ کیونکہ اس مقام پر

اپنی تعریف ان الفاظ میں فرمانے کا صاف مطلب یہی ہے کہ حامد ان اسماء کی صفات کا مستحق ہو رہا ہے۔

اللہ کی تربیت رحمن و رحیم سے مرکب ہے:

اور دونوں کی رحمت کے الگ الگ ہونے کی دلیل:

الحمد للہ میں اللہ جل شانہ نے دعویٰ فرمایا تھا کہ تمام کی تمام صفتیں میری ہی ذات کے لیے مختص ہیں اس کے بعد اس دعوے کی دلیل ''رَبُّ الْعَالَمِیْن'' نے بیان فرمائی۔ اب رب العٰلمین کی تشریح فرماتے ہیں کہ تربیت ہم کس طرح کرتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے کہ ہماری تربیت رحمٰن اور رحیم سے مرکب ہے۔ اور یہ تو بیان کر ہی چکا ہوں کہ رحمٰن کا تعلق دنیا سے ہے اور رحیم کا تعلق آخرت سے۔ سابقہ بیان کے علاوہ یہاں پر سورہ فاتحہ کے محض الفاظ پر غور کرنے سے رحمٰن و رحیم کی رحمت کا فرق فوراً ذہن نشین ہو سکتا ہے۔ وہ اس طرح کہ رحمٰن کے پہلے رب العٰلمین آیا ہے۔ اور ربوبیت کا اولین تعلق دنیا سے ہے۔ اس واسطے رحمتِ رحمانی کا تعلق بھی دنیا سے ہے۔ اور رحیم کے بعد مالک یوم الدین آتا ہے۔ اور یوم دین آخرت کا دوسرا نام ہے۔ تو گویا بتا دیا کہ رحمتِ رحیمی کا تعلق یومِ آخرت سے ہے۔

تو اب اس فرق کو سمجھنے کے بعد آپ کو معلوم ہو کہ اللہ تعالیٰ الرحمٰن الرحیم فرما کر اپنی تربیت کی یوں تشریح فرماتے ہیں۔ کہ اے لوگو! میں ہی تم کو دنیا میں تمہاری ضروریات عطا کرتا ہوں۔ جس سے تم بڑھتے اور پھلتے پھولتے ہو۔ اور میں ہی ہر شخص کو آخرت میں اس کے اعمال اور استعمالِ دنیا کے مطابق بدلہ دونگا۔ اور یہ دونوں صفتیں تربیتِ عالم میں کیوں داخل فرمائیں۔ اس کی وضاحت میں ایک مثال دے کر بیان کرتا ہوں۔

رحمٰن اور رحیم کی صفتوں کو تربیتِ عالم میں داخل کرنے کی وجہ:

دیکھئے بچہ جس وقت پیدا ہوتا ہے۔ تو وہ دنیا میں آ کر دو تربیتوں کا محتاج ہوتا ہے۔ ایک عام اور دوسری خاص۔ عام رحمت تو باپ کی طرف سے ہوتی ہے کہ بچے کے کھانے پینے اور ضروریات یومیہ کے علاوہ اس کو قابل اور لائق بنانے کی بھی فکر کرتا ہے۔ وہ اس کے لئے ایسے بندوبست کرتا ہے کہ جس سے اس کی

آئندہ زندگی سدھر جائے۔ اور ایسے اُمورِ عامہ کلیہ اس کے ذہن میں جزوی اُمور مثل کپڑے خوراک وغیرہ کے زیادہ قابلِ توجہ ہوتے ہیں۔ مگر ماں اگر چہ وہ بھی ان اُمورِ عامہ کا لحاظ تو کرتی ہے مگر باپ جتنا نہیں۔ ہاں وہ زیادہ تر اس کے اُمورِ جزیہ کا خیال رکھتی ہے بچے کے کھانے پینے لباس اور جوتے وغیرہ کا خیال اسے باپ سے زیادہ ہوتا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ دونوں جزیہ وکلیہ رحمتیں نہ ہوتیں تو بچے کی تربیت میں ضرور نقص رہ جاتا۔ اسی واسطے یتیم بچے عموماً اُمورِ کلیہ سے محروم دیکھے جاتے ہیں۔ مگر یسیر بچوں کو اُمورِ جزیہ (جزوی کام) کی تکلیفوں میں مبتلا دیکھا جاتا ہے۔

تو اللہ تعالیٰ کی رحمتِ رحمانی بھی مخلوقات کے اُمورِ کلیہ اور عام ضرورتوں کا لحاظ رکھتی ہے۔ اور رحمتِ رحیمی کا کام اُمورِ جزیہ اور خاص خاص کاموں کا خیال رکھنا ہے۔ تاکہ انسان کی تربیت جزئی اور کلی ہر دو اُمور میں پوری پوری ہو اور کسی قسم کی کمی نہ رہے۔

ہر بڑے چھوٹے کام میں رب العزت کا دروازہ کھٹکھٹانا چاہیے اور حکایتاً اس کا تقابل دنیوی سلاطین سے:

رب العزت نے رب العٰلمین کے بعد یہ صفتیں بیان فرما کر انسان کو ایک یہ سبق بھی سکھایا کہ اے ابن آدم تو چھوٹے اور بڑے ہر ایک کام میں میرا دروازہ کھٹکھٹا۔ کیونکہ اگر صفتِ رحمٰن کے بعد صفتِ رحیم کو بیان نہ فرماتے تو شاید انسان بڑے بڑے کاموں میں تو اللہ تعالیٰ کے آستانہ پر سرِ نیاز جھکاتا۔ تو چھوٹے چھوٹے کاموں کو ذاتِ خداوندی کی شانِ عالیشان کے لائق نہ سمجھ کر کسی اور طرف سر ٹکراتا۔ کیونکہ لکھا ہے کہ کسی شخص نے ایک جلیل القدر بادشاہ سے ایک پیسہ کا سوال کیا۔ اس پر بادشاہ نے کہا کہ تو نے یہ سوال میری شان کے مطابق نہ کیا۔ اس لئے تیرا سوال ردّ کیا جاتا ہے۔ پھر اس نے کہا۔ اچھا اگر آپ اپنی شان کے مطابق مجھ سے سوال کروانا چاہتے ہیں تو مجھے سو گاؤں عنایت فرما دیجیے۔ بادشاہ نے کہا کہ اگر چہ تو نے یہ سوال میری شان کے مطابق کیا ہے مگر اس میں تو نے اپنی شان کا خیال نہیں رکھا۔ اس واسطے یہ بھی پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ جل شانہ رحمٰن اور رحیم دو الفاظ لا کر ہدایت فرما رہے ہیں کہ یہاں دنیوی بادشاہوں کی طرح شان کا سوال نہیں۔ بلکہ ہر چھوٹا بڑا سوال مجھ ہی سے کرو اور قرآن پاک میں فرمایا!

’’وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ؕ اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ۙ۔

(البقرۃ:۱۸۶)

یعنی اے میرے حبیب جب میرے بندے آپ سے میرے متعلق پوچھیں تو آپ فرما دیجیے کہ میں تو قریب ہوں اور ہر ایک دعا کرنے والے کی دعا کا جواب دیتا ہوں جب وہ مجھے پکارے۔
شیخ سعدی فرماتے ہیں۔

محال است اگر سر بریں در نہی
کہ باز آیدت دست حاجت تہی

یعنی محال اور ناممکن ہے کہ کوئی اس دروازہ پر آ کر ہاتھ لمبا کرے۔ اور پھر اس کے ہاتھ کو خالی لوٹایا جائے۔ تو اللہ تعالیٰ نے رب العٰلمین کے بعد یہ دونوں صفتیں اس لئے بیان فرمائیں تا کہ انسان ہر چھوٹے بڑے معاملہ میں اس سے سوال کرے۔

حتی شراك نعلك و ملح قدرك۔

(روح البیان: جلد ا، صفحہ ۵، سورہ فاتحہ، دار احیاء التراث العربی بیروت)
یعنی یہاں تک کہ جوتی کا تسمہ اور ہانڈی کا نمک بھی اگر ضرورت ہو تو اللہ جل سے مانگے۔

رحمتِ خداوندی اور ضرورتِ انسانی کا تعلق:

اور پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت بھی قربان ہونے کے قابل ہے کیونکہ جس چیز کی انسان کو زیادہ ضرورت ہے وہ بلا تکلیف دے رہا ہے اور جس کی کم ضرورت ہے وہ ضرورت کے فرق کے مطابق محنت کے ساتھ متعلق فرما دی ہے۔

مثلاً انسان ہوا کے بغیر ایک دو منٹ تک بمشکل زندہ رہ سکتا ہے۔ اور اس کی ہر جاندار کو اس قدر ضرورت ہے کہ اس کی غیر حاضری میں تھوڑے ہی عرصہ میں دنیا کا نظام تباہ برباد ہو جائے۔ مگر رحمت خداوندی کو تو دیکھو کہ ہوا اس قدر سستا اور سہل الحصول بنا دیا ہے کہ نہ اس پر پیسہ پائی خرچ کرنے کی ضرورت اور نہ اس کے اندر لے جانے اور باہر نکالنے کی فکر۔ نہ اس کی کمی کا ڈر اور نہ اس کی زیادتی کا خوف۔

کسی سے باتیں کرو سوؤ یا جاگو۔ اٹھو یا بیٹھو ہر حالت میں خود بخود قدرتی طور پر اندر آ جا رہی ہے۔ نہ قیمت اور نہ تکلیف۔ ہوا کے دوسرے درجے پر پانی ہے چونکہ پانی کی اتنی ضرورت نہیں جتنی ہوا کی ہے۔ بلکہ اس کے بغیر انسان دنوں زندہ رہ سکتا ہے۔ اس واسطے اسے بھی اگرچہ سہل الحصول اور عام تو بنایا مگر اس کی ضرورت دوسرے درجے کی ہونے کے باعث ساتھ ہی انسان کی محنت کا تعلق بھی رکھ دیا۔

یعنی کنوئیں کھودو یا چل کر کے لاؤ۔ اور پھر پینے میں بھی کچھ محنت صرف کرو ہوا سے تیسرے درجے اور پانی سے دوسرے درجہ پر طعام ہے۔ اس کی کمیٔ ضرورت کے باعث اس میں اور زیادہ محنت خرچ کرنی پڑتی ہے۔ اس کے واسطے ہل چلاتے ہیں بیج بوتے ہیں فصل کاٹتے ہیں۔ صاف کر کے پیستے ہیں۔ پھر پکاتے ہیں، تب کہیں جا کر کھانے کی نوبت آتی ہے۔

سب سے آخری درجہ مال و دولت اور زر و جواہر کا ہے۔ چونکہ انسان کا ان کے بغیر بھی گزارہ ہو سکتا ہے۔ اس واسطے ان کے حصول میں طرح طرح کی مشکلات رکھ دی گئیں انسان ان کے پیچھے کہاں سے کہاں مارا مارا پھرتا ہے۔ موتی کے نکالنے میں کبھی دریا برد ہو جاتا ہے۔ تو کبھی مچھلی کا نوالہ بن جاتا ہے۔ ہیروں کے لئے کانوں کے اندر گھستا ہے۔ اور بعض دفعہ اس کشمکش میں جان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔

غرضیکہ اس تمام تقریر سے یہ بات پوری واضح ہو گئی کہ رب العزت نے اس چیز کو نہایت ہی سہل الحصول بنایا ہے جو انسانی زندگی کے لئے نہایت ضروری اور اہم ہے۔

اور وہ چیز جس کے بغیر انسان گزارہ کر سکتا ہے۔ اس کے حصول میں تکلیف کے مختلف مدارج رکھ دیئے ہیں۔ جہاں ضرورت زیادہ ہے وہاں تکلیف کم اور جہاں ضرورت کم وہاں تکلیف زیادہ۔ مگر انسانوں کا یہ حال نہیں وہ تو جس چیز کی زیادہ کھپت اور زیادہ ضرورت ہو اسے نہایت ہی مہنگا اور گراں کر دیتے ہیں۔ اور جس چیز کی کم ضرورت ہو اسے سستا اور ارزاں کر دیتے ہیں۔

مثلاً آج اگر کسی بیوپاری کے پاس گیہوں کا ایک بڑا گودام ہو اور اس علاقہ میں قحط پڑ جائے تو وہ تاجر لوگوں کی ضرورت کو دیکھ کر اس گیہوں کی تگنی چوگنی قیمت کر دیگا۔ مگر اللہ جل شانہٗ تو مربی اور کریم ہیں۔ وہ تو ضروری کو زیادہ سستا اور عام بناتے ہیں۔

الحمدللّٰہ کی رب العٰلمین تا الرحیم بھی دلیل بن سکتے ہیں اور اس کی توضیح:

اور الرحمٰن الرحیم کو رب العٰلمین کی تشریح نہ مانا جائے تو ان دونوں الفاظ کو رب العٰلمین کی طرح الحمد اللہ کی دلیل بھی ٹھہرا سکتے ہیں۔ یعنی الحمد للہ میں جو باری تعالیٰ نے اختصاص کا دعویٰ فرمایا ہے۔ اس کی ایک دلیل تو رب العٰلمین ہے۔ اب الرحمٰن الرحیم بھی رب العٰلمین کے ساتھ ملا کر رب العٰلمین الرحمٰن الرحیم سب کو اس دعوے کی دلیل قرار دیا جا سکتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ انسان دنیا میں تین شخصیتوں کی تعریف کرتا ہے۔ ایک تو وہ جس نے اس کے ساتھ گذرے ہوئے زمانے میں مہربانی کی ہو دوسرا وہ جو اس کے ساتھ فی الحال احسان کر رہا ہو۔ تیسرا وہ جس سے اسے آئندہ نوازش کی امید ہو۔

تو اللہ جل شانہ نے رب العٰلمین میں تو نعماے ماضیہ (گزشتہ نعمتیں) اور گذشتہ احسانات کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ کہ میں نے تجھے پیدا کیا، پالا، بڑا کیا۔ تجھے تیرے سب ضروریات سے نوازا تیرے متناسب اعضاء تیرے قد وقامت اور تیرا عقل وفکر سب کچھ میرا رہینِ منت ہے۔ پھر الرحمٰن فرمایا یعنی فی الحال بھی میں ہی تیری ضروریات کا کفیل ہوں۔ ہر ایک چیز تجھے میری ہی طرف سے دی جاتی ہے۔ پھر فرمایا الرحیم۔ یعنی زمانہ مستقبل میں کہ زمانہ آخرت ہے۔ میری ہی رحمت سے تیری نیا پار لگے گی۔ میں ہی تیرے گناہوں کو معاف کر کے تجھے جنت میں داخل کروں گا۔ اور آخرت کی سب نعمتیں میری ہی عطا کردہ ہیں۔ اور چونکہ انہی تین قسم کی نعمتوں کا عطا استحقاقِ حمد کو پیدا کرتا ہے اس لئے دنیا کی ہر ہر حمد میری ہی ذات وصفات کے لئے مختص ہے۔

رحمتِ خداوندی پر اعتراض اور اس کا جواب:

اعتراض: اگر اللہ جل شانہ رحمٰن ہیں اور آپ کی رحمت سے ہر ایک مخلوق پورا پورا فائدہ اٹھاتی ہے تو پھر یہ بیماریاں تکلیفیں مفلسی اور محتاجی وغیرہ دنیا میں کیوں پائی جاتی ہیں۔

جواب: اس شبہ کا جواب دینے سے پہلے ایک اور بات آپ کے ذہن نشین کرنی مناسب سمجھتا ہوں۔ اس کے سمجھنے سے یہ شبہ خود بخود زائل ہو جائے گا۔

آپ غور کریں گے تو دنیا میں ہم کو جس قدر چیزیں ملتی ہیں۔ وہ بڑی بڑی چار قسموں پر منقسم ہوتی ہیں۔

(۱) وہ چیزیں جو ہمارے لئے ضروری بھی ہیں اور نافع بھی۔ مثلاً ہوا کہ ضروری بھی ہے اور نافع بھی اس کے بغیر انسان چند لمحوں کا مہمان ہوتا ہے۔

(۲) وہ چیزیں جو ہمارے لئے ضروری تو ہیں۔ مگر نافع نہیں مثلاً مرضیں، تکلیفیں، آفتیں کہ ضرور ہر انسان پر آتی ہیں۔ مگر نافع نہیں بلکہ تکلیف دہ ہیں۔

(۳) وہ چیزیں جو ہمارے لئے ضروری تو نہیں مگر نافع ہیں۔ مثلاً مال اسباب، دھن دولت۔ کہ ضروری تو نہیں کیونکہ انسان اس کے بغیر بھی گزارہ کرسکتا ہے۔

(۴) وہ چیزیں جو ہمارے لئے نہ ضروری ہیں اور نہ نافع۔ مثلاً فقیری اور محتاجی کہ نہ انسان کے لئے ضروری ہے کہ اس کے بغیر کام نہ چلے۔ اور نہ نافع ہے بلکہ سوچو تو اس سے تکلیف اور نقصان ہوتا ہے۔

اس کی تفصیل کو سمجھنے کے بعد اب معلوم ہوا کہ جو چیزیں مخلوقات کے لئے ضروری اور نافع ہیں وہ تو بالکل عام ہیں اور اس سے ہر ایک نفس کو پورا پورا حصہ دیا گیا ہے۔ مگر وہ چیزیں جن میں ضرورت اور نفع بیک وقت جمع نہیں ہوتے۔ بلکہ بعض نفع دیتی ہیں تو ضروری نہیں اور بعض ضروری ہیں تو نفع نہیں دیتیں اور بعض نہ ضروری ہیں نہ نافع۔ تو ایسی چیزوں کے دینے میں صفتِ رحمانی کی رحمت اضافی طور پر اثر دکھاتی ہے، یعنی کسی کو کم اور کسی کو زیادہ، اور یہ کم وبیش دینا بجائے خود ایک رحمت ہے۔ اگر یہ رحمت نہ ہوتی بلکہ نعوذ باللہ زحمت ہوتی۔ تو رب العزت کے لئے دعویٰ رحمانیت کسی طرح زیبا نہ تھا۔

مولانا روم علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

گر خضر در بحر کشتی را شکست

صد درستی در شکست خضر ہست

اگر خضر نے دریا میں کشتی کو توڑا اس کے اس فعل میں سینکڑوں فوائد موجود ہیں۔

یعنی دیکھو کہ ظاہر میں خضر علیہ السلام نے کشتی کو توڑا تھا اور آپ کا یہ کام ہماری عقل میں اچھا نظر نہیں

آتا۔ مگر حقیقت میں آپ کا یہ کام حکمت اور دور اندیشی پر مبنی تھا اور یہ کشتی کو برباد کرنے کے لئے نہ تھا بلکہ اسی میں کشتی کی حفاظت اور بچاؤ کا راز پوشیدہ تھا۔ جیسا کہ قرآن پاک ارشاد ہے۔

”اَمَّا السَّفِيۡنَةُ فَكَانَتۡ لِمَسٰكِيۡنَ يَعۡمَلُوۡنَ فِى الۡبَحۡرِ فَاَرَدْتُّ اَنۡ اَعِيۡبَهَا وَكَانَ وَرَآءَهُمۡ مَّلِكٌ يَّاۡخُذُ كُلَّ سَفِيۡنَةٍ غَصۡبًا ۝ (کہف:۷۹)

یعنی حضرت خضر علیہ السلام موسیٰ علیہ السلام سے کشتی توڑنے کی وجہ یوں بیان فرماتے ہیں کہ کشتی مسکینوں کی تھی جو دریا میں مزدوری کیا کرتے تھے۔ تو میں نے چاہا کہ اسے عیب دار کر دوں کیونکہ دوسری طرف ایک بادشاہ تھا جو ہر ایک کشتی کو زبردستی پکڑ لیتا تھا۔

تو گویا اگرچہ ظاہر میں توڑنا اور برباد کرنا معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت میں ان مسکینوں کے فائدے کے لئے تھا۔ اسی طرح یہ بیماریاں، دکھ، تکلیفیں اگرچہ بادی النظر میں زحمت معلوم ہوتی ہیں مگر حقیقت میں اگر غور کیا جائے تو یہ بھی باری تعالیٰ کی رحمت و رافت ہے۔ اور اس سب کی تفصیل یوں ہے کہ دنیا میں اگر غنا کے مقابل میں محتاجی نہ ہوتی تو کوئی کسی کا ملازم کیوں ہوتا کوئی کسی کی اطاعت اور فرمانبرداری کس لئے کرتا۔ بادشاہ کے پاس لشکر کہاں سے آتا۔ امراء خدمتگار کہاں سے حاصل کرتے اور اگر دوسرے کی طرف دنیوی احتیاج نہ ہوتی تو دنیا کا نظام کیسے قائم رہتا۔ اور پھر خدا کو بھی کون جانتا۔ اگر بیماری نہ ہوتی تو اطباء کو کون پوچھتا، عطاروں اور دوا سازوں کی کیا قدر ہوتی۔ کتنے بڑے بڑے مالدار ہیں کہ مفلس طبیبوں کے دروازوں پر پڑے ہیں۔ اور کتنے صحت مند اور تنومند سپاہی بیمار بادشاہوں کی چاکری (نوکری) کر رہے ہیں۔ کتنے ہی مفلس فقیر بادشاہوں سے زیادہ آرام کے ساتھ پڑے ہوئے ہیں۔

کتنے ہی امیر ان کے آرام و آسائش پر رشک کرتے ہیں۔ بادشاہ کی مرض اگرچہ اس کے لئے تکلیف ہے، مگر طبیب کے حق میں رحمت، سپاہی کی محتاجی اگرچہ اس کے لئے مصیبت ہے مگر بادشاہ کے حق میں رحمت۔۔ تو اسی طرح پچھلی تین چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے رحمتِ اضافی کی صورت میں تقسیم فرمایا۔ جس سے اس سارے جہاں کا انتظام اور آبادی ہے۔ اگر وہ رحمت بھی پہلی ضروری اور نافع رحمت کی طرح عام ہوتی تو پھر یہی رحمت دنیا کی بربادی اور خرابی کا باعث بن کر زحمت ہو جاتی۔ تو یہ شخصی تکلیف یا انفرادی احتیاج بھی

حقیقت میں رحمت ہے۔ اور اسی واسطے وہ بے نیاز ہستی رحمٰن الدنیا کہلائے جانے کی مستحق ہے۔

تو چہ دانی کہ دریں کارِ خداوند خطا است
زانکہ او ہر چہ کند عین ثواب است

تجھے کیا معلوم کہ اللہ تعالیٰ کے کام میں کبھی غلطی ہو سکتی ہے کیونکہ وہ جو کرتا ہے ٹھیک اور درست کرتا ہے۔

بالشوزم سرمایہ داری کو مٹانے کا غلط علاج ہے:

شبہ: ہاں یہ خیال ہو سکتا ہے کہ یہ تفاوت اور فرق جو ظاہراً ایک شخص کے لئے دکھ اور تکلیف معلوم ہوتا ہے۔ اگر حقیقت میں رحمت ہی ہوتا تو پھر روس جیسے ملکوں میں اس دکھ کو دور کرنے کی کیوں کوشش کی جاتی ہے۔ وہاں پر اسی فرق کو تو مٹانے کے لئے بالشوزم کی تحریک کو جاری کیا گیا ہے۔ تا کہ موجودہ بے چینی اور تکلیف کو جو سرمایہ داری کی وجہ سے پھیلی ہوئی ہے۔ مٹا کر امیر اور غریب کو برابر کر دیا جائے۔ جب لوگوں میں مالی تفاوت نہ رہے گا تو زمانۂ موجودہ کی کشمکش اور بے اطمینانی کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔

جواب: اگر سوچو گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ انسانوں کا یہ ظاہری فرق رب العزت کی طرف سے مقرر شدہ ہے اور اس فرق کے من جانب اللہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ کوئی انسانی ہاتھ یا طاقت اس فرق کو نہیں مٹا سکتے۔ انسان لاکھ کوشش کرے مگر یہ فرق ضروری رہے گا۔ اور اس فرق کے رحمت ہونے کی یہ دلیل ہے کہ اگر اس فرق کو کوشش کر کے کسی حد تک دور بھی کیا جائے تو انجام کار وہ ملک اور قوم تباہ ہو جائے گی۔

تفصیل: اگر دنیا کے انسانوں کا فرق صرف مال و دولت ہی تک محدود ہوتا تو یہ ممکن تھا کہ بالشوزم کی تحریک اس فرق کو مٹا کر اس بے چینی کا خاتمہ کر سکتی۔ مگر یہاں تو مال و دولت کے فرق کے علاوہ اور ہزاروں ایسے فرق ہیں کہ ان کا مٹانا کسی انسانی ہاتھ سے ممکن نہیں۔ اور جب تک وہ فرق نہ مٹائے جائیں موجودہ کشمکش ضرور ہی رہے گی۔ مثلاً عام انسانوں کو دیکھو تو قد میں فرق، رنگ میں فرق، اخلاق میں فرق، صحت میں فرق، قوت میں فرق، عقل میں فرق، میلان میں فرق، اعضاء میں فرق، غرضیکہ ایک انسان دوسرے سے سینکڑوں امتیازات کے ساتھ جدا ہے۔ جن کا دور کرنا کسی انسانی طاقت سے ممکن نہیں۔ جب اس

قدر اختلافات کو انسان مجبوراً اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسلیم کرتا ہے تو پھر مال و دولت کے فرق کو من جانب اللہ ماننے میں کیا حجت ہو سکتی ہے۔

بالشوزم کا ملکی اثر:

اب لیجئے دوسری شق، کہ یہ فرق اور تفاوت رحمتِ اضافی سے متعلق ہے اور اس کے رحمت ہونے کی یہ دلیل بیان کی ہے کہ اگر کسی ملک یا قوم سے اس فرق کو مٹانے کی کوشش جو کی جاتی ہے تو آخر کار وہ ملک یا قوم خود بھی مٹ جاتی ہے اور وہ اس طرح کہ انسان فطرتاً اور طبعاً خود غرض پیدا ہوا ہے۔

جسے قرآن پاک:

”وَاُحْضِرَتِ الْاَنْفُسُ الشُّحَّ “(النساء:۱۲۸)

(انسانی نفوس خود غرض پیدا کیے گئے ہیں)

کے الفاظ میں بیان فرماتا ہے جس کام میں اس کا ذاتی فائدہ نہیں ہوتا وہ کام یہ بالکل نہیں کرتا۔ اور اگر اس سے مجبوراً کرایا جائے تو وہ بددلی سے کرتا ہے اور بجائے سنوارنے کے اور الٹا اس کو بگاڑ دیتا ہے۔

انسان کی اس خود غرضانہ طبیعت ہی کے لئے اللہ تعالیٰ نے جنت اور حور و قصور پیدا فرمائے اور انسان کو عبادت و اطاعت پر بڑے بڑے وعدے دلائے۔ تو اب اگر انسان دنیا میں مزدوری کرے اور اس کے پسینے کی کمائی اسے یا اس کے بال بچوں کو ملنے کی بجائے قوم میں تقسیم کر دی جائے تو پھر وہ اپنی مزدوری میں قطعاً تندہی اور شوق سے مشغول نہ رہ سکے گا۔ اور یہ ایک ایسا فطری جذبہ ہے کہ معمولی سے معمولی حیوانات میں بھی پایا جاتا ہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اس کا روحِ مسابقت یا دنیا میں آگے بڑھنے کا جذبہ بالکل مردہ ہو جائے گا۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ خواہ کام کروں یا نہ پھر سنوار کر کروں یا بگاڑ کر ہر حالت میں میرے اخراجات اور ضروریات کی ذمہ دار گورنمنٹ ہے۔ تو پھر اسے خواہ مخواہ محنت مزدوری میں رات دن ایک کر دینے سے کیا فائدہ۔ اور اگر ایک آدھ ایسی شخصیت نکل بھی آئے جو قوم کے مفاد اور ترقی کو اپنے ذاتی فائدے اور آرام پر ترجیح دے تو ایسے کا وجود نہ ہونے کے برابر ہے۔ کیونکہ حکم عام کا ہوتا ہے اور عام انسان فطرتاً خود غرض ہیں۔ تو جب کسی

ملک سے جذبہ مسابقت ناپید ہو جائے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ دنیا کے اور ملکوں سے تہذیب، تمدن اور طاقت میں پیچھے رہ جائیگا اور بالآخر غلامی اور محکومیت کی کڑیوں میں جکڑ دیا جائے گا۔

بالشوزم کا اخلاقی اثر:

ساتھ ہی اس فرق کے مٹانے سے اخلاقی حیثیت سے بھی بہت بڑا نقصان ہوگا۔ کیونکہ دنیا میں کسی کی عزت دو وجہ سے کی جاتی ہے۔ کسی خوف سے یا کسی امید سے۔ جب بچوں، بیویوں، رشتہ داروں کو اپنے باپ، خاوند اور قریبیوں سے نہ کسی چیز سے محروم کئے جانے کا خوف ہوگا۔ اور نہ کسی چیز کے حاصل ہونے کی امید تو وہ کبھی بھی اس کی عزت یا تعظیم نہ کرینگے۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ بچے نافرمان، عورتیں ناشزہ **(نافرمان)** اور اقارب کالعقارب **(رشتہ دار بچھوؤں کی طرح)** ہو جائینگے۔ عفت وعصمت، پیار ومحبت، شجاعت وسخاوت کے لئے تین چیزوں کی ضرورت ہے ایک مال کی، دوسرے دینے والے کی اور تیسرے لینے والے کی۔ جب مال اس کے پاس نہ ہوگا تو یہ سخاوت ہی کیا کریگا کیونکہ مال تو سب گورنمنٹ کا ہے۔ اور اگر بالفرض مال بھی ہے۔ مگر لینے والا کوئی نہیں کیونکہ سب یکساں حال ہیں۔ تو دے گا کسے؟ نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ اور باقی اخلاقی جذبات بھی آہستہ آہستہ آگ کی طرح بجھ جائیں گے۔

اس سے یہ خیال نہ ہو کہ آج کل ایسے ملک تو نہایت ترقی کر رہے ہیں کیونکہ یہ ترقی عارضی اور چندروزہ ہے۔ اس کے پیچھے پھانسی کا تختہ یا قتل کا خونی ڈنڈا کام کر رہا ہے۔ اس ڈنڈے کے گرتے ہی یہ سب کچھ جاتا رہے گا۔ ہاں اخلاقی پستی تو مسلمہ ہے اور جو کچھ ذرہ برابر ہے تو وہ بھی ملکی قوانین کی پابندی ہے نہ کہ انسانیت کے تقاضے سے۔ (آج یہ حقیقت سامنے ہے کہ روس ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہے جب کہ یہ پیشگوئی ۱۹۳۹ء میں قاضی صاحب علیہ الرحمہ نے کی ناشر)

اسلام اور نسلی ومالی امتیازات:

مگر قربان جائیے اسلام اور پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جنہوں نے اس قدرتی فرق کا ایک نہایت اعلیٰ علاج بتایا۔ جس سے نہ تو قدرت کے ساتھ ٹکر لگتی ہے اور نہ ہی یہ فرق حدِ اعتدال سے بڑھ کر تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔ قرآن نے نسلی اور قبائلی امتیازات کو دور کرنے کے لئے فرمایا!

” یَا اَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ

اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط‘‘ (الحجرات: ۱۳)

یعنی اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے جو سب سے متقی ہے۔

تو گویا قرآن پاک نے ہدایت فرمائی کہ تمہاری قومی تعریفات اور قبائلی امتیازات محض ایک دوسرے کو پہچاننے کے لئے ہیں، یہ کچھ فخر و مباہات یا بڑائی چھوٹائی کا مبنیٰ نہیں۔ اللہ کے نزدیک بڑا وہی ہے، جو اس کے احکام کو ملحوظ رکھتا ہے گورا یا کالا ہونا، مغل یا پٹھان ہونا نہ باعثِ عزت ہوسکتا ہے اور نہ باعثِ ذلت۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بھی اپنے حجۃ الوداع خطبے میں فرمایا ہے!

’’یَا اَیُّھَا النَّاسُ اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ، وَاِنَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ، کُلُّکُمْ لِاٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ ط لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی اَعْجَمِیٍّ، وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ، وَلَا لِاَسود عَلٰی اَحْمَرَ وَلَا لَاَحْمَرَ عَلَی اَلاَسْوَدَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی‘‘

(شعب الایمان: جلد ۷، رقم: ۴۷۷۴، صفحہ ۱۳۲، مکتبۃ الرشد)

(مسند ابن المبارک: جلد ۱، رقم: ۲۳۹، باب من الفتن، مکتبۃ المعارف الریاض)

(مجمع الزوائد: جلد ۳، رقم: ۵۶۲۲، صفحہ ۲۶۶، باب خطاب الحج، مکتبۃ القدسی القاھرہ)

یعنی اے لوگو تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ تم سب آدم کے بیٹے ہو اور آدم مٹی سے تھے۔ تم میں سے اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ معزز وہ ہے جو زیادہ متقی ہو پس عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر یا کالے کو گورے پر یا گورے کو کالے پر کوئی بزرگی نہیں سوائے تقویٰ کے۔

یہ تو تھا ذات پات اور رنگ و نسل کے اختلاف کا علاج۔ اب مالی امتیاز کا علاج سنئے اسلام نے اس امتیاز کو قائم رکھتے ہوئے اسے حدِ اعتدال پر رکھنے کے لئے نہایت اعلیٰ اصول اور قوانین مقرر فرمائے مثلاً مالداروں پر زکوٰۃ فرض فرمائی جس کی وجہ سے ان کے مال کا چالیسواں حصہ ہر سال غربا کے پاس بلا جبر و اکراہ پہنچ جاتا ہے۔

صدقہ فطر مقرر فرمایا، قربانی کا سبق سکھایا۔ قرض حسنہ کی تعلیم دی، قسم وغیرہ پر دم اور کفارے مقرر

فرمائے۔ حج فرض کیا کہ مالداروں کے مال کا بہت سا حصہ اللہ کے رستے میں غربا کو پہنچ جائے، وراثت کا قانون قائم فرمایا تاکہ مورث کے مرنے کے بعد بجائے اس کے کہ اس کا مال ایک شخص کے پاس رہ کر سرمایہ داری کی لعنت کو بڑھائے۔

تمام وارثوں میں مقرر حصص کے مطابق تقسیم ہو کر تمول (مالداری) کو اعتدال پر لے آئے سود کھانے سے سختی سے منع فرمایا کہ کسی غریب کا روپیہ بلا محنت کسی کی تجوری میں داخل ہونے سے بچا رہے اور آج کل سودی کاروبار جس قدر سرمایا کاری کو بڑھا رہا ہے اس کی ایک ادنیٰ سی مثال آپ کے سامنے پیش کر کے اس کی وضاحت کرتا ہوں۔

زکوٰۃ کے دینے اور سود لینے سے سرمایہ داری پر کیا اثر پڑتا ہے:

فرض کرو ایک شخص کسی کو آج صرف ایک روپیہ قرض ایک فی صدی سود کے حساب سے دیتا ہے تو یہ ایک روپیہ سود در سود کے حساب سے تیس سال میں 64 روپے بن جاتا ہے۔ یہی ایک روپیہ ساڑھے سینتیس سال میں 128 اور 106 برس میں ایک لاکھ اکتیس ہزار بہتر اور 150 برس میں تین کروڑ پینتیس لاکھ چون ہزار چار سو تین ہو جائیں گے۔

مگر اس کے برعکس اگر آج ایک شخص کے پاس ایک لاکھ روپیہ ہے اور وہ اس کی باقاعدہ زکوٰۃ ادا کرتا ہے تو تین سال میں اس ایک لاکھ سے ۱۔ ۷۳۱۴ روپے زکوٰۃ کے نکل کر ۱۵۔ ۹۲۶۸۵ رہ جائیں گے۔ اب یہی روپیہ وہ کسی بنک میں ۵ فی صدی پر تین سال کے لئے رکھتا۔ تو تین سال بعد یہ ایک لاکھ ۸۔ ۱۶۸۱۲ بن جاتا ہے۔ تو اب آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں کہ زکوٰۃ دینے اور سود لینے میں سرمایہ داری پر مخالف و موافق کتنا حیرت انگیز اثر پڑتا ہے۔

غرضیکہ اور ایسے ایسے بہت سے اصول قائم کئے کہ جس سے باوجود و مالی فرق کے دوسرے قدرتی فرقوں کی طرح قائم رہنے سے سرمایہ داری کی موجودہ کشمکش پیدا نہیں ہو سکتی۔ مگر افسوس کہ نہ تو آج مسلمان ان اصولوں پر کاربند ہیں نہ ہی دوسری قومیں خاتم الرسل صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان بے مثال اصولوں پر غور کرتی

ہیں۔

دنیا کی موجودہ بے چینیوں کا واحد علاج اسلام ہے:

دنیا کی موجودہ کشمکش بے چینیوں، پریشانیوں اور لڑائیوں کا علاج اگر کہیں مل سکتا ہے تو وہ اسی اُمی محمد رسول اللہ ﷺ کی لائی ہوئی کتاب قرآن مجید میں ہی مل سکتا ہے۔

جو فلسفیوں سے کھل نہ سکا اور نکتہ وروں سے حل نہ ہوا
وہ راز اک کملی والے نے بتلا دیا چند اشاروں میں

کوئی ہے جو تاجدار مدینہ کے اصولوں کو آزمائشاً پرکھنے اور ہمارے صدق وکذب کا فیصلہ خود ہی اپنی معترف زبان سے کر دے ”الفضل ما شھدت به الاعداء“ بات وہ قابل تسلیم ہے جو مخالفین کے منہ سے نکلے۔

(مَالِكِ يَوْمِ الدِّينِ) کی تفسیر:

دین بدلے اور جزا کو کہتے ہیں حدیث شریف میں آتا ہے!

”كَمَا تَدِينُ تُدَانُ۔ یعنی جیسا تو کریگا ویسا ہی تجھے بدلہ ملے گا۔

بعض قرأتوں میں مَلِكِ آتا ہے یعنی بادشاہ ہے روز جزا کا۔ مگر غور کیا جائے تو مالک کی قرأت میں جو راز اور اسرار ہیں وہ ملک والی قرأت میں نہیں پائے جاتے۔

مالک اور مَلِک کا فرق:

کیونکہ مَلِک یعنی باشاہ کا قبضہ جزوی ہوتا ہے اور بہت سی چیزیں اس کے قبضے سے باہر ہوتی ہیں۔ مثلاً وہ صرف ظاہری تصرف کرسکتا ہے۔ اگر کوئی اس کا ظاہراً حکم نہ مانے تو وہ اس کو سزا دے سکتا ہے یا اس کے قانون کو توڑے تو قید کرسکتا ہے مگر باطنی حالات سے وہ بے خبر ہوتا ہے اور ان میں اسے تصرف کرنے کا کچھ اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ فرض کرو، کوئی اسے دل سے برا مانے یا برا کہے تو یا خفیہ طور پر اس کے قانون کے برخلاف کرے تو وہ کچھ نہیں کرسکتا یا مثلاً اس کا تصرف محض جسم تک منحصر ہے اور روح پر اس کی بادشاہی نہیں یا اختیار زندوں تک محدود ہے مردوں کو نہ وہ کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہے نہ نقصان، مگر مالک کا

تصرف اپنی مِلک پر ظاہراً، باطناً، جسماً اور روحاً ہر طرح ہوتا ہے۔ دنیا کے انسانوں کو جو مالک و مملوک (غلام) کہا جاتا ہے یہ مجاز ہے نہ کہ حقیقت۔ پھر عربی کا یہ قاعدہ بھی ہے کہ حروف کی زیادتی معنی کی زیادتی پر دلالت کرتی ہے۔ اس لئے مالک کے حروف مَلِک سے زیادہ ہونے کے باعث اس کا مِلک بھی ملک سے زیادہ ہوگا۔ پھر حضور ﷺ ایک حدیث میں فرماتے ہیں!

مَنۡ قَرَاَ حَرۡفًا مِنۡ کِتَابِ اللّٰهِ فَلَهُ بِهِ حَسَنَةٌ، وَالحَسَنَةُ بِعَشۡرِ اَمۡثَالِهَا، لَا اَقُولُ الٓم حَرۡفٌ، وَلَکِنۡ أَلِفٌ حَرۡفٌ وَلَامٌ حَرۡفٌ وَمِيمٌ حَرۡفٌ۔

(سنن ترمذی: الجزء۵، رقم: ۲۹۱۰، دار الغرب الاسلامی)

یعنی جس نے قرآن پاک سے ایک حرف پڑھا تو اس کے لئے اس کا بدلہ ایک نیکی ہے اور پھر یہ نیکی دس گنا دیجاتی ہے اور پھر فرمایا کہ میں یہ نہیں کہتا کہ الم ایک حرف ہے نہیں بلکہ الف ایک حرف ہے لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے تو گویا الم کے پڑھنے والے کو تین حرفوں کے بدلے میں تیس نیکیاں ملیں تو اسی طرح جب ملک سے مالک میں ایک الف زیادہ ہے تو اس قرأت کے پڑھنے میں دس نیکیاں بھی زیادہ ملیں تو پھر آخرت کے ایسے سستے سودے کو مَلِک پڑھ کو کون عاقل مفت میں جانے دے گا۔ چنانچہ روح البیان جلد اول میں لکھا ہے کہ محمد بن شجاع بلخی رحمۃ اللہ علیہ ہمیشہ سورۂ فاتحہ میں مَالِكِ پڑھا کرتے تھے۔ ایک دفعہ انہوں نے کسی سے سنا کہ مَلِک کی قرأت مالک سے زیادہ فصیح ہے چناچہ اسی دن سے انہوں نے مالک یوم الدین کی بجائے مَلِک یوم الدین پڑھنا شروع کر دیا۔ چند دنوں کے بعد خواب میں کسی شخص نے آکر کہا کہ اے شخص تو اپنے نامۂ اعمال سے مالک کی بجائے مَلِک پڑھ کر دس نیکیاں کیوں کم کروا رہا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں کہ میں گھبرا کر اٹھا اور اسی دن سے پھر مالِک پڑھنا شروع کر دیا اور آج تک وہی پڑھتا ہوں۔

دیکھو مَلِک اپنے مملوک (کسی کے قبضے میں ہونا) یعنی غلام کو بیچ سکتا ہے مگر مَلِک اپنی رعیت کو نہیں بیچ سکتا۔ رعیت بادشاہ کی بادشاہت سے نکل سکتی ہے۔ مگر غلام مالک کے ملک سے نہیں نکل سکتا۔ مملوک (غلام) مالک کی خدمت کرتا ہے مگر ملک رعیت کی۔ مملوک اپنے مالک کے اذن کے بغیر کسی

سے عہد و پیمان یا بیع و شرا نہیں کرسکتا ہے۔ مگر رعیت کرسکتی ہے مملوک کو اپنے مالک سے طمع لالچ اور احتیاج ہوتی ہے۔ مگر بادشاہ کو رعیت سے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ مالک کا تصرف مَلِک سے زیادہ ہے۔ اور اسی تصرف کی زیادتی کے باعث اللہ جل شانہ اپنے آپ کو قرآن پاک میں ”مَالِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَاءُ “ کے الفاظ کے ساتھ ذکر فرماتے ہیں۔ یعنی اپنے آپ کو قرآن پاک میں ”مَالِكَ الْمُلْكِ“ کہتے ہیں مَالِكَ الْمِلْكِ نہیں فرماتے۔ اور پھر بعض کتابوں میں آیا ہے کہ ملک حقیقت میں ”ملك الشی من الدنیا “ یعنی دنیا کی کسی چیز کا بادشاہ ہوتا ہے مگر مالک الذی ملک الملوک یعنی مالک وہ ہوتا ہے جو بادشاہوں کا بھی بادشاہ ہو اور اللہ تعالیٰ چونکہ احکم الحاکمین ہیں۔ اس لئے آپ کے شان کو باحسنِ وجوہ ظاہر کرنے والا لفظ مالک ہی ہوسکتا ہے۔

پھر اللہ جل شانہ اپنے آپ کو رحیم فرما چکے ہیں اور رحمت کا تقاضا ہے گنہگاروں کو معاف کرنا تو اگر یہاں ملک یوم الدین ہو تو اللہ تعالیٰ کی ذات مَلِک ٹھہریگی اور مَلِک یا بادشاہ تو صرف انصاف کرنے والی ہستی ہوتی ہے اس کا کام یہ ہے کہ جانبین میں سے مظلوم کی دادرسی کرے اور ظالم کو سزا دے۔ اسے ظالم کو معاف کرنے کا کوئی حق نہیں۔

اگر وہ ظالم کو باوجود شہادت نامہ کے معاف کردے گا تو وہ خود اس ناانصافی کے لیے دربارِ ربی میں پکڑا جائے گا۔ اس کو دوسرے پر کیے ہوئے ظلم کے معاف کرنے کا کوئی اختیار نہیں۔ ہاں اگر خود اس کے اپنے نفس کا کسی سے معاملہ ہو تو وہ بجائے انتقام لینے کے ظالم کو معاف کرسکتا ہے اس صورت میں خود اس کا اپنا نفس مظلوم ہے مگر کسی دو شخصوں کے جھگڑے میں سوائے انصاف کرنے کے اسے اور کوئی اختیار نہیں...... اس کے برعکس مالک کو اپنے مملوک (غلام) پر کلی اختیار ہوتا ہے، خواہ وہ فریقین میں سے کسی کو معاف کردے یا سزا دے اس کے فعل پر کوئی نکتہ چینی نہیں کرسکتا ہے۔ کیونکہ ظلم شریعت میں غیر کی چیز میں تصرف کرنے کا نام ہے لیکن جب دونوں فریق اپنے مملوک ہوں اور مملوک بھی ایسے کے جن کا وجود جن کی حیات، جن کی حرکت وسکوں بھی مالک ہی کی دی ہوئی ہو تو پھر ان کے درمیان مالک کو اپنی مرضی کے مطابق فیصلہ کرنے میں کسے اعتراض ہوسکتا ہے مثلاً آپ کا ریشمی کپڑا ہو اور آپ اس سے آگے جلانے کا کام

لیں تو کوئی شخص آپ کو ظالم نہیں کہہ سکتا کیونکہ آپ کسی غیر کے حق میں تصرف نہیں کر رہے، بلکہ آپ کی اپنی چیز ہے اور آپ اسے ہر طرح استعمال کرنے کے مجاز ہیں تو گویا اللہ تعالیٰ کے عفو و سزا کے کلی اختیارات کو مدنظر رکھتے ہوئے رحیم کے بعد مالک کا لفظ ہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔

مالک کا لفظ تناسخ اور کفارہ کی تردید کرتا ہے:

قرآن پاک نے اللہ تعالیٰ جل شانہ کے لیے معافی کی طاقت و اختیار ثابت کر کے ہندوؤں کے تناسخ اور عیسائیوں کے کفارہ کا بھی پورا پورا رد کر دیا ہے۔ کیونکہ ان دونوں عقیدوں کی رو سے اللہ تعالیٰ کو معافی کا اختیار نہیں رہتا بلکہ وہ سزا دینے کے لیے مجبور ہے۔

تناسخ کا رد:

ہندو کہتے ہیں کہ جب انسان مر جاتا ہے تو اس کی روح اس کے جسم سے الگ ہو کر اس کے جسم کے اعمال کے مطابق دوسرے جسم میں جنم لیتی ہے اور پھر جب اسے الگ ہوتی ہے تو تیسرے میں دوسرے کے اعمال کے مطابق لوٹائی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ اس طرح سینکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں اجسام کے چکر سے گزر کر مکتی یعنی نجات حاصل کرتی ہے۔ کبھی کتے کے جسم میں جاتی ہے تو کبھی گدھے کے جسم میں۔ کبھی بھکاری بنتی ہے تو کبھی بادشاہ، غرضیکہ اسی طرح پس پس کر نجات کے قابل بنتی ہے۔ اللہ تعالیٰ اسے بغیر اس اواگون یا تناسخ کے چکر کے معاف کر دینے کا مجاز نہیں۔

ہندوؤں کے عالم اواگون کے ثبوت کے لئے دلیل پیش کرتے ہیں کہ ہم دنیا میں کسی کو بیمار دیکھتے ہیں اور کسی کو تندرست۔ کسی کو اندھا اور کسی کو سجا کھا، اور کسی کو امیر تو کسی غریب، کسی کو خوب صورت تو کسی کو بدصورت کسی کو ٹانگوں والا تو کسی کو لنگڑا۔ ان سب حالتوں کا فرق ان کے اگلے اعمال کا نتیجہ ہے اور اگر ایسا نہ ہو بلکہ خود اللہ تعالیٰ نے اس فرق کو بلا وجہ رکھا ہو تو پھر وہ کسی طرح بھی منصف کہلانے کے قابل نہیں مگر افسوس کہ وہ یہ خیال نہیں کرتے کہ اس فرق کا انحصار انسانوں یا جانداروں ہی پر نہیں بلکہ دنیا کا ذرہ ذرہ اور پتا پتا ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ سبزیوں کو دیکھو، درختوں کو دیکھو پتھروں کو دیکھو، آسمان، چاند، سورج، تاروں پر نظر کرو، ہر طرف اختلاف ہی اختلاف ہے۔ اگر انسان کا اندھا یا سجا کھا ہونا کسی گذشتہ اعمال کا نتیجہ ہے۔ تو ایک

ہی پہاڑ کے دو پتھروں میں سے ایک مسجد میں لگ کر لوگوں کی سجدہ گاہ بن جانا اور دوسرے کا پاخانہ میں لگ کر رات دن گندگی سے آلودہ رہنا کون سے اعمال کا باعث ہے لعل نے کونسے اچھے اعمال کیئے کہ اس قدر قیمتی بنا اور عام پتھر سے کیا قصور سرزد ہوا کہ اس کسمپرسی کی حالت میں پھینک دیا گیا زعفران تو دو روپے تولہ بکے اور کھانوں میں ڈالی جائے، مگر بھوسے نے کیا گناہ کیا کہ روپے کی دو من بک کر گدھوں کے کام آئے، چاند بھی آسمانی جسم ہے اور سورج بھی۔

مگر سورج دن کو نکلے اور اس قدر روشنی دے، اور پھر وہ روشنی بھی بالذات مگر چاند غریب رات کو اور پھر سورج سے روشنی بھی کم اور وہ بھی مستعار۔ تو اب وہ ہی بتائیں کہ اس چاند نے پہلے جنم میں کیا قصور کیا تھا اور سورج نے کونسا اچھا کرم کہ ان کے مراتب میں اتنا فرق رکھا گیا ہے، پھر اور تو چھوڑ دو خود انسان کے جسم ہی کو لو۔ آنت نے کیا قصور کیا کہ رات دن آلودگی اور پاخانہ سے بھری رہے اور آنکھ نے کونسا کام کیا ہے کہ اس کو نور کا خزانہ بنایا گیا۔ مقعد کے سوراخ نے کیا گناہ کیا کہ جسم کی سب کثافت وغلاظت اسی سے نکالی جاتی ہے اور منہ نے کونسا عمل خیر کیا کہ تمام دنیا جہاں کی لذتیں اسے ہی دی جاتی ہیں۔

خوبصورتی اور بدصورتی کی حقیقت:

پھر یہ خوبصوتی اور بدصورتی جسے کہا جاتا ہے حقیقت میں کوئی چیز نہیں، ہر ایک شخص کا اپنا اپنا معیار اور اندازہ ہے جو بھی اس کے اندازے پر صحیح اتر جاتا ہے وہ اس کے نزدیک خوبصورت کہلاتا ہے مگر دوسرا اسے بدصورت سمجھ کر اس سے نفرت کرتا ہے۔ مولانا روم صاحب علیہ الرحمہ نے لکھا ہے کہ ایک دفعہ لیلیٰ کو خلیفہ وقت نے بلایا کیونکہ خلیفہ کا خیال تھا کہ لیلیٰ نہایت خوبصورت ہو گی جس کے لیے قیس عامری نے اپنی سرداری اور شہزادگی کو تباہ کر کے مجنونانہ حالت بنائی ہوئی ہے۔ چنانچہ جب لیلیٰ خلیفہ کے سامنے پیش ہوئی تو بادشاہ کو اس کی کالی شکل جس کی وجہ سے وہ لیلیٰ کہلاتی تھی۔ پسند نہ آئی، لیلیٰ، لیل سے ہے اور لیل کہتے ہیں رات کو۔ خلیفہ نہایت تعجب سے لیلیٰ کی طرف مخاطب ہو کر کہنے لگا۔

گفت لیلیٰ را خلیفہ کاں توئی　　کزتو مجنوں شد پریشان و قوی
از دگر خوباں تو افزوں نیستی　　گفت خامش چوں تو مجنون نیستی

دیدۂ مجنون اگر بودے ترا　　　ہر دوعالم بے خطر بودے ترا

یعنی خلیفہ نے لیلیٰ کو کہا کیا تیرے لئے ہی قیس مجنوں اور پریشان ہے تو تو اور حسینوں سے کچھ زیادہ خوبصورت نہیں۔ لیلیٰ نے کہا خلیفہ صاحب آپ اس معاملے میں خاموش رہیں اور کچھ نہ کہیں کیونکہ آپ مجنون نہیں ہیں۔ اگر مجنوں کی آنکھوں سے مجھے دیکھتے تو پھر میرے حسن و جمال کے مقابلے میں آپ کو دونوں جہاں بے قدر معلوم ہوتے۔

پھر ہر ملک کا معیارِ حسن الگ ہے۔ ہندوستانی سیاہ آنکھ کو پسند کرتے تو یورپین نیلی کو۔ گرم ملک والے کالے بالوں کو فخراً کالاناگ کہتے ہیں۔ مگر یورپ کے رہنے والے سنہری بالوں کو پسند کرتے ہیں۔ افریقن سیاہ رنگ کو پسند کرتے ہیں عرب اور انڈین وغیرہ ملیح یا گندم گوں کو۔ مگر یورپین سفید رنگ کو اچھا سمجھتے ہیں اور ہر ایک کے پاس اپنے اپنے پسندیدہ رنگ کے لئے دلائل ہیں۔

ہارون الرشید کی دو لونڈیوں کی خوبصورتی کے متعلق دلچسپ بحث:

چنانچہ ایک دفعہ ہارون الرشید نے دو لونڈیوں کو اپنے پاس بلایا۔ ایک نہایت سفید اور گوری تھی اور دوسری نہایت سیاہ اور کالی تھی۔ خلیفہ نے ان دونوں سے پوچھا کہ تم میں سے زیادہ خوبصورت کون ہے۔ سفید نے کہا امیر المؤمنین یہ بات کوئی پوچھنے کی ہے سب لوگ سفید ہی کو خوبصورت کہتے ہیں اور گورا رنگ سب ہی کو پسند آتا ہے۔ دوسری لونڈی نے کہا حضور یہ غلط کہتی ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو دنیا میں کوئی کالی عورت سے تعلق نہ پیدا کرتا۔ بلکہ ہر ایک کے اپنے اپنے مذاق پر موقف ہے۔ اور اگر مجھ سے حقیقت پوچھتے ہو تو میرے خیال میں سیاہ رنگ سب رنگوں سے زیادہ خوبصورت اور جاذب ہے۔ اس پر بادشاہ نے کہا کہ تم دونوں نے صرف دعویٰ پیش کئے اور کسی قسم کی دلیل دعوؤں کے ثبوت میں نہ لائیں۔ اور دعویٰ بغیر دلیل کے قابل سماع نہیں ہوسکتا۔ اس واسطے تمہیں چاہئے کہ اپنے اپنے قول کی صداقت پر دلیل پیش کرو تاکہ صحیح و غلط کا فیصلہ ہوسکے۔ چناچہ سفید لونڈی نے کہا۔

الم تر ان الدر لاشئ مثله　　　وان سواد الفخم حمل بدرهم

وان رجال اللہ بیض وجوھھم   وان وجوہ السود اھل جھنم

یعنی اے امیر المؤمنین کیا آپ نہیں دیکھتے کہ کوئی چیز بھی سفید موتی کا مقابلہ نہیں کرسکتی مگر سیاہ کوئلے تو ایک درہم میں پورا بوجھ مل جاتے ہیں۔ اور پھر قیامت کے دن اللہ والوں کے منہ سفید ہوں گے اور سیاہ منہ جہنمیوں کے ہوں گے۔ اس واسطے معلوم ہوتا ہے کہ سفید اور گورا رنگ قیمتی ہے۔ اور جہاں پر یہ ہوگا اسے بھی قیمتی اور پیارا بنا دے گا اس پر کالی لونڈی آگے بڑھی اور عرض کرنے لگی۔

الم تر ان المسک لاشئ مثلہ   وان بیاض اللفت حمل بدرھم
وان سواد العین لاشک نورھا   وان بیاض العین لا شئ فافھم

یعنی اے سلطان المسلمین کیا آپ نہیں دیکھتے کہ کستوری جو سیاہ رنگ کی ہوتی ہے۔ قیمت اور خوشبو کے لحاظ سے اس کا کونسی چیز مقابلہ کرسکتی ہے۔ مگر روئی کو تو دیکھو جو سفید ہوتی ہے۔ ایک درہم میں پورا گٹھا مل جاتی ہے۔ اور پھر دیکھئے کہ آنکھ کی سیاہی میں ہی نور ہوتا ہے اور آنکھ کی سفیدی تو کسی کام کی نہیں ہوتی، اس سے معلوم ہوا کہ کالا رنگ قدر و قیمت کے لحاظ سے اور رنگوں سے بڑھا ہوا ہے۔ اس واسطے یہ جس جگہ ہوگا اسے بھی قیمتی اور پیارا بنا دے گا۔

بادشاہ دونوں کی دلیلوں سے۔ بہت محظوظ ہوا۔ اور دونوں کو انعام کا حکم دیا اور فیصلہ یہی دیا کہ تم دونوں کے دعوے اور دلائل اپنی اپنی جگہ پر صحیح اور درست ہیں اور خوبصورتی دیکھنے والے کے معیار پر پورا اترنے کا دوسرا نام ہے۔ اس سے نہ تو اواگون کا تعلق ہے اور نہ اگلے کرموں کا اثر۔

تناسخ کی خرابیاں:

پھر اگر اواگون کا مسئلہ صحیح ہے تو اس مسئلہ کے معتقدین اپنے بیماروں کا علاج کیوں کرواتے ہیں۔ کیونکہ یہ بیماری تو اس کے کسی پہلے جنم کے برے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اسے اس عمل کی سزا اسے اس طریقہ سے دے رہا ہے اب اس کی بیماری کو دور کرنے کی کوشش کرنا تو گویا مجرم کو جرم سے بنا سزا دئے چھڑوانا ہے اور یہ بجائے خود ایک۔ بہت بڑا جرم اور انصاف کا خون ہے۔

تو معلوم یہ ہوا کہ تناسخ مسئلہ محض توہمات اور زٹلیات پر کھڑا کیا گیا ہے حقیقت میں اس کے لئے کوئی

قابل توجہ اصولی دلائل نہیں اسی واسطے اللہ تعالیٰ نے ملک یوم الدین میں اپنے لئے جزاوسزا اور دعا کا اختیار ثابت کر کے اس عقیدہ کی بھی تردید فرمادی ہے۔

انسانی حالات کے مختلف ہونے کی وجہ:

اعترض: ہاں اس سے یہ بات رہ جاتی ہے کہ اگر تناسخ کا مسئلہ صحیح نہیں اور موجودہ دکھ سکھ کسی اگلے جنم کا نتیجہ نہیں تو پھر یہ دکھ سکھ، امیری غریبی، حسن و جمال اور صحت و بیماری وغیرہ کے انسانی حالات میں اس قدر فرق کیوں ہے۔

جواب: اس کا جواب آگے الرحمٰن الرحیم وغیرہ کی تفسیر میں بیان ہو چکا ہے۔ مگر پھر بھی یہاں اختصار کے ساتھ کچھ عرض کر دیتا ہوں۔ یہ بات پوری طرح سمجھ چکے ہیں کہ اللہ جل شانہ مالک الدنیا والآخرۃ ہیں اور یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ مالک کو اپنے ملک میں طرح کا اختیار حاصل ہے وہ جس طرح چاہے اپنے ملک میں تصرف کر سکتا ہے۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ جیسے بھی انسان کو رکھیں یہ ان کی اپنی مرضی ہے۔ اور ہر حالت میں ان کی مرضی عین انصاف ہی کہلائے گی۔

کیونکہ ظلم تو کسی غیر کے ملک میں تصرف کرنے کو کہتے ہیں اور وہ یہاں ہے نہیں اور پھر یہ فرق بھی رحمت اضافی کا اثر ہے جس کا مفصل بیان آگے ہو چکا ہے۔ یعنی وہ تکلیف یا دکھ جو ایک شخص کے لئے زحمت ہے دوسرے کے لئے رحمت اور کرم ہے۔ اور اسی رحمتِ اضافی کے فرق سے دنیا کا نظام قائم ہے بیمار نہ ہو تو طبیب کا کیا کام چلے اور غریب نہ ہو تو امیر کو کون پوچھے اور سب سے آخری اور نئی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس فرق کو دنیا میں رکھ کر اپنی قدرت کاملہ کو ظاہر فرماتے ہیں وہ کسی کو لنگڑا، کسی کو اندھا، کسی کو غریب اور کسی کو بیمار بنا کر دکھا رہے ہیں کہ تم کو پاؤں یا آنکھیں یا دولت یا صحت دینا محض احسان ہے یہ ہم پر کچھ واجب نہیں ورنہ تمہارے مقابلہ میں ہم دوسروں کو کیوں ان ضروری چیزوں سے محروم رکھتے۔

غرضیکہ اپنی قدرت اور انسان کو ایک بلند و بالا ہستی کے ماننے پر مجبور کرنے کے لئے یہ فرق رکھا۔ اور پھر اسے شکر کرنے کا سبق سکھایا کہ جب ہم نے تم پر دوسروں کے مقابل میں یہ احسان کیا تو تم بھی ہماری مہربانی کا شکریہ ادا کرو پھر اس فرق کے ذریعے سے انسان کے دل میں یہ خوف بھی پیدا کیا کہ اگر تو احسان

فراموش ہو جائے گا تو ہوسکتا ہے کہ دوسروں کی طرح تجھے بھی اپنے انعامات سے محروم کردوں اس لئے دوسروں کی چھنی ہوئی نعمتوں کو خیال کر کے مجھ سے رشتہ عبودیت کو مضبوط کرلو پھر اس فرق کو رکھ کر اپنی کمال قدرت کا ثبوت دیا۔

کیونکہ کامل کاریگر وہی ہوتا ہے جو ہر قسم کا کام کرسکے اگر وہ ایک ہی طرح کا ایک خاص معیار اور اندازے اور ہیت کا کام کرسکتا ہے اور دوسری طرز وطریقہ کا نہیں کرسکتا تو یہ اس کے کمال کو تباہ کردیتا ہے۔ تو گویا اس فرق اور اختلاف سے اس کا کمالِ علم کمالِ قدرت اور کمالِ فن ظاہر ہوتا ہے۔ اور پھر اگر یہ اختلاف نہ ہوتا تو پھری دنیا دنیا نہ کہلاتی کچھ اور ہی چیز ہوتی۔

گلہائے رنگا رنگ سے ہے زینتِ چمن
اے ذوق اس چمن کو ہے زیب اختلاف سے

مسئلہ کفّارہ اور اس کا رد:

اب رہا مسئلہ کفارہ جو عیسائیت کا مایہ ناز مسئلہ ہے اور جس پر عیسائی مذہب کی سب عمارت چنی ہوئی ہے اس کا گرانا گویا سب بلڈنگ کو زمین کے برابر کردینا ہے۔ اس واسطے مالک کے لفظ میں اس عقیدہ کا بھی رد کردیا گیا ہے۔

عیسائیوں کے عالم کہتے ہیں کہ انسان فطرتاً گنہگار ہے اور شریعت یا قانون الٰہی پر چلنے کے قابل نہیں اس لئے اس سے گناہ کا سرزد ہونا ضروری ہے۔ اب گناہوں کے عذاب سے بچنے کے لئے ایک کفارہ کا ہونا ضروری ہے کیونکہ گناہوں کی سزا دئے بغیر کسی گنہگار کو چھوڑ دینا انصاف نہیں کہلا سکتا۔ یا خود گنہگار کو سزا ملے یا اس کی جگہ دوسرا بُھگت کر اس کے گناہوں کا کفارہ بنے۔ مگر چونکہ انسان تو سب کے سب گنہگار ہیں۔ اس لئے وہ دوسروں کا کفارہ کیسے بن سکتے ہیں۔ اس واسطے اللہ تعالیٰ نے اپنے بیٹے (نعوذ باللہ) عیسیٰ مسیح کو دنیا میں بھیجا تا کہ وہ مصلوب ہو کر سب انسانوں کے گناہوں کو کفارہ بنے۔ چنانچہ یوحنا ۴: ۱۰: ۱۴ میں ہے کہ محبت اس میں نہیں کہ ہم نے خدا سے محبت کی بلکہ محبت اس میں ہے کہ اس نے ہم سے محبت کی اور ہمارے گناہوں کے کفارے کے لئے اپنے بیٹے کو بھیجا۔ اور باپ نے بیٹے کو دنیا کا منجی بنایا۔ دوسری جگہ یوحنا ۱: ۷

میں ہے کہ اس کے بیٹے یسوع کا خون ہمیں تمام گناہوں سے پاک کرتا ہے۔

مگر عیسائی یہ نہیں سمجھتے کہ اگر شریعت یا قانون پر چلنے کی ہمیں طاقت نہ ہوتی تو پھر یہ شریعت اور قانون دیکر اس کی تفصیل وتشریح کے لئے انبیاء کا بھیجنا اور اس کے مطابق عمل کرنے پر ثواب اور خلاف کرنے پر عذاب کا وعدہ و وعید دینا بالکل بے سود تھا۔ دنیا میں ہی اگر کوئی بادشاہ ایسا قانون بنائے کہ اس پر عمل کرنا رعیت کی طاقت سے باہر ہو تو ایسا قانون رعیت کے لئے کسی طرح بھی قانون کہلائے جانے کے قابل نہیں ہوسکتا۔ اسی واسطے تو دنیوی قانون بھی انسانوں کی طاقت، طبیعت اور ضرورت کے مطابق ہوتے ہیں۔ ہاں شاید اس کو یہ خیال پیدا ہو جائے کہ شریعت تو قانون ربی ہے اور ہم مثال میں پیش کر رہے ہیں قوانینِ دنیا کو لیکن اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ دنیا کے سارے قوانین کی بنیاد قوانینِ ربی پر ہوتی ہے ہاں وہ افراط وتفریط کی وجہ سے بگڑ کر کہیں کے کہیں جا پہنچتے ہیں۔ مثلاً دنیا کے سب قانونوں کو چھان مارو تو آپ کو کسی گورنمنٹ کے بھی ایسے قوانین نہ ملیں گے کہ جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دس احکام شریعت پیش پیش نہ ہوں۔

اب رہا حضرت عیسیٰ کا تمام انسانوں کے کفارے کے لئے مصلوب ہونا وہ بھی خود عیسائیوں کے عقائد کی رو سے غلط ٹھہرتا ہے اور میں آپ کو بالکل عامیانہ طریق سے اس بات کو سمجھاتا ہوں کیونکہ علمی طریقے سے اس عقیدہ کا رد بعض لوگوں کی سمجھ میں آنا مشکل ہوگا۔

(۱) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جب بموجب انجیل صلیب دینے لگے تو آپ نے فرمایا ایلی ایلی لما سبقتانی یعنی اے میرے اللہ آپ نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ اب اگر حضرت عیسیٰ خدا کے بیٹے تھے اور وہ کفارہ ہی کی غرض سے دنیا میں بھیجے گئے تھے تو آپ نے عین موقعۂ صلیب پر ایسے الفاظ کہہ کر اپنی بشری کمزوری کا کیوں اظہار کیا۔

(۲) یہودا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا حواری تھا اور جس نے آپ کو پکڑوایا تھا۔ اور پیلوط جس نے آپ کو پھانسی دی اور جس پر آج تک تمام عیسائی لعنت بھیجتے ہیں۔ عقیدۂ کفارہ کی رو سے تو وہ نہایت قابل احترام اور ذی عزت ہستیاں ثابت ہوتی ہیں کیونکہ ان دونوں نے ہی تمام دنیا کو خدا کی مرضی کے مطابق

گناہوں سے نجات دلوانے میں مدد دی۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو عین ان کے مصرف اور مطلب میں جس کے لئے انہیں بھیجا گیا تھا استعمال کیا۔

(۳) جب آدم زاد عیسائی عقیدہ کی رو سے گنہگار ہیں کیونکہ وہ شریعت پر عمل کرنے کے قابل نہیں تو پھر ہم پوچھتے ہیں کہ تمہارے عقیدہ کے مطابق جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو پھانسی دی گئی تو کیا یہ پھانسی جسم کو ہوئی یا روح کو، روح کو تو ہو نہیں سکتی کیونکہ وہ لطیف اور غیر محسوس ہے تو لامحالہ اقرار کرنا پڑے گا کہ پھانسی جسم کو ہوئی۔ تو ہم پھر پوچھتے ہیں کہ آپ کا جسم انسانی تھا یا نہ۔ جواب یہی ہے کہ انسانی تھا، کیونکہ آپ کے ساتھ تمام انسانی حاجتوں کا متعلق ہونا خود انجیل سے ظاہر ہوتا ہے، آپ کھاتے تھے پیتے تھے اور سوتے تھے۔ تو جب آپ کا جسم انسانی تھا اور وہ مصلوب ہوا تو پھر وہ آدم زاد ہونے کے باعث دوسرے ابنائے آدم کا کیسے کفارہ بنے۔

(۴) جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تمہارے کہنے کے بموجب تمام دنیا کے گناہ اٹھائے اور صلیب کی موت جو بروئے انجیل ایک لعنتی موت ہے مرے تو نعوذ باللہ وہ دنیا کے بارگناہ سے کس قدر گنہگار ہوئے اب ان کے گناہ کے لئے دوسرے کفارے کی ضرورت ہے تا کہ آپ کے سر سے دنیا کے گناہوں کا بوجھ دور ہو۔ مگر پھر اس کفارے کے لئے اسی طرح دوسرے کفارے کی ضرورت پڑے گی اور یہ سلسلہ لامتناہی صورت میں چلتا رہے گا۔

(۵) دنیا کا کوئی قانون ایسا نہیں کہ کسی بے گناہ کو پکڑ کر گناہ گار کی جگہ پھانسی پر چڑھایا جائے کیونکہ یہ صریح ظلم ہے گناہ تو کوئی کرے اور عذاب کوئی بھگتے۔ کسی صاحب عقل کی سمجھ میں یہ بات نہیں آسکتی اگر گناہ گار کو چھوڑنا ہی منظور تھا تو اسے معاف کر دیا جاتا نہ کہ دوسرے بے گناہ کو اس کے گناہ کے بدلے سزا دی جاتی۔ یہ تو وہ مثل ہوئی کہ نانی خصم کرے اور دوہتا چٹی بھرے۔ جب دنیوی لحاظ سے یہ ظلم ہے تو باری تعالیٰ کس طرح ایک معصوم پیغمبر کو گنہگار دنیا کے بدلے مصلوب ہونے کے لئے بھیجے۔

(۶) خیر اگر دنیا کے گناہوں کا کفارہ ہوئے تو ہم پوچھتے ہیں کہ وہ اپنے ہی زمانہ کے لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ہوئے یا ان کا بھی جو پہلے گزر گئے اور جو آئندہ آنے والے تھے۔ اگر صرف اپنے زمانہ کے

لوگوں کے گناہوں کا کفارہ ہوئے یا ان کا بھی جو پہلے گزر گئے اور جو آئندہ آنے والے تھے اگر صرف اپنے زمانے کے لوگوں کا کفارہ ہوئے تو پہلے غریبوں پر تو اللہ نے ظلم کیا کہ ان کو شریعت دی تو وہ بھی نا قابل عمل اور پھر گناہوں کے بعد کفارے سے بھی محروم رکھا اور پھر موجودہ لوگوں کو کفارۂ مسیح پر ایمان رکھنا یا اس پر ایمان لانے کی دعوت دینا بالکل بے سود ہے اور اگر کہو کہ نہیں وہ سب گذشتہ، موجودہ اور آئندہ لوگوں کا کفارہ بنے۔ تو پھر ہم جو ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے اور جن سے گناہ کا صدور تو درکنار خود ان کا وجود تک نہ تھا۔ تو پھر ان کے ان ہوئے گناہوں کا کفارہ کیسے بن گئے۔ کیونکہ کفارہ ہمیشہ گناہ کے ہونے کے بعد ہوتا ہے نہ کہ پہلے۔ اگر گناہ سے پہلے کفارہ ہو تو پھر تو اللہ تعالیٰ گویا خود لوگوں کے گناہ کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس واسطے یہ شق بھی باطل ہے۔ اور اگر خیر یہ بھی مان لیا جائے کہ تینوں زمانوں کے گناہوں کا کفارہ ہوئے تو پھر یہ دنیا میں پھانسیاں جیل خانے اور سزائیں کس غرض سے ہیں کیونکہ ان سب گناہوں کا کفارہ تو ہو چکا۔ پھر سزا کیسی اور اگر کہو کہ وہ کفارہ تو آخرت کا ہے نہ کہ دنیا کا، تو پھر یہ اور بھی حماقت ہوئی کہ اللہ تعالیٰ جس گناہ پر انسان کو مجرم نہ ٹھہرائے خود انسان اس کو جرم خیال کرے اور یہ اللہ تعالیٰ کا اعلانیہ خلاف ہوا۔

(۷) اب جب سب اگلے پچھلے گناہوں کا کفارہ ہو چکا ہے۔ تو عیسائی خود کیوں اتوار کو چرچوں میں جاتے ہیں کیونکہ عبادت تو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کیلئے ہوتی ہے تا کہ اللہ تعالیٰ ہمارے گناہوں کو معاف فرما کر کے ہمیں اخروی نعمتوں سے سرفراز فرمائے۔ لیکن اب جب کفارہ نے سب گناہ معاف کروا دیے تو اب اسے راضی کرنا یا نہ کرنا سب برابر ہے۔ کیونکہ کفارہ کی وجہ عفو و سزا کا اختیار اس کے ہاتھ سے نکل چکا ہے۔

غرضیکہ اور ایسی پچاسوں دلیلیں ہیں کہ جن کی رو سے عیسائی کفارہ ایک مضحکہ اور کھیل معلوم ہوتا ہے۔ اور آج اس قوم کی فحاشی و عیاشی الحاد و بے دینی اسی مسئلہ کفارہ کا نتیجہ ہیں۔ کیونکہ اس مسئلے نے ان کے دلوں سے خدا کا خوف دور کر دیا ہے اور وہ دن دہاڑے اور کھلے بازاروں میں وہ کام کرتے ہیں کہ جس پر انسانیت لرزہ براندام ہے۔

اسی واسطے قرآن پاک نے ہر جگہ ''اٰمَنُوْا'' کے ساتھ ''عَمِلُوْا'' کا لفظ بھی لگایا ہے تا کہ معلوم ہوتا رہے کہ صرف ایمان ہی کافی نہیں بلکہ اس کے ساتھ عمل کی بھی ضرورت ہے۔ عمل ہی پر جزا و سزا کا دارومدار

ہے۔ گیہوں بو کر جو کی امید، اور جو بو کر گیہوں کی امید رکھنا عقل کیخلاف ہے۔

از مکافاتِ عمل غافل مشو

گندم از گندم بروید جوز جو

یعنی اے شخص تو اعمال کے بدلے سے غافل نہ ہو گیہوں سے گیہوں اور جو سے جو پیدا ہوتے ہیں۔ دیکھئے بات کیا تھی اور ہم کہاں سے کہاں پہنچ گئے بیان یہ ہو رہا تھا کہ مَلِک سے مالِک کی ذات افضل ہے اور اس پر بتایا تھا کہ عربی کا قاعدہ ہے کہ جہاں کسی ایک ہی مادہ کے دو الفاظ میں سے ایک کے حروف زیادہ ہوں تو وہ زیادہ حروف والا لفظ تھوڑے حروف والے لفظ سے معنی میں بھی زیادہ ہوتا ہے۔ اور اسی ضمن میں تناسخ اور کفارہ کا مسئلہ بھی چھڑ گیا تو اب پھر اسی سابق مضمون کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔

مالک اور مَلِک کے فرق سے ایک ناصحانہ نکتہ:

نکتہ: جب مَلِک اور مالک کا فرق بخوبی ذہن نشین ہو چکا تو اب غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر ہم ملک یعنی بادشاہ کی کہ جس کا درجہ مالک سے بہت ادنیٰ اور کم ہے نافرمانی کرتے ہیں تو اس کی نافرمانی کا انجام ہمارے گھر بار کی تباہی بال بچوں کی جدائی اور بسا اوقات جان سے بیزاری کی صورت میں دیکھنا پڑتا ہے۔ تو پھر اس احکم الحاکمین کی نافرمانی کا نتیجہ جو کچھ بھی ہو سکتا ہے وہ ملک اور مالک کے فرقوں کو مدنظر رکھ کر سوچ سکتے ہیں اس واسطے ضروری ہے کہ مَلِک اور مملوک (غلام) دونوں اپنے مالک کی رضامندی میں کوشش کریں تا کہ اللہ جل شانہ اپنی رحمت اور نعمت کی موسلا دھار بارش سے ان کو سیراب فرما دے۔

مالک کو یوم الدین کی طرف مضاف کر کے عام بادشاہوں کو کیا سبق سکھایا:

اور ساتھ ہی مالک کو یوم الدین کی طرف مضاف کر کے یہ بھی ظاہر فرما دیا کہ جس طرح مالکیت کا کمال یوم الدین یعنی روز انصاف سے ہے اسی طرح مالکِ مجازی یعنی بادشاہ بھی اگر ملوکیت کا کمال چاہتا ہے تو اس یوم الدین یا انصاف کے زمانہ کی طرف مضاف اور متعلق کرے یعنی اپنے زمانہ سلطنت میں عدل و انصاف کو ضروری سمجھے ورنہ اس کی سلطنت چند دنوں کی مہمان ہو گی اگر غور کرو تو عدل و انصاف کے بغیر کسی

سلطنت کا قیام نہایت مشکل امر ہے۔ کیونکہ عدل وانصاف سے رعیت فارغ البال اور ملک خوشحال ہوتا ہے۔ اور جس بادشاہ کی رعیت خوش اور ملک آباد ہو اس کی سلطنت بھی زوال سے بچی رہتی ہے۔ شیخ سعدی نے فرمایا

رعیت چو بیخ است سلطاں درخت
درخت اے پسر باشد از بیخ سخت

یعنی بادشاہ درخت اور رعیت اس کی جڑیں ہیں اور جڑوں ہی سے درخت کا قیام واستحکام ہوتا ہے۔ اگر جڑیں کمزور یا کٹی ہوئی ہوں گی تو درخت بھی کھڑا نہیں رہ سکے گا۔ تو گویا بادشاہ کے عدل سے خود اس کی جڑیں مضبوط ہوتی ہیں کیونکہ رعیت خوشحال اور ملک آباد ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے ظلم سے خود اس کی جڑیں برباد ہو جاتی ہیں۔ کیونکہ ظلم سے رعیت پامال اور ملک ویران ہو جاتا ہے۔

بادشاہ کے عدل وظلم سے ملک کے متأثر ہونے کی مثال:

لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ نوشیروان جنگل میں شکار کھیلنے کو گیا شکار کے پیچھے گھوڑا دوڑانے کے باعث وہ اپنے ساتھیوں سے الگ ہو گیا۔ بہت دوڑ دھوپ کے بعد جب تھک گیا اور بھوک اور پیاس معلوم ہونے لگی تو قریب کے ایک باغ میں گیا اور مالی کو کہا کہ ایک انار باغ سے لے آئے کیونکہ میں بہت پیاسا ہوں چنانچہ مالی اسے مسافر سمجھ کر ایک اچھا عمدہ سا انار توڑ لایا نوشیرواں نے انار کا پانی نچوڑ کر پیا۔ دیکھا کہ نہایت میٹھا اور لذیذ ہے دل میں خیال آیا کہ ایسا باغ تو بجائے رعیت کے ایک عام شخص کے پاس ہونے کے شاہی جاگیر میں داخل ہونا چاہئے۔ اس کے دل میں اس قسم کے خیالات چکر کھا رہے تھے کہ اس نے مالی کو ایک اور انار لانے کو کہا چنانچہ وہ دوبارہ ایک نہایت خوشرنگ اور موٹا انار لے کر حاضر ہوا۔ اب جو بادشاہ نے اسے توڑا تو ایک تو پانی بہت کم نکلا۔ اور دوسرے نہایت ہی کھٹا تھا نوشیرواں نے مالی سے دونوں اناروں میں اس قدر شدید فرق ہونے کا سبب پوچھا مالی نے جواب دیا اے شخص میں سمجھتا ہوں کہ کسی نے بادشاہ سے اس باغ کے متعلق کچھ کہا ہے اور شائد اس انار کے توڑنے سے پہلے بادشاہ نے ظلماً اس باغ کو لے لینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی بری نیت کے باعث پھلوں سے برکت کو بھی اٹھا لیا

ہے۔ نوشیرواں نے دل میں اپنی بری نیت سے توبہ کی اور امتحاناً تیسرا انار لانے کے لئے اسے بھیجا۔ اب جو تیسرا توڑ کر پانی نکالا گیا تو بالکل پہلے کی طرح میٹھا اور رسیلا نکلا۔ بادشاہ نے پھر مالی سے پوچھا کہ یہ کیا معاملہ ہے۔ کہ اب پھر اچھا نکلا۔ مالی نے کہا صاحب میں سمجھتا ہوں کہ بادشاہ نے بری نیت سے توبہ کر لی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے زمین کی برکات کو پھر واپس کر دیا ہے۔ بادشاہ سمجھ گیا کہ مالی کوئی بہت روشن دل انسان ہے۔ اسے محل میں لے گیا اور اسے باقی عمر نہایت باعزت طریقہ سے اپنے درباریوں میں رکھا اور ظلم سے اس قدر پکی توبہ کی۔ اور عدل و انصاف کو اپنی سلطنت میں ایسا پھیلایا کہ حضور سیّد کائنات فخرِ موجودات والاصفات جیسی ہستی اپنی زبانِ فیض آیات سے یوں فرماتے ہیں!

"وُلِدْتُ فِیْ زَمَنِ الْمَلِكِ الْعَادِلِ"۔

(شعب الایمان: الجزء۷، رقم: ۴۸۳۰، مکتبۃ الرشد)

کہ میں منصف بادشاہ کے زمانے میں پیدا ہوا ہوں۔

نوشیرواں کے لئے اس سے زیادہ اور کیا فخر ہو سکتا ہے کہ خود حضور پرنور اس کے زمانے پر فخر فرماتے ہیں۔
شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

زنداست نامِ فرخ نوشیرواں بعدل   گرچه بسے گزشت که نوشیرواں نماند
خیرے کن اے فلاں وغنیمت شمار عمر   ازاں پیشتر که بانگ برآید فلاں نماند

یعنی نوشیرواں کا مبارک نام عدل سے زندہ ہے۔ اگرچہ نوشیرواں کو گزرے ہوئے ایک زمانہ ہو گیا۔ تو اے شخص تو بھی عمر کو غنیمت سمجھ کر موت کے آنے سے پہلے کچھ نیکی کر لے ورنہ مرنے کے بعد افسوس اور پچھتانے کے بغیر اور کچھ نہ بن پڑیگا۔

صفتِ رحم کے ساتھ صفتِ مالکیت کو بیان کرنے کی وجہ:

اللہ تعالیٰ یہاں رحمٰن اور رحیم کے بعد صفت مالکیت کو بیان فرمایا۔ اور اس سے مطلب یہ ہے کہ اللہ جل شانہ کے نام رحمٰن اور رحیم کو سن کر اور پڑھ کر اس کی رحمت پر مغرور نہ ہو جائے۔ جیسا کہ آج کل کسی کو نیکی کا کہا جاتا ہے تو وہ فوراً یہ جواب دیتا ہے کہ بھائی اللہ بہت بڑا غفور الرحیم ہے وہ معاف کر دیگا۔ مگر افسوس کہ اس کی

نظر اللہ تعالیٰ کے قہار و جبار، منتقم اور مذل ہونے کی طرف نہیں جاتی۔ اور شیطان اسے دھوکا دیکر صرف اس کی رحمت ہی کو سامنے لاکر تمام کاموں سے معطل کر دیتا ہے۔ لیکن اس سے زیادہ افسوس ہے تو یہ کہ جب انہی کو پوچھا جاتا ہے کہ کیوں صاحب اللہ تعالیٰ آخرت ہی میں غفور الرحیم ہے یا دنیا میں بھی۔ تو جواب دیتے ہیں کہ دنیا میں بھی۔ تو پھر جب یہ کہا جاتا ہے کہ جب وہ دنیا میں بھی غفور الرحیم ہے۔ تو پھر رزق کمانے کیلئے اس قدر پریشانی و سرگردانی سے کیا فائدہ۔ وہ بڑا رازق ہے کارساز ہے۔ کچھ نہ کچھ انتظام خزانہ غیب ہی سے فرما دیگا۔ یہ دنیا کے دھندے اور کاروبار کرنے سے کیا فائدہ۔ تو وہ دنیا میں ہمارے اس مشورے کو تسلیم کر کے اس کی رحیمی پر بھروسا نہیں کرتے۔ اور پھر وہ رزق کہ جس کے لئے خود قرآن پاک وعدہ فرما رہا ہے!

’’وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا۔ (ہود:٦)

یعنی زمین میں کوئی جانور نہیں کہ جس کا رزق اللہ کے ذمہ نہ ہو۔

مگر وہ آخرت کہ جس کے لئے حکم ہے!

لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ (النجم:٣٩)

یعنی وہاں انسان کو سوائے اپنی کوشش کے پھل کے اور کچھ نہ ملے گا۔

اس تو سعی و عمل کو رحمتِ ربی کے بھروسے پر ترک کر رہے ہیں۔

بھائیو! اگر اللہ جل شانہ کی رحمت پر تکیہ رکھ کر ہم کو اعمال چھوڑ دینے کی اجازت ہوتی تو پھر سلسلہ نبوت اور نظام شریعت کا بھیجنا اور ان کی اتباع و اطاعت کی تاکید بالکل بیکار تھا۔ تو معلوم ہوا

’’کار کن پس تکیہ بر جبار کن‘‘

کے مطابق کام کر کے پھر اس کی رحیمی پر بھروسا کرنا چاہیے تاکہ وہ تکمیل کے بعد اس کے قصوروں اور نقائص کو اپنے پردۂ رحمت سے ڈھانک دے۔ اور اس کے قصور کو قصور نہ قرار دے۔ یہ نہیں کہ کام تو کچھ کرے ہی نہیں اور پھر بھروسا ہو رحمت کے غلط تخیل پر اسی غلط تخیل کو دور کرنے کے لئے رحمٰن و رحیم کے بعد مالک یوم الدین کو لایا گیا۔ تاکہ انسان رحمتِ خداوندی کے ساتھ ساتھ یوم الدین کو یاد کر کے اللہ تعالیٰ کے عادل اور منصف ہونے کو نہ بھلائے۔ وہ یوم الدین کہ جس میں نیکوں کو جزا اور بدوں کو سزا ملے گی۔ اور اس سے اس

کے دل میں رحمت ممزوج بالخوف **(خوف سے ڈرا ہوا)** پیدا ہوگی۔ جس سے اس کا ایمان بین الخوف والرجا **(ڈر اور اُمید کے درمیان)** رہیگا۔ اور یہی ٹھیک عقیدہ ہے، مگر انسان کو چاہئے کہ امید پر اسکے خوف کو مقدم رکھے اور اس کے عذاب اور پکڑ سے ڈر کر اس کی اطاعت وفرمانبرداری کرے اور پھر اپنی عبادت کے قصور اور کوتاہی کو اس کی رحمت سے بخشے جانے کی امید رکھے۔ اسی واسطے قرآن پاک میں آتا ہے!

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۔ (المائدہ:۹۸)

یعنی تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ سخت عذاب دینے والا ہے۔ اور مہربان اور رحم کرنے والا ہے۔

دیکھو اس جگہ شَدِيْدُ الْعِقَابِ کو غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ پر مقدم فرمایا۔ تاکہ اوّل خوف پیدا ہو بعدہٗ کام کر کے رحمت کے امیدوار رہیں۔

اے دل بہوس بر سرکارے نرسی   تا غم نخوری بغمگسارے نرسی
تا ہمچو حنا سودہ نگردی تہ سنگ   ہر گز بکف پائے نگارے نرسی

ترجمہ: اے دل ہوس اور خواہشات کے ساتھ کام کی انتہا اور انجام تک نہیں پہنچ سکے گا جب تک غم نہیں کھائے گا۔ کسی غم گسار تک نہیں پہنچے گا۔ جب تک حنا (مہندی) کی طرح پتھر کے نیچے نہ پسے گا ہرگز کسی حسین و جمیل محبوب کے ہاتھ اور پاؤں تک نہیں پہنچ سکے گا۔

مالک یوم الدین کے الفاظ زندگی کے انجام کو یاد دلاتے ہیں:

پھر مالک یوم الدین میں ہر انسان کو اس دنیوی زندگی کا انجام یاد دلایا گیا ہے کہ اے انسان تو لاکھ برس جی! دنیا بھر کے عیش وآرام سے تمتع حاصل کر۔ مگر آخر تیرا انجام یہ ہوگا کہ تو اس دنیا سے رخصت ہو کر محاسبۂ اعمال کے لئے دربارِ ربی میں پیش کیا جائے گا۔ جہاں تیرے اعمال کے مطابق سزا اور جزا مرتب ہوگی۔ اس واسطے اس زندگی کو حُباب یا سراب سمجھ کر محاسبہ کی تیاری کر۔ سچ ہے۔

کیا بھروسہ ہے زندگانی کا
آدمی بلبلہ ہے پانی کا

تاکہ وہاں یوم الدین میں عصیاں وتمرد **(نافرمانی وسرکشی)** کے باعث شرمندگی نہ اٹھانی پڑے۔

سورہ فاتحہ کے پانچ بیان کردہ اسمائے حسنیٰ پر ہی حقانی مذہب کی بنیا ہوسکتی ہے:

اللہ تعالیٰ نے سورہ فاتحہ میں اپنے پانچ نام ذکر فرمائے۔ پہلے اللہ۔ یعنی وہ ذات جس نے انسان کو عدم سے وجود میں لایا۔ پھر رب۔ یعنی وہ ذات جس نے انسان کو بتدریج پالا پوسا اور بڑا کیا۔ پھر رحمٰن۔ یعنی وہ ذات جس نے اس کو دنیا میں رزق اور دوسرے ضروریاتِ انسانی سے نوازا۔ پھر رحیم۔ یعنی وہ ذات جو آخرت میں اس پر نوازش و مہربانی فرمائیگی۔ پھر مالک یوم الدین۔ یعنی وہ ذات جس کے دستِ قدرت میں آخرت کی ذلت و عزت اور سزا و جزا ہے۔ اور یہی پانچ نام ایک حقانی مذہب کی بنیاد ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ سب سے پہلے مذہب کا اوّل ترین فرض یہ ہوتا ہے۔ کہ وہ انسان کو اللہ تعالیٰ کے وجود کا یقین دلائے۔ ذاتِ باری کے یقین کے بعد انسان اور اللہ کے درمیانی تعلق کو اس پر واضح کرے۔

پھر اس تعلق پر غور و خوض کروا کر اس سے محبت کی دعوت دے۔ پھر یہ محبت اسی دنیا تک ہی محدود نہ رکھے۔ بلکہ اس کا تعلق آخرت میں باقی رہتا ہے۔ اس بات کو بھی اس کے ذہن نشین کر دے۔ پھر جب دوسری دنیا میں محبت کے باقی رہنے کا یقین ہو جائے تو اب اسے یہ سمجھائے کہ پھر ایسے محبوب حقیقی کے سامنے کہ جس کے ساتھ دارین کی محبت کا تعلق ہے۔ نافرمانی اور گنہگاری کی صورت میں کس طرح کھڑا ہونے کی جرأت کر سکیں گے۔ اب اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ دنیا کو مزرعِ آخرت سمجھ کر کچھ اچھا پھل بونے کی کوشش کرے گا۔ اور اپنے مالک و خالق کے سامنے سرخرو ہو کر کھڑا ہونیکی سعی میں مشغول رہے گا۔ اور یہی پانچوں کام سورہ فاتحہ کے پانچوں اسماء انجام دے رہے ہیں۔ اللہ خدا کے وجود کا یقین دلاتا ہے۔ رب انسان اور اللہ کے درمیانی تعلق کو ظاہر کرتا ہے۔ رحمٰن دنیا میں محبت کی دعوت دیتا ہے۔ رحیم آخرت کے علاقہ محبت کو ظاہر کرتا ہے اور مالک یوم الدین دربار ربانی میں حاضر ہونے کی خبر دیتا ہے۔

مالکیت کو یوم الدین کیساتھ مختص کرنے کی حکمت:

ہاں یہ خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مالکیت کو یوم الدین کی طرف کیوں مضاف فرما کر خاص کیا کیونکہ وہ تو ہر ایک دن کا مالک ہے۔

جواب: دنیا میں اگرچہ حقیقی مالک تو کوئی نہیں مگر مجازی مالک بہت ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ فلاں اس مکان کا مالک ہے۔ فلاں اس دکان کا مالک ہے۔ مگر یوم الدین میں یہ مجازی مالکیت بھی نہ رہے گی۔ اس دن صرف حقیقی مالکیت کا اظہار ہوگا۔ چنانچہ قرآن پاک میں آتا ہے کہ قیامت کے دن پوچھا جائے گا۔ ''لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ'' تو اس وقت کوئی مجازی طریقے پر بھی اپنی مالکیت کا دعویٰ نہ کر سکے گا۔ بلکہ سب اپنی محتاجی و عاجزی اپنی مملوکیت وعبودیت کی وجہ سے چپ چاپ کھڑے ہوں گے۔ اور ''وَعَنَتِ الْوُجُوْهُ لِلْحَيِّ الْقَيُّوْمِ'' (طٰہٰ:۱۱۱) کا ہر طرف نظارہ دکھائی دے گا۔ اس وقت رب العزت خود ارشاد فرمائیں گے۔ '' لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ''۔ یعنی آج مالکیت صرف خدائے واحد کی ہے جو بڑا قاہر و جابر ہے۔ اسی اختصاص کے باعث اللہ تعالیٰ نے اپنی صفتِ مالکیت کو یوم الدین سے مختص فرمایا۔

جزاو سزا کے لئے دن مقرر کرنے پر دو اعتراضات اور ان کے جوابات:

سوال: اس سے تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام لوگوں کے حساب اور جزاوسزا کے لئے ایک خاص دن مقرر فرمایا ہوا ہے جس سے دو اعتراض پیدا ہوتے ہیں۔

(۱) وہ دن کب ہوگا۔ (۲) محاسبہ اعمال کے لئے ایک خاص دن مقرر کرنے کی کیا ضرورت ہے جو مرے اس کا حساب کر کے اسے اس کے اعمال کے مطابق مقام دیدیا جائے۔ ایک جنتی کو دوسروں کی موت کے لئے اپنے اعلیٰ مقام سے جدا رکھنا کس طرح مناسب ہوسکتا ہے۔

جواب (شق اول): اس دن کے کب یا کس وقت ہونے کا ٹھیک حال تو اللہ جل شانہ ہی کو معلوم ہے۔

قرآن پاک میں آتا ہے!

''يَسْأَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسَاهَا قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّي لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَا اِلَّا هُوَ ثَقُلَتْ فِي السَّمَاوَاتِ وَالْاَرْضِ لَا تَأْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً''۔ (اعراف:۱۸۷)

یعنی اے حبیب آپ سے پوچھتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی آپ کہہ دیجیے کہ اس کا علم تو میرے رب کے

پاس ہے اور وہی اس کو اس کے وقت موعودہ پر ظاہر کرے گا۔ بھاری ہے جاننا اس کو زمین و آسمان میں اور وہ تم پر اچانک آجائے گی۔

اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں ظاہر فرمادیا ہے کہ لوگوں کو اس کا علم نہیں دیا گیا اور وہ نہیں جانتے اور ان کو یہ بتانا بھی حکمت سے خالی نہیں۔ کیونکہ:

’’ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوَاتِ وَالْاَرْضِ‘‘۔
یعنی اس کا جاننا زمین اور آسمان کے رہنے والوں پر بڑا بھاری اور گراں گزرتا۔

کیونکہ جب ان کو معلوم ہوجاتا کہ قیامت فلاں وقت آئے گی تو انسان اس کی ہیبت، غم اور فکر سے دنیا کا کاروبار چھوڑ دیتا۔ دنیا کے کاروبار میں اسے کچھ مزا نہ آتا۔ اور دنیا کا موجودہ سلسلہ قیامت کے قریب آنے سے پہلے ہی درہم برہم ہوجاتا پھر انبیاء علیہم السلام اور صحفِ سماویہ کا سلسلہ بھی بیکار ہوجاتا، کیونکہ ہر انسان خودبخود نیک کام کی طرف متوجہ ہوجاتا۔ پھر اس کے علاوہ انسانوں کی بہترین آزمائش بھی نہ ہوتی۔ کیونکہ وہ قیامت کی تاریخ جاننے کے باعث بغض وفساد سے خودبخود رک جاتے۔

مگر اب جب کہ وہ دن معلوم نہیں ان کی نیکی و بدی کی حقیقت کامل طور پر ظاہر ہورہی ہے۔ کیونکہ جو قیامت کے آنے کو یقینی سمجھتے ہیں وہ دیر یا سویر کو نہیں دیکھتے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ایک نہ ایک دن رب العزت کے دربار میں حاضر ہونا ہی ہے۔ اس واسطے اس دنیا کی زندگی میں کچھ اچھے کام کرلینے چاہئیں۔ دوسرے جو اس حقیقت سے انکار کرتے ہیں یا اس کے دیر سے آنے کا یقین رکھتے ہیں۔ اپنے فساد ومعاصی میں اور بڑھتے چلے جاتے ہیں اور کسی بیرونی دباؤ کے نہ ہونے کی وجہ سے ان کی طبیعت اپنا اصلی رنگ کامل طور پر دکھاتی ہے۔ اس واسطے اللہ جل شانہ نے فرمایا ہے!

’’لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً‘‘۔ (اعراف:۱۸۷)
یعنی قیامت تم پر اچانک آئے گی۔

تم دنیا میں پورے پورے منہمک ہو گے اور اس کا تمہیں خیال تک بھی نہ ہوگا، کہ وہ آجائیگی۔ مگر چونکہ ایسی چیز کا اچانک واقع ہوجانا اور انسان کو جس کی فطرت ہی میں نسیان و کمزوری پڑی ہوئی ہے اسے

اس کی مقررہ تاریخ سے مطلع نہ کرنا تو خیر۔ مگر اسے اس کے قرب کی علامات بھی نہ بتانا شان رحیمی کے لائق نہ تھا۔ اس واسطے رب العزت نے اپنے حبیب لبیب حضرت محمد ﷺ کی معرفت قیامت کے دن کے آنے سے پہلے جس قدر چھوٹی بڑی علامتیں ظاہر ہوں گی سب کی سب بیان فرما دی ہیں۔

حضور ﷺ نے بیان فرمایا کہ قیامت کے قرب کی سب سے پہلی نشانی میرا انتقال ہے۔ پھر میرے بعد بیت المقدس کا فتح ہونا۔ پھر ایک عام وبا کا آنا۔ مال کا اس قدر زیادہ ہو جانا کہ لوگ سو دینار تک کو بھی حقیر سمجھیں گے۔ پھر عرب میں ایک ایسا فتنہ پیدا ہوگا کہ عرب کے گھر گھر میں گھس جائے گا۔ پھر نصاریٰ اور تمہارے درمیان صلح ہوگی۔ جس میں نصاریٰ تم سے وعدہ خلافی کریں گے۔ اور اسی ہزار نشان کہ ہر نشان کے ساتھ بارہ ہزار لشکر ہو گا لے کر تم پر چڑھائی کریں گے۔ علم اٹھ جائے گا۔ جہالت زیادہ ہو جائیگی۔ زنا، شراب خوری اور سود کی کثرت ہو جائے گی۔ عورتیں زیادہ اور مرد کم ہوں گے۔ بڑے بڑے کام نالائقوں کے حوالے کئے جائیں گے۔ لوگ دنیا کی تکالیف سے تنگ آ کر موت کی آرزو کریں گے۔

امانت اور دیانت دنیا سے اٹھ جائیگی۔ لوگ زکوٰۃ دینے کو جرمانہ سمجھیں گے۔ علم دنیا کے لئے پڑھا اور پڑھایا جائے گا مرد عورت کا مطیع اور ماں کا نافرمان، یار کو قریبی اور باپ کو دور سمجھے گا۔ لوگوں کی تعظیم ان کے خوف سے ہوگی۔ گانا بجانا گھر گھر گھس جائے گا۔ زلزلے، آندھیاں اور بے وقت بارشیں کثرت سے آئیں گی۔ نصاریٰ بادل کی طرح دنیا پر چھا جائیں گے۔ ہر طرف سے برے کام ظاہر ہوں گے اور نیک کام دنیا سے اٹھتے جائیں گے ایسے وقت میں قیامت کا قرب ہوگا اور قیامت کی بڑی بڑی نشانیاں مثلاً دابۃ الارض کا ظہور، نزولِ عیسیٰ، ظہورِ امام مہدی اور خروجِ دجال وغیرہ کے بعد قیامت قائم ہو جائے گی۔

جواب شق نمبر ۲: یعنی محاسبہ اعمال کے لئے خاص دن مقرر کرنے کی وجہ کا جواب یہ ہے۔ کہ انسان کے مرنے کے بعد اگر اس کے اعمال منقطع ہو جاتے۔ اور آئندہ اس کے نامۂ اعمال میں کچھ درج نہ ہوتا۔ تو پھر یہ اعتراض بجا تھا کہ دنیا سے گئے ہوئے شخصوں کو دوسروں کی موت کے لئے کیوں انتظار کرایا جاتا ہے۔ مگر مذہب اسلام کی رو سے مرنے کے بعد بھی ان کے اعمال نامہ میں نیکی و بدی کا اندراج ہوتا رہتا ہے۔ حضور سرور عالم ﷺ فرماتے ہیں کہ!

انسان کے مرنے کے بعد اسے تین چیزوں کا تاقیامت ثواب ملتا رہتا ہے۔ نیک اولاد، جو اللہ جل شانہ کی عبادت کرے اور اپنے والدین کی روح کو مالی و بدنی صدقات سے ثواب پہنچاتی رہے۔ دوسرے رفاہ عام کے کام مثلاً کنواں، پل، مسجد، مدرسہ وغیرہ، تیسرا کسی کو علم نافع سکھانا۔ کہ جو بھی اس علم سے نفع اٹھائے گا اس کا ثوب اس کے نامۂ اعمال میں درج ہوتا رہے گا۔ اسی طرح برا شخص بھی اپنے بعد برائی کے کام چھوڑ جاتا ہے جس کا گناہ کرنے والے کو تو ہوتا ہی ہے مگر اس کے نامۂ اعمال میں اس کا گناہ درج ہوتا رہتا ہے۔ مثلاً کسی نے کسی بُرے اعتقاد یا طریقے کی بنیاد ڈالی یا لوگوں کو گمراہ کرنے والی کتاب یا تجویز نکالی تو اس کا گناہ کرنے والوں کی طرح اس کے نامۂ اعمال میں تاقیامت درج ہوتا رہے گا۔ اس لئے قیامت سے پہلے بروں کو اور نیکوں کو اپنے اپنے مخصوص مقامات میں نہیں بھیجا جاتا۔ تاکہ شائد بروں پر کسی پچھلے کی نیکی سے رحمت فرمائی جائے۔ یا نیکوں کے کسی پسماندہ نیکی سے درجے بلند کئے جائیں۔

ہاں اتنا ضرور ہوتا ہے کہ نیکوں اور بروں کو عالمِ برزخ میں ثواب وعتاب کا ایک نمونہ دکھایا جاتا ہے، قرآن پاک میں آتا ہے!

”اَلنَّارُ یُعۡرَضُوۡنَ عَلَیۡہَا غُدُوًّا وَّ عَشِیًّا ۚ وَ یَوۡمَ تَقُوۡمُ السَّاعَۃُ ۟ “۔(المومن:۸۶)

یعنی وہ صبح وشام آگ پر پیش کئے جاتے ہیں اور ایسے ہی جب کہ قیامت قائم ہوگی پیش کئے جائیں گے۔ اسی طرح نیکوں کے بارے میں قرآن پاک میں آتا ہے!

”فَرِحِیۡنَ بِمَاۤ اٰتٰىہُمُ اللّٰہُ مِنۡ فَضۡلِہٖ ۙ وَ یَسۡتَبۡشِرُوۡنَ بِالَّذِیۡنَ لَمۡ یَلۡحَقُوۡا بِہِمۡ مِّنۡ خَلۡفِہِمۡ ۙ اَلَّا خَوۡفٌ عَلَیۡہِمۡ وَ لَا ہُمۡ یَحۡزَنُوۡنَ “۔(آلِ عمران:۱۷۰)

یعنی خوش ہیں اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے اور ان شہداء کے خویش واقارب کو جو ابھی مر کر ان کو نہیں ملے بشارت دی جاتی ہے کہ ان پر کچھ خوف اور غم نہیں۔

تو معلوم ہوا کہ نیکوں اور بدوں کو اپنے اپنے مقامات کا ایک نمونہ عالمِ برزخ میں دکھایا جاتا ہے جو بعد کے اعمال وحسنات سے بیش وکم ہوتا رہتا ہے۔ جس پر کثیر احادیث اور بزرگانِ دین کے مکاشفے دلالت کرتے ہیں۔

عذابِ اخروی پر ایک عجیب اعتراض اور اس کا جواب:

ہاں اب ایک اور اعتراض رہ جاتا ہے کہ دنیا تو چند دنوں کا تماشا خانہ ہے۔ اسی طرح اس کا غم اور خوشی بھی چند روزہ ہے، مگر آخرت تو ابدی اور دوامی ہے۔ ایک دفعہ مرنے کے بعد پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے موت نہیں۔ نیکوں کے لیے ابدی نعمتیں اور مشرکوں کیلئے دوامی عذاب ہے۔ خیر نعمتوں کے سوال کو تو رہنے دیجئے کیونکہ وہ تو انعام ہے مگر دوامی عذاب کے متعلق کہا جاسکتا ہے۔ کہ یہ کیسا انصاف ہے کہ ایک شخص نے مثلاً اس عارضی دنیا میں چند سال تک شرک کیا اور اب اسے اس کی سزا ابدی عذاب کی صورت میں دی جاتی ہے کیونکہ گناہ تو ہے چند سالوں کا اور عذاب ہے ہمیشہ کا۔

جواب: عذاب جرم کی نوعیت پر منحصر ہے۔ اگر جرم سخت ہے تو سزا بھی سخت۔ اور اگر جرم معمولی ہے تو سزا بھی معمولی۔ وقت اور مدت کا اس میں کوئی سوال نہیں۔ دنیا میں ہی دیکھ لیجئے ایک شخص عرصہ دس سال تک چوری کرتے کرتے پکڑا جاتا ہے تو زیادہ سے زیادہ اسے آٹھ دس سال قید کی سزا ملتی ہے۔ مگر اس کے برعکس ایک دوسرا شخص کسی کو ایک منٹ میں قتل کر دیتا ہے تو اب اسے یا تو عمر قید یا پھانسی کی سزا دی جاتی ہے۔ یا مثلاً ایک شخص ایک آدمی کا ایک منٹ میں جیب کاٹتا ہے مگر اسے اس کی سزا ایک سال با مشقت قید کی صورت میں دی جاتی ہے۔ تو پھر ارتکابِ جرم اور سزا کے وقت کا مقابلہ کہاں رہا۔ بلکہ سزا کی نوعیت جرم کی شدت یا خفت پر موقوف رہی۔ اب جب کہ ہم دنیا میں ایسی سزاؤں کو ظلم نہیں سمجھتے بلکہ اسے عین عدل و انصاف سمجھ کر خود پارلیمینٹوں اور مجالس مقننہ (قانون ساز اسمبلی) میں قوانین کی صورت میں پاس کرتے اور کراتے ہیں تو پھر اللہ جل شانہ کا شرک جیسے قبیح گناہ کی ابدی سزا دینا عدل و انصاف کے کیسے بر خلاف ہوسکتا ہے۔ رب العزت فرماتے ہیں!

”اِنَّ الشِّرۡكَ لَظُلۡمٌ عَظِيۡمٌ“ یعنی بیشک شرک بہت بڑا ظلم ہے۔

ہاں موحدین اپنے اپنے گناہوں کے اندازے سے دوزخ کی بھٹی میں رہ کر مجلیٰ و مصفیٰ ہونے کے بعد جنت میں داخل کئے جائیں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ بندے کی زبان سے کہلواتے ہیں:

”اِیَّاکَ نَعۡبُدُ“ یعنی اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں“۔

عبادت شریعت میں انتہا درجہ کے تذلل ۔ عاجزی اور انکسار کا نام ہے۔ اور اس کا مستحق وہی ہوسکتا ہے۔ جس کی بزرگی، فضیلت اور بڑائی بھی انتہا کو پہنچی ہوئی ہو۔ کیونکہ اس سے کم درجہ والی ہستی کے سامنے اپنے آپ کو ذلیل کرنا انسانی کرامت اور شخصی شرافت کو خاک میں ملانا ہے۔

اب سوچنا یہ ہے کہ ایسی کون سی ہستی ہے جو اس قدر بلند اور بالا ہو کہ انسان جیسی عزیز و شریف مخلوقات کی عبادت کا مستحق ہو سکے۔ ظاہر ہے کہ ایسی بلند ہستی اللہ جل شانہ کی ذات کے بغیر اور کون ہو سکتی ہے۔ اس نے ہمیں نیست سے ہست کیا۔ ہماری کمزوری کو طاقت سے بدلا۔ ہمیں موت کی جگہ حیات عنایت فرمائی۔ ہماری تمام ضروریات کو پورا فرمایا۔ اور ہمارے تقاضا و اصرار کے بغیر ہم کو گوناگوں نعمتوں سے نوازا۔ وہی آخرت میں اپنی صفتِ رحیمی کا اظہار فرما کر ہماری کمزوریوں کو اپنی رحمت کی چادر سے ڈھانکے گا۔ اور جس کے متعلق ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ وہ اللہ ہے۔ وہ رب وہ رحمٰن اور رحیم ہے وہی ''مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ'' ہے تو پھر اب اس کے علاوہ اور کونسی ایسی ذات ہو سکتی ہے کہ جس کے سامنے یہ انسان خلیفۃ المنان اپنی سر عبادت کو خم کرے۔ اسی واسطے ''اِيَّاكَ نَعْبُدُ'' میں مفعول کو اوّل لا کر عبادت کو ذاتِ باری ہی میں محصور کر دیا گیا۔

انسان صفاتِ خداوندی کا مظہر ہونے کے باوجود کیوں عبادت نہیں کیا جاتا:

ہاں یہ خیال ہوسکتا ہے کہ جن صفات کی رو سے اللہ تعالیٰ کو قابلِ عبادت ٹھہرایا جا رہا ہے۔ ایسی صفات کے نمونے تو انسانوں میں بھی پائے جاتے ہیں۔ تو پھر وہ کیوں قابلِ عبادت نہیں ٹھہرائے جاتے بلکہ عبادت کو ذاتِ الٰہی کے لئے ہی کیوں مختص کر دیا گیا ہے۔ مثلاً ہم دیکھتے ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے نیست سے ہست کیا۔ اسی طرح ہمارے والدین کا بھی ہمارے موجود ہونے میں دخل ہے۔ رب نے ہمیں پالا، پوسا، تو ماں باپ نے بھی ہماری پرورش میں کونسی کمی چھوڑی۔ اگر اللہ جل شانہ رحمٰن ہو کر ہماری تمام دنیاوی ضروریات کو پورا فرماتے ہیں۔ تو والدین بھی بچے کی ہر ضرورت کا اپنی طاقت سے زیادہ خیال رکھتے ہیں اور حتی الامکان اس کے لئے ہر چیز مہیا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اگر اللہ بتقاضائے رحمیت انسانوں کے گناہ معاف فرما کر ان کو نوازشات سے سرفراز فرمائیں گے۔ تو والدین بھی بچوں کے قصور معاف کر کے

ان پر مہربانی کیا کرتے ہیں۔

جواب: والدین کا احسان حقیقت میں خدا کا احسان ہے، وہی والدین کے دل میں بچے کی محبت اور شفقت ڈالتے ہیں۔ جس کی وجہ ان تمام احسانات کا ان سے اظہار ہوتا ہے۔ اگر وہ ان کے دل میں محبت نہ ڈالتے تو وہ کبھی بھی بچے کے لئے اس قدر دکھ اور تکلیفیں نہ سہتے۔ اس واسطے حقیقی محسن رب العزت ہی ہے۔ یہ تمام آلات و اسباب ہیں۔ جن کے ذریعے سے وہ اپنے احسانات کو ظاہر فرما رہے ہیں اس لئے عبادت کے قابل صرف وہی ہے اور بس۔

اس کے علاوہ عبادت چونکہ نہایت درجہ کی عاجزی اور تذلل ہے۔ اس لئے اس کے لائق وہی ذاتِ پاک ہو سکتی ہے۔ جس کا احسان ہم پر نہایت زیادہ اور اعلیٰ ہو۔ اب اللہ تعالیٰ کے احسان بے پایاں کو تو یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ والدین کے احسان کا تعلق صرف خارج تک محدود ہے۔ اور وہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے۔ مگر اللہ جل شانہ کا احسان ہم پر باطنی اور خارجی دونوں طرح سے ہونا ظاہر ہے۔ پھر والدین کا احسان خاص خاص شعبوں اور شاخوں سے تعلق رکھتا ہے۔ مثلاً وہ کھانا دے سکتے ہیں۔ دانت نہیں دے سکتے۔ مثلاً ماں اپنا پستان بچے کے منہ میں رکھ سکتی ہے مگر اس میں دودھ نہیں پیدا کر سکتی پھر دودھ بھرا ہوا پستان بچے کے منہ میں رکھ سکتی ہے مگر اسے دودھ پینا نہیں سکھا سکتی۔ پھر پیٹ میں جانے کے بعد ہضم نہیں کرا سکتی۔ پھر ہضم ہونے کے بعد فضلہ باہر نہیں نکال سکتی۔

غرضیکہ اللہ تعالیٰ کا احسان والدین سے کروڑوں گنا زیادہ ہے۔ اب ذاتِ باری کا احسان دوسروں کے احسان سے اعلیٰ کیوں ہے؟ اس لئے کہ دنیا کے جس قدر لوگ بھی احسان کرتے ہیں۔ ان کے احسانات نتیجتاً کسی نہ کسی غرض سے وابستہ ہوتے ہیں۔ مثلاً والدین بچے کو عصائے پیری **(بڑھاپے کا سہارا)** سمجھ کر پالتے پوستے ہیں۔ استاد شاگرد پر علم کا احسان۔ مالی امداد، شہرت یا جسمانی خدمت کے لئے کرتا ہے۔ اور تو اور انبیائے کرام علیہم السلام جیسی مخلص ہستیاں بھی دنیا کو گمراہی سے نکال کر ہدایت کی طرف لانے کے عوض میں ” اِنْ اَجْرِیَ اِلاَّ عَلَی اللہِ “ کی متوقع ہوتی ہے۔ مگر اللہ جل شانہ کا احسان کسی بدلہ یا جزا کی امید پر نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ تو فرماتے ہیں۔

’’مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّ مَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ ‘‘(الذاریات:۵۷)

میں ان سے کچھ رزق نہیں مانگتا اور نہ یہ چاہتا ہوں کہ وہ مجھے کھانا دیں۔

بلکہ میرا احسان محض نوازش اور کرم پر مبنی ہے۔

عبادات احساناتِ ربی کا کچھ بدلہ نہیں بلکہ یہ بھی ایک مزید احسان ہے:

اور یہ جو فرمایا کہ!

’’وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ()‘‘(الذاریات:۵۶)

یعنی میں نے جنوں اور انسانوں کو عبادت کے لئے پیدا کیا۔

تو عبادت کچھ ان کے احسانات کا بدلہ نہیں۔ بلکہ اگر سوچو تو عبادت خود دوسرے احساناتِ ربی کی طرح ایک بہت بڑا احسان ہے۔ ورنہ اس کی ذاتِ بے نیاز تو ایسی ہے کہ!

’’اِنْ تَكْفُرُوْٓا اَنْتُمْ وَ مَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۙ فَاِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ حَمِيْدٌ ‘‘۔(ابراہیم:۸)

یعنی اگر تم اور سارا جہاں میرا منکر ہو کر کافر ہو جائے تو اللہ تو بہت بڑا غنی اور صفت کیا ہوا ہے۔

اسے کچھ تمہارے ایمان کی احتیاج یا تعریف کی ضرورت نہیں بلکہ وہ تمہاری توصیف کے بغیر سراہا ہوا ہے۔

ہاں عبادت خود انسان کے لئے مفید ہے۔ چنانچہ قرآن پاک فرماتا ہے!

’’مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَ مَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ ‘‘۔(الشوریٰ:۴۶)

یعنی جو شخص اعمالِ صالحہ کہ جس میں سب عبادتیں بھی آجاتی ہیں کرے گا۔ تو اس میں اس کے لئے اپنے نفس کا فائدہ ہے۔ اور جو برا کام کریگا تو اس کا اپنا ہی نقصان ہے۔

تو اس آیت سے صاف معلوم ہو گیا کہ ہماری عبادات کچھ احساناتِ ربی کا بدلہ نہیں۔ بلکہ یہ بھی اور احسانوں کی طرح ایک احسان عظیم ہے۔ ؎

من نکردم خُلق تا سود ے کنم
بلکہ تا بر بندگان جود ے کنم

ترجمہ: میں نے عمدہ اخلاق اس لیے نہ کئے کہ کوئی فائدہ حاصل کروں بلکہ اس لیے کہ بندگانِ خدا پر کوئی جُو دو احسان کروں (اور ان کا بھلا ہو جائے)

عبادت سے ہمارا ظاہر و باطن صاف ہوتا ہے۔ روحانی ترقی ہوتی ہے سفر آخرت کے لئے زاد راہ حاصل ہوتا ہے۔ وصول الی اللہ اور حصولِ رضائے ربی کی قابلیت پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر احسان پر احسان تو یہ ہے کہ اس عبادت پر بھی مزید انعامات مثل جنت اور حور وقصور کے وعدے دئے جاتے ہیں باری تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ! اگر تم میری عبادت کرو گے جو حقیقت میں خود تمہاری ہی ذات کے لئے مفید ہے تو اس کے بدلے میں! ”جَنّٰتٌ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ“ باغات جن میں نہریں جاری ہوں گی، دونگا۔ ”فِیۡهَا عَیۡنٌ جَارِیَةٌ“ جن میں چشمے پھوٹتے ہوئے ہوں گے۔ ”فِیۡهَا سُرُرٌ مَّرۡفُوۡعَةٌ“ جن میں اونچے اونچے تخت بچھے ہوں گے۔ ”وَّاَكۡوَابٌ مَّوۡضُوۡعَةٌ“ جن میں آب خورے پڑے ہوں گے ”وَّنَمَارِقُ مَصۡفُوۡفَةٌ“ جن میں گاؤ تکیے قطار در قطار پڑے ہوئے ہوں گے۔ ”وَّزَرَابِیُّ مَبۡثُوۡثَةٌ“ جن میں فرش بچھے ہوئے ہوں گے۔ اور پھر ان میں ”وَحُوۡرٌ عِیۡنٌ () كَاَمۡثَالِ اللُّؤۡلُؤِ الۡمَكۡنُوۡنِ“ خوبصورت عورتیں جو محفوظ رکھے ہوئے موتیوں کی طرح ہوں گی۔ عنایت کی جائیں گی اور اللہ تعالیٰ کا ہماری عبادت پر اس انعام کا وعدہ ایسا ہے جیسے کہ والدین بچے کو کوئی دوائی پلاتے ہیں اور حالانکہ وہ دوائی بچے ہی کے لئے مفید ہوتی ہے۔ مگر اس پر بھی وہ بچے جو پیسے اور مٹھائی دیتے ہیں تا کہ وہ دوائی جو اسی کی ذات کے لئے مفید ہے خوشی سے پی لے۔ اسی طرح اللہ جل شانہ کا احسان عظیم ہے کہ عبادت جو ہمارے ہی فائدہ کے لئے ہے۔ اس پر انعاماتِ اخروی بھی عطا فرمائیں گے۔ تو اس لحاظ سے اللہ جل شانہ کا احسان اعلیٰ ٹھہرا تو معلوم ہوا کہ دنیا کے تمام محسنوں سے اللہ تعالیٰ ہی کا احسان بے انتہا اور اعلیٰ ہے۔ اس واسطے اسی کی ذاتِ عالی صفات کے ساتھ عبادت کا مختص کرنا لائق و مناسب ہے۔

منت منه که خدمت سلطان میکنی
منت شناس ازو که بخدمت گذاشت

تو اس بات کا احسان نہ کر کہ تو بادشاہ کا خدمت گار ہے بلکہ بادشاہ کا احسان مان کہ اس نے تجھ سے خدمت کا کام

لیا۔

عبادت کی چار قسمیں:

جب یہ معلوم ہوگیا کہ عبادت باری تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہے تو اب معلوم ہو کہ عبادت کی چار قسمیں ہیں۔ عبادتِ لسانی، عبادتِ مالی عبادتِ ارکانی اور عبادتِ حالی۔

(۱) عبادتِ لسانی تو یہ ہے کہ زبان سے اللہ تعالیٰ کی تسبیح وتہلیل اور حمد وثنا کی جائے اور زبان کو اس کے ذکر وفکر میں مشغول رکھا جائے۔

(۲) عبادتِ مالی یہ ہے کہ اپنے اعمال کو اللہ جل شانہ کے رستے میں صرف کیا جائے اور اپنی کمائی سے اس کی رضامندی حاصل کی جائے۔

(۳) عبادتِ ارکانی یہ ہے کہ اپنے اعضاء اور جمیع بدن کو اللہ تعالیٰ کی یاد میں لگایا جائے۔ اور مختلف ہیئتوں اور شکلوں سے جس سے اس بے نیاز ہستی کے سامنے اظہار تذلل ہو سکے ظاہر کرے۔

(۴) اور عبادتِ حالی یہ ہے کہ روح اور قلب اللہ تعالیٰ کی یاد میں مشغول رہیں اور دل اس کی الوہیت اور محبت سے بسا ہوا ہو کہ غیر اللہ سے نفیر اور اللہ کے قریب ہونے کے باعث ''وَالَّذِیْنَ آمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰہِ'' کا مظہرِ اتم ہو۔ اور اس کی خواہشات کا سر احکامِ ربی کے سامنے پورا پورا خم ہو۔ روح التخلق باخلاق ہو اور جسم ''صِبْغَةَ اللّٰہِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰہِ صِبْغَةً''
(اللہ کا رنگ اور اللہ کے رنگ سے کون سا رنگ اچھا ہے) کا مکمل آئینہ ہو۔

نماز عبادت کے چاروں اقسام کی جامع ہے اور اس کی تشریح:

چونکہ نماز ان چاروں کی مجموعہ ہے۔ اس لئے شریعت مطہرہ نے نماز کی حد سے زیادہ تاکید فرمائی ہے۔ حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں!

''اَوَّلُ مَا یُحَاسَبُ بِهِ الْعَبْدُ یَوْمَ الْقِیَامَةِ بَعْدَ التُّوْحِیْدِ صَلَاتُهُ۔
یعنی قیامت کے دن بندے سے توحید کے بعد نماز کا سوال ہوگا۔
شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

روزِ آخر کہ جاں گداز بود
اولیں پرسش نماز بود

یعنی آخرت کے زہرہ گداز دن (**کلیجہ کو پگھلانے والی**) میں سب سے پہلے نماز کا سوال ہوگا۔ کیوں؟ اس لئے کہ یہ عبادتوں سے بہتر اور سب کی جامع ہے۔ اس میں زبان کی حمد وثنا، قرأت اور تسبیح وتہلیل عبادتِ لسانی ہے۔ کپڑوں کی پاکی، سترِ عورت وغیرہ عبادتِ مالی ہے۔ قیام، قعدہ، قومہ، جلسہ، عبادتِ ارکانی ہے پھر خضوع وخشوع تفکر الفاظ پھر الفاظ سے معنوں کی طرف انتقال اور پھر اس انتقال سے دل پر خاص قسم کا اثر وسرور عبادتِ حالی ہے۔

مسجدوں کی صحیح آبادی اور اس پر ایک حکایت:

مگر افسوس کہ آج ہم اور تو خیر اس بہترین عبادت میں بھی نہایت سست نظر آتے ہیں آج مسجدیں ویرانی وبے سروسامانی کی حالت میں نظر آتی ہیں۔ سچ ہے۔

پنج وقتہ مسجدوں میں اب بھی ہوتی ہے اذاں
پر وہ آوازِ اذاں پر دوڑنے والے کہاں
اب نہ وہ اخلاق باقی اور نہ وہ مسلماں
مٹ گیا ہے عشق تیرا رہ گیا نام و نشاں
مسجدیں رنگدار ہیں لیکن یہ منظر عام ہے
ایک امام اک مقتدی باقی خدا کا نام ہے

مسجدوں کی آبادی رنگ وروغن سے نہیں مسجدوں کی آبادی جھاڑ فانوس سے نہیں، مسجدوں کی آبادی بجلی اور ایرانی قالینوں سے نہیں۔ مسجد کی آبادی تو نمازیوں سے ہے مسجد کی آبادی اسی میں ہے۔ کہ جب مؤذن حی علی الصلٰوۃ کہے تو ساری کی ساری مسجد نمازیوں سے بھر جائے جب دربارِ ربی کا نقیب حاضری دربار کے لئے بلائے تو دنیا کا اہم سے اہم کام بھی دربار میں حاضر ہونے میں مانع نہ آئے۔

لکھا ہے ایک صاحبِ حال بزرگ ایک شہر سے گزرے رات کا وقت سفر کی ماندگی اور تکلیف کی

وجہ سے انہیں خیال ہوا کہ آج یہاں ہی کی مسجد میں گزار کر آرام کروں چنانچہ آپ جامع مسجد میں آئے آپ نے دیکھا نہ امام نہ مقتدی نہ موذن نہ خادم، اس قدر عالی شان مسجد مگر نہایت کسمپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے۔ خیر آپ نے وضو کر کے نماز پڑھی اور ایک کونے میں لیٹ گئے رات کو تہجد کے لئے اٹھے تو آپ نے سنا کہ مسجد چیخ چیخ کر فریاد کر رہی ہے کہ اے اللہ جس طرح یہاں کے لوگوں نے مجھے ویران کیا ہوا ہے۔ اسی طرح ان کو بھی ویران و برباد کر دے۔ بزرگ صاحب وہاں کے لوگوں پر عذابِ الٰہی کے نازل ہونے سے ڈرے اور صبح کے وقت سب اہلِ قریہ کو بلا کر مسجد کی فریاد اور حقیت حال سے آگاہ کر دیا۔ لوگ مالدار تھے فوراً پانچ سات ہزار جمع کر کے مسجد کو خوب رنگ و روغن کروا دیا۔ مؤذن امام کا بندوبست کر دیا اور نہایت اعلیٰ فرش وفروش بچھوا دیا۔ یہی بزرگ صاحب پانچ چھ مہینے بعد پھر ادھر سے گزرے اور پہلی طرح پھر اسی مسجد میں رات گزارنے کے خیال سے ٹھہر گئے۔ دیکھا کہ مسجد نہایت خوبصورت اور رنگ و روغن سے راستہ ہے۔ نہایت قیمتی غالیچے بچھے ہوئے ہیں، سینکڑوں ہنڈو کی روشنی میں مسجد بقعۂ نور اور حجلہ عروسی معلوم ہوتی ہے۔ بہت خوش ہوئے اور آرام کرنے کے لئے ایک کونے میں لیٹ گئے رات کو جو معمول کے مطابق اٹھے تو مسجد کو شور و فریاد اور شکوہ وشکایت میں مشغول پایا آپ نے مسجد سے فرمایا کہ اے مسجد اب تو ویران نہیں بلکہ نہایت آراستہ و پیراستہ معلوم ہوتی ہے۔ پھر ان لوگوں کے لئے اس قسم کی بد دعائیں کرنے کا کیا مطلب ہے؟۔ مسجد نے جواب دیا کہ اے بزرگ میری آبادی فرش وفروش اور جھاڑ وفانوس سے نہیں ہوسکتی میری آبادی کا تعلق تو نمازیوں سے ہے۔ میں تب آباد ہوسکتی ہوں کہ جب موذن اذان دے کر لوگوں کو بلائے تو میری زمین کی ایک بالشت بھی نمازیوں سے خالی نظر نہ آئے۔ اس کے نہ ہوتے ہوئے مجھے نام نہاد آبادی کی ضرورت نہیں چنانچہ آپ نے پھر صبح لوگوں کو بلایا اور مسجد کی آبادی کا فلسفہ سمجھایا۔ لوگ تھے خوش نصیب بزرگ کی بات کو تعویذ کی طرح عملاً گلے میں باندھا اور اسی وقت سے باقاعدہ نمازی ہو گئے۔ اور تھوڑے عرصے میں ان لوگوں کے اعمال احوال اور اولاد میں دن دونی اور رات چوگنی ترقی ہونی شروع ہو گئی اور ان کی مرادوں کے پژمردہ باغ رحمتِ خداوندی کی بارش سے نہایت سرسبز وشاداب ہو گئے۔

تو بھائیو! یاد رکھو کہ مسجدوں کی آبادی آپ کے نماز پڑھنے سے ہے نہ کہ صرف چونے گچ کر کے

لمبے لمبے مینار بنا دینے سے۔ وہ ہو تو نور علیٰ نور۔ نہ ہو تو کوئی حرج نہیں مگر آپ نماز نہ پڑھیں اور پھر مسجد کہیں کہ مسجدیں آباد ہیں تو یہ کہنا سراسر غلط ہوگا۔

نماز میں انتہائی انکسار کس طرح پایا جاتا ہے:

عبادت نام ہے غایت تذلل (انتہائی ذلت) کا۔ اور نماز میں اس قدر انکسار اور تذلل کا اظہار کیا جاتا ہے کہ دوسری کوئی عبادت بھی اظہارِ تذلل میں اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ کیونکہ انسان کے وجود میں سب سے اعلیٰ و اشرف عضو منہ ہے اسی پر سب جسم کی خوبصورتی و بدصورتی کا انحصار ہوتا ہے۔ یہ فطرت کا آئینہ ہے۔ جس میں انسان کے تمام اندرونی جذبات و اثرات کی تصویر کھچ جاتی ہے۔ خفا ہوا تو بھویں چڑھ گئیں خوش ہوا تو باچھیں کھل گئیں۔ شرمندہ ہوا تو سرخی دوڑ گئی ڈرا تو پیلا پڑ گیا نماز میں ایسے اشرف الاعضاء منہ کو زمین پر جو نہایت درجہ کی ادنیٰ چیز ہے جو ادنیٰ و اعلیٰ کے پاؤں کے نیچے روندی جاتی ہے۔ اور جس پر تمام دنیا کی غلاظت ڈالی جاتی ہے رکھ دیا جاتا ہے۔ اور پھر یوں بھی نہیں بلکہ دھو کر، صاف کر کے، نمازی اللہ جل شانہ کے سامنے سربسجود ہو جاتا ہے۔ تو اب آپ ہی بتائیے کہ اس سے زیادہ تذلل و تعجز کا نمونہ اور کس جگہ دیکھا یا دکھایا جا سکتا ہے۔ اسی واسطے تو رب العزت نے بار بار ''اقیموا الصلوٰۃ'' فرما کے اس کی اہمیت اور بہترین ہونے کی طرف انسان کی توجہ دلائی ہے۔

اسلام نے سب عبادتوں کو دس بڑی بڑی قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، قرأتِ قرآن، ذکرِ الٰہی، طلبِ حلال، نگاہداشت حقوق المسلمین اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر۔ اگر غور کیا جائے تو دوسری سب عبادتیں کسی نہ کسی طرح لامحالہ ان اقسام میں داخل ہو جاتی ہیں۔

عبادت تین خیالوں سے کی جاتی ہے اور ان کا فرق:

اب اللہ تعالیٰ کی یہ سب عبادتیں انسان تین خیال سے کرتا ہے یا تو خوف سے یعنی ڈرتا ہے کہ شاید خالق الارض و السمٰوٰت کی نافرمانی دنیا میں نعمتوں کے چھن جانے اور عقبیٰ میں عذابِ جہنم کا باعث نہ بن جائے۔ اس لئے وہ ایک غلام یا نوکر کی طرح ہے جو ملازمت کے چلے جانے یا کسی مالی و بدنی سزا کے خوف سے مالک کا حکم بجالاتا ہے۔

اور یہ نہایت ہی ادنیٰ درجہ کی عبادت ہے یا اس کی عبادت کسی لالچ کے باعث ہوتی ہے یعنی وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت اس غرض سے کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ راضی ہو کر اسے دنیا و آخرت کی نعمتوں سے نوازے دنیا میں آرام سے رکھے اور آخرت میں حور و غلمان اور قصور و جناں (**محلات و باغات**) عنایت فرمائے اور یہ متوسط درجے کی عبادت ہے۔ کیونکہ اس میں انسان فانی دنیا کی فانی لذتوں کے مقابلہ میں اشرف دنیا کی اشرف لذتوں کا خواہاں ہوتا ہے۔ اس واسطے اس کا درجہ پہلی عبادت سے بحیثیت مقصود کے ارفع و اعلیٰ ہے یا عبادت کرنے کا تیسرا مقصود لقائے ربی (**رب کی ملاقات**) اور مشاہدۂ حق ہوتا ہے اس میں عبادت کا مقصد نہ تو حصول دنیا ہوتا ہے اور نہ حصول آخرت بلکہ محض دیدارِ ربی اور رضائے خداوندی کے لئے کی جاتی ہے۔ اور یہ سب سے بہترین عبادت ہے۔ کیونکہ اس میں عابد کا مقصود خالق ہوتا ہے برعکس پہلی دو قسموں کی، کہ ان میں مطلوبِ مخلوق ہے اور مخلوق اور خالق کے درجوں میں جو فرق ہے وہ ایک عاقل جانتا ہے۔ اسی فرق پر مراتبِ مقاصد کو بھی خیال کر لینا چاہیے۔

اسی واسطے صوفیائے کرام فرماتے ہیں!

”طالب دنیا مخنث و طالب العقبیٰ مؤنث و طالب المولیٰ مذکر۔

یعنی دنیا کا طالب ہیجڑا ہے، نہ ادھر کا نہ ادھر کا، جیسے ہیجڑا نہ مردوں میں شامل ہوتا ہے نہ عورتوں میں

اسی طرح دنیا کا طالب بھی ایک فانی اور آب نما سراب کی طلب میں مشغول ہے طلب عقبیٰ عورت کی طرح ہے اگرچہ اس کا مقصود بھی عورت کی طرح کمزور ہے مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ اہمیت ضرور رکھتا ہے۔ جس طرح عورت اگرچہ ”الرجال قوامون علی النساء“ (مرد عورتوں پر نگران ہیں) کے مطابق مرد سے کمزور واقع ہوئی ہے مگر دنیا کی زندگی میں اس کا وجود بھی جزو لابدی کی حیثیت رکھتا ہے۔ کیونکہ توالد و تناسل کا سلسلہ امور خانگی کا انتظام بچوں کی نگہداشت وغیرہ اسی کی ذات سے وابستہ ہے۔ اسی طرح طالب عقبیٰ بھی اگرچہ کمزور مقصود کا طالب ہے مگر پھر بھی یہ اخروی طلب اپنے اندر بہت اہمیت رکھتی ہے۔ اب اس بعد فرمایا طالب المولیٰ مذکر یعنی اللہ کا طالب مذکر ہے۔ کیونکہ اس کا مقصود اتنا رفیع و منیع ہے کہ سوائے نر انسان کے اور کوئی اس کے حاصل کرنے کے درپے نہیں ہو سکتا۔ اور حقیقت میں طلب مولیٰ کے لئے عبادت کرنا ہی

پرکیف و پرلذت عبادت کہی جا سکتی ہے۔ کسی نے کہا ہے۔

تو بندگی چو گدایاں بشرط مزد مکن
کہ خواجہ خود روش بندہ پروری داند

تو عبادت فقیروں کی طرح نہ کر جس طرح مزدور اجرت کے لیے کام کرتا ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ خود بندے کی توفیق کے مطابق اس کا صلہ عطا کرتا ہے۔

جسے خالق مل گیا سب مخلوق اس کی ہوگئی:

کیونکہ جب عبادت کا مقصود خالق دنیا ہوا اور وہ مل بھی جائے تو دنیا تو پھر عابد کی ایک ادنیٰ غلام ہے۔

یاد حق گر مونس جانت شود
ہر دو عالم زیر فرمانت شود

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کی یاد اگر تیری زندگی کا حصہ بن جائے تو پھر تیرا حکم زمین و آسمان کی ہر چیز پر چلنا شروع ہو جائے گا۔

جس طرح کہتے ہیں کہ ہارون رشید کو ایک لونڈی سے جو کچھ زیادہ حسین و جمیل نہ تھی بہت محبت تھی۔ ایک دفعہ بعض امراء نے عرض کی کہ امیر المؤمنین سینکڑوں حسین و جمیل لونڈیاں حرم میں موجود ہیں مگر کیا وجہ ہے کہ نظر انتخاب ایک ایسی لونڈی پر پڑی ہے جو چنداں خوش شکل نہیں۔ ہارون رشید نے کہا میں کل تمہارے اس سوال کا جواب دوں گا۔ چنانچہ ہارون رشید نے دوسرے دن سب دربار کو آراستہ کرنے اور تمام درباریوں کے حاضر ہونے کا حکم دیا۔ جب لوگ آگئے تو اس نے نہایت قیمتی چیزیں منگوا کر دربار میں رکھوائیں۔ تھوڑی دیر بعد خلیفہ نے حکم دیا کہ آج جو شخص اس دربار میں سے کوئی چیز لے جائے گا تو وہ چیز ہمیشہ کے لئے اسی کی ہو جائے گی۔

چنانچہ حکم کی دیر تھی تمام کے تمام درباری قیمتی اشیاء کے لُوٹنے پر ٹوٹ پڑے مگر وہ لونڈی بادشاہ کے پاس سے نہ ہٹی بادشاہ نے لونڈی سے کہا کہ اے لونڈی تو کیوں اسی جگہ بت بنی کھڑی ہے کیا تو نے نہیں سنا کہ میں نے درباریوں کو لُوٹنے کا حکم دیا ہے۔ اور جو شخص بھی کوئی چیز اٹھائے گا وہ اسے ہی دے دی

جائے گی۔ لونڈی نے ہاتھ جوڑ کر عرض کی جہاں پناہ میں نے آپ کا فرمان سنا مگر مجھے ڈر ہے کہ میں جو چیز لوں گی وہ مجھے نہ دی جائے گی۔ بادشاہ نے کہا دیوانی جب ہم نے عام حکم دیدیا ہے تو پھر اس چیز کے نہ دیے جانے کا کیا مطلب۔ تو لُوٹ اور اگر ہم نے نہ دی تو شکایت کرنے کی مجاز ہے۔ چنانچہ جب لَونڈی نے بادشاہ کی زبان سے سنا تو بڑھ کر اپنا ہاتھ بادشاہ کے کندھے پر رکھ دیا کہ مجھے اس دربار کی اشیاء سے اس قیمتی و نایاب موتی کی ضرورت ہے۔ بادشاہ نے تمام امیروں و وزیروں کو مخاطب کر کے کہا دیکھو تم ادنیٰ ادنیٰ چیزوں پر ٹوٹ پڑے جو میرے ہاتھ کی میل اور میری جمع کی ہوئی تھیں مگر اس لونڈی نے اس شخص کا انتخاب کیا جو ان کا باعث ہے یہی وجہ ہے کہ میری نظر میں اس لَونڈی کی قدر حرم کی دوسری لونڈیوں سے بہت زیادہ ہے پھر حکم دیا کہ چونکہ اس لونڈی نے مجھے چنا ہے اس لئے جو کچھ بھی تمام درباریوں کو ملا ہے اس سے دو چند اس ایک لونڈی کو دیا جائے تو بھائی طلب مولیٰ میں بھی یہی ہے کہ اگرچہ ہماری عبادتیں خوش شکل اور خوبرو نہ ہوں لیکن اگر ہماری عبادتوں کا مقصود لَقائے رَبی (رب کی رضا) ہو تو اللہ تعالیٰ اسے ضرور شرفِ قبولیت عطاء فرما کر اس عابد کو اپنا بنا لیتے ہیں۔ اور جب انسان مولا کا ہو جاتا ہے تو پھر مولا بھی سب دنیا کو اس منتخب انسان کے پاؤں پر ڈال دیتا ہے تو پھر ہماری عبادتوں کا مقصود و مطلوب کیوں نہ خالق الدنیا والعقبیٰ ہو اور ان کے مرتبے کو دنیا یا عقبیٰ کو مقصود بتا کر کیوں گرایا جائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے یہی راز ہم کو نماز کی نیت میں سکھایا ہے کیونکہ آپ کی ارشاد فرمائی ہوئی نیت میں یوں آتا ہے ”اُصَلِّیْ لِلّٰہ “یعنی میں اللہ کے لئے نماز پڑھتا ہوں۔ آپ نے یوں نہ سکھایا کہ کہو اصلی لِحَسَنَۃِ الدُّنْیَا اَمِ الْحَسَنَۃِ الْاٰخِرَۃ کیونکہ حسن دنیا یا آخرت لَقائے رَبی کے مقصود سے نہایت کم درجہ کا مقصد ہے۔

صوفیائے کرام کے غائت عبادت کے متعلق مختلف نظریے:

اور بعض صوفیائے کرام جنہوں نے اپنے آپ کو مشاہدہ الٰہی میں فنا کر دیا۔ اور جنہوں نے دنیا و آخرت سے ہاتھ دھو کر ذاتِ باری کو اپنا مقصود و مطلوب بنایا اور پھر اس حصول مقصد کے بعد ایسے بیخود اور بے ہوش ہوئے کہ طلبِ مولیٰ کے بغیر کسی اور غرض کے لئے عبادت کرنے کو گناہ قرار دیا اور دلیل یہ دی کہ جب کوئی انسان عبادت کرتا ہے اور عبادت اللہ تعالیٰ کو راضی کر کے اس سے دنیا یا آخرت چاہتا ہے تو گویا اس

نے دنیا اور آخرت مقصود بنایا اور رضائے مولیٰ کو اس کا وسیلہ اور یہ ظاہر ہے کہ وسیلہ مقصود سے کم درجہ کا ہوتا ہے۔ تو گویا اللہ تعالیٰ کو عابد نے دنیا و آخرت سے کم مرتبہ سمجھا اور ایسے سمجھنے کا جو حکم ہے وہ ظاہر ہے مگر یہ سب باتیں صاحبِ سُکر اور مَغلوبُ الحال لوگوں کی شطحیات (**بزرگان دین کی لغزشیں**) ہیں۔

اور یہ وہ مقام ہے کہ جب وہ فنافی اللہ کا پیالہ لُنڈھاتے ہیں اور توحید کا جام انہیں مست و بیہوش بنا دیتا ہے تو اس وقت اگر بایزید بسطامی سبحانی ما اعظم شانی کہتے ہیں تو شبلی لوائی ارفع من لواء محمد کا دم بھرتے ہیں منصور حلاج اگر انا الحق کہتا ہے۔ تو سیدنا غوث الثقلین ’’قدمی ہذہ علی رقبۃ کل ولی اللہ‘‘ کا دعویٰ فرماتے ہیں سچ ہے۔

نہ من تنہا درین میخانہ مستم
جنید و شبلی و عطار ہم مستم

یعنی میں ہی اکیلا اس وحدت و فنا و بقاء کے میخانہ کا مست نہیں بلکہ میرے ساتھ جنید و شبلی اور عطار جیسے مستوں کا گروہ ہے۔

اور ایسے غلبہ ہی کی حالت میں بعض صوفیا نے اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی دوسری چیز کو مقصود بنانے میں قیل و قال کی ہے۔ ورنہ عاقبت کو مقصود بنانا اس کی تمنا کرنا اور اس کا اللہ جل شانہ سے طلب کرنا تو خود قرآن پاک کی رو سے جائز ہے۔

اور رب العزت نے قرآن پاک میں:

’’ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ‘‘ (التوبہ:۹)

فرما کر طلبِ عقبیٰ کو فوزِ عظیم اور مقصودِ مخیم ٹھہرایا ہے مگر وہ جو بیان ہوا مذہب عشق کا بیان تھا۔

مذہب عاشق ز مذہبہا جدا است
عاشقاں را مذہب و ملت جدا است

ترجمہ: عاشقوں کا طریقہ دوسرے طریقوں سے علیحدہ ہے کیونکہ عاشقوں کا مذہب اور طریقے دسرے مذاہب اور طریقوں سے علیحدہ ہیں۔

عاشقوں کی تین قسمیں اور ان کا فرق:

لیکن بھائیو! اگر سوچو تو اللہ جل شانہ سے عشق اس کی رضا و لقا کے بغیر کسی اور غرض سے کرنا حقیقت میں نہایت ہی ادنیٰ درجہ کا عشق ہے کتابوں میں لکھا ہے کہ عاشقوں کی تین قسمیں ہیں عاشقِ ذاتی، عاشقِ صفاتی اور عاشقِ احسانی۔ عاشقِ ذاتی تو وہ عاشق ہے جو محض معشوق کی ذات سے محبت کرے اور خواہ معشوق سے نفع پہنچے یا نقصان خواہ اس سے آرام ملے یا تکلیف جب تک معشوق کی ذات موجود ہے اس کے عشق میں کچھ تزلزل نہیں آتا اور یہ عشق کا نہایت اعلیٰ درجہ ہے۔ عاشقِ صفاتی وہ عاشق ہے جو معشوق کی بعض صفات کا عاشق ہو مثلاً اس کے حسن و جمال کا اس کے جاہ و منصب کا اس کے علم و حلم یا اور کسی ایسی ہی صفت کا یہ متوسط درجہ کا عشق ہے۔ کیونکہ اس میں عشق ذات اور موصوف سے نہیں بلکہ عرض اور صفت سے ہے لیکن چونکہ صفت کا قیام موصوف سے ہے اور وہ عرض اس کی ذات میں ہو کر پایا جاتا ہے اس واسطے عشقِ صفاتی میں ضمنی طور پر موصوف بھی شامل ہو جاتا ہے اب تیسرے درجہ کا عاشق، عاشقِ احسانی ہے۔ اس کا عشق نہ تو ذات سے ہے نہ صفات سے بلکہ اس کا عشق نتیجہ احسان ہے کہ کرم نوازش سے وابستہ ہے۔ اور یہ عشق نہایت ادنیٰ درجہ کا عشق ہے اور حقیقی عشاق عشقِ صفاتی اور عشقِ احسانی کو مذہبِ عشق میں شرک سے تعبیر کرتے ہیں

دوزخ سے کچھ نہ کام جنت سے کچھ غرض
جائیں گے ہم ادھر کو جدھر یار لے چلے
دنیا ست بلا خانہ و عقبیٰ ہوس آباد
ما حاصل ایں ہر دو بیک جو نہ ستانیم
ایں فتنہ بدنیا شد واو غرہ بعقبیٰ
ما فارغ ازیں ہر دو نہ اینیم نہ آنیم

ترجمہ: دنیا مصیبت و آزمائش کا گھر ہے اور عقبیٰ (آخرت) ہوس آباد کرنے کی جگہ ہے ان دونوں کا ماحصل ہم ایک جو دانہ کے بدلے میں نہیں لیتے۔

یہ دنیا میں فتنہ ہوا اور وہ آخرت پر مغرور ہونا ہے ہم ان دونوں سے فارغ ہیں نہ یہ ہیں اور نہ وہ ہیں۔

امام حسن بصری مالک بن دینار اور رابعہ بصری رحمۃ اللہ علیہم اجمعین کی عشق حقیقی کے متعلق دقیق گفتگو:

چنانچہ مجھے رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا کی ایک بات یاد آ گئی جس سے اس تمام اجنبی تقریر کی تفصیل ہو جائیگی ایک دفعہ آپ کے پاس امام حسن بصری اور مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہم تشریف لائے اور عرض کی کہ بی بی صاحبہ عشقِ حقیقی کیا چیز ہے ذرا آپ مہربانی فرما کر اس کی تفصیل فرمادیں بی بی صاحبہ نے فرمایا آپ مرد اور پھر امام زماں آپ سے بڑھ کر میں عشقِ حقیقی کے اسرار کو کیا جانوں خیر جب انہوں نے بہت کچھ تقاضا کیا تو بی بی صاحبہ نے فرمایا کہ اچھا پہلے آپ ہی بتائیے کہ آپ کے خیال میں عشقِ حقیقی کو کن الفاظ میں تعبیر کیا جاسکتا ہے چنانچہ امام صاحب نے فرمایا کہ!

مَنْ لَّمْ يَصْدُقْ فِيْ دَعْوَاهُ مَنْ لَّمْ يَصْبِرْ عَلٰى ضَرْبِ مَوْلَاهُ

یعنی دعویٰ عشق میں وہ شخص کبھی بھی سچا نہیں ہوسکتا جو اپنے مولیٰ کی مار اور تکلیف پر صبر نہ کرے بی بی صاحبہ نے فرمایا سبحان اللہ دعوٰی عشق اور پھر ساتھ شرک بھی پھر آپ نے مالک بن دینار سے پوچھا کہ آپ کے نزدیک عاشقِ حقیقی کون ہوسکتا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ!

مَنْ لَّمْ يَصْدُقْ فِيْ دَعْوَاهُ مَنْ لَّمْ يَشْكُرْ عَلٰى ضَرْبِ مَوْلَاهُ۔

یعنی وہ شخص کبھی بھی اپنے دعویٰ محبت میں سچا قرار نہیں دیا جاسکتا جب تک کہ وہ اپنے مولا کی مار پر اس کا شکریہ ادا نہ کرے۔

آپ نے فرمایا یہ بھی شرک ہے۔ اس پر امام صاحب اور مالک بن دینار رحمہما اللہ نے حیرت سے عرض کی کہ بی بی صاحبہ ہمارے دعویٰ عشق میں شرک کا تعلق کس طرح ہوسکتا ہے۔ آپ نے پہلے امام صاحب کو فرمایا کہ جب آپ نے عاشقِ صادق کی تعریف میں یہ بیان کیا کہ وہ ضربِ مولیٰ پر صبر کرے تو اس سے اپنے معشوق کے بغیر عاشق کے وجود اور ہستی کو بھی ثابت کیا کیونکہ جب تک اس کی ہستی وجود اور اس کا عقل وشعور نہ ہوگا۔ وہ ضربِ مولیٰ پر صبر کیسے کرے گا اور صبر کے مفہوم ومطلب کو کیا سمجھے گا۔ اور جب وہ ہشیار و باحواس ہوا تو اس پر وہ دیوانگی کیا طاری ہوئی کہ جس پر دنیا کی ہزار ہشیاریاں قربان ہونے کے قابل ہیں۔ سچ

ہے ؎

تیرے جلوے کے بیہوشوں کو
ہوش میں آنے سے کیا مطلب

اور پھر اس نے جب تک اپنی ہستی کو نہ مٹایا تو ذاتِ باری میں فنا کیسے ہوا اور فنا نہ ہوا تو کامل کہلانے کا مستحق کیسے ہو سکتا ہے۔

تو مباش اصلا کمال این است و بس
تو درو گم شو وصال این ست و بس

ترجمہ: تو اصل میں بالکل موجود ہی نہ ہو (اپنے آپ کو مٹا دے) کمال یہی ہے اور بس، تو اُس (کی ذات) کے اندر گم ہو جا وصال یہی ہے اور بس۔

بایزید بسطامی کی ایک عرض اور اس کا جواب:

حضرت بایزید بسطامی علیہ الرحمہ نے ایک دفعہ دربارِ ربی میں عرض کی:

”یَارَبِّ کَیْفَ السَّبِیْلُ اِلَیْكَ۔
یعنی اے اللہ آپ تک پہنچنے کا کیا طریقہ ہے؟ ندا آئی۔

”دَعْ نَفْسَكَ وَتَعَالَ“
یعنی اپنے نفس کو چھوڑ دے اپنے آپ کو مٹا ڈال اور پھر میری طرف آنے میں کوئی چیز مانع نہیں ہو سکتی۔

انانیت مقصود میں حائل ہوتی ہے اور اس کی مثال:

کہتے ہیں کہ ایک پیر صاحب نے دو مریدوں کو ریاضت و چلہ کشی کے لئے جنگل میں بھیجا جب زمانہ پورا ہو چکا تو دونوں مرید حاضر خدمت ہونے کے لئے شہر میں واپس آئے جب پیر صاحب کے مکان پر حاضر ہوئے تو کوٹھڑی کے دروازہ کو اندر سے بند پایا دروازہ پر دستک دی تو آپ نے اندر سے پوچھا کون ہے ایک مرید نے آگے بڑھ کر عرض کی حضور میں ہوں فلانا ریاضت ختم کر کے حاضر ہو رہا ہوں آپ نے فرمایا دوسرا تیرے ساتھ کون ہے تو جھٹ دوسرے نے آگے بڑھ کر عرض کی حضور آپ کا ناچیز خادم ہے حکم کے پورا

کرنے کے بعد خدمت میں حاضر ہوا ہوں آپ نے پہلے مرید کو فرمایا کہ ابھی تم جا کر پھر اتنا ہی زمانہ اور ریاضت و چلہ کشی میں گزارو کیونکہ میرے پاس "مَیں" والے کی ضرورت نہیں اور دوسرے کو اپنے پاس اندر آنے کی اجازت دی اور فرمایا کہ آقا کے ساتھ خادم رہ سکتا ہے۔ اس واسطے آج سے میرے پاس رہا کرنا اسی واسطے تو کبیر صاحب نے فرمایا ہے۔

بکری جو میں میں کرے گلے چھری پھروائے
مینا جو میں نہ کہے سب کے من کو بھائے

بی بی صاحبہ کی تقریر کی طرف رجوع اور اس پر یوسف علیہ السلام کے قصے کا استشہاداً بیان:

بی بی صاحبہ نے فرمایا کہ صبرِ عاشق سے وجودِ عاشق کا ثبوت بھی ملتا ہے جو مذہبِ عشق میں شرکِ صریح ہے۔

اذا قلت ما اذنبت قالت مجیبة
وجودك ذنب لایقاس به ذنب
گفتم چه دورم از تو چومارا گناه نیست
گفتا که هست هستی تو بدترین گناه
حجاب راه توئی حافظ از درمیاں برخیز
خوشا کسی که ازیں راه بے حجاب رود

ترجمہ: جب میں نے کہا کہ میں نے گناہ نہیں کیا تو اُس نے جواب دیتے ہوئے کہا تیرا وجود ہی اتنا بڑا گناہ ہے جس کے برابر کوئی گناہ نہیں، کوئی گناہ اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔

میں نے کہا آپ سے میں اتنا دور کیوں ہوں جب میرا گناہ کوئی نہیں اُس نے کہا کہ تیری ہستی تیرا موجود ہونا بدترین گناہ ہے۔

اے حافظ راہ کا حجاب تو ہی ہے درمیان سے اُٹھ جا۔ وہ شخص بہت ہی خوش قسمت اور اچھا ہے جو اس رستے سے

بے حجاب جائے۔

پھر اسی طرح آپ نے مالک بن دینار علیہ الرحمہ سے فرمایا کہ تیرے عشق کا وجود ثابت ہوتا ہے کیونکہ شکر شاکر کے وجود کا مقتضی ہے اس واسطے تیری تعریف بھی کچے عاشق کی شان کے مناسب ہے نہ کہ پختہ کار کے۔ جب آپ یہ فرما چکیں تو دونوں صاحبوں نے عرض کی کہ پھر بی بی صاحبہ پختہ عشق اور کامل محبت کیا ہو سکتی ہے آپ نے فرمایا!

لم یصدق فی دعواہ من لم ینس الم الضرب فی مشاھدۃ مولاہ“

یعنی دعویٰ عشق میں وہی سچا اور پکا ہے جو معشوق کے مشاہدہ میں اس قدر منہمک اور مستغرق ہو کہ اسے مار یا دکھ محسوس ہی نہ ہو اور وہ دیدِ یار میں ایسا خود رفتہ ہو جائے کہ ضرب کے متعلق اسے کچھ معلوم ہی نہ ہو سکے۔

تا کہ تو دم میزنی ہمدم نہ
تا کہ موئے ماندۂ محرم نہ

ترجمہ: جب تک تو دَم مارتا رہے گا اپنی ہستی کو برقرار رکھے گا (اُس وقت تک) تو ہمدم نہیں ہے جب تک تجھے اپنے وجود کا اقرار ہے تو محرم نہیں ہے۔

اور فرمایا جس طرح یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر بی بی زلیخا کی ملامت کرنے والیوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لئے تھے مگر مشاہدۂ یوسف میں ایسی خود رفتہ ہوگئی تھیں کہ اس وقت انہیں اپنے وجود تک کا خیال نہ تھا ہاتھوں کا کٹنا اور اس کے درد کا محسوس ہونا تو دوسرا مرتبہ تھا تو جب مخلوق کا مشاہدہ اور استغراقِ دید اپنے آپ سے اس قدر بیگانہ بنا دے تو پھر مشاہدۂ خالق میں اپنے آپ سے بیگانہ نہ ہو کر دعویٰ عشق کرنا کیسے پختہ عشق کی دلیل ہو سکتا ہے۔

قرآن پاک میں سورۂ یوسف کے چوتھے رکوع میں ارشاد ہوتا ہے !

”وَقَالَ نِسْوَةٌ فِی الْمَدِیْنَةِ امْرَاَتُ الْعَزِیْزِ تُرَاوِدُ فَتٰىهَا عَنْ نَّفْسِهٖ ۚ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ؕ اِنَّا لَنَرٰىهَا فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ () فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ اَرْسَلَتْ اِلَیْهِنَّ وَ اَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَاً وَّ اٰتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِّنْهُنَّ سِكِّیْنًا وَّ قَالَتِ اخْرُجْ عَلَیْهِنَّ ۚ فَلَمَّا رَاَیْنَهٗۤ اَكْبَرْنَهٗ وَقَطَّعْنَ اَیْدِیَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلّٰهِ مَا

هٰذَا بَشَرًا ؕ اِنْ هٰذَآ اِلَّا مَلَكٌ كَرِيْمٌ ○ (یوسف:۳۱)

یعنی شہر کی عورتیں کہنے لگیں کہ عزیز کی عورت اپنے غلام کو حصول مقصد کے لئے طلب کرتی ہے۔ اور اس کی محبت اس کے دل میں گھر کر گئی ہے اور ہم اسے اس معاملہ میں صریح غلطی پر سمجھتی ہیں جب زلیخا نے ان کی ایسی باتیں سنیں تو انہیں بلا بھیجا اور ان کیلئے کھانا تیار کیا اور ان میں سے ہر ایک کے ہاتھ میں چھری دی اور یوسف علیہ السلام کو کہا کہ ان کے سامنے آؤ جب ان عورتوں نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو بڑا پایا ان کو حسن و جمال میں اور اسی خود رفتگی میں بجائے ترنج یا پھل کاٹنے کے اپنے ہاتھ کاٹ ڈالے اور پکار اٹھیں کہ سبحان اللہ یہ انسان نہیں بلکہ ایک بزرگ فرشتہ ہے۔

مولانا جامی علیہ الرحمہ نے یوسف زلیخا کے تمام قصے کو ایک نہایت دلچسپ اور پر کیف مثنوی میں لکھا ہے اور درس نظامی کے فارسی طبقہ میں جامی رحمۃ اللہ علیہ کی ''زلیخا'' کو ایک خاص امتیاز اور اہمیت حاصل ہے۔ اس آیت کا ترجمہ جو آپ نے فارسی میں کیا ہے اس کا اردو ترجمہ سننے کے قابل ہے آپ فرماتے ہیں۔

ہوئیں طعنہ زن عورتیں مصر کی   کہ بندے کی اپنی بندی ہوئی
لیا جس کو مول اسکو لو دل دیا   بجھا شمع غیرت کی یہ کیا کیا
خریدا جسے اس پہ شیدا ہوئی   زلیخا کی عقل و خرد کیا ہوئی
عجب پر عجب اور ہے یہ سنو   کہ خواہاں ہی یہ اور گریزاں ہے وہ
اسے الفت اور اس کو نفرت ہے واہ   یہ ہے عزتِ دختر بادشاہ
یہ نزدیک جاوے وہ بھاگے ہے دور   یہ کرتی ہے عجز اس کو ہے سو غرور

بی بی زلیخا جب ان کی اس قسم کی باتیں سنتی ہیں تو سب کی مہمانی کر کے اپنے محل میں بلاتی ہیں۔

مہیا کئے بزم عشرت وہ بس   کہ جز ناز و نعمت نہ تھا ہم نفس
کر آراستہ جشن شاہوں کی شکل   ہر اک قسم کا تھا جس میں شراب اور اکل
ترنج اور چھری دی ہر ایک کو   کہ کاٹو اسے تا مزیدار ہو
کہا پھر کہ یوسف کو بلواؤں میں   جو خواہش تمہیں ہو تو دکھلاؤں میں

کہا سب نے لو ہم کو تو آرزو　　　یہی ہے کہ دیکھیں وہ روئے نکو
اسے دیکھ کے کھائیں اپنا ترنج　　　تراشیں گے پھر لو خوشی سے ترنج

چنانچہ جب یوسف علیہ السلام بی بی زلیخا کے کہنے پر نکلتے ہیں تو

کہاں کا ترنج اور کہاں کی چھری　　　رہا تھا کسی کا نہ بس جی میں جی
گئی عقل تو ہاتھ سے یک قلم　　　ہر اک نے کئے ہاتھ اپنے قلم
بجائے ترنج اپنے ہاتھوں کو کاٹ　　　دیا خون سے سارے دامن کو پاٹ

اور پھر بے ساختہ پکار اٹھیں ؎

یہ انسان نہیں ہے فرشتہ ہے یہ
بنُورِ الٰہی سرشتہ ہے یہ

طوالع الشموس سے ایک ایسا ہی واقعہ:

یوسف علیہ السلام کے واقعے کی طرح قاضی حمید الدین ناگوری رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ایک واقعہ ''طوالع الشموس'' میں درج فرمایا ہے۔ لکھا ہے کہ ایک نوجوان کو ایک عورت کے ساتھ متہم کیا گیا۔ جس پر عدالت سے سو درے لگائے جانے کا فیصلہ ہوا۔ تاریخ مقررہ پر ہزاروں لوگ سزا دیکھنے کے لئے جمع ہوئے۔ چنانچہ جب اُسے دُرے لگنے شروع ہوئے تو وہ ایک ٹکٹکی باندھے دیکھتا رہا نہ کوئی شور نہ واویلا نہ چیخ نہ پکار۔ جب آخر کار سواں دُرہ لگا تو اس نے انتہائی فریاد شروع کی۔ لوگوں کو تعجب ہوا کہ ۹۹ دُروں پر تو اس نے اُف تک نہ کی مگر آخری دُرے پر اس قدر زاری وفریاد کی۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کچھ نہ کچھ راز ہے۔ چنانچہ جب تفتیش کی گئی تو معلوم ہوا کہ ۹۹ دُروں تک تو اس کی محبوبہ وہاں اس کے سامنے موجود تھی۔ جس کے دیدار کے استغراق وانہماک نے مار کی تکلیف کا احساس نہ ہونے دیا۔ ہاں آخری دُرے پر وہ نظر سے اوجھل ہوگئی جس سے سوویں دُرے پر اس قدر تکلیف کا اظہار کیا گیا۔

دیکھو یہ تو عشقِ مجازی ہے جس میں دکھوں و تکلیفوں کا احساس نہیں ہوتا اگر عشقِ حقیقی ہو تو پھر آپ ہی بتائیے عاشقِ صادق کو المِ ضرب (تکلیفوں) کا کیا احساس ہو سکے گا۔ اسی واسطے بی بی صاحبہ نے فرمایا کہ

عاشقِ صادق وہ ہے جو اپنے نفس سے بیگانہ ہو جائے اور اپنے آپ کو ذاتِ باری کے مشاہدہ میں بالکلیہ فنا کر دے۔ کیونکہ جب نفس کا وجود ہے اور منؔ اور اناؔ کا مصداق ہو سکتا ہے۔ تب تک نہ تو وہ مشاہدے کے قابل ہوتا ہے اور نہ ہی عشاق کی فہرست میں درج کیا جاتا ہے۔

نفس کی چار قسمیں اور ان کے حجابات نمازی سے کیسے ہٹائے جاتے ہیں:

اسی واسطے تو مصلی کو نماز میں سب سے پہلے اپنے نفس کے چھوڑنے کا ارشاد ہوتا ہے اور جب نفس کو چھوڑ دیتا ہے تو پھر فوراً دربار کی حاضری کا حکم ہو جاتا ہے۔ اور وہ اس طرح کہ قرآن پاک کی رو سے نفس کی چار قسمیں ہیں امارہ، لوامہ، مُلہمہ اور مُطمئنہ۔ نفسِ امارہ برے کاموں کی رغبت دیتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں آتا ہے!

’’اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ‘‘۔ (یوسف:۵۳)

کہ نفس تو برے کاموں کا حکم دیتا ہے۔

نفسِ لوامہ انسان کو برے کام پر ملامت کرتا ہے۔

قرآن پاک میں!

’’وَلَآ اُقۡسِمُ بِالنَّفۡسِ اللَّوَّامَۃِ‘‘ (القیامۃ:۲)

کے الفاظ میں اللہ تعالیٰ نے نفسِ لوامہ کی قسم کھائی ہے۔ اس کے بعد نفسِ مُلہمہ وہ ہے۔ جو انسان کو نیک و بد سمجھاتا ہے۔

’’فَاَلۡهَمَهَا فُجُوۡرَهَا وَتَقۡوَاهَا‘‘ (الشمس:۸)

قرآن پاک نے اسی نفس کے متعلق ارشاد فرمایا ہے! اور نفس مطمئنہ وہ ہے جو دنیا کی آلائشوں اور کثافتوں سے پاک ہو کر:

’’اَلَا بِذِکۡرِ اللّٰہِ تَطۡمَئِنُّ الۡقُلُوۡبُ‘‘ (الرعد:۲۸)

کے مطابق ذکر الٰہی اور یاد خداوندی کے ساتھ مطمئن ہو جاتا ہے۔ قرآن پاک ایسے نفس کو بشارت دیتا ہے!

''یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ० ارْجِعِیْۤ اِلٰی رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً ० (الفجر: ۲۷،۲۸)
یعنی اے نفسِ مطمئنہ تو اپنے رب کی طرف لوٹ جا۔ اس حال میں کہ تو اس سے راضی ہے اور وہ تجھ سے۔

اب ان چاروں قسموں میں سے اگرچہ ایک بری اور باقی تین اچھی ہیں مگر پھر بھی نفس ہی کی قسمیں ہیں۔ اس لئے ان چاورں کو اللہ تعالیٰ اپنی چار صفتوں سے مغلوب کر کے مٹانے کی تلقین فرماتے ہیں۔ اور وہ چار صفتیں رب العالمین، رحمٰن، رحیم اور مالک یوم الدین ہیں۔

جب اللہ تعالیٰ کو صفتِ ربوبیت سے یاد کیا جاتا ہے تو نفسِ اَمارہ کا پردہ اٹھ جاتا ہے۔ جب رحمانیت کی ثناء کو ادا کیا جاتا ہے۔ تو لوامہ کے حجاب کو ہٹا دیا جاتا ہے۔ جب صفتِ رحمیت کو ذکر کیا جاتا ہے تو ملہمہ کے پنجہ سے چھڑایا جاتا ہے۔ اور جب اس احکم الحاکمین کو مالک یوم الدین کہہ کر سراہا جاتا ہے۔ تو نفس مطمئنہ کی آخری اوجھل کو بھی دور کر دیا جاتا ہے۔

اب مصلی نفس کی سب قسموں سے پاک وصاف ہو کر ایک سادہ کاغذ رہ جاتا ہے۔ جس پر حسبِ منشا ہر قسم کا نقش کھنیچا جا سکتا ہے۔ اب نفس کے بوجھ کے ہٹنے سے اس کی پرانی ملکوتی صفات خوب اُبھر کر آتی ہیں جس کی وجہ سے اسے فوراً دربارِ خداوندی میں حاضر کر دیا جاتا ہے۔ اسی واسطے اب نمازی ''اِیَّاكَ نَعْبُدُ'' کہہ کر بطریقہ خطاب بات کرنی شروع کرتا ہے۔ گویا کہ وہ پہلے نفس کے پردوں میں محجوب تھا۔ مگر اب ان صفات کے ذکر نے ان پردوں کو ہٹا دیا اور اب وہ رب العزت سے بالمشافہ بات چیت کر رہا ہے۔

اِیَّاكَ نَعْبُدُ میں جمع کا صیغہ کیوں لایا؟

یہاں خیال ہو سکتا ہے کہ عبادت تو ایک شخص کرتا ہے۔ مگر صیغہ بجائے ''اعبد'' میں عبادت کرتا ہو ل کہ ''نعبد'' کیوں استعمال کیا جا رہا ہے؟ جمع کا صیغہ استعمال کرنے میں اللہ جل شانہ نے بہت بڑا راز رکھا ہے کہ جس سے قرآن پاک کے لفظ لفظ کا بحر ذخار اور سمندر ناپیدا کنار ہونے کا یقین ہو جاتا ہے۔ اور پھر یہ راز تو محض ہم جیسے سطحی لوگوں کا ہے وہ لوگ جو دریائے معرفت کے تیراک اور بحرِ عرفاں کے غواص ہیں وہ قرآن پاک کے ایک ایک لفظ سے سینکڑوں ایسی باریکیاں اور اسرار سمجھتے ہیں۔ ادنیٰ تو ادنیٰ متوسط درجے کا آدمی بھی ان کے رفعتِ خیال اور وقتِ راز معلوم کر کے بے ساختہ ما ھذا کلام البشر پکار اٹھتا ہے۔

قرآنِ پاک کے بحرِ معانی ہونے پر شبہ اور اس کا جواب:

شاید اس سے آپ کے دل میں یہ شبہ پیدا ہو جائے کہ کیا وجہ ہے کہ مثلاً سورۃ فاتحہ کے لفظ تو وہی ہیں۔ آیتیں اتنی وہی ہیں کسی لفظ کسی حرف یا حرکت وسکون کی کچھ کمی بھی نہیں ہوتی۔ پھر لغوی لحاظ سے معنی میں بھی تبدیلی ممکن نہیں۔ تو پھر یہ دعوٰے کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ کہ ایک ادنیٰ متوسط اور اعلیٰ شخص کے فہم مطالب میں بھی ادنیٰ متوسط اور اعلیٰ کا فرق ہو گا۔

جواب: میں اس فرق کو آپ کے سامنے بذریعہ مثال بیان کرتا ہوں تا کہ جو لوگ پڑھے لکھے نہیں۔ ان کی سمجھ میں بھی میری بات آسکے۔ سمندر کی مثال کو لیجئے۔ ایک شخص سمندر کو دور سے دیکھتا ہے اور اسے ایک پانی کی لکیر سمجھ کر اسے ہی سمندر کی حقیقت قرار دیتا ہے۔ دوسرا اس کے کنارے پر آتا ہے اس کے مدوجزر کو دیکھتا ہے اس کے کنارے پر رنگ برنگے سیپ اور عجیب وغریب جانور مرے ہوئے دیکھتا ہے۔ اس کے پانی کو چکھتا ہے تو نمکین پاتا ہے اور بس اسے ہی سمندر کی حقیقت سمجھ کر مطمئن ہو جاتا ہے۔ تیسرا شخص اس سمندر کا سفر کرتا ہے۔ طرح طرح دریائی پرندے اور مچھلیاں دیکھتا ہے۔ سب میرین یا سمندر کے اندر جانے والی موٹر کے ذریعہ سے اس کی تہہ کی سیر کرتا ہے سمندر کے پیٹ کے عجائبات کو دیکھ کر ” فَتَبَارَكَ اللّٰهُ اَحْسَنُ الْخَالِقِيْنَ “ (المومنون: ۱۴) کا ورد کرتا ہے۔

غواصوں کے موتی نکالنے کے طریقے سے مطلع ہوتا ہے اور سمندر کی حقیقت کچھ ایسے الفاظ میں سمجھتا ہے کہ جس کو میں بھی بیان نہیں کر سکتا۔ تو اب آپ ہی بتائیں کہ سمندر تو ایک ہے مگر پہلا اسے سفید پانی کی لکیر دوسرا اس سے کچھ زیادہ اور تیسرا اس سے کچھ زیادہ مطلب اس لفظ کے ساتھ وابستہ دیکھتا ہے۔ اسی طرح قرآن پاک کے سمندر کا سطحی عالم۔ اس کے باطنی عالم سے بہت کم اسرار ونکات کو سمجھ سکتا ہے۔

اسی واسطے ارشاد باری تعالیٰ ہے!

”قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمَاتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمَاتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا“۔ (الکھف: ۱۰۹)

یعنی اے حبیب آپ لوگوں کو کہہ دیجئے کہ سمندر بھی کلماتِ ربی کے لکھنے کیلئے سیاہی بن جائے تو کلماتِ ربی کے

ختم ہونے سے پہلے وہ بھی ختم ہو جائیگا اور یہی نہیں بلکہ اتنی ہی اگر اور سیاہی بھی لے آئیں تو وہ بھی اللہ تعالیٰ کی باتیں لکھنے کے لئے بالکل ناکافی اور کم ہے ۔

اے بر ترا ز خیال و قیاس و گمان و وہم　　وز ہر چہ گفتہ ایم و شنیدیم و خواندایم
دفتر تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر　　ماہمچناں در اول و صف تو ماندہ ایم

ترجمہ: اے وہ ذات جو خیال وقیاس اور گمان و وہم سے اور جو کچھ ہم نے کہا ہے اور سنا ہے اور پڑھا ہے ان تمام سے برتر ہے ۔ دفتر سب تمام ہو گئے اور عمر انتہا کو پہنچ گئی لیکن ہم اسی طرح تیری پہلی صفت میں ہی رہ گئے ہیں (اسے پورا کماحقہ) بیان نہیں کر سکے ۔

بجائے ''اَعْبُدُ'' کے ''نَعْبُدُ'' لانے میں راز:

تو اب اس بات کو میں پھر بیان کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ نے بجائے اَعْبُدُ کے نَعْبُدُ فرما کر اس میں کون سے پُرحکمت راز ودیعت فرمائے ۔

پہلا راز: نعبد فرما کر اس طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ مسلمان باجماعت نماز پڑھیں کیونکہ نعبد کا معنی ہے ہم عبادت کرتے ہیں ۔ اور ہم کا اطلاق تب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ جب بہت سے نمازی اجتماعی شکل میں عبادت کریں ۔ تو گویا یہ لفظ باشارۃ النص مسلمانوں کی جماعت کی تاکید کر رہا ہے ۔

آپ کہیں گے کہ اشارہ النص کیا ہوتا ہے تو آپ کو معلوم ہو کہ علم اصول نے کسی نص یا عبارت کے مطلب پر استدلال کرنے کے لئے چار طریقے مقرر کئے ہیں ۔ اور جن کا جاننا ایک عالم قرآن کے لئے نہایت ضروری ہے ۔ ورنہ وہ مکمل طور پر مطالب قرآن کو نہ سمجھ سکے گا ۔ وہ چار طریقے عبارۃ النص، اشارۃ النص، اقتضاء النص اور دلالۃ النص کہلاتے ہیں ۔ کیونکہ استدلال یا تو لفظ سے ہو گا یا معنی سے ۔ اگر لفظ سے ہے اور وہ خاص اسی مطلب کے لئے بولا گیا ہے ۔ تو وہ عبارۃ النص کہلاتا ہے ۔ اور اگر وہ کلام خاص اسی مطلب کے لئے تو نہیں مگر نص کے الفاظ سے بغیر کسی زیادتی کے وہ مطلب مفہوم ہوتا ہو تو یہ اشارۃ النص کہلاتا ہے ۔

جیسے قرآن پاک میں آتا ہے!

''لِلْفُقَرَاءِ الْمُهَاجِرِينَ الَّذِينَ أُخْرِجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ'' (الی اخر الایۃ) (الحشر: ٨)

یہاں عبارۃ النص کے ذریعے مہاجرین فقراء کا مستحق غنیمت ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ متکلم نے اس کلام کو قصداً اسی غرض کے لئے بیان کیا ہے۔ مگر اسی عبارت میں اشارۃ النص کے ذریعے معلوم ہو رہا ہے کہ مہاجرین ہجرت کرنے کے بعد اپنے مال ومتاع کے مالک نہیں رہے بلکہ فقیر ہو گئے۔ لہٰذا جب کوئی کافر ان کے مال پر قبضہ کرے گا۔ تو اس کی ملکیت بھی ثابت ہو جائیگی۔ کیونکہ اگر مہاجرین کے مال ان کی ملک میں رہتے تو وہ فقراء نہ کہلائے جاسکتے۔

اگر وہ استدلال معنی سے ہے تو پھر اس میں دو صورتیں ہونگی اگر وہ مطلب اس لئے سمجھا جاتا ہے کہ شرعاً یا عرفاً یا عقلاً وہ معنی اُس پر موقوف ہے تو اقتضاء النص کہلائیگا۔ اور اگر اس طرح نہیں بلکہ زیادہ ہونے کی وجہ سے سمجھ میں آتا ہے تو اس کو دلالۃ النص کہتے ہیں۔

اقتضاء النص کی مثال: مثلاً کسی نے دوسرے شخص کو کہا ''اعتق عبدك عني بالف درهم '' یعنی میری طرف سے تو اپنا غلام ہزار روپے کے بدلے آزاد کردے۔ اس نے جواب میں کہا اعتقت میں نے آزاد کر دیا۔ تو اب غلام آزاد ہو گیا اور حکم دینے والے کا مطلب یہ تھا کہ تو اپنے غلام کو مجھ پر ایک ہزار میں فروخت کر۔ اور پھر میرا وکیل ہو کر آزاد کردے۔ تو گویا اس کلام سے بیع کے ساتھ ساتھ قبولیت اور توکیل اقتضاء النص کے طریق پر ثابت ہو گئی۔

اب دلالۃ النص کی مثال: قرآن پاک کی آیت!

''فَلَا تَقُل لَّهُمَآ أُفٍّ وَلَا تَنْهَرْهُمَا'' (الاسرا:۲۳)

یعنی والدین کو کلمہ اُف تک نہ کہہ اور نہ ان دونوں کو جھڑک۔

اس سے آدمی فوراً سمجھ جاتا ہے کہ والدین سے ایذا کو دور کرنے کی غرض سے کلمہ اُف تک کہنے کی ممانعت کی گئی ہے۔ پس دلالۃ النص سے ثابت ہوا کہ ماں باپ کو مارنا، گالی دینا، یا اور کسی قسم کی انہیں ایذا پہنچانا۔ اسی آیت سے یقیناً حرام ہے۔

تو اب امید ہے کہ آپ اس تشریح کے بعد میرا یہ کہنا کہ نعبد سے اشارۃ النص کے ذریعے جماعت کا التزام ثابت ہو رہا ہے بخوبی سمجھ گئے ہوں گے۔ اسی اشارۃ النص کے باعث امام احمد داؤد اور عطار رحمۃ اللہ

علیہم اجمعین نے جماعت کو فرض عین قرار دیا ہے اور اس پر اس مسئلے کو متفرع کیا ہے کہ جس شخص نے اذان سنی اور جماعت کے لئے حاضر نہ ہوا تو اب اس میں نماز اکیلے درست نہ ہو سکے گی۔ امام شافعی نے اسے فرض کفایہ ٹھہرایا ہے مگر امام اعظم نے اسے واجب قرار فرمایا ہے۔

چنانچہ درمختار میں آتا ہے!

”وَالْجَمَاعَةُ سُنَّةٌ مُؤَكَّدَةٌ لِلرِّجَالِ قَالَ الزَّاهِدِي: أَرَادُوا بِالتَّأْكِيدِ الْوُجُوبَ۔

(ردالمحتار: جلد ۱، باب الامامۃ، صفحہ ۵۵۲، دارالفکر بیروت)

یعنی جماعت سنتِ موکدہ ہے۔ زاہدی نے فرمایا کہ تاکید سے مراد وجوب ہے۔

پھر آگے فرمایا۔

وَقِيلَ وَاجِبَةٌ وَعَلَيْهِ الْعَامَّةُ

(ایضاً صفحہ ۵۵۴، دارالفکر بیروت)

اور بعضوں نے کہا ہے کہ واجب ہے اور اسی پر اکثر مشائخ کا فتویٰ ہے۔

نماز باجماعت کی فضیلت اور مسلمانوں کی افسوس ناک سُستی:

مگر افسوس کہ اول آج تو بہت سے مسلمان نماز ہی نہیں پڑھتے اور بعض جو پڑھتے ہیں وہ بھی زیادہ تو بلا کسی عذر کے اپنے گھروں میں پڑھ لیتے ہیں اور ان سے مسجد تک چند قدم چل کے آنے کی تکلیف نہیں اٹھائی جا سکتی۔ مگر بھائی آخرت کا سودا ہے اس واسطے اس میں سستی ہے۔ اگر کوئی دنیا کا سودا ہوتا اور سو کے پیچھے ایک ہی ملتا۔ تو ایک میل تک پاؤں سے چل کر جانا تو خیر سر کے بل جانے میں بھی کچھ عذر نہ ہوتا۔ حضور سرور کائنات ﷺ فرماتے ہیں!

صَلَاةُ الْجَمَاعَةِ تَفْضُلُ صَلَاةَ الْفَذِّ بِسَبْعٍ وَعِشْرِينَ دَرَجَةً“۔

(صحیح البخاری: الجزء ۱، رقم: ۶۱۹، دار ابن کثیر بیروت)

یعنی جماعت کی نماز اکیلے کی نماز سے ۲۷ درجے زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔

اور پھر فضیلت کو تو چھوڑ یئے حضور جو رحمۃ اللعالمین ہیں تارک جماعت پر کس قدر غصے کا اظہار ان الفاظ میں فرماتے ہیں!

”وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَقَدْ ھَمَمْتُ اَنْ آمُرَ بِحَطَبٍ فَیُحْطَبَ ثُمَّ آمُرَ بِالصَّلاَۃِ فَیُؤَذَّنَ لَھَا ثُمَّ آمُرَ رَجُلاً فَیَؤُمَّ النَّاسَ ثُمَّ اُخَالِفَ اِلٰی رِجَالٍ لاَ یَشْھَدُوْنَ الصَّلاَۃَ فَأُحَرِّقَ عَلَیْھِمْ بُیُوْتَھُمْ“۔

(صحیح البخاری، الجزالاوّل، باب وجوب صلاۃ الجماعۃ، رقم: ۶۴۴، دارطوق النجاۃ)

یعنی قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ میں نے ارادہ کیا کہ لکڑیاں جمع کرنے کا حکم دوں۔ پھر جب جمع ہو جائیں تو نماز کا حکم دوں پس اس کے لئے اذان دی جائے۔ پھر کسی کو حکم دوں کہ وہ لوگوں کو امامت کرائے۔ پھر میں ان لوگوں کی طرف جاؤں جو نماز میں حاضر نہیں ہوئے۔ پس جلا دوں ان پر ان کے گھروں کو۔

مسلمانوں غور کرو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تارکِ جماعت کے گھر کو اس سمیت جلا دینے کا فرما رہے ہیں۔ اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کسی کے مکان کو جلایا نہیں مگر یہ یقین رکھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس کے لئے جو فرمایا وہ اس کے لئے ہو ہی گیا۔

صحیح مسلم میں آتا ہے کہ!

حضور کی خدمت میں عبداللہ بن مکتوم صحابی جو نابینا تھے حاضر ہوئے اور عرض کی کہ حضور بوجہ نابینا ہونے کے میں دیکھ نہیں سکتا اور میرے پاس ایسا کوئی شخص بھی نہیں کہ وہ مجھے لائے تو کیا آپ مجھے گھر میں نماز پڑھنے کی اجازت دے سکتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کیا تو اذان کی آواز سن سکتا ہے۔ عرض کی ہاں تو فرمایا کہ پھر تو نماز کو حاضر ہی ہوا کر۔

(صحیح مسلم: جلد ۲، رقم: ۱۵۱۸، باب یجب اتیان المسجد علی من سمع النداء، دارجیل بیروت)

اس حدیث پاک سے وہ لوگ عبرت حاصل کریں اور نصیحت پکڑیں کہ جن کو مسجد کے پڑوس میں سالوں گزر گئے مگر وہ ایسے غافل اور شراب دنیا کا پیالہ پی کر مدہوش ہیں کہ کبھی بھی موذن کی آواز پر نہ عملی لبیک کہی اور نہ زبانی۔

بے نماز انسان حیوان سے بھی بدتر ہے اور اس پر ایک لطیفہ:

مجھے ایک قصہ یاد آ گیا جو مطلب کا مطلب اور لطیفہ کا لطیفہ ہے۔ ایک دفعہ کسی مسجد کے پڑوسی کا گدھا مسجد میں گھس آیا۔ مؤذن صاحب نے جب گدھے کو مسجد میں گھستے دیکھا تو ایک مضبوط سا ڈنڈا لے کر دوہتھڑ اس غریب کی پیٹھ پر "ضَرَبَ یَضْرِبُ" کی گردان شروع کر دی۔ ابھی گدھے کو پانچ سات ہی پڑی تھیں کہ اس کی خوش بختی سے اس کا مالک بھی آپہنچا۔ مؤذن صاحب نے انتہائی غصے میں اس کے مالک کی طرف بھی ڈنڈا سیدھا کیا۔ اس نے فوراً ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ بانگی صاحب، یہ بے چارہ حیوان ہے گدھا ہونے کی وجہ سے اندر چلا آیا۔ ہمیں بھی آپ کے پڑوس میں تیس سال سے زیادہ گزر چکے ہیں مگر آپ ایمان سے کہیں کبھی بھی آپ نے ہمیں مسجد میں گھستے دیکھا ہے؟۔ یہ جانور اور ناسمجھ تھا چلا آیا اس واسطے آپ اسے اس دفعہ معاف فرمائیں۔ تو گویا اس جنگلی کے خیال میں مسجد میں گھسنا صرف ناسمجھوں کا کام تھا۔ مگر وہ انسان نما گدھا نہ سمجھا کہ مجھ سے حقیقی گدھا ہی اچھا ہے کہ بھول کر مسجد میں چلا آیا میں تو نہ کبھی بھول کر آیا اور نہ سمجھ کر۔

اور اگر غور کرو تو ایسے ناشکرے انسانوں سے حیوان ہی اچھے ہیں دیکھو خواہ وہ کتنے ہی سرسبز گھاس کے کھانے میں مشغول ہوں۔ کتنا ہی لذیذ چارا ان کے آگے پڑا ہو مگر جہاں مالک نے آواز دی فوراً اسے چھوڑ کر آ گئے۔ چرتے چرتے کتنے ہی دور چلے جائیں شام کو اپنے تھان پر آ کر حاضر ہو گئے۔ مگر یہ انسان ایک خسیس دنیا کے چارے میں ایسا مشغول ہو جاتا ہے کہ مالکِ حقیقی کے نقیب کی ہزاروں آوازیں بھی اسے ہشیار بنانے سے قاصر رہتی ہیں۔ وہ دنیا کی چرائی میں دور تو کیا بالکل قریب ہو کر بھی پانچ وقتوں سے ایک وقت بھی اپنی عاقبت کے تھان پر حاضری نہیں دیتا۔ تو پھر یہ اچھا ہوا یا اس سے حق شناس اور باوفا حیوان۔

ہاں البتہ کسی کو کچھ شرعی عذر ہو تو اسے اپنے مکان یا دکان پر بھی نماز پڑھ لینے کی اجازت ہوتی ہے۔ مثلاً بیمار ہو، جان یا آبرو کا خوف ہو، سخت بارش یا سخت سردی ہو، اسی طرح بہت بھوکا ہو یا استنجے کی ضرورت ہو تو ایسی صورتوں میں تخلفِ جماعت سے عذاب کا مستحق نہ ہوگا۔

دوسرا راز: غرضیکہ ایک تو "نَعْبُدُ" میں جمع کا صیغہ لا کر التزامِ جماعت کی طرف اشارہ فرمایا۔ اب دوسرا راز یہ ہے کہ عابد جب کہتا ہے کہ اے اللہ ہم خاص تیری ہی عبادت کرتے ہیں تو گویا وہ اپنی

عبادت کو دوسروں کی عبادت کے ساتھ ملا دیتا ہے۔ تو اگر اس کی عبادت ناقص اور دوسرے عابدین میں سے کسی کی عبادت کامل ہوئی تو سب عابدین کی عبادت ایک ہونے کی وجہ سے اسے بھی اس کے ساتھ درجۂ قبولیت عطاء کیا جاتا ہے۔ اور اگر اس کی عبادت کامل ہے اور دوسرے عابدین کی ناقص تو یہ ان کی ناقص عبادتوں کو اپنی کامل عبادت سے ملا کر انہیں بھی دربارِ ربی میں پیش کر دیتا ہے۔ کیونکہ لوہا اگرچہ بھاری اور ڈوبنے والا ہے مگر لکڑی کے ساتھ مل کر وہ بھی تیرنے لگتا ہے۔ اور فقہ کا مسئلہ بھی ہے کہ اگر چند چیزیں اکٹھی بیچی جائیں کہ جس میں کچھ خراب اور کچھ اچھی ہوں تو گاہک کو یہ اختیار نہیں کہ وہ اچھی اچھی چن کر خراب واپس کرے۔ کیونکہ وہ سب مجموعی شکل میں بیچی جا رہی ہیں۔ اگر لینا ہے تو سب کی سب ہی لینی پڑیں گی۔ اسی طرح جب کامل اور ناقص عبادتیں نعبد کے صیغہ کے ذریعہ یکجا کر دی گئیں۔ تو اب چونکہ کامل عبادتوں نے تو ضرور ہی قبول ہونا ہے۔ اس واسطے اس مسئلہ کی رو سے ناقص عبادتیں بھی ضرور ہی مقبول ہو جائینگی۔ کیونکہ کامل کا چن کر ناقص کا لُوٹا دینا جب انسان کی شان کے مناسب نہیں تو اس شہنشاہ کی کریمی و رحیمی کے کیسے لائق ہو سکتا ہے۔

شنیدم که در روز امید و بیم
بداں را به نیکاں به بخشد کریم

ترجمہ: ہم نے سنا ہے کہ اس دن جب لوگ اُمیدی اور نا اُمیدی کی حالت سے گزر رہے ہوں گے، اللہ کریم اپنے گناہ گار بندوں کو اپنے نیک بندوں کی وجہ سے کرم فرما دیں گے۔

تیسرا راز: نمازی اگر کہتا کہ اے اللہ میں خاص تیری ہی عبادت کرتا ہوں۔ تو اس سے جلالِ کبریائی کچھ زیادہ ظاہر نہ ہوتا۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت میں ہی ایک عابد ہوں۔ مگر جب نعبد کہا تو مطلب یہ ہوا کہ اے معبود میں تیرے بے انتہا عابدوں میں سے ایک عابد ہوں۔ اور تیرے لاتعداد چاکروں (نوکروں) میں سے ایک چاکر (نوکر) ہوں۔ اور اس طرح رَبُّ العزت کے کمال و جلال کا نہایت بہترین طور پر مظاہرہ ہوتا ہے۔

چوتھا راز: چونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات والاصفات جو مستحق عبادت ہو رہی ہے وہ بوجہ الوہیت،

ربوبیت، رحمانیت اور رحیمیت کے ہو رہی ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ ان صفات کا تعلق کسی خاص فرد سے نہیں۔ بلکہ بالکل عام ہے اس لئے اس کا عابد بھی کوئی فردِ مخصوص نہیں۔ بلکہ تمام مخلوقات ہے اور جب تمام مخلوقات نتیجہ کے اعتبار سے عابد ٹھہری تو جمع کا صیغہ لانا ہی ضروری تھا۔

پانچواں راز: اگر غور کیا جائے تو نماز میں انسان کا ہر ہر عضو ہر ہر جوڑ اپنے مخصوص طریقہ پر عبادت کرتا ہے۔ مثلاً زبان ثنا کہتی ہے۔ ہاتھ تکبیر تحریمہ میں اٹھ کر ماسویٰ اللہ سے قطعِ تعلق کو ظاہر کرتے ہیں گھٹنے ہتھیلیاں ناک اور ماتھا وغیرہ زمین کو چھو کر عجز و انکسار کا نمونہ پیش کرتے ہیں اس لئے انسان کا ہر ہر جوڑ بمنزلہ عابد کے ہو جاتا ہے۔ تو گویا ایک انسان مجمع عابدین ہونے کی وجہ سے نعبد کہہ رہا ہے۔

اس کے علاوہ اس میں بہت سے علمی رموز و اسرار ہیں۔ جو عالم پر پوشیدہ نہیں اور غیر عالم کو زیادہ اس جھمیلے میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔ تو خلاصۂ کلام یہ نکلا کہ ایاک نعبد کا معنی یہ ہے کہ اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ کیونکہ عبادت کے قابل تیری ہی ذات رفیع الدرجات ہے اور بس۔

اب اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ "اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ"۔ یعنی ہم تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔ جب بندہ نماز میں کھڑا ہوا تھا۔ تو بالکل بیگانہ تھا۔ نفس اور خودی کے پردوں میں مستور (چھپا ہوا) تھا مگر جب اللہ جل شانہ کی تعریف کی۔ اپنے اور مالک حقیقی کے درمیانی تعلقات پر غور کیا۔ اس کی ربوبیت اور رحیمیت کے خیال نے نفس کے پردوں کو پھاڑ کر اسے ذات باری کا مشتاق و شیدا بنا دیا۔ تو اب وہ بیگانگی یگانگی سے بدل گئی۔ یہ ایک قدم آیا تو رب العزت شانِ کریمانہ کے ساتھ دو قدم آئے۔ اس نے ہاتھ لمبا کیا تو مالک الملک نے اسے پکڑ کر وہاں پہنچا دیا کہ جس کے ذکر سے زبان گنگ اور قلم شق ہے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے کہ رب العزت فرماتے ہیں!

"وَمَنْ تَقَرَّبَ مِنِّیْ شِبْرًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ ذِرَاعًا وَمَنْ تَقَرَّبَ مِنِّی ذِرَاعًا تَقَرَّبْتُ مِنْهُ بَاعًا وَمَنْ اَتَانِیْ یَمْشِیْ اَتَیْتُهٗ هَرْوَلَةً"۔

(صحیح مسلم: جز۸، باب فضل الذکر والدعاء، رقم: ۷۰۰۹، دار جیل بیروت)

(سنن ابن ماجہ: ج ۲، رقم: ۳۸۲۱، باب فضل العمل، دار الفکر بیروت)

یعنی جو ایک بالشت ہمارے قریب آتا ہے ہم اس کے قریب ایک گز جاتے ہیں۔ اور جو ہمارے پاس چل کر آتا ہے ہم اس کی طرف دوڑ کر جاتے ہیں۔

سچ ہے ؎

عاشق کہ شد کہ یار بحالش نظر نکرد
اے خواجہ درد نیست وگرنہ طبیب ہست

ترجمہ: وہ عاشق کیا ہوا کہ اُس کے محبوب نے اُس کے حال پر نظرِ التفات نہیں فرمائی اے خواجہ درد نہیں ہے وگرنہ طبیب ہے۔

دربارِ شاہانہ میں سوال کس طرح کرنا چاہیے؟

اب جبکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے توفیق حسبِ حال ہوئی۔ اور نفس کے پردوں کو ہٹا کر نمازی کو دربارِ ربی میں پہنچا دیا گیا۔ تو بندے نے احکم الحاکمین کے حضور اپنی ناقص عبادت کا تحفہ پیش کیا۔ حکم ہوا تمہارا تحفہ قبول ہے مانگو کیا مانگتے ہو۔ اب ایسے قیمتی موقعہ پر عابد دنیا کی فانی لذتوں اور اس کی چند روزہ آسائشوں کے مانگنے میں مشغول ہو جاتا۔ تو گویا ابھی تک یہ اس شہنشاہ ذوالجلال کے مرتبہ سے پوری طرح واقف ہی نہیں ہوا کہ ایسے موقع اور مقام پر ایسی حقیر اور کم حیثیت چیزوں کی التجا کر رہا ہے اور پھر یہ شخص دربارِ شاہی میں بلائے جانے کے قابل ہی نہ تھا۔ کیونکہ اسے ابھی تک ایسے جلیل القدر اور عظیم الشان شہنشاہ سے سوال کرنے کا طریقہ ہی نہ آیا۔ مثلاً کسی شخص کو دنیا کے کسی بڑے بادشاہ کے دربار میں حاضر کیا جائے۔ بادشاہ اس سے راضی ہو کر کہے مانگ کیا مانگتا ہے وہ شخص بادشاہ کے مرتبے اور اتنے بڑے عہدے کا خیال نہ کرے اور کہے صاحب مجھے ایک پیسہ یا ایک دھیلا دلا دیجئے۔ تو کیا آپ خیال کر سکتے ہیں کہ بادشاہ اس کے اس سوال سے راضی ہوگا، نہیں، بلکہ ممکن ہے کہ وہ اسے مار اور خطاب کے قابل نہ سمجھ کر دربارِ شاہی سے دھتکار دینے کا حکم دے دے۔ مگر جو شخص سمجھدار اور آدابِ دربار سے واقف ہوگا وہ بجائے اس کے کہ کسی معمولی چیز کا سوال کرے گا یا ایک دو چیزیں مانگے گا۔ اور عرض کرے گا کہ عالیجاہ مجھے صرف آپکی نظرِ عنایت اور توجہ کی ضرورت ہے۔ آپ کی مہربانی اور نوازش کے ہوتے ہوئے مجھے کسی چیز کی کمی نہیں ہو سکتی۔ تو کیا پھر آپ خیال

کر سکتے ہیں۔ کہ بادشاہ اسے خالی ہاتھ دربار سے واپس کردے گا۔ نہیں بلکہ اس کے الفاظ سے بادشاہ اس کی احتیاج اور ضرورت کو سمجھ جائے گا۔ کہ اسے کسی ایک چیز کی ضرورت نہیں بلکہ زندگی کے ہر شعبے اور تعلق میں وہ میری توجہ کا محتاج ہے مگر اس نے اپنی احتیاج کو ایسے الفاظ میں بیان کیا کہ جس کی وجہ سے نہ تو بادشاہ کے مرتبے میں فرق آیا۔ اور نہ ہی طرز سوال میں آداب شاہانہ کی کچھ کمی رہی۔

اسی طرح جب دربارِ ربی سے مانگنے کا حکم ہوا۔ تو بندہ نے عرض کی ’’ایاك نستعین‘‘

یعنی اے باری تعالیٰ ہم آپ کی مدد چاہتے ہیں۔ اور ہماری التجا ہے کہ آپ کی مدد ہمیشہ شاملِ حال رہے اور بس۔ صرف اس لفظِ استعانت میں عابد نے دنیا و آخرت کی سب چیزیں بھی مانگ لیں۔ اور نزاکتِ موقعہ اور مالک کے بلند مرتبہ کو بھی پورا پورا ملحوظ رکھا۔ کیونکہ جب اللہ جل شانہٗ کی مدد انسان کے شاملِ حال ہوگئی تو گویا اس کی دین و دنیا سب سنور گئی۔ اور اس کی مثال تو ایسے ہوئی جیسے ابو نواس کا ایک قصہ مشہور ہے۔

ابو نواس کا ہارون الرشید سے ایک عجیب طرز کا سوال:

ابو نواس ہارون الرشید کے دربار کا ایک نہایت مشہور شاعر اور ظریف الطبع بذلہ گو تھا۔ ایک دفعہ اُس نے ہارون الرشید کی شان میں قصیدہ پڑھا۔ امیر المؤمنین بہت خوش ہوئے اور فرمایا۔ مانگ کیا مانگتا ہے۔ ابو نواس نے عرض کی! خلیفۃ المسلمین مجھے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ ہاں اگر آپ ایک شکاری کتے دلائے جانے کا ارشاد فرمائیں تو آپ کی بڑی ذرہ نوازی ہوگی۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اسے ایک اعلیٰ قسم کا شکاری کتا دیا جائے۔ اس نے پھر ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ عالیجاہ! شکاری کتا تو مل گیا۔ مگر اس کے ساتھ شکار میں دوڑنے کے لئے مجھے ایک عربی گھوڑا کی بھی ضرورت ہوگی۔ کیونکہ اس کے بغیر شکار کیسے ممکن ہوگا۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ اچھا اسے ایک عربی گھوڑا بھی دیا جائے۔ جب یہ حکم ہو چکا تو اس نے پھر عرض کی کہ حضور گھوڑے کے لئے ایک اعلیٰ زین اور لگام کی بھی ضرورت ہوگی۔ اور وہ لگام اور زین ایسی ہو جو ایک شاہی تحفہ کے ساتھ مناسب معلوم ہو سکے۔ حکم ہوا اچھا اسے ایک سنہری کام کی زین اور لگام بھی دی جائے۔ اس نے پھر عرض کی کہ حضور یہ تو سب کچھ ہو گیا۔ مگر کتے اور گھوڑے کی دیکھ بھال کے لئے ایک دو نوکروں کی بھی ضرورت تو پڑیگی۔ حکم ہوا کہ وہ بھی اسے دے دیے جائیں۔ اور ان کی تنخواہ شاہی خزانہ سے دی جایا

کرے۔ پھر ابونواس نے عرض کی کہ جہاں پناہ یہ تو ٹھیک مگر ان کے کھانا پکانے اور کتے اور گھوڑے کے راتب کا خیال رکھنے کے لئے ایک آدھ لونڈی کی بھی ضرورت تو پڑیگی۔ حکم ہوا ایک خوبصورت سی سلیقہ مند لونڈی بھی دی جائے۔

چنانچہ جب وہ بھی مل گئی تو عرض کی حضور یہ تو آپ نے میرے حوالے ایک پورا کنبہ کر دیا ہے اب ان کے رہنے کے لئے مکان کی بھی ضرورت ہوگی یا نہ کیونکہ ان کو میں کہاں رکھونگا کس جگہ۔ ایک مکان کتے اور گھوڑے کے لئے اور ایک ہم لوگوں کے رہنے کے لئے عنایت فرمایا جائے۔ اور پھر اس کا بھی آپ خیال رکھیں کہ وہ مکان مجھ جیسے خادمِ دربار کے لائق ہو کہ جس سے بادشاہ کے نام پر کسی قسم کا حرف نہ آئے۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ ایک اعلیٰ قسم کا مکان جو اچھا کشادہ اور تمام ضروریات سے آراستہ ہو اسے دے دیا جائے۔ جب اس کا بھی انتظام ہو گیا۔ تو پھر عرض کی حضور اس کنبے کے رہنے کا انتظام تو آپ نے فرما دیا مگر یہ کھائیں گے کیا۔ اگر سرکاری خزانہ سے ان کے معاش کا انتظام ہو جائے، نہیں تو میں ایک غریب آدمی ان سب کا خرچہ کہاں سے برداشت کروں گا۔ ہارون الرشید نے حکم دیا کہ اچھا اسے ایک مستقل جاگیر دی جائے کہ جس پر اس کا اور اس کے سب متعلقین کا نہایت عزت کے ساتھ گزارہ ہو سکے۔ اس کے بعد ابونواس نے اس جاگیر کے لئے محاسب مانگا۔ اور اس سلسلہ کو بہت دور تک لے گیا۔

تو خیال کرو۔ ابونواس نے صرف ایک شکاری کتا مانگا تھا مگر چونکہ وہ کتا بادشاہ کی طرف سے تھا اس لئے اس کتے کا سب انتظام بھی شاہی خزانہ سے ہی ہوا۔ اور ابونواس نے ضروریات کا اس طرح کا سلسلہ نکالا کہ اس کی تمام زندگی سدھر گئی۔ تو اسی طرح جب بندہ صرف اتنا کہہ دیتا ہے کہ اے اللہ تعالیٰ مجھے اور کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ صرف آپ کی مدد کی ضرورت ہے تو گویا مصلی نے دنیا اور آخرت کی تمام ضرورتوں کے بٹن کو دبا دیا۔ جس طرح ایک بٹن کے دبانے سے الیکٹرک کے ہزاروں بلب روشن ہو کر مکان کو بقعۂ نور بنا دیتے ہیں۔ اسی طرح استعانت کے بٹن کو دبانے سے انسان کی دنیا و آخرت کی ضرورتوں کا گھر تکمیلِ مقاصد اور انجاحِ مطالب کے نور سے سراپا منور ہو گیا۔

استعانتِ عابد میں ایک لطیف لُطف:

پھر اس میں ایک لطیف لُطف اور ہے کہ عابد استعانت اور مدد جو چاہتا ہے۔ وہ اس لئے نہیں کہ میں تجارت میں کامیاب ہوں یا مجھے ملازمت مل جائے وہ اس لئے مدد کی خواستگاری نہیں کرتا کہ مجھے بیٹا دے یا مال۔ وہ مدد بھی چاہتا ہے۔ تو عبادتِ خداوندی کیلئے۔ وہ پہلے کہتا ہے ’’اِیَّاكَ نَعْبُدُ ‘‘ یعنی ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ پھر عرض کرتا ہے ’’اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ ‘‘ یعنی اے معبود تیری اس عبادت کے اتمام اور پورا کرنے میں ہمیں تیری ہی مدد کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کی مدد اس معاملہ میں شامل نہ ہوئی تو ہم کبھی بھی آپ کی عبادت کو پورا نہ کرسکیں گے۔ کیونکہ شیطان مردود کے لشکر عُجب، رِیا، سمعہ کے گولوں اور وساوس وخطرات کے ہتھیاروں سے مسلح ہو کر ہم پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ جن کا مقابلہ ہم جیسے عاجز انسان سے قطعاً محال ہے۔ کیونکہ اگر وہ محسوس ہوسکتے تو شاید ہم بھی کسی حد تک ان کے حملوں سے بچنے کی کوشش کرتے مگر وہ تو!

’’اِنَّهٗ یَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِیْلُهٗ مِنْ حَیْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ط ‘‘۔ (اعراف: ۲۷)

ابلیس اور اس کا کنبہ تمہیں اس طرح سے دیکھتا ہے کہ تم اسے ہرگز نہیں دیکھ سکتے۔

کی شان کا لشکر ہے اس واسطے ان کا مقابلہ سوائے آپ کی مددِ خاص کے بالکل مشکل ہے۔ اس واسطے آپ ہمارے حالِ زار پر نوازش فرما کر اپنی مددِ عالیہ سے موید فرمائیں۔

اگر عابد کسی اور کام کے لئے مدد کا طالب ہوتا تو ممکن تھا کہ اس کا سوال کسی مصلحت یا راز کی وجہ سے مسترد کردیا جاتا۔ مگر جب وہ عبادت کے لئے مدد مانگتا ہے اور پھر عبادت بھی رب العزت کی۔ تو ایسی صورت میں مدد کا دیا جانا یقینی اور حتمی ہے۔ اور جب عابد نے استعانتِ خداوندی کا یہ مؤثر اور اعلیٰ طریقہ نکال کر عبادت کو بتوفیقِ الٰہی پورا کیا۔ تو اس کا نتیجہ کیا نکلا؟ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ انسان اللہ جل شانہٗ کے عابد، شاکر اور صالح بندوں میں لکھا گیا۔ اور رضی اللہ عنہ و رضوعنہ کے رجسٹر میں اس کا نام عاملینِ قضا کو درج کرنے کا ارشاد ہوگیا۔ اور جب رضونِ الٰہی حاصل ہوگئی تو پھر اب باقی ہی کیا رہا۔

قرآن پاک خود شہادت دیتا ہے!

’’وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا وَمَسٰكِنَ

طَيِّبَةً فِيْ جَنَّاتِ عَدْنٍ ط۔ (التوبۃ: ۷۲)

یعنی اللہ نے مومنین اور مومنات سے ایسے باغات کا وعدہ فرمایا ہے کہ جس میں نہریں جاری ہوں گی۔ اور پھر جنتی اس میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے نہایت عالی شان اور پاکیزہ مکانوں میں رہیں گے۔

مگر پھر آگے فرمایا!

”وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللهِ اَكْبَرُ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۔ (التوبۃ: ۷۲)

اوران تمام اخروی نعمتوں باغات و جنات، حور و قصور، غلمان و ولدان سے اللہ جل شانہ کی رضامندی بہت بڑی ہے۔

اور یہی مقصودِ عظیم اور مطلوبِ فخیم ہے۔ تو جب اخروی نعمتیں رضوانِ الٰہی کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتیں تو اس خسیس و رزیل دنیا کی اس کے سامنے کیا قدر و قیمت ہوگی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں!

”لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا سَقٰى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةَ مَاءٍ۔

(سنن الترمذی: ج ۲، رقم: ۲۳۲۰، دار الغرب الاسلامی بیروت)

یعنی اگر دنیا اللہ تعالیٰ کے نزدیک مچھر کے پر جیسی بھی قدر و قیمت رکھتی تو کافر کو اس سے ایک گھونٹ پانی کا بھی نصیب نہ ہوتا۔

رضوانِ الٰہی سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں اور اس پر بابا فرید علیہ الرحمۃ کا ایک مقولہ:

تو معلوم ہوا کہ رضوانِ الٰہی سے بڑھ کر نہ دنیا میں کوئی نعمت ہو سکتی ہے اور نہ آخرت میں یہ نعمت سب سے اعلیٰ و افضل ہے ؎

سوا تیری رضا کے کچھ نہیں درکار یا رحمٰن
مجھے دے روضۂ رضواں کہ ہے وہ موضعِ رضوان

تو اب عابد نے اپنی عبادت کو بتوفیقِ انیق کامل کر کے رضوانِ الٰہی کو حاصل کر لیا تو اب دین و دنیا

کی کونسی چیز ہے جو رضائے مولیٰ کے حاصل ہو جانے کے بعد اس عابد کو راضی کرنے سے انکار کر سکتی ہے ۔

تم مہربان ہو تو زمانہ ہے مہربان
بدلے جو تم تو سارا زمانہ بدل گیا

جیسے بابا فرید الدین شکر گنج رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ ایک وہ زمانہ تھا کہ خدا کی باتوں کو پورا کرتے تھے۔ اور آج وہ زمانہ ہے کہ وہ ہماری باتوں کو پورا کرتا ہے۔ کیونکہ جب مرتبہ رضوان حاصل ہو گیا تو گویا عاشق معشوق بن گیا اور ”عشق اوّل در دِل معشوق پیدا شود“ کا مقولہ صادق آ گیا۔ تو اب جب عاشق معشوق بن گیا۔ تو پھر محبوب کی بات کو کیسے رد کیا جا سکتا ہے۔ عاشق اس کی دلداری و دلجوئی میں حتی الامکان کوشش کرتا ہے۔ شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

کہ میں ایک دفعہ کہیں سفر پر جا رہا تھا کہ رستے میں ایک شخص کو چیتے پر سوار دیکھا میں اس کی دلیری سے متعجب ہوا اور ڈر کر ایک طرف ہو گیا۔ جب وہ شخص میرے قریب آیا تو میرے خوف و تعجب کو دیکھ کر فرمایا۔ کہ اے سعدی یہ کوئی بڑی بات نہیں تجھے بھی میں اس کا طریقہ بتاتا ہوں۔ چیتا تو چیتا دنیا کی ساری چھوٹی بڑی چیزیں تیرے زیرِ فرمان ہو جائینگی۔ اور اس نے وہ طریقہ ان الفاظ میں بتایا۔

تو ہم گردن از حکم داور مپیچ
که گردن نه پیچد از حکمِ تو ہیچ

اے سعدی تو اللہ کے حکم سے گردن نہ مروڑ اس کے ہر ایک حکم اور فرمان کو پوری طرح بجا لا۔ پھر دیکھ تیرے حکم سے دنیا کی کوئی چیز منہ نہ موڑ سکے گی۔ تو اس کو راضی کر تو راضی کیا جائے گا۔ تو اس کے حکم کی تعمیل کر تیرے حکم کی تعمیل کی جائے گی۔ اور تو اس سے محبت کر تجھے محبوبِ عالم بنا دیا جائے گا۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ!

جب انسان نیک کام کر کے محبوبِ حق بن جاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کے ذریعے تمام عالم میں منادی کرا دیتے ہیں کہ فلاں کو ہم نے اپنے دوستوں کی صف میں جگہ دے دی ہے اس واسطے آج سے اس کی محبت ہماری محبت اور اس کی عداوت ہماری عداوت سمجھی جائے گی۔

چنانچہ قرآن پاک میں آتا ہے!

”مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ۝

(البقرۃ:۹۸)

یعنی جو اللہ کا یا فرشتوں کا یا رسولوں کا یا جبریل ومیکائیل کا دشمن ہوگا۔ تو اللہ بالتحقیق ایسے کافروں کا دشمن ہے

دیکھئے یہاں پر اپنی برگزیدہ مخلوق اور فرشتوں اور رسولوں کی دشمنی کو اپنی دشمنی پر عطف فرمایا ہے۔ اور یہ واؤ بمعنی ”اَوْ“ ہے۔ تو اسی طرح اولیائے کرام کی دشمنی وبغض اللہ تعالیٰ کی دشمنی وبغض ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں۔

چوں خدا خواہد کہ پردہ کس درد　　میلش اندر طعنۂ ، پاکاں برد
ور خدا خواہد کہ پوشید عیب کس　　کم زند در عیب معیوباں نفس

یعنی جب رب العزت کسی کی عزت وحرمت، وقار اور نیک نامی کے پردے کو پھاڑنا چاہتے ہیں تو اس کی طبیعت بزرگانِ دین کی بدگوئی ونکتہ چینی کی طرف مائل کر دیتے ہیں۔ اور جب کسی کا پردہ ڈھانکنا چاہتے ہیں تو اس کی طبیعت ایسی بنا دیتے ہیں کہ وہ عیب داروں کے عیوب کے متعلق بات چیت نہیں کرتا۔

حدیث شریف میں آتا ہے!

”مَنْ عَادٰى لِيْ وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهٗ بِالْحَرْبِ“۔

(صحیح البخاری: الجز،۸، رقم: ۶۵۰۲ باب التواضع، دار طوق النجاۃ)

یعنی جو میرے دوست کی عداوت کرے گا میں اسے لڑائی کا چیلنج دیتا ہوں۔

سچ ہے۔

بس تجربہ کردیم درین دیر مکافات
با دردکشاں ہر کہ در آویخت بر آویخت

ترجمہ: مکافات کے اس گھر میں یعنی دنیا میں ہم نے بہت سے تجربے کیے ہیں۔ دردِ عشق اُٹھانے والوں کے ساتھ جو بھی اُلجھا وہ پھنس ہی گیا۔

تو گویا جب محبوب خلائق جہاں ہوا تو محبوبِ جہاں تو بن گیا۔ اسی واسطے سورۃ فاتحہ میں ایسے قیمتی اور گراں قدر موقعہ پر استعانت علی العبادۃ جس کا نتیجہ رضوانِ الٰہی ہے، مانگنے کی تلقین فرمائی گئی۔

"اِیَّاکَ" کا تکرار کیوں کیا گیا:

یہاں پھر اِیَّاكَ کا تکرار کیا۔ یعنی جب ہم تیری عبادت کرتے ہیں تو پھر مدد کس سے مانگیں۔ مدد بھی تجھ ہی سے مانگیں گے۔ کیونکہ کام تیرا کریں اور دام کے لئے دوسرے کے سامنے ہاتھ کیوں پھیلائیں۔ بلکہ جس طرح ہم نے تجھے عبادت کے لئے مخصوص کیا ہے اسی طرح طلبِ اعانت میں بھی تیری ذاتِ والاصفات کو مخصوص سمجھتے ہیں تو مدد نہ کرے تو کس کی طاقت ہے کہ وہ مدد کرے۔ اور تو مدد دے تو کون ہے جو تیرے چشمۂ رحمت کو بند کر سکے۔

"وَاِنْ یَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ ط"۔

(یونس:۱۰۷)

یعنی اگر اللہ کسی کو ضرر پہنچائے تو کوئی نہیں جو اس کے دکھ کا مداوا کر سکے۔ مگر وہی ذات پاک اور اگر کسی کو فائدہ پہنچائے تو کوئی نہیں جو اس کی رحمت کو روک سکے۔

جب انسان اللہ تعالیٰ کی عبادت کر کے اپنے آپ کو اس کی مدد پر چھوڑ دیتا ہے اور غیر اللہ سے تعلق توڑ کر اس سے رشتہ جوڑ لیتا ہے۔ تو اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں!

اے فرشتو! گواہ رہو جب میرے بندے نے دنیا کے تمام آسروں۔ سببوں اور وسیلوں کو چھوڑ کر میری مدد پر تکیہ کر لیا ہے اور ہر رنج و غم اور درد دکھ میں میرا ہی دروازہ کھٹکھٹا تا ہے۔ تو اب میں نے اس کے لئے اپنی مدد کا دروازہ کھول دیا ہے۔ یہ جب اور کسی کے دروازے کی طرف رخ نہیں کرتا تو مجھے بھی شرم آتی ہے کہ اب اسے کسی اور دروازے کا محتاج رکھوں۔ تم گواہ رہو کہ میں اس کے دین و دنیا کے کاموں کا کفیل و وکیل بن گیا۔

اور اب بندہ کا حال یہ ہے کہ ؎

کارساز ما بفکر کارِ ما

فکرِ ما در کارِ ما آزارِ ما

ترجمہ: دنیوی امور میں ہماری سوچ اکثر ہماری پریشانی کی وجہ بنتی ہے اور ان پریشانیوں کے دور کرنے میں ہمارا رب ہماری فکر میں رہتا ہے۔

یعنی ہمارا کارساز ایسی حالت میں خود بخود ہماری فکر کرتا ہے اور جب ایسے کریم ورحیم کے دروازے پر جگہ مل گئی ہے تو اب اپنے کاروبار اور وجہ معاش کے لئے متردد ہونا ایک بیہودہ فکر ہے۔ کیونکہ ؎

”خواجہ خود روش بندہ پروری داند“

یعنی شہنشاہِ بے مثال بندہ پروری کے طریقے کو سب دنیا سے بہتر جانتے ہیں۔

اب بندوں میں نام درج ہونے کے بعد بندہ پروری کا خیال انہی کیساتھ متعلق ہو چکا ہے۔

اللہ سے تعلق جوڑنا اور غیر اللہ سے تعلق توڑنا ابوابِ رحمت کھول دیتا ہے:

لیکن یہ ضروری ہے کہ زبانی ”اِیاك نستعین“ کیساتھ باطن بھی غیروں کے دروازوں سے انقطاعِ کلی کرے۔ دیکھئے جب بچہ چھوٹا ہوتا ہے اور چل پھر نہیں سکتا اور ہر بات میں ظاہری و باطنی طریق پر والدین کا محتاج ہوتا ہے پانی کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو والدین سے مانگتا ہے کھانا چاہیے تو اماں سے کہتا ہے دودھ کی ضرورت ہوتی ہے تو انہی سے مانگتا ہے غرضیکہ اپنی تمام ضروریات میں ان کا مکمل محتاج ہوتا ہے۔ تو اس کے والدین بھی بلا اس کے تقاضے اور اصرار کے اس کی تمام ضروریات کا خیال رکھتے ہیں۔ مگر جوں جوں وہ بڑا ہو کر اپنی احتیاج کو ان سے کم کرتا جاتا ہے۔ اسی تناسب سے ادھر سے بھی بے توجہی کا اظہار ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

مرغی کے بچے جب چھوٹے ہوتے ہیں اور اپنے کھانے پینے اور چلنے پھرنے میں ماں پر ہی بھروسا کرتے ہیں جب اس نے ذرا ٹُخ ٹُخ کی۔ اور فوراً اس کے پاس دوڑ کر پہنچ گئے۔ جب ذرا چیل نے جھپٹا مارا تو فوراً اس کے پروں کے نیچے چھپ گئے۔ تو ایسے وقت میں مرغی ان کو چیل سے بچانے کے لئے

اپنی جان تک پیش کر دیتی ہے۔ وہ چیل کا مقابلہ کرتی ہے۔ اور اس کے پنجوں کا زخم اپنی جان پر برداشت کرتی لیتی ہے۔ مگر بچوں کو کسی قسم کی تکلیف نہیں ہونے دیتی۔ مگر جب وہی بچے ذرا بڑے ہو جاتے ہیں اور اپنی ماں سے الگ الگ پھرتے ہیں۔ اس کے بلانے پر نہیں جاتے اور مصیبت کے وقت اس کے پروں میں نہیں چھپتے۔ تو وہ بھی اپنی محبت اور امداد کم کر دیتی ہے۔ پھر جہاں دانہ ملتا ہے وہ خود کھا جاتی ہے اور انہیں بلاتی تک نہیں۔ جب ان پر کوئی دشمن حملہ کرتا ہے۔ تو وہ اپنی جان بچاتی ہے۔ اور ان کا ذرہ بھی خیال نہیں کرتی کیوں؟ اس لئے کہ انہوں نے اس کی مدد سے استغنا برتی۔ اس لئے اس نے بھی موقعہ پر مدد دینے سے گریز کیا۔

اسی طرح جب انسان اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کی مدد پر ڈال دیتا ہے اور عرض کرتا ہے کہ اے میرے رب العزت آپ کے بغیر میرا کوئی بھی مددگار نہیں آپکی مدد اور اعانت میرے شاملِ حال نہ ہوئی تو میں دنیا میں زیاں کار رہوں گا۔ تو باری تعالیٰ اس کی التجا، الحاح **(اصرار و منت)** اور بیکسی و بے سروسامانی پر نظر کر کے ابوابِ رحمت کھول دینے کا اشارہ فرماتے ہیں۔ تو گویا اِیَّاكَ کو لا کر انسان کو سکھایا کہ جس طرح تو عبادت اللہ تعالیٰ ہی کی کرتا ہے اسی طرح مدد بھی اسی سے مانگ۔ کسی دوسرے کے دروازے پر نہ جا۔ یہاں ہی تیری بگڑی کو سنوارا جائے گا۔ تجھے خبر بھی نہ ہوگی کہ تیرے تمام مقاصد کو:

”مِنۡ حَيۡثُ لَا يَحۡتَسِبُ“۔ (الطلاق: ۳)

جہاں سے تیرا گمان بھی نہ ہوگا کے خزانہ سے پورا کر دیا جائے گا۔

لیکن میں پھر بھی عرض کر دوں کہ ”مِنۡ حَيۡثُ لَا يَحۡتَسِبُ“ کے خزانۂ عامرہ سے اسی کی نگہداشت کی جاتی ہے۔ جو اپنے ظاہر و باطن کو کسی دوسرے کی امداد کا محتاج نہیں بناتا۔ کیونکہ یہ فنڈ خاص طور پر نہتوں، بے کسوں اور بے بسوں کے لئے ہے۔ اس لئے اس کے حاصل کرنے کے لئے نہتہ، بے کس اور بے بس بن جانا لازمی ہے۔ اگر ملے یا نہ۔ رب العزت کے دروازہ کو نہ چھوڑ دیا جائے۔ ایک نہ ایک دن ابتلاؤں اور آزمائشوں کے بعد اس پر فتوحاتِ سماویہ کا دروازہ کھول دیا جائیگا۔ ایسا نہ ہو کہ ایک دن نہ ملا اور چلے دوسروں کا دروازہ کھٹکھٹانے۔

ایک بزرگ کی اِبتلا اوران کا عدمِ استقلال:

جیسے ایک بزرگ صاحب کے متعلق مشہور ہے کہ آپ ایک پہاڑ کی کھوہ میں رات دن اللہ کی عبادت کیا کرتے تھے۔ کہیں نہ کہیں سے شام کو دو روٹیاں آجاتیں۔ جنہیں یہ کھا کر اور قریب کے چشمے سے پانی پی کر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے۔ اور پھر اسی طرح عبادت میں مشغول ہو جاتے۔ ایک دفعہ اللہ کو ان کی ابتلا منظور ہوئی تو چند دن تک کہیں سے کچھ روٹی وغیرہ نہ آئی۔ انہوں نے تین چار دن تک تو انتظار کیا مگر بھوک سے بے تاب ہوئے تو صبر کی باگ ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ عصا وغیرہ لے کر قریب گاؤں کی طرف چلے تاکہ وہاں کے لوگوں سے کچھ مانگ کر پیٹ کی تکلیف دور کر سکیں۔ جب گاؤں میں پہنچے تو اتفاقاً سب سے پہلا مکان جس پر انہوں نے دستک دی کسی یہودی کا تھا یہودی کا نوکر باہر آیا اور مطلب پوچھا۔ انہوں نے کہا آج چار دن کا بھوکا ہوں تھوڑی سی روٹی کا سوال ہے۔ اگر آپ لوگوں سے ہو سکے تو مہربانی کریں۔ نوکر اندر گیا اور تین روٹیاں لا کر ان کے ہاتھ پر رکھ دیں۔ یہ انہیں زنبیل میں ڈال کر پہاڑ کی طرف چلے۔ ابھی دروازے سے تھوڑا ہی دور پہنچے تھے کہ پیچھے سے یہودی کا کتا بھونکتا ہوا آپہنچا۔

جب انہوں نے دیکھا کہ کتا بالکل قریب آگیا ہے اور ابھی کاٹ کھائیگا۔ تو آپ نے ایک روٹی کتے کے آگے ڈال دی اور خیال کیا کہ جتنی دیر میں یہ روٹی کھائے گا۔ اتنی دیر میں مَیں دور نکل جاؤں گا۔ مگر کتا غریب بھی نہ معلوم کتنے دن کا بھوکا تھا کہ ایک ہی لقمے میں ساری روٹی نگل گیا۔ اور پھر بدستور ان صاحب کے پیچھے بھونکتا ہوا دوڑا۔ انہوں نے دیکھا کہ ابھی پھر کاٹتا ہے۔ تو دوسری روٹی بھی اس کے آگے ڈال دی اور تیزی سے اپنے غار کی طرف چلے۔ مگر کتے نے اسے بھی ایک لقمہ بنا کر پھر بزرگ صاحب کا پیچھا کیا۔ آخر انہوں نے بمجبوری تیسری روٹی بھی ڈال دی۔ اور خالی ہاتھ آگے بڑھے کتا اسے بھی کھا کر پھر بزرگ صاحب کو کاٹنے دوڑا۔ اب تو آپ کو غصہ آیا۔ فرمانے لگے کم بخت! تو بڑا بے صبرا ہے۔ تیرے ہی مالک نے تین روٹیاں دی تھیں۔ وہ تو تجھے سب کی سب دے ہی چکا ہوں۔ پھر میرے پیچھے دوڑنے کا مطلب۔ کتے نے زبان حال سے جواب دیا۔ اے صاحب بے صبر میں نہیں ہوں بے صبر تو آپ ہیں۔ آپ کو صرف تین چار دن کھانا نہ ملا تو آپ نے اس مالکُ الملک کے دروازے کو چھوڑ دیا جس نے سالوں تک آپ کی

ضروریات کو بہم پہنچایا۔ اور آپ اس کی شکایت لے کر اس کے دشمن کے دروازے پر بھیک مانگنے چلے آئے مگر دیکھو میں ہفتوں بھوکا پڑا رہتا ہوں پھر بھی کسی کے دروازے پر جا کر اپنے مالک کی شکایت نہیں کرتا۔ اور نہ اس کو چھوڑ کر دوسروں سے بھیک مانگتا ہوں۔ بزرگ صاحب کے دل پر اس کتے کی بات سے سخت چوٹ لگی۔ کتے کو پیر طریقت سمجھ کر بوسے دینے لگے۔ اور زار و قطار روتے ہوئے اپنے مقام پر واپس ہوئے۔ مگر آپ کے وردِ زبان کیا تھا۔

جزاک اللہ چشمم باز کردی
مرا باجانِ جاں ہمراز کردی

ترجمہ: اللہ تیرا بھلا کرے کہ تو نے میری آنکھوں سے غفلت کی پٹی دور کر کے مجھے حقیقت سے آشنا کر دیا۔

اس مقام پر پہنچ کر مصمم ارادہ کر لیا کہ آج سے کسی غیر کا دروازہ نہ دیکھوں گا۔ خواہ مالک ابتلا میں میری جان ہی کیوں نہ لے لے۔ اس عزمِ بالجزم کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ قدیم وظیفہ پھر خزانہ غیبی سے جاری کر دیا گیا۔ اور بزرگ صاحب کتے کے نہایت ممنون و احسان مند ہوئے۔

کتا پیر طریقت ہے:

میں نے کتے کو پیر طریقت کہا ہے اور اگر سوچو گے تو کتا واقعی پیر طریقت ہے۔ اگر انسان اپنے آپ میں کتے کی عادتیں پیدا کر لے اور اسے پیرِ کامل سمجھ کر اس کے قدم بہ قدم چلے تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ تھوڑے ہی عرصے میں انسان واصلِ باللہ ہو جائے گا۔ اور سچ پوچھو تو آج کل کے انسان نما حیوان پیروں سے یہ حیوان نما انسان پیر بدرجہا بہتر ہے۔ آپ کہیں گے کہ کتے میں وہ کونسی باتیں ہیں کہ جن کے اتباع سے انسان ایک کامل انسان بن سکتا ہے اگرچہ اس کی بہت سی خصلتیں قابل تعریف اور لائقِ تقلید ہیں اور میں مختصراً آپ کو اس کی چند ایک عادتیں ایسی بتاتا ہوں کہ جن پر چل کر انسان ایک نہایت اعلیٰ روحانی ترقی کا مالک بن سکتا ہے۔

(۱) **بھوکا رہنا**۔ پالتو کتا کتنے کتنے دن تک بھوکا پڑا رہتا ہے۔ مگر کسی دوسرے دروازے کی طرف کھانا مانگنے کے لئے جانا اپنی اور اپنے مالک کی بے عزتی سمجھتا ہے۔ اسی طرح انسان اگر بھوکا ہو یا

پیٹ بھرا ہر حال میں اپنے مالک کا شاکر رہے اور اپنے اندر رضا بالقضاء (**تقدیر پر راضی ہونے**) کا مادہ پیدا کرلے اور ہر دکھ اور درد و رنج کو تحفۂ دوست سمجھ کر بطیبِ خاطر برداشت کرے تو گویا اس نے منزلِ طریقت کا آدھا رستہ طے کرلیا۔

(۲) **مقرر مکان نہ رکھنا** ۔ کتے کا کوئی خاص مکان نہیں ہوتا۔ جہاں مالک نے رکھا رہا۔ جدھر لے گیا۔ چلا گیا۔ وہ اہلِ توکل کی طرح اپنی زندگی کے دن کاٹتا رہتا ہے۔ اور مالک کی مرضی کا تابع رہنا باعث فخر سمجھتا ہے۔ اہلِ توکل کا شیوہ تو یہی ہوتا ہے کہ وہ دنیا کو چند روزہ سمجھ کر اس میں اپنی ابدی زندگی کو سنوارنے کی سوچ و بچار کرتے ہیں۔ وہ تو کہتے ہیں ؎

بنائیں کیا سمجھ کر شاخ گل پر آشیاں اپنا
چمن میں آہ کیا رہنا، جو ہو دو روز کا رہنا

حضرت آدم علیہ السلام کا قصہ سن چکے کہ آپ نے باوجود اتنی لمبی عمر کے کوئی مستقل سکونت اختیار نہ کی۔ مگر اس کے برعکس آج اپنی حالتوں کو دیکھئے بموجب حدیث پاک:

”عُمُرُ اُمَّتِیْ مِنْ سِتِّیْنَ سَنَةً اِلٰی سَبْعِیْنَ سَنَةً“۔

(سنن ترمذی: ج، ۴، رقم: ۲۳۳۱، دار الغرب اسلامی بیروت)

ہماری انتہائی عمریں ساٹھ سے ستر سال تک ہیں۔

مگر ہم ہیں کہ ایسے مضبوط مکانات بنانے کی طرف مائل ہیں کہ جو عمرِ نوح سے بھی زیادہ پائدار ہوں ذرا ذرا سی جگہ کے لئے اپنے پڑوسیوں اور خویش و اقارب سے لڑتے ہیں۔ دوسروں کا حق دبانے کے لئے جھوٹے دعوے کرتے ہیں۔ اگر ارد گرد کوئی جگہ مکان کو وسیع کرنے کے لئے نہیں ملتی تو آسمان کی طرف تو رستہ کشادہ ہے کہیں دس منزلیں اوپر جاتے ہیں تو کہیں بیس منزلیں۔ گویا دنیا میں ہم نے ابداً اور مستقلاً رہنا ہے۔ لیکن کبھی یہ بھی سوچا ہے کہ ان اونچے محلات اور سرسبز باغات کا انجام کیا ہوتا ہے۔ سنو!

اَلَا یَاسَاکِنُ الْقَصْرِ الْمُعَلّٰی سَتُدْفَنُ عَنْقَرِیْبٍ فِی التُّرَابٖ
لَهٗ مَلَكٌ یَّنَادِیْ کُلِّ یَوْم لِدُوْا لِلْمُوْتِ وَابْنُوْا لِلْخَرَاب

یعنی اے اونچے اونچے محلات کے رہنے والو! عنقریب ہی تم مٹی میں دفن کئے جاؤ گے۔ اللہ تعالیٰ کا ایک خاص فرشتہ روزانہ ندا کرتا ہے۔ کہ اے دنیا کے لوگو! تمہاری پیدائش موت کے لئے ہے۔ اور تمہاری آبادی ویرانی کے لئے۔

(۳) **رات کو نہ سونا**۔ کتا تمام رات جاگتا ہے اور مالک نے اسے جس کام کے لئے پالا ہے وہ پورے طور پر بجالاتا ہے۔ یعنی مالک کے مال، مکان اور عیال کی حفاظت میں تمام رات آنکھوں میں گزار دیتا ہے۔ انسان کو چاہیے کہ اس کی شب بیداری کی عادت سے محبت کا سبق سیکھے۔ اور مالک نے جس مطلب کے لئے پیدا کیا ہے۔ اسے پوری طرح بجالائے۔ اور وہ مطلب کیا ہے۔ خود ارشاد فرماتے ہیں! ”وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ“۔ (الذریات:۵۶)
یعنی ہم نے جنات اور انسانوں کو عبادت کے لئے پیدا کیا۔

مگر انسان کتے سے بھی گیا گزرا ہوا ہے کہ وہ تو ایک مجازی مالک کو راضی کرنے کے لئے تمام رات آنکھوں میں گزار دیتا ہے۔ مگر انسان خلیفۃ المنان شرابِ غفلت کا متوالا تمام کی تمام رات خراٹے بھر بھر کر نکال دیتا ہے اور صبح کے وقت بھی جب دربارِ ربی کا نقیب ”اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ (نماز نیند سے بہتر ہے) کی آواز لگاتا ہے تو بھی اس مدہوش کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگتی۔ اور یہ غافل انسان اس وقت اٹھتا ہے جب کہ سورج تمام دنیا کو اچھی طرح منور کر چکا ہوتا ہے۔ کسی شاعر نے کیا ہی عمدہ کہا ہے ؎

دوش مرغ سحر بہ صبح مے نالید — عقل و صبرم ببرد و طاقت و ہوش
شرط ہمت نہ باشد اے انسان — مرغ تسبیح خواں و تو مدہوش

یعنی کل صبح کے وقت مرغ کے رونے کی آواز سے میرا عقل و صبر اور طاقت و ہوش چلا گیا۔ اے انسان تو اس قدر کم ہمت ہے کہ مرغ تو تسبیحِ الٰہی میں مشغول ہو مگر تو خاموش و بے ہوش پڑا ہوا ہے۔

(۴) **مرنے کے بعد ترکہ نہ چھوڑنا**: کتا اپنے مرنے کے بعد کوئی دھن دولت یا جائداد و مکان نہیں چھوڑتا۔ بلکہ اس کا عقیدہ ہے کہ جب اللہ نے مجھے اتنا زمانہ دیا۔ کیا وہ میرے ورثا کو نہ دیگا۔ نہیں دیگا اور ضرور دے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں!

”نَحْنُ عَصَبَۃُ الْاَنْبِیَاءِ لَا نُورَثُ مَا تَرَکْنَا صَدَقَۃٌ“۔

یعنی ہم گروہِ انبیا کچھ وراثت نہیں چھوڑتے جو ہمارے بعد رہے۔

وہ صدقہ اور عامۃ المسلمین کا حق ہے۔ تو اپنے بعد ورثہ نہ چھوڑنا بلکہ ورثہ کے بھروسے کے بجائے اللہ جل شانہٗ کے بھروسے پر اپنے ورثا کو چھوڑ جانا توکل کا سب سے بڑا درجہ ہے۔ انسان دنیا میں خود تو ایک پاؤ کھاتا ہے۔ مگر کماتا ایک من ہے۔ یہ کس لئے بچوں کے لئے۔ بیوی کیلئے۔ پھر ان میں بعض ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو جائز طریقہ سے کماتے ہیں ورنہ اکثر اور بیشتر حرام وحلال میں کچھ تمیز ہی نہیں کرتے۔ جو آیا اور جیسا آیا ہڑپ کر جاتے ہیں۔ اب یہ سب مال کماتا تو یہ ہے مگر کھاتے اور عیش اڑاتے اور ہیں اس کی سزا تو اس کے نامۂ اعمال میں درج ہوتی ہے۔ مگر فائدہ اس سے وہ اٹھاتے ہیں۔ تو اگر کسی انسان میں یہ جرأت پیدا ہو جائے کہ وہ اپنے آل وعیال کو اللہ کے بھروسے پر چھوڑ کر اطمینانِ قلب کے ساتھ اس دنیا سے رخصت ہو سکے تو پھر یہ شخص انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہے۔

(۵) مالک کتنا ہی ظلم کرے اسے نہیں چھوڑتا:

مالک کتے کو مارتا ہے۔ سزا دیتا ہے اسے بھوکا اور پیاسا رکھتا ہے مگر یہ اس سے نہ تو ناراض ہوتا ہے۔ اور نہ اس کے دروازے کو چھوڑ کر دوسرے کے گھر جاتا ہے۔ اسی طرح انسان پر مالک کی طرف سے دکھ یا تکلیف آئے تو اسے بھی چاہیے کہ اسی مالک الملک کے دروازے پر پڑا رہے۔ دل خفگی اور زبان شکایت سے ملوث نہ ہو۔ بلکہ ایسی حالت میں بھی مالک کی محبت اور دوستی کا دم بھرتا رہے۔ اور یہی ایک سچے عاشق کی نشانی ہے کہ وہ معشوق کی تکالیف کو آرام جان سمجھ کر بطیبِ خاطر برداشت کرتا رہے ع

ہر چہ از دوست میرسد نیکوست

ترجمہ: دوست کی طرف سے جو کچھ بھی پہنچتا ہے وہ اچھا ہوتا ہے۔

خدا عزوجل اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے محب کو کس طرح اِبتلا کی کسوٹی پر پرکھا جاتا ہے:

اسی طرح جو شخص خدا اور رسول کی محبت اور دوستی کا دعویٰ کرتا ہے۔ تو اسے بھی فقر و فاقہ، رنج و غم اور تکلیف و مصائب کی بھٹیوں میں گلا کر پرکھا جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ! ایک شخص حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی۔ یا رسول اللہ قسم ہے ذاتِ کبریائی میں آپ کو دوست رکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا اے شخص سوچ سمجھ کر بات کر۔ پھر اس نے کہا حضور واقعی میں آپ کو دوست رکھتا ہوں اور اسی طرح اس نے تین دفعہ کہا۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا اگر تو مجھے دوست رکھتا ہے تو پھر فاقہ کے لئے تیار ہو جا۔ کیونکہ جو بھی ہمارے ساتھ دوستی کرتا ہے فقر و فاقہ اس کی طرف دوڑ کر آتا ہے۔

چنانچہ ترمذی شریف میں اس حدیث پاک کے الفاظ یہ ہیں:

قَالَ رَجُلٌ لِلنَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : يَا رَسُولَ اللهِ وَاللهِ إِنِّي لَأُحِبُّكَ. فَقَالَ لَهُ : انْظُرْ مَاذَا تَقُولُ، قَالَ : وَاللهِ إِنِّي لَأُحِبُّكَ، ثَلَاثَ مَرَّاتٍ، فَقَالَ : إِنْ كُنْتَ تُحِبُّنِي فَأَعِدَّ لِلْفَقْرِ تِجْفَافًا، فَإِنَّ الْفَقْرَ أَسْرَعُ إِلَى مَنْ يُحِبُّنِي مِنَ السَّيْلِ۔

(سنن ترمذی: جز، ۴، باب، ماجآء فی فضل الفقر، رقم: ۲۳۵۰، دار الغرب الاسلامی)

لیکن جب وہ آزمائش میں ثابت قدم رہتا ہے۔ اور ابتلاء کٹھالیوں میں اپنا رنگ نہیں چھوڑتا۔ تو آخر کار دونوں جہاں کی نعمتوں کو اس کے قدموں پر ڈال دیا جاتا ہے۔ کیا نہیں دیکھتے کہ قلم تب ہی جاگیروں اور پھانسیوں کے فرمان لکھنے کے قابل ہوتا ہے جبکہ اول اپنا سر کٹوا کر اسے سیاہی سے کالا کروا لیتا ہے۔ مہندی تب ہی حسین وجمیل انسانوں کے ہاتھوں پر لگانے کے قابل ہوتی ہے جبکہ وہ پتھر کے پاٹوں میں پس کر اپنے آپ کو چورا چورا کروا دیتی ہے۔ موتی تب ہی حسین لوگوں کے گلے کا ہار ہوتا ہے جب وہ سمندر کی تہہ میں سیپ کے پیٹ میں تنگ و تاریک جگہ پر ایک زمانہ دراز تک قید کی صعوبتیں برداشت کرتا ہے اور پھر اپنے آپ کو چھید کے لئے پیش کرتا ہے۔ سچ ہے۔

نامی کوئی بغیر مشقت نہیں ہوا　　سو بار جب عقیق کٹا تب نگیں ہوا

کسی فارسی شاعر نے چار پانچ نہایت عجیب وغریب شعر کہے ہیں۔ فرماتے ہیں ؎

تا وقتیکہ سرمہ نشدہ در تہ دو سنگ　　ہرگز نہ کسے شخص بہ دو چشم کشیدہ

تاوقتیکه شانه نشده درته ارّه   ہر گز نرسد برسر گیسوئے خمیده
تاوقتیکه خامه نشده درتهِ کارد   ہر گز سرانگشت نگارے نکشیده
تاوقتیکه سفته نشده لولوئے لالا   ہر گز سر انگشت نگارے نکشیده
تاوقتیکه سائیده نشد برگِ حنائے   ہر گز بکف پائے جمیله نرسیده

یعنی جب تک سرمہ دو پاٹوں میں نہیں پستا۔ تب تک کسی شخص کی آنکھ میں پڑنے کے قابل نہیں رہتا۔ اسی طرح کنگھی، قلم موتی، اور حنا بھی اپنی اپنی مخصوص آزمائشوں میں ثابت قدم رہنے کے بعد عزت و وقار کا درجہ دیے جاتے ہیں۔

(۶) **تھوڑی سی جگہ پر راضی ہو جاتا ہے:** مالک اسے جس قدر جگہ دے اسی پر شاکر و صابر ہو کر زندگی کو گزار دیتا ہے۔ سکڑ کر رہتا ہے۔ تنگ ہو کر گزارہ کرتا ہے۔ مگر مالک کے مکان کو چھوڑ کر دوسرے مکان پر نہیں جاتا۔ اسی طرح اگر انسان بھی اس دنیا کو مسافر خانہ سمجھے۔ اور جتنی جگہ ہو اس پر راضی ہو کر دنیا کے چند روز گزار دے۔ تو دنیا کے تقریباً ۳/۱ جھگڑے آج صفحۂ زمین سے نابود ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ آجکل کے جھگڑے اور قتل و قتال و مقابلے زیادہ تر زر، زن، زمین کے لئے ہیں۔ ایک پڑوسی دوسرے کی جگہ دبانے کی سوچتا ہے۔ جھوٹے مقدمے اور ناجائز حیلے کر کے کسی نہ کسی طرح اپنے مکان کو وسیع کرنے کی تدبیریں ڈھونڈتا ہے۔

سعدی فرماتے ہیں۔ اور کیا ہی اچھا فرماتے ہیں ؎

اے دل بکام خویش جہاں را تو دیده گیر   دروے ہزار سال چو نوح آرمیده گیر
بستان و باغ ساخته گیر اندر و بسے   ایوان و قصر سر بفلک بر کشیده گیر
گیرم تراکه مال زقاروں فزوں بود   ہر لذتے که ہست سراسر چشیده گیر
روز پسیں که ہیچ نماند بجز دریغ   صد بار پشت دست بدنداں گزیده گیر

یعنی اے دل تو سمجھ لے کہ سارے کی ساری دنیا تیری خواہش کے مطابق ہے۔ اور تو اس میں نوح علیہ السلام کی طرح ہزار سال رہنے والا ہے تو مان لے کہ تیرے پاس باغات ہیں اور ان میں اعلیٰ اعلیٰ قسم کے اونچے

محلات و مکانات ہیں۔ اور فرض کر کہ تیرے پاس قارون سے زیادہ مال ہے۔ اور دنیا کی ہر لذت بھی تو نے چکھی ہے۔ مگر آخر موت کے وقت سوائے افسوس اور ہاتھ کی پیٹھ کاٹنے کے اور کچھ حاصل نہ ہوگا۔ تو جب اس دنیا کو کل چھوڑنا ہے تو آج ہی سے ترک دنیا کی طاقت پیدا کر۔ اور ''موتو قبل ان تموتوا ''(موت سے پہلے مرجاؤ) کا مصداق بن جائے۔

بو العجب قومے کہ پیش از مردن خود مردہ اند
پیش ازاں کاید نویدے رخت آنجا بردہ اند

ترجمہ: عجیب قوم ہے کہ اپنے مرنے سے پہلے وہ مر چکے ہیں (اپنے آپ کو مٹا دیا ہے) موت کی نوید کے آنے سے پہلے وہ اپنا سامان وہاں لے جا چکے ہیں۔

(۷) **مالک کی سزا پر صبر اور توجہ پر خوشی:** جب مالک کچھ سزا دیتا ہے تو خاموشی سے صبر کر کے چلا جاتا ہے۔ مگر جونہی کہ وہ پھر بلاتا ہے۔ خوشی سے دم ہلاتا ہوا آجاتا ہے۔ اس پر مالک کی مار اور اس کے غصے کا کچھ اثر نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ اس کی محبت میں ان تمام چیزوں کو بھلا دیتا ہے۔ اسی طرح اگر کسی انسان میں یہ خصلت پیدا ہو جائے کہ مالک کی طرف سے خواہ رنج آئے یا تکلیف خواہ وہ بھوکا رہے یا ننگا۔ اس کی محبت کو دل سے نہ نکالے۔ بلکہ اہل تسلیم کے طریقہ کی طرح اس کی طرف سے آئی ہوئی تکلیف کا شکریہ ادا کرے۔ اور یہ درجہ سلوک کے آخری منازل سے ہے۔ کہ کوئی دکھ یا تکلیف، رنج یا خوشی اس کے بحرِ جذبات کو متلاطم نہ کر سکے۔

مقامِ تسلیم اور شہاب الدین سہروردی علیہ الرحمۃ کا ایک واقعہ:

لکھا ہے کہ ایک دفعہ شہاب الدین سہروردیؒ کے سامنے آپ کے ایک مرید کی بہت کچھ تعریف کی گئی۔ مرید بھی وہاں مجلسِ بابرکت میں حاضر تھا۔ آپ نے فرمایا کہ تم اس خبیث مجہول مرید کی میرے سامنے کیا تعریف کرتے ہو۔ میں اس کے حالات سے پورا پورا واقف ہوں۔ دوسرے حاضرین اور معتقدین آپ کے ان الفاظ سے سخت حیران ہوئے کہ آپ نے تو کبھی کسی دشمن کی شان میں بھی ایسے الفاظ استعمال نہیں فرمائے تھے۔ چہ جائیکہ ایک خاص الخاص مرید کے لئے اور وہ بھی اس کے حضور میں۔ سب لوگ آپ کا منہ

دیکھنے لگے۔ مگر وہ مرید جیسے پہلے دوزانوں بیٹھا ہوا تھا ویسے ہی بیٹھا رہا۔ اس کے رنگ یا رویہ میں پیر صاحب کی ترش روئی اور تلخ کلامی سے ذرا بھی فرق نہ آیا۔ تھوڑی دیر بعد آپ اُٹھے اور اس مرید کو گلے لگا لیا۔ اور فرمایا کہ میرا یہ مرید اب سلوک کی انتہائی منزل مقامِ تسلیم پر پہنچ چکا ہے۔ جہاں تعریف و تقبیح، ذلت و عزت اور مدح و ذم کے الفاظ کچھ اثر نہیں رکھتے۔

(۸) **مالک کی توجہ اور بے توجہی پر راضی:** اگر اس کی طرف توجہ کی جائے تو بھی خوش رہتا ہے۔ اور اگر بے توجہی برتی جائے تو بھی ناراضی کا اظہار نہیں کرتا۔ اور مالک کی محبت میں ذرہ برابر فرق نہیں آنے دیتا۔ بلکہ جب مالک باہر سے آتا ہے۔ تو وہ اسے بلائے یا نہ بلائے یہ اسے دیکھتے ہی دم ہلاتا ہوا اس کے پاؤں پر جا پڑتا ہے۔ اسی طرح مجذوب بھی جاذب کی طرف سے توجہ ہو یا نہ ہو۔ اسی کی محبت، استغراق، تصور اور یاد میں مست الست پڑے رہتے ہیں۔ احمد جامؒ فرماتے ہیں۔

احمد تو عاشقی بمشیخت تراچہ کار
دیوانہ باش سلسلہ شد شد۔ نشد نشد

ترجمہ: احمد تو عاشق ہے مشیخت (پیر بننے سے) تجھے کیا کام ہے۔ دیوانہ ہو جا سلسلہ ہوا تو ہو جائے گا اگر سلسلہ نہ ہوا تو نہ ہو (کوئی پروا نہیں)

غرضیکہ اور بھی کتے میں کئی ایک ایسی محمودہ صفات پائی جاتی ہیں۔ کہ جن کی اتباع سے انسان بہت کچھ فائدہ حاصل کرسکتا ہے۔ اور جن کا ذکر محض تطویلِ کلام ہے۔

کُتے کے پیر طریقت ہونے کے باوجود شریعت نے اس کے رکھنے کی ممانعت کیوں فرمائی:

لیکن ہاں اس سے ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے۔ کہ جب کتے میں اس قدر اعلیٰ صفات پائی جاتی ہیں تو پھر حضور ﷺ نے یوں کیوں فرمایا ہے کہ!

”لَا تَدْخُلُ الْمَلَائِكَةُ بَيْتًا فِيهِ كَلْبٌ“۔

(صحیح بخاری: الجز، ۴، رقم: ۳۲۲۵، کتاب بدء الوحی، دار الشعب القاھرہ)

یعنی جس گھر میں کتا ہو اس میں رحمت کے فرشتے داخل نہیں ہوتے۔

کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ چیز اچھی نہیں ورنہ رحمت کے فرشتے کیوں داخل نہ ہوتے۔

جواب: کتے میں جہاں یہ سب محمودہ صفات اور پسندیدہ عادات پائی جاتی ہیں۔ وہاں اس میں ایک ایسی بری عادت بھی پائی جاتی ہے۔ جس نے اس کی سب صفتوں پر پانی پھیر دیا ہے۔ اور اسی کی وجہ سے حضور ﷺ نے اسے گھروں میں رکھنے سے منع فرمایا ہے۔ وہ بری عادت قوم کی دشمنی ہے۔ جہاں یہ اپنی قوم کے کسی فرد کو دیکھتا ہے۔ فوراً غصے سے بھر جاتا ہے۔ اس پر بھونکتا ہے اور اسے کاٹنے کی کوشش کرتا ہے۔ کتنا ہی کھانا موجود ہو اپنے کسی دوسرے بھائی کو کھاتا ہوا نہیں دیکھ سکتا۔

بلکہ اگر اس کے پاس کچھ موجود ہو تو وہ بھی اس سے جھپٹ کر لے لینے کی کوشش کرتا ہے۔ چونکہ جلیس اور ساتھ اٹھنے بیٹھنے والے کا اثر ہوتا ہے۔

اس واسطے حضور ﷺ نے اسے گھروں میں رکھنے سے منع فرمایا ہے کہ کہیں مسلمانوں میں بھی اپنی قوم کی دشمنی اور اپنے کلمہ گو بھائیوں کی عداوت نہ اثر کر جائے۔ ہاں حضور ﷺ نے ضرورت کے لئے کتا رکھنے کی اجازت دے دی ہے۔

چنانچہ ترمذی میں آتا ہے!

”وَمَا مِنْ اَهْلِ بَيْتٍ يَرْتَبِطُوْنَ كَلْبًا اِلَّا نَقَصَ مِنْ عَمَلِهِمْ كُلَّ يَوْمٍ قِيْرَاطٌ. اِلَّا كَلْبَ صَيْدٍ، اَوْ كَلْبَ حَرْثٍ، اَوْ كَلْبَ غَنَمٍ“۔

(جامع ترمذی: الجزء، ۳، رقم: ۱۴۸۹، دار الغرب الاسلامی بیروت)

یعنی جو لوگ سوائے شکاری کتے۔ چوکیداری کے کتے، اور مویشیوں کی دیکھ بھال کے کتے کے اور کسی قسم کے کتے پالتے ہیں تو روزانہ ان کے اعمال سے ایک قیراط ثواب کم ہوتا رہتا ہے۔

تو معلوم ہوا کہ شکار کے لئے، یا کھیت اور مکان وغیرہ کی چوکیداری کے لئے یا مویشیوں کی حفاظت کے لئے کتے کو پالنا جائز ہے۔ صرف بیہودہ کتوں کا باندھنا اور پالنا ہی ناجائز ہے۔ اور ملائکہ کا عدم دخول انہیں کتوں کے ساتھ مختص ہے جو بلا ضرورت رکھے جاتے ہیں۔

کُتے والے گھر میں اگر فرشتے داخل نہیں ہوتے تو اس مکان کے لوگوں کی روح کون قبض کرتا ہوگا:

اس پر بعض لوگ کہا کرتے ہیں کہ اگر کتے والے گھر میں فرشتے داخل نہیں ہوتے تو اس مکان کے رہنے والوں کی روح کون قبض کرتا ہوگا۔

جواب: حدیث میں ملائکہ پر الف لام تعریف داخل ہے۔ جس سے مراد صرف ملائکہ رحمت ہیں۔ یعنی ملائکہ رحمت اس گھر میں داخل نہیں ہوتے۔ ہاں ملائکہ غضب آتے جاتے ہیں۔ اور وہی روح بھی قبض کریں گے۔ یا یوں سمجھ لو کہ جو فرشتے کتے کی روح کو قبض کرنے پر متعین ہیں وہی کتے والے گھر کے رہنے والوں کی روح بھی قبض کریں گے۔ اس لئے اس فکر کی ضرورت نہیں اور پھر وہ یہ بھی تو دیکھ ہی چکے ہیں کہ لاکھوں کتے رکھنے والوں کی روح قبض ہو چکی ہے۔ اس واسطے جیسا ان کا ہوا ہے ان کا بھی کر لیا جائے گا۔

دیکھئے بات کیا تھی اور ہم کہاں چلے گئے۔ اب پھر اصل مطلب کو شروع کیا جاتا ہے یعنی بیان یہ ہو رہا تھا کہ خزانہ الٰہیہ سے مدد کا وہی مستحق ہوتا ہے جو اپنے آپ کو ظاہراً اور باطناً اللہ تعالیٰ کی مدد پر چھوڑ دیتا ہے۔ اور مالک کی مرضی کے ماتحت اس کا یہ حال ہو جاتا ہے کہ گویا وہ لوگوں کے ہاتھ میں میت ہے یا دھوبی کے ہاتھ میں کپڑا۔ کہ اول الذکر کو جدھر چاہتے ہیں لیجاتے ہیں اور موخر الذکر کو جس طرح وہ چاہتا ہے پتھر پر مارتا ہے۔ نہ پہلے کی چون و چرا نہ پچھلے کا انکار۔

عبادت کو استعانت پر مقدم کرنے میں اسرارِ لطیفہ:

اعتراض: کیا وجہ ہے کہ عبادت کو استعانت سے پہلے لایا گیا۔ حالانکہ استعانت یا مدد تو عبادت کے لئے مانگتا ہے۔ اس لئے اسے چاہیے تھا کہ عبادت سے پہلے مدد مانگتا۔ اور پھر استعانت کے بعد عبادت میں مشغول ہوتا۔

جواب: عبادت کو استعانت سے پہلے لانے میں اللہ تعالیٰ نے نہایت لطیف اسرار کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ جن کے جاننے کے بعد انسان کو یقین ہو جاتا کہ قرآنی کوزے میں معانی کا بحرِ ذخار بند کیا گیا ہے۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ قرآنِ پاک مشک ہے جسے لوحِ محفوظ کے نافہ سے اہلِ زمین کے لئے بھیجا گیا

ہے اور جسے عقل و ذہن کے پتھر پر جتنا بھی رگڑا جائے اتنی سی ہی اس کی روح افزا خوشبو میں تیزی آتی جاتی ہے۔ سچ ہے۔ هو المسك ما کررته يتضوع۔

اب میں ان اسرارِ لطیفہ سے چند ایک مختصراً بیان کرتا ہوں جس سے آپ پر میرے دعویٰ کی حقیقت بخوبی روشن ہو جائے گی۔

ا۔ اس سورۃ کا نام حضور ﷺ نے سورۃ المسئلہ بھی فرمایا ہے۔ یعنی اس میں انسان کو اللہ تعالیٰ نے اپنے منتخب الفاظ میں سوال کرنے کا طریقہ بتایا ہے کہ اے انسان تو ان الفاظ میں اپنی عرضی کو میرے دربار میں پیش کر۔ دنیا میں قاعدہ ہے کہ جب کسی حاکم یا نواب کو کوئی عرضی لکھی جاتی ہے تو سب سے پہلے عرضی کنندہ مکتوب الیہ کے پورے القاب و خطاب درج کرتا ہے القاب کے بعد دوسرے درجے پر کاتب اپنا مکتوب الیہ سے تعلق بیان کرتا ہے۔ اظہارِ تعلق کے بعد کاتب اپنا سوال پیش کرتا ہے۔ اور عرضِ مطلب کے بعد مؤدبانہ الفاظ میں عرضی کو ختم کر دیتا ہے۔ اسی طرح سورۃ المسئلہ بھی اس احکم الحاکمین کے دربار میں انسان کی طرف سے ایک عرضی کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس واسطے سب سے پہلے الحمد للہ سے مالك يوم الدين تک اس مالک الملک کے القاب و خطابات بیان کیے گئے۔ اس کے بعد اياك نعبد میں انسان اس رفیع الشان مالک کے ساتھ اپنا تعلق بیان کرتا ہے تا کہ استحقاقِ سوال پیدا ہو سکے۔ عرض کرتا ہے کہ اے اللہ ہمارا آپ سے تعلق یہ ہے کہ آپ ہمارے معبود اور آقا ہیں۔ ہم آپ کے عابد اور غلام ہیں اس واسطے ہم بحیثیت عابد ہونے کے آپ سے اياك نستعين سے ولاالضالين تک سب چیزیں مانگتے ہیں کیونکہ کسی دوسرے کا دروازہ اس قابل نہیں کہ اس دربار کو چھوڑ کر اسے کھٹکھٹائیں۔

حدیث شریف میں آیا ہے کہ اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے!

”قَسَمْتُ الصَّلَاةَ بَيْنِيْ وَبَيْنَ عَبْدِيْ نِصْفَيْنِ فَنِصْفُهَا لِيْ وَنِصْفُهَا لِعَبْدِيْ وَلِعَبْدِيْ مَا سَأَلَ“

(سنن ابی داؤد: جلد ا، رقم: ۸۲۱، من ترک القرآۃ فی صلاتہ، دار الکتاب العربی بیروت)

(ترمذی: جزء ۵، رقم: ۲۹۵۳، باب ومن سورۃ فاتحۃ الکتاب، دار الغرب الاسلامی بیروت)

یعنی میں نے نماز کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک حصہ میرا ہے۔ (الحمد للہ سے لے کر اِيَّاكَ نَعْبُدُ)

اور ایک حصہ میرے بندے کا ہے (ایاك نستعین سے ولا الضالین) اور میں بندے کو اس کی مانگی ہوئی چیز دیتا ہوں۔

اب ایاک نستعین سے ولاالضالین تک بندہ اپنی ضروریات ومعروضات پیش کر چکتا ہے تو آمین کے مؤدبانہ الفاظ پر اپنی عرضی ختم کر دیتا ہے۔ تو مطلب یہ نکلا کہ سورۃ فاتحہ سورۃ المسئلہ ہے۔ القابِ ضروریہ کے بعد انسان کو رب العزت سے اپنا تعلق بیان کر کے اپنے مطالبہ کو پیش کرنا ضروری سمجھتا ہے۔ چونکہ اِیَّاكَ نَعْبُدُ تعلق ہے مابین عبد ومعبود کے اور اِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ چیز ہے مطالبہ کی۔ اس واسطے مطالبہ سے اظہار تعلق مقدم کیا گیا۔

(۲) ایاک نعبد“ کو ”ایاک نستعین“ سے مقدم کرنے میں ایک راز یہ بھی ہے کہ انسان جب کسی بادشاہ کے دربار میں حاضر ہو کر کچھ سوال کرنا چاہتا ہے۔ تو مؤثر اور بہترین طریقہ سوال کرنے کا یہ ہوتا ہے کہ سب سے پہلے دربار میں جا کر آداب شاہانہ بجالائے اس کے بعد بادشاہ کی کوئی پسندیدہ چیز بطور تحفہ پیش کرے اور ہاتھ باندھ کر کھڑا رہے۔ بادشاہ اس کی تعظیم اور تحفہ گذاری سے خوش ہو کر خود بخود اسے کچھ مانگنے کا حکم کرے گا۔ اس وقت وہ اپنے معروضات کو نہایت مؤدبانہ اور مہذبانہ طریق پر پیش کر سکتا ہے۔ اور جس کا قبول کیا جانا قریباً قریباً یقینی ہوتا ہے۔ اسی طرح جب بندہ دربار رب العزت میں پیش ہوا۔ حمد وثنا کا ادب بجالانے کے بعد دربار خداوندی میں پیش کیا۔ اور ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ اے اللہ۔ آپ کے سوا دنیا کی اور مخلوق اس عبادت کے جلیل القدر تحفے کے قابل نہیں۔ اس واسطے اسے آپ کے دربار عالی میں حاضر کیا ان الفاظ نے رحمت خداوندی کے سمندر میں طوفان پیدا کر دیا۔ حکم ہوا مانگ کیا مانگتا ہے۔ بندے نے نہایت ادنیٰ غلام کی طرح ہاتھ باندھے ہوئے عرضی کی کہ اے معبود آپ کی مدد کی ضرورت ہے اسی طرح بتدریج معروضات کا سلسلہ ولاالضالین تک پہنچا دیا۔ تو معلوم ہوا کہ استعانت کے سوال سے پہلے عبادت کا تحفہ پیش کرنا، آداب شاہی کے لائق اور مناسب تھا اس واسطے پہلے اسے بیان کر کے پھر سوال استعانت کو لایا گیا۔

(۳) یہ استعانت مطلق عبادت کے لئے نہیں۔ بلکہ اتمام عبادات کے لئے ہے۔ یعنی عابد یوں کہتا ہے کہ اے معبود میں نے تیری عبادت تیرے حکم کے مطابق شروع تو کر دی۔ مگر چونکہ اس کا پورا

کرنا اور اس کو انجام تک پہنچانا میری طاقت سے باہر ہے۔ کیونکہ قدم قدم پر شیطانِ رجیم خشوع وخضوع کو بگاڑ کر خطرات اور وسوسے پیدا کر رہا ہے۔ اس لئے آپ اپنی مدد کو میرے شاملِ حال فرما دیجئے۔ تا کہ میں آپ کی عبادت کو کماحقہٗ پورا کرسکوں تو گویا یہ استعانت اس لحاظ سے عبادت کے شروع کرنے کے لئے نہیں بلکہ اس کے ختم کرنے کے لئے ہے۔ اور چونکہ اختتام ابتداء کے بعد ہوتا ہے۔ اس لئے استعانت کو بھی عبادت کے بعد لایا گیا۔

(۴) ایّاکَ نعبد میں جب انسان نے دعویٰ کیا کہ اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں تو اس دعویٰ کی وجہ سے تین طرح پر نفس میں غرور آجانے کا احتمال تھا۔ ایک تو اس طرح کہ جب نفس نے یہ دعویٰ کیا کہ اے اللہ ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں تو گویا اس نے اپنے آپ کو وجود باری کے سامنے ہم کہہ کر موجود ثابت کیا۔ اور وجود باری کے سامنے اپنے وجود کا اقرار، انانیت اور خودی کا نتیجہ ہے۔ تو گویا نفس اس جگہ خدا بینی کے دعویٰ کے ضمن میں خود بینی کا دعویٰ بھی کر رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ عبادت کی نسبت اپنی طرف کر کے یہ بات بھی ظاہر کر رہا ہے۔ کہ گویا عبادت جیسے اہم اور ضروری فرض کو میں بالاستقلال اور بلا مددِ ربّی پورا کر رہا ہوں۔ اور یہ بھی اپنی جگہ پر تکبر کا کھلا مظاہرہ ہے۔ اور تیسری اور آخری وجہ یہ ہے کہ جب ایسے رفیعُ الشان آقا سے اپنی غلامی کا سلسلہ اور ایسے منیعُ المرتبت معبود سے اپنی عبدیت کا رشتہ جوڑا تو جیسے ایک دنیوی بادشاہ کا ادنیٰ سے ادنیٰ چاکر (نوکر) بھی شاہی انتساب کیوجہ سے حد درجے کا مغرور اور متکبر ہو جاتا ہے۔ اس طرح مالکُ الملک کے ساتھ رشتۂ عبدیت کی وجہ سے انسان کے مغرور ہو جانے کا احتمال تھا۔ جیسا کہ کسی نے کہا۔

ما اگر قلاش و گر دیوانہ ایم
مست آں ساقی و آں پیمانہ ایم

ترجمہ: ہماری دنیا سے بے رغبتی اور دیوانگی کی وجہ صرف اور صرف وہ شخصیت ہے جس نے ہمیں شرابِ محبت اپنی نظروں سے پلا کر ہمیں مست اور دیوانہ بنا دیا ہے۔

اس لئے ایّاکَ نعبد کے بعد ایّاکَ نستعین لا کر تمام وجوہِ تکبر کو توڑ دیا گیا۔ کیونکہ اس میں نفس نے

کھلم کھلا اقرار کرلیا کہ اے معبود، نہ میری عبادت بالاستقلال ہے اور نہ میرا وجود قابلِ ذکر بلکہ جو کچھ ہے وہ آپ کی مدد کے طفیل سے ہے۔ اگر آپ ہاتھ نہ پکڑتے۔ تو نہ میرا وجود ہوتا۔ اور نہ میری عبادت کا نام ونشان۔ اور میرا آپ جیسے شہنشاہِ والاجاہ سے انتساب محض آپ کے فضل وکرم اور رحمت ورافت کا نتیجہ ہے۔ ورنہ کہاں تو عظیم الشان اور کہاں میں ضعیف البنیان۔

تو گویا دعویٰ عبادت کے فخر کو توڑنے کے لئے استعانت کو اس کے بعد لایا گیا تاکہ نشۂ غرور کے لئے ترشی کا کام دے۔ اور بالاستقلال عبادت کا فخر ایّاک نستعین کے احتیاج سے ٹوٹ جائے۔

اور ذرا غور سے کام لیں تو آپ اس نتیجہ پر پہنچ جائیں گے کہ ایاک نستعین کے الفاظ ایاک نعبد سے پیدا شدہ فخر کو توڑتے نہیں بلکہ اس فخر میں اصلی کمال اور حقیقی جمال پیدا کر رہے ہیں۔ کیونکہ حقیقت میں فخر وہی ہے جس میں ذات خداوندی کے دروازہ کا فقر بھی شامل ہو۔ جب انسان دنیا سے بے نیاز ہو کر دنیا کے پیدا کرنے والے کا محتاج ہو جاتا ہے۔ تو پھر اس کی حالت شاہِ بے کلاہ اور حاکمِ بے سپاہ کی سی ہو جاتی ہے۔ وہ بلا تاج وتخت بادشاہی کرتا ہے۔ اور فوج ولشکر کے بغیر ہی تمام کائنات پر حکم چلاتا ہے۔

مبیں حقیر گدایان عشق راکیں قوم
شہان بے کمر و خسروانِ بے کلہ اند

ترجمہ: عشق میں مست گداگروں کو حقیر نہ سمجھو حقیقت میں یہ وہ بادشاہ ہیں جن کو کمر میں سنہری پٹہ اور سر پر رکھنے والی سنہری پگڑی کی ضرورت نہیں ہوتی۔

ابراہیم بن ادھم علیہ رحمۃ اللہ کا ایک واقعہ:

ابراہیم بن ادھمؒ کا قصہ تو آپ نے سنا ہوگا۔ آپ خراسان کے ایک جلیل القدر حاکم تھے۔ اللہ کی محبت میں جب دنیا کے کاموں کو خلل انداز دیکھا تو محبت الٰہی پر محبت شاہی کو قربان کر کے ایک دریا کے کنارے رہنے لگے۔ ایک دفعہ سب امیر و وزیر اور سلطنت کے اراکین خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ اے بادشاہ آپ کو کیا ہوگیا ہے کہ آپ ایک عظیم الشان اور آرام وراحت والی سلطنت کو چھوڑ کر اس کسمپرسی اور محتاجی کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آپ مہربانی فرما کر شہر کو چلیں اور حکومت کی باگ ڈور دوبارہ اپنے

ہاتھ میں لیں ۔ آپ نے فرمایا میاں جو سلطنت مجھے ملی ہے ۔ اس کے مقابل میں خراسان کی حکومت کیا حقیقت رکھتی ہے اب ایسی بڑی نایاب سلطنت کو چھوڑ کر خراسان جیسی چھوٹی اور ادنیٰ سلطنت کے لئے واپس جانا کہاں کی دانائی ہے ۔ لوگوں نے عرض کی حضرت وہ کونسی سلطنت آپ کو مل چکی ہے ۔ جس کے لئے آپ نے سب آرام و آسائش اور اہل وعیال کو چھوڑ کر جنگل کو مقام بنالیا ہے ۔ ہمیں بھی تو دکھائیں کہ آخر وہ سلطنت کیسی اور کہاں ہے ۔

آپ اس وقت اپنی گدڑی سی رہے تھے ۔ امراء کے اس کہنے پر آپ نے ہاتھ سے سوئی کو دریا میں پھینک دیا اور فرمایا کہ دریا سے ذرا یہ سوئی تو نکلوادو ۔ انہوں نے عرض کی کہ صاحب اس کا ملنا اب تو بہت مشکل ہے ۔ ایک تو نہایت باریک ۔ پھر ہلکی ۔ نہ معلوم دریا کے بہاؤ سے کہاں سے کہاں جا پہنچی ہوگی ۔ اس پر آپ نے فرمایا تو کیا تم مجھے ایسی حقیر و ناچیز اور ضعیف و کمزور سلطنت کی طرف لوٹنے کی دعوت دینے آئے ہو ۔ دیکھو میں ابھی تمہیں یہ سوئی باہر نکلوا دیتا ہوں ۔ چنانچہ آپ نے مچھلیوں کو حکم دیا کہ میری سوئی فوراً مجھے دریا سے نکال کر لادو ۔ آپ کا فرمانا تھا کہ فی الفور ایک مچھلی آپ کی سوئی کو منہ میں پکڑے ہوئے پانی کی سطح پر ظاہر ہوئی آپ نے اس کے منہ سے سوئی لیتے ہوئی فرمایا ۔ اب تم اس سلطنت کا اس سلطنت سے مقابلہ کر کے خود ہی فیصلہ کرلو کہ کونسی سلطنت بڑی ہے ۔ یہ سلطنت تو وہ ہے کہ اس میں انسان تو انسان کائنات کا ذرہ ذرہ زیرِ فرمان کر دیا جاتا ہے ۔ یہ نہیں کہ دنیوی سلطنت کی طرح اگر کسی ایک آدمی کو دربار میں بلانا پڑے تو درجنوں سپاہی بھیجنے کے باوجود حاضر ہونے میں حیل وحجت کرتا ہے ۔ اور جھوٹے بہانے کر کے وہ کسی نہ کسی بادشاہ کے پاس جانے سے بچنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اور پھر جس کا ملک فانی اور عارضی ہے ۔ یہ سلطنت تو وہ ہے کہ جس کا ملک باقی اور دوامی ہے ۔ اور جس کا حکم ظاہر سے گزر کر باطن پر بھی اثر انداز ہوتا ہے ۔

ظاہری اور باطنی بادشاہوں کے فرقِ مراتب پر ایک مثال:

لکھتے ہیں کہ عبداللہ بن مبارک رحمۃ اللہ علیہ جو مذہبِ شافعی کے ایک بہت بڑے عالم اور مقتدا تھے خراسان سے حج کے ارادہ پر مکہ شریف کو روانہ ہوئے ۔ ابھی بغداد سے دور ہی تھے کہ آپ کے آنے کی خبر تمام شہر میں بجلی کی طرح پھیل گئی بغداد کا چھوٹا بڑا امام ہمام کے استقبال کے لئے بے چین نظر آنے لگا ۔ چنانچہ

جس دن آپ بغداد کے قریب پہنچے، تو لاکھوں انسان آپ کے استقبال کے لئے شہر سے باہر آئے۔ ہارون رشید کی بیوی، بی بی زبیدہ نے محل کے اوپر سے دیکھا کہ آج تمام کی تمام مخلوقات شہر سے باہر جارہی ہے۔ ہر ایک دوسرے سے آگے ہونے کے لئے بے تاب ہے۔ لوگوں کی پگڑیاں ہجوم کی وجہ سے گر رہی ہیں۔ اور دھکے پر دھکا لگ رہا ہے۔ مگر مخلوقات ہے کہ ایک متلاطم سمندر کی طرح ہر طرف سے امڈی چلی آرہی ہے۔ آپ نے ایک نوکر کو بلا کر پوچھا کہ آج لوگوں کے اس اژدہام کا کیا سبب ہے۔ اس نے عرض کی کہ اے ملکہ عالیہ آج خراسان کا مشہور عالم عبداللہ بن مبارک بہ ارادۂ حج شہر میں آرہا ہے۔ اور یہ سب مخلوقات اس کے استقبال کے لئے جمع ہوئی ہے۔ بی بی زبیدہ نے ہارون الرشید کو بلا کر کہا کہ دیکھ حقیقی بادشاہی تو ان لوگوں کی ہے نہ فوج نہ سپاہ، نہ گنج نہ خزانہ۔ نہ حکومت نہ زر۔ مگر اس پر بھی لوگوں کے دلوں پر حکومت کر رہے ہیں۔ کہاں آپ کی حکومت اور کہاں یہ سلطنت۔

چہ نسبت خاک را بہ عالم پاک

ترجمہ: خاک کو عالمِ پاک سے کیا نسبت ہے

آپ یا آپ کا کوئی امیر و وزیر باہر سے آتا ہے۔ تو لوگوں کو مار مار کر اور مجبور کر کے استقبال کے لئے لیجاتے ہیں۔ اس پر بھی بعض چھپ جاتے ہیں۔ اور طرح طرح کے بہانوں سے حاضر ہونے میں کوتاہی کر جاتے ہیں مگر یہاں تو ایک جہان خود بخود کھچا ہوا جا رہا ہے۔ اگر سچ پوچھو تو حقیقی سلطنت یہی ہے۔

بے ساقی و بے شراب مستیم
بے تخت و بے کلاہ کیقبادیم

ترجمہ: ہم نے شرابِ عشق کا وہ جام پی لیا ہے کہ اب ہمیں نہ تو دنیوی شراب اور شراب پلانے والے کی ضرورت ہے اور نہ ہی تختِ شاہی اور تاجِ شاہی کی ہمارے نزدیک کوئی اہمیت ہے۔

اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ کی ایک مثال سے توضیح:

اسی واسطے تو حضور ﷺ نے فرمایا ہے!

"اَلْفَقْرُ فَخْرِیْ۔ فقر میرا فخر ہے۔

یعنی اللہ تعالیٰ کی احتیاج اور دنیا سے استغنا میر افخر ہے۔ کیونکہ اس احتیاج میں کروڑوں بے احتیاجیاں پوشیدہ ہیں۔ اسی واسطے جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو رب العزت نے فرمایا۔ کہ اے حبیب اگر آپ چاہیں تو ہم آپ کے لئے احد کے پہاڑ کو سونے کا بنا دیں تو آپ نے عرض کی!

”اَللّٰھُمَّ اَحۡیِنِیۡ مِسۡکِیۡنًا وَاَمِتۡنِیۡ مِسۡکِیۡنًا وَاحۡشُرۡنِیۡ فِیۡ زُمۡرَۃِ الۡمَسَاکِیۡنِ“

(جامع ترمذی: الجزء، ۴، رقم: ۲۳۵۲، دار الغرب الاسلامی بیروت)

یعنی اے اللہ مجھے مسکین زندہ رکھ۔ مسکین مار اور مسکین ہی اٹھا۔ کیونکہ یہ ایسی مسکینی اور فقیری ہے کہ دنیا کی لاکھوں تونگریاں اور مالداریاں اس پر قربان ہیں۔

سیدنا غوث اعظم عبد القادر جیلانی محبوب سبحانی ؒ سے سلطان سنجر نے کہلا بھیجا کہ اگر آپ قبول فرمائیں تو میں نیمروز کا علاقہ آپ کے مصارف کے لئے پیش کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے شاہی فرمان کی پشت پر یہ رباعی لکھ کر واپس کر دیا ؎

چوں چتر سنجری رخ بختم سیاہ باد　　در دل اگر بود ہوس ملکِ سنجرم
زانگہ کہ یافتم خبر از ملک نیم شب　　من ملک نیم روز بیک جو نمی خرم

یعنی خدا کرے میرا منہ شاہ سنجر کے چتر کی طرح کالا ہو جائے۔ اگر میرے دل میں ملکِ سنجر کی کچھ خواہش بھی ہو۔ اس وقت سے کہ مجھے نیم شب کے ملک کا پتہ چل گیا۔ میں نیمروز کے ملک کو ایک جو کے بدلے میں بھی لینا نہیں چاہتا۔ نیم شب سے مراد آدھی رات کے تہجد ہیں۔ کیونکہ اس وقت رحمتِ باری کا خاص نزول ہوتا ہے۔ دنیا محوِ خواب ہوتی ہے۔ اور دن کے تھکے ہارے انسان نرم گرم بستروں پر خراٹے لے رہے ہوتے ہیں۔ اس وقت صرف ایک سچا عاشق ہی اپنے نرم اور گرم بستر کو چھوڑ کر یادِ الٰہی میں مصروف ہو سکتا ہے۔ اور صرف حقیقی محبت ہی نیند جیسی پیاری اور میٹھی چیز پر غالب آ سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ خود قرآن پاک میں فرماتا ہے!

”اِنَّ نَاشِئَۃَ الَّیۡلِ ھِیَ اَشَدُّ وَطۡاً وَّ اَقۡوَمُ قِیۡلًا ؕ○۔ (المزمل: ۶)

کہ بیشک رات کا اٹھنا آرام میں مخل ہونے کے باعث نہایت شاق گزرتا ہے۔ اور بات کا بہت سیدھا اور

ٹھیک کرنیوالا ہے۔

یعنی تہجد ہجود سے ہے اور ہجود کہتے ہیں سو کر اٹھنے کو نفس کشی اور قبولِ دعا کے لئے نہایت اعلیٰ وقت ہے اس وقت انسان کا دل دنیا کی بیہودگی اس کی بے پناہ مصروفیتوں سے آسودہ ہوتا ہے۔ عالمِ سکوت خضوع وخشوع کے قائم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ اور پھر اس وقت ؎

بات جو منہ سے نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں طاقت پرواز مگر رکھتی ہے

حضور ﷺ فرماتے ہیں!

’’یَنْزِلُ اللّٰہُ تبارك وتعالیٰ اِلَی السَّمَاءِ الدُّنْیَا کُلَّ لَیْلَۃٍ حِیْنَ یَمْضِیْ ثُلُثُ اللَّیْلِ الْاَوَّلُ فَیَقُوْلُ اَنَا الْمَلِكُ اَنَا الْمَلِكُ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَدْعُوْنِیْ فَاَسْتَجِیْبَ لَہٗ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَسْاَلُنِیْ فَاُعْطِیَہٗ مَنْ ذَا الَّذِیْ یَسْتَغْفِرُنِیْ فَاَغْفِرَ لَہٗ فَلَا یَزَالُ کَذٰلِكَ حَتّٰی یُضِیْءَ الْفَجْرُ‘‘۔

(جامع ترمذی: الجزالاوّل، رقم: ۴۴۶، دارالغرب الاسلامی بیروت)

یعنی اللہ جل شانہٗ آسمان دنیا پر ہر رات کے اول تہائی گذر جانے پر نزول فرماتے ہیں اور ارشاد ہوتا ہے۔ میں بادشاہ ہوں۔ کون ہے جو مجھ سے دعا مانگے۔ تو میں اس کی دعا کو قبول کروں۔ جو مجھ سے سوال کرے تو اس کا سوال پورا کروں۔ کون ہے جو مجھ سے بخشش مانگے تو میں اسے بخشش دوں۔ اسی طرح فرماتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ صبح پھوٹ نکلتی ہے۔

خیال کرو ایک انسان تو خود بادشاہ کو ڈھونڈتا ہے کہ کہیں مل جائے تو کچھ مانگوں۔ اور ایک بادشاہ خود انسانوں کو بلاتا ہے کہ آ اور کچھ مانگ اور بادشاہ بھی کیسا کہ جس کے وعدے اور قول کی نسبت آتا ہے!

’’وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰہِ قِیْلًا ۝‘‘۔ (النساء: ۱۲۲)

کہ اللہ سے زیادہ کون سچا ہے۔

’’وَمَنْ اَوْفٰی بِعَھْدِہٖ مِنَ اللّٰہِ۔‘‘ (التوبۃ: ۱۱۱)

اور اللہ سے زیادہ وعدے کو پورا کرنیوالا کون ہے۔

مسلمانوں کی حالتِ زار اور ترقی کا غلط مفہوم:

مگر بھائیو! آج کل مشکل یہ ہے کہ اس احکم الحاکمین سے کوئی مانگنے والا نہیں آج اگر ہم پر کوئی مصیبت آتی ہے تو اس کے لئے انسانی سفارشیں حاصل کرتے ہیں۔ عرضیاں لکھتے ہیں۔ اور طرح طرح کے حیلے اور تدبیریں اس کے ازالے کے لیے کرتے ہیں۔ مگر نہیں گڑگڑاتے تو دربارِ خداوندی میں۔ نہیں مانگتے تو اس سے کہ جس کے خزانۂ کرم سے اٹھارہ ہزار عالم پرورش پا رہا ہے۔ اور جس کی شان یہ ہے ؎

اے کریمے کہ از خزانہء غیب   گبر ترسا وظیفہ خورداری
دوستاں را کجا کہ کنی محروم   تو کہ بادشمناں نظر داری

یعنی اے کریم خدا تیرے خزانۂ غیب سے تو آتش پرست اور مشرکین تک وظیفہ کھا رہے ہیں۔ تو پھر ہمیں جو تیرے نام لیوا اور تجھے واحد لایزال سمجھتے ہیں کس طرح محروم رکھ سکتا ہے۔ کیونکہ تو تو اپنے دشمنوں پر بھی نوازش وکرم فرماتا ہے۔ مگر آج کل کی حالت کا اکبر الہ آبادی نے نہایت اعلیٰ چربہ اتارا ہے۔ آپ فرماتے ہیں ؎

ترقی کی نئی راہیں جو زیر آسماں نکلیں   میاں مسجد سے نکلے اور حرم سے بیبیاں نکلیں
مصیبت میں بھی اب یاد خدا آتی نہیں ہم کو   دعا منہ سے نہ نکلی پاکٹوں سے عرضیاں نکلیں

آج ہم عزت، دولت اور حکومت غیروں سے چاہنے لگے۔ اللہ سے قطع تعلق کر کے غیر اللہ پر بھروسا کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دنیا کی ہر عزت سے آج ہمیں جدا کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے!

”وَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ وَلِرَسُوْلِهٖ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ“۔ (المنافقون:۸)

کہ عزت تو اللہ، اس کے رسول اور مومنوں کے لئے ہے۔

مگر مومن کون ہوتا ہے۔ مومن وہ ہوتا ہے جس کی زبان اور قلب دونوں اقرار وایقانِ خداوندی سے بھرے ہوئے ہوں جس کی شان۔

”اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ (انعام:۱۶۲) ہوتی ہے۔ جس کی موت اور زندگی، جس کی نماز اور قربانی، جس کی حرکت اور سکون سب کا سب، اللہ تعالیٰ ہی کے لئے مخصوص ہوتا ہے۔ خدا سے ڈرتے ہیں اور بس۔ مگر ساری مخلوق کے دل میں ان کا رعب ڈال دیا جاتا ہے۔ مومن موحد

ہوتا ہے۔ اور توحید کے متعلق کسی شاعر نے کہا ہے ۔

موحد چه بر پائے ریزی زرش　　　چه فولاد ہندی نہی برسرش
امید و ہراسش نبا شد ز کس　　　ہمیں اس بنیاد توحید و بس

یعنی خواہ موحد کے پاؤں پر مال و زر ڈال یا اس کے سر پر ہندی تلوار رکھ دے۔ اسے کسی غیر اللہ سے نہ امید نفع ہوتی ہے نہ خوف و ہراس۔ اور توحید کی حقیقت یہی ہے کہ غیر اللہ کو وجودِ باری کے سامنے کالعدم سمجھے اسے ہی معز و مذل اور اسے ہی ملجا و ماوا سمجھے اور بس۔ مگر آج ہم توحید کا دعویٰ کرتے ہوئے خدا سے نڈر اور مخلوقات سے خائف نظر آتے ہیں۔ کیا یہ ہماری ایمانی کمزوری اور ضعفِ توحید کا کھلا ثبوت نہیں۔

مسلمانو! غیر اللہ کے خوف کو دل سے نکال پھینکو۔ عزت و ذلت اسی احکم الحاکمین کے ہاتھ میں ہے۔ اس کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط کرو۔ پھر دیکھو کہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ جو اللہ جل شانہٗ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لئے وعدہ فرمایا تھا وہی وعدہ امت محمدیہ کے ساتھ کیسے پورا کیا جاتا ہے۔

بنی اسرائیل کا سا وعدہ اُمت محمدیہ کے ساتھ کیسے پورا ہو سکتا ہے:

وہ وعدہ نویں پارے میں سورۃ اعراف کے پندرھویں رکوع میں موجود ہے۔ اللہ جل شانہٗ فرماتے ہیں!

”وَ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ اَتَذَرُ مُوْسٰی وَ قَوْمَهٗ لِیُفْسِدُوْا فِی الْاَرْضِ وَیَذَرَكَ وَ اٰلِهَتَكَ ؕ قَالَ سَنُقَتِّلُ اَبْنَآءَهُمْ وَ نَسْتَحْیٖ نِسَآءَهُمْ ۚ وَاِنَّا فَوْقَهُمْ قٰهِرُوْنَ (اعراف:۱۲۷)

قومِ فرعون سردارِ فرعون سے کہنے لگے کہ کیا تو موسیٰ علیہ السلام اور اس کی قوم کو چھوڑتا ہے کہ وہ زمین میں فساد کریں۔ اور تجھے اور تیرے معبودوں کو چھوڑ دیں۔ فرعون نے جواب دیا کہ ہم ان کے بیٹوں کو قتل کریں گے۔ اور ان کی لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیں گے۔ اور ہم ان پر غالب ہیں۔

اب سنئے موسیٰ علیہ السلام ان کے غلبہ، ان کے ظلم اور ان کے دکھوں سے قوم کو بچنے کا کیا نسخہ بتاتے ہیں۔ فرماتے ہیں۔

''قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِهِ اسْتَعِیْنُوْا بِاللّٰهِ وَاصْبِرُوْا ۚ اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ ۙ قف یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ؕ وَالْعٰقِبَةُ لِلْمُتَّقِیْنَ ○ ۔(اعراف:۱۲۸)

موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا کہ تم اللہ تعالیٰ سے مدد چاہو۔ اور صبر کرو۔ زمین کا مالک اللہ ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے وارث بنا دیتا ہے اور انجام یعنی فتح تو متقی لوگوں کے لئے ہے۔

چنانچہ جب بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کی بات کو مانا اور اللہ جل شانہ کی امداد پر بھروسہ کرنے کے ساتھ ساتھ متقی بنے تو فرعون اور اس کے لشکر کو باوجود مسلمہ طاقت کے جو ذلت اور رسوائی حاصل ہوئی۔ اس سے تاریخیں اور مذہبی کتابیں بھری ہوئی ہیں۔ فرعون کو لشکر سمیت غرق کر کے اس کے بجائے بنی اسرائیل کو تختِ سلطنت پر متمکن کر دیا گیا اور ان پر مہربانیوں اور نوازشوں کے دروازوں کو کھول دیا گیا۔

فرعونِ زمانہ اور فرعونِ موسیٰ کا مقابلہ:

بھائیو! غور کرو۔ آج بھی ایک فرعون ہے وہ بھی یہی چاہتا ہے کہ اُمتِ محمدیہ میری اور میرے معبود کی پرستش کرے۔ وہ بھی دینِ حق کو دنیا سے مٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ قوم کے بچوں کو نام نہاد کالجوں میں تعلیم دلوا دلوا کر ذبح کر رہا ہے۔ کیونکہ جیسے ذبح ہونے سے انسان کی زندگی رخصت ہو جاتی ہے۔ اور وہ قوم کے کسی کام کا نہیں رہتا۔ اسی طرح آج قوم کے بچے بھی پڑھ کر اسلامی روح اور اسلامی جذبہ سے بالکل بیگانہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی روح عیسائی تعلیم اور عیسائی تہذیب کی شکار ہو جاتی ہے۔ ان کی قومی خیر خواہی نادان دوست کی خیر خواہی سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اکبر الہ آبادی نے فرمایا ہے اور بجا فرمایا ہے۔

یوں قتل پہ بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا
افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

خیر وہ فرعون تو صرف بچوں کو ذبح کرتا تھا۔ لیکن یہ فرعون تو قوم کی بچیوں کو بھی ذبح کر رہا ہے۔ وہ ابتداء سے انتہا تک مغربی تہذیب وتمدن میں پلتی ہیں۔ ان کی تعلیم وتربیت سب فرعونِ زمانہ کے رنگ میں رنگی ہوتی ہیں۔ جس کے لئے وہ بھی آج تقریباً قوم کے لئے مردہ ثابت ہو رہی ہیں۔ آج مردوں کی ترقی کا مفہوم انگریزی فیشن اور بلا مطلب بی۔ اے پاس کر لینا ہے۔ اور عورتوں کی ترقی انگریزی تعلیم کے ساتھ ساتھ پردہ کو

خیر آباد کہہ کر بال وغیرہ کٹا کر مردوں میں مل جانا ہے۔ اور یہی نہیں بلکہ ان کا تو یہ قتلِ روح اور جذبات اس قدر بڑھ چکا ہے۔ کہ وہی مسلمان جو کل تک اپنی تہذیب وتمدن اور اپنے مذہب کو تمام دنیا سے اعلیٰ اور بہتر سمجھتے تھے اور جسے وہ ہمدردانہ طریقے پر اپنے پڑوسیوں پر پیش کرنا اپنا اول ترین فرض سمجھتے تھے۔ آج خود اس پر آوازے کستے نظر آتے ہیں۔ اور اپنے باپ دادا کی قابل فخر تہذیب خود ان کی نظر میں تمسخر و استہزاء کے لائق معلوم ہوتی ہے۔ اور یہ دنیا میں بدترین قسم کا قتل ہے کہ کسی نسل کے روح، جسم اور ذہن کو لگاتار کوششوں کے ساتھ بالکل مسخ کر دیا جائے۔ احقر نے ایک اخبار میں پڑھا تھا کہ فارن اور برٹش بائیبل سوسائٹی کے ۱۹۳۰ء کے جلسے میں بعض لوگوں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ ہم نے آج تک جو روپیہ ہندوستان میں عیسائیت کی تبلیغ پر خرچ کیا ہے وہ سب کا سب برباد ہو گیا ہے کیونکہ اخراجات کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو مقابل میں کوئی شاندار نتیجہ نہیں نکلا۔ اور اس قدر مال و دولت خرچ کرنے کے باوجود بہت کم ہندوستانی عیسائیت کی گود میں آئے ہیں۔

اس پر ایک پادری صاحب نے جو سالوں ہندوستان میں رہ چکے تھے۔ اور جنہیں یہاں کے حالات کا وسیع تجربہ تھا۔ جواب دیا کہ صاحبو جو روپیہ ہندوستان میں آج تک تبلیغی سلسلہ میں خرچ ہوا ہے وہ برباد نہیں گیا بلکہ نہایت کارآمد جگہوں پر خرچ ہوا ہے۔ انسان جب کسی زمین کو قابل زراعت بنانا چاہتا ہے۔ تو فصل حاصل کرنے سے پہلے اسے بہت کچھ اس زمین پر خرچ کرنا پڑتا ہے۔ اس میں ہل جوتتا ہے جھاڑیوں اور جنگلی درختوں کو کاٹتا ہے۔ گھاس پھونس کو صاف کرتا ہے پھر کھاد ڈال کر بیج کو اس میں پھینک دیتا ہے۔ مگر آخر کار جب فصل کاٹنے کا وقت آتا ہے۔ تو اس کی سب تکلیفیں اور دکھ مٹ جاتے ہیں وہ اپنے غلے کے انباروں اور کھیتوں پر نظر کر کے پھولا نہیں سماتا۔

اسی طرح جو روپیہ آج تک ہندوستان میں تبلیغی سلسلہ میں خرچ ہوا ہے۔ وہ بیکار نہیں گیا بلکہ اس سے ہندوستانیوں کے دل و دماغ کی زمین کو عیسائیت کے بیج کے لئے بالکل تیار کر دیا گیا ہے ایک وہ زمانہ تھا کہ کسی ہندوستانی کے مذہب یا تمدن کی کسی کتاب میں مذمت کرنا تمام قوم کی توہین کے مترادف خیال کیا جاتا تھا۔ مگر آج اسی مال و دولت کے خرچ کرنے کے طفیل وہ اس حد تک پہنچ چکے ہیں کہ غیر تو بجائے خود

وہ اور ان کی اولاد خود ہی اپنے عقائد و تہذیب پر پھبتیاں کستے ہیں۔ اور ان کے دل و دماغ کی زمین کو کالجوں، سکولوں اور مشنوں کے ذریعے سے ایسا صاف کر دیا گیا ہے کہ اب جو بیج بھی اس میں ڈالا جائے گا۔ وہ یک لخت اسے قبول کر کے سرسبز پودے کی شکل میں اُگا دینگے۔

آپ نے سنا کس طرح اس پادری صاحب نے حقیقت حال کو بیان کیا ہے ہنود کو تو چھوڑ دیجئے، کیونکہ نہ ان کا کوئی مذہب ہے اور نہ تمدن۔ وہ ہمیشہ حاکم کے خیال و حرکات کا آئینہ رہے ہیں اور رہتے ہیں۔ مگر مسلمان قوم بھی دین سے اس قدر نا آشنا اور بیگانہ ہو چکی ہے کہ انہیں بھی اب نہ تو اپنے مذہب کے متعلق کچھ معلوم ہے اور نہ پیغمبرِ مذہب کے متعلق، نہ دین کا پتہ ہے اور نہ دین لانے والے کا۔ اب ایسی حالت میں جس طرف بھی انہیں کھینچا جائے گا وہ بلا تامل کھچ جائیں گے۔ ایک شخص جنگل میں بھٹک رہا ہو اور اسے رستہ معلوم نہ ہو تو آپ اسے جو راستہ بتائیں گے وہ اسے ہی ٹھیک رستہ سمجھ کر چل کھڑا ہو گا۔ صرف وہی شخص غلط رستے پر جانے سے انکار کرے گا۔ جسے پہلے سے صحیح رستہ معلوم ہو تو ایسی صورت میں دین کے رستے سے بھٹکے ہوئے مسلمان کیوں نہ وہ غلط رستہ اختیار کریں گے جو ملمع کاری، حکومت اور لالچ کے پتھروں سے خوب ہموار کیا ہوا ہے۔

توفیقِ عبادت بھی قربِ باری کی علامت ہے اور اس پر ایک حکایت:

بعض نے ایّاک نستعین سے یہ مراد بھی لی ہے کہ اے رب جس طرح ہم آج اس وقت آپ کی عبادت کر رہے ہیں۔ اسی طرح آپ ہمیشہ ایسی ہی توفیق عنایت فرمائیں کہ ہم آپ کی عبادت کیا کریں اور آج جو آپ نے مہربانی فرما کر حاضرِ دربار ہونے کی توفیق عنایت فرمائی ہے۔ ایسے ہی ہمیشہ اپنے کرم و فضل سے حاضریٔ دربار کا شرف عنایت فرمائیں۔

اگر آپ غور فرمائیں گے تو توفیقِ عبادت بھی اللہ جل شانہٗ کے قرب و اختصاص کی ایک بیّن علامت ہے۔ کیونکہ عبادت سے جی چرانے والے بھی اسی جیسے انسان ہیں۔ اس ہی جیسے اُن کے بھی ہاتھ پاؤں، ناک کان، آنکھ اور منہ ہیں مگر باوجود اشتراک انسانیت کے وہ اپنے مالک کے دربار سے گریزاں اور

فراری ہیں۔ مگر یہ ہے کہ ان کے برعکس ٹھنڈے پانی سے وضو کرتا ہے اپنی دنیوی کاموں میں ہرج ڈالتا ہے۔ مسجد میں آنے کی تکلیف اٹھاتا ہے اور پھر دربار بی میں کھڑا ہو کر شرف تخاطب حاصل کرتا ہے۔ تو دیکھو کتنا بڑا اختصاص اور قرب ہے اللہ تعالیٰ اسے اپنے خاص لطف کی وجہ سے اسے ان کاموں کی توفیق عطاء کرتے ہیں۔ اگر یہ عبادت توفیق پر موقوف نہ ہوتی تو وہ دوسرے انسان باوجود اشتراکِ انسانیت کے کیوں نہ اس اختصاص سے بہرہ اندوز ہوتے۔

کہتے ہیں کہ کسی شخص کی ایک لونڈی ہر رات کو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتی۔ اور پھر اس کے بعد دیر تک دعا میں مشغول رہتی۔ ایک دن اس کے مالک نے خیال کیا کہ آج رات کو سنوں کہ یہ لونڈی نماز کے بعد سجدہ میں گر کر اور گڑ گڑا کر اللہ تعالیٰ سے کیا سوال کرتی ہے۔ چنانچہ جب لونڈی حسب معمول رات کو عبادت سے فارغ ہو کر نہایت خضوع وخشوع سے دعا کرنے لگی۔ تو مالک نے سنا کہ وہ بار بار یہی کہتی ہے کہ اے مالک حقیقی۔ اے سچے آقا۔ جو آج کل اپنا قرب اور اختصاص بخشا ہوا ہے۔ اب مہربانی فرما کر اسے مجھ سے چھین نہ لینا۔ بلکہ اب اس اختصاص میں اور بھی زیادتی فرمانا۔

جب صبح ہوئی تو اس لونڈی کے مالک نے پوچھا کہ اے لونڈی تو رات کو دعا کرتی تھی اور بار بار کہتی تھی کہ اے اللہ جو آپ نے مجھے قرب اور خصوصیت بخشی ہے وہ اب مجھ سے واپس نہ لینا بلکہ اس میں زیادتی فرمانا تو مجھے بھی بتا کہ تجھے کونسا قرب اور اختصاص دیا گیا ہے جس کی زیادتی کی تو دعا کر رہی تھی۔ لونڈی نے جواب دیا۔ اے مالکِ مجازی، کیا توفیقِ عبادت اور رغبتِ ذکر سے بھی کوئی زیادہ اختصاص ہو سکتا ہے۔ کیا یہ قربِ خداوندی نہیں کہ جب تمام دنیا محوِ خواب ہوتی ہے۔ تو اس وقت کوئی غائبانہ کشش میرے دل کو کھینچتی ہے۔ میں دیوانہ وار اُٹھتی ہوں دن کی تھکاوٹ اور ماندگی کا ذرہ برابر احساس نہیں ہوتا۔ سردی مجھے ٹھنڈے پانی سے وضو کرنے میں مانع نہیں ہوتی۔ وضو کر کے جو مصلے پر کھڑی ہوتی ہوں تو دل خوشی اور مسرت سے بھر جاتا ہے۔ تو پھر اے آقا۔ آپ ہی بتائیں کہ یہ اختصاص نہیں تو اور کیا ہے۔ مالک نے کہا۔ اے لونڈی جا۔ آج سے تو آزاد ہے۔ مالکِ حقیقی کا غلام مالکِ مجازی کا غلام نہیں۔ بلکہ آقا ہونے کے لائق ہوتا ہے۔

جبریہ، قدریہ اور اہل سنت کے عقائد پر تنقیدی مقالہ:

نکتہ: اللہ تعالیٰ نے ایاک نستعین میں بیان کئے ہوئے مطالب کے علاوہ ایک اور نہایت باریک اور دقیق راز یہ بیان فرمایا ہے کہ ان دو جملوں میں اہلِ سنت والجماعت کے عقیدہ کو ثابت کر کے جبریہ و قدریہ کے باطل عقائد کو رد کر دیا گیا ہے۔ اور اس راز کو سمجھانے سے پہلے میں آپ کے سامنے ان تینوں فرقوں کا مختصر طور پر عقیدہ بیان کر دیتا ہوں تا کہ پھر مطلب کے سمجھنے میں کسی قسم کی دقت نہ رہے۔

جبریہ وہ فرقہ ہے جو انسان کو مجبورِ محض سمجھتا ہے اور اس کا عقیدہ ہے کہ انسان کو کسی قسم کا کچھ اختیار نہیں دیا گیا۔ بلکہ وہ اپنے افعال میں درخت، پتھر اور لکڑی کی طرح بے اختیار اور مجبور ہے۔ اور وہ دلیل یہ دیتے ہیں کہ جو کام بھی انسان دنیا میں کرتا ہے۔ اللہ جل شانہٗ جو عالم الغیب اور خبیر و بصیر ہے اوّل ہی سے اس کام کے ہونے یا نہ ہونے کو جانتا ہے۔ مثلاً زید آج روزہ نہیں رکھتا تو ازل ہی سے علمِ الٰہی میں آج کا روزہ نہ رکھنا لکھا ہوا تھا۔ یا مثلاً آج اس نے نماز پڑھی تو ازل ہی سے علمِ الٰہی میں آج اس کا نماز پڑھنا مقدر تھا۔ اب پہلی صورت میں وہ کبھی بھی اس دن روزہ نہیں رکھ سکتا تھا اور دوسری صورت میں وہ کبھی بھی نماز نہیں چھوڑ سکتا تھا کیونکہ اگر وہ اس دن روزہ رکھتا یا نماز نہ پڑھتا تو نعوذ باللہ علمِ خداوندی غلط ٹھہرتا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے علم کے برخلاف کام ہوا۔ مگر علمِ الٰہی میں تخلف محال ہے۔ اس لئے انسان کے کام کا علمِ الٰہی کے مطابق واقع ہونا لازمی ٹھہرا جب لازمی ٹھہرا تو پھر بندہ کو اختیار کیا رہا۔ وہ تو ایک مشین کی طرح ہو گیا۔ کہ مالک نے جب چاہا چلایا اور جب چاہا بند کر دیا۔ اور وہ نہ اپنے اختیار سے چلتا ہے نہ ٹھہرتا ہے۔ وہ نہ تو بالاستقلال کچھ کام کر سکتا ہے۔ اور نہ کسی کام کے کرنے سے انکار کر سکتا ہے۔

لیکن اگر غور سے کام جائے تو ان کا یہ عقیدہ ’’بناء فاسد علی الفاسد‘‘ ہے۔ وہ یوں تو کہتے ہیں کہ باری تعالیٰ ازل ہی سے کسی شخص کے ایک کام کرنے یا نہ کرنے کو جانتے ہیں اس واسطے وہ اپنے افعال میں مجبور ہے لیکن اس کے ساتھ اگر وہ لفظ اختیار کو بھی زیادہ کر لیں تو ان کا یہ وہمی قلعہ سب کا سب ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا ہے۔

یعنی ہم یوں کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ازل ہی سے جانتا تھا کہ یہ شخص اپنے اختیار سے یہ کام کرے گا یا نہ کرے گا۔ تو جب اختیار ثابت ہو گیا تو مجبوری کہاں رہی۔ اور اس کی مثال یوں سمجھیے۔ ایک شخص اپنے نوکر کو

ایک کام کرنے کا حکم دیتا ہے اور وہ شخص جانتا ہے کہ میرا نوکر اپنے اختیار سے اس کام کو یوں کرے گا اب نوکر نے اُس کے علم کے مطابق اُس کام کو پورا کیا۔ تو کیا نوکر کا وہ کام بالاختیار کیا ہوا کہلائے گا یا بالجبر؟ ایک چھوٹا سا بچہ بھی سمجھ سکتا ہے کہ نوکر کا کام اختیاری کہلائے گا۔ کیونکہ اسے اس کام کے کرنے یا نہ کرنے کا اختیار تھا۔ اگرچہ اس کا کرنا مالک کے علم کے مطابق تھا۔ مگر مالک کے اس علم کا نوکر کے اختیار پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔

اور اس عقیدہ کی غلطی کو ایک اور طرح سے بھی سمجھ سکتے ہو۔ اگرچہ وہ ذرا باریک بات ہے مگر غور کرنے سے انشا اللہ آپ کی سمجھ میں آجائیگی۔ یعنی ہم جبریہ سے پوچھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے خود اپنے کام اختیاری ہیں یا غیر اختیاری؟ اس کا تو وہ بھی اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سب کام اختیاری ہیں۔ اب مثلاً زید کو اللہ تعالیٰ اپنے اختیار سے مالدار کرتا ہے۔ اور اس کو مالدار کرنے کا علم اللہ تعالیٰ کو ازل ہی سے تھا۔ تو کیا اب علمِ الٰہی سے اختیارِ الٰہی جبر کے ساتھ تبدیل ہو جائیگا؟ ہرگز نہیں۔ تو اسی طرح علمِ الٰہی اختیارِ انسانی کو بھی جبر کے ساتھ تبدیل نہیں کرتا۔ یہی مسئلہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے پوچھا گیا کہ!

اے ابو عبدالرحمٰن لوگ زنا کرتے ہیں۔ شراب پیتے ہیں مگر وہ اس کے کرنے میں مجبور ہیں۔ کیونکہ رب العزت کے علم میں ان کے لئے ایسا ہی مقدر تھا تو آپ نے فرمایا:

”قَالَ سُبْحَانَ اللهِ الْعَظِیمِ، قَدْ کَانَ فِي عِلْمِهِ أَنَّهُمْ یَفْعَلُونَهَا فلم یحملهم علی اللهِ عَلَی فِعْلِهَا۔ یعنی پاک ہے اللہ بزرگ۔ ان کا ایسا کرنا ضرور علمِ خداوندی میں تھا۔ مگر خدا کے علم نے انہیں ایسا کرنے پر مجبور نہیں کیا۔

اس کے بعد آپ نے بروایت عمر رضی اللہ عنہ یہ حدیث بیان فرمائی:

” مَثَلُ عِلْمِ اللهِ فِیکُمْ کَمَثَلِ السَّمَاءِ الَّتِیْ أَظَلَّتْکُمْ، وَالْأَرْضِ الَّتِیْ أَقَلَّتْکُمْ، فَکَمَا لَا تَسْتَطِیْعُوْنَ الْخُرُوْجَ مِنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ فَکَذٰلِكَ لَا تَسْتَطِیْعُوْنَ الْخُرُوْجَ مِنْ عِلْمِ اللهِ تَعَالَی، وَکَمَا لَا تَحْمِلُکُمُ السَّمَاءُ وَالْأَرْضُ عَلَی الذُّنُوْبِ فَکَذٰلِكَ لَا یَحْمِلُکُمْ عِلْمُ اللهِ تَعَالَی عَلَیْهَا۔

(تفسیر مفاتیح الغیب، الجز، ۲، سورۃ البقرہ، ص، ۴۴، دار الکتب العلمیہ)

یعنی اللہ تعالیٰ کے علم کی تمہارے افعال کے متعلق ایسی مثال ہے جیسی آسمان کی جو تمہارا سائبان ہے اور زمین کی جو تمہارا مقام ہے۔ پس جس طرح تم زمین و آسمان سے نہیں نکل سکتے۔ اسی طرح تمہارا علمِ خداوندی سے بھی نکلنا محال ہے۔ اور جیسا تم کو زمین و آسمان گناہوں پر مجبور نہیں کرسکتا۔ اسی طرح علمِ الٰہی بھی تمہیں گناہوں کے کرنے پر مجبور نہیں کرتا۔

اور پھر قرآن پاک سے صاف ظاہر ہے۔ کہ انسان کو نیک و بد کے امتیاز کے لئے عقل دی گئی ہے اسے ایک کام کرنے یا نہ کرنے کا اختیار دیا گیا ہے۔ مثلاً اللہ جل شانہٗ فرماتا ہے!

”وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَاِنْ تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ؕ۔ (الزمر: ۷)

وہ اپنے بندوں کے لئے کفر کو پسند نہیں کرتا۔ اور اگر تم شکر کرو تو وہ تمہارے لئے پسند کرتا ہے۔

اب اگر کفر و شکر میں انسان مجبور ہوتا تو پھر اللہ تعالیٰ کی رضا و غیرِ رضا کا کیا سوال ہوسکتا تھا۔ کفر پر ناراضگی اور شکر پر رضامندی تب ہی ہوسکتی ہے کہ جب انسان کو ان دونوں راستوں پر چلنے کا اختیار دیا جائے۔ اختیار مل جانے کے بعد اب انسان جو رستہ چلے اللہ جل شانہٗ کی رضامندی اور ناراضگی کا مستحق ہوسکتا ہے۔ سورہ محمد میں کفار کی روح قبض کرنے کے متعلق ارشاد ہوتا ہے!

”فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَ اَدْبَارَهُمْ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَ كَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ۝۔ (محمد: ۲۷)

یعنی ان لوگوں کی کیا حالت ہوگی جب فرشتے ان کے مونہوں اور پیٹھوں پر کوڑے مارتے ہوئے ان کی روح قبض کرینگے۔ اور وہ اس لئے کہ وہ اس بات کی پیروی کرتے تھے جو اللہ جل شانہٗ کو غضبناک کرتی تھی۔ اور اس کی رضامندی کو وہ ناپسند کرتے تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال کو برباد کر دیا۔

اب غور کرنے کا مقام ہے کہ اگر انسان کو اختیار نہ ہوتا اور وہ درخت یا پتھر کی طرح مجبور محض ہوتا۔ تو اتباع کی نسبت ان کی طرف کیسے کی جاتی اور ”کَرِہُو“ کے وہ فاعل کس طرح بن سکتے۔ تو معلوم ہوا کہ اللہ جل شانہٗ نے انسان کو قوتِ ارادہ اور قوتِ اختیار ضرور دی ہوئی ہے۔ اسے وہ جس طرح چاہے استعمال کریگا۔ اللہ

تعالیٰ اسے اس کے ارادہ کے مطابق نتیجہ عنایت فرمادینگے۔ خواہ وہ مراد اچھی ہو یا بُری۔ جیسے آگ میں اللہ تعالیٰ نے جلانے کی قوت رکھ دی ہے۔ اب اس سے اگر کوئی اپنے کپڑے جلائے تو وہ جل جائیں گے۔ اور اگر کھانا پکائیگا تو وہ پک جائے گا۔ یعنی جیسے اس کو استعمال کرے گا، ویسے ہی اسے اس کا نتیجہ دیا جائیگا۔ خواہ استعمال برا ہو یا اچھا۔ اسی طرح اگر انسان کو کچھ اختیار نہ ہوتا۔ تو پھر اللہ تعالیٰ:

''قَدۡ اَفۡلَحَ مَنۡ زَكّٰهَا () وَقَدۡ خَابَ مَنۡ دَسّٰهَا ''۔ (الشمس: ۱۰۔۹)

نہ فرماتے۔ جس کا مطلب ہے کہ بامراد ہوا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو پاک کیا۔ اور نامراد ہوا وہ جس نے اسے دبایا یعنی برباد کیا۔

سوال: اگر انسان اپنے افعال میں مجبور نہیں تو پھر اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں یوں کیوں فرماتا ہے کہ ''یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ ''(جو چاہے وہ کرتا ہے) اور'' یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَهۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ '' (جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے گمراہ کرتا ہے) ان آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی گمراہی اور ہدایت سب اللہ جل شانہ کی طرف سے ہے۔ بندے کا اس میں کوئی چارہ نہیں۔

جواب: یہ اور ایسی تمام آیتیں جن میں اللہ تعالیٰ نے غیر فعل کو اپنی طرف منسوب کیا ہے وہ محض خالق ہونے کی حیثیت سے ہے یعنی ان تمام چیزوں کا پیدا کرنے والا باری تعالیٰ ہے۔ اسی نے انسان کو پیدا کیا۔ اسی نے اسے نیک و بد کی تمیز دی۔ اور اچھے برے کاموں کا ذمہ دار ٹھہرایا۔ اب اگرچہ خالق ہونے کی حیثیت سے انسان کو تمام کاموں کا اللہ جل شانہ کی طرف منسوب کرنا صحیح ہوگا۔ مگر حقیقت میں ان سب کا فاعل انسان ہی ہے۔ اس واسطے ان کے نتیجے کا ذمہ دار بھی اسی انسان کو ٹھہرایا جائے گا۔ مثلاً کہا جاتا ہے کہ پرنالہ یا میزاب بہہ رہا ہے تو کیا حقیقت میں پرنالہ بہتا ہے یا اس کا پانی۔ ظاہر ہے کہ پرنالہ تو کبھی نہیں بہتا ہمیشہ اس کا پانی ہی بہتا ہے۔ مگر چونکہ وہ پانی اس کی وجہ سے مکان سے جمع ہو کر بہہ رہا ہے۔ اس واسطے بہنے کو پرنالہ کی طرف منسوب کیا گیا۔ اسی طرح بندے کے افعال بھی اللہ تعالیٰ کی طرف علتِ العلل اور خالق ہونے کی حیثیت سے منسوب کئے جاتے ہیں۔ کیونکہ کسی کام کے کرنے میں چار چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے:

(۱) **قدرتِ فعل**: یعنی جو کام کرنا ہے اس کے کرنے کی طاقت ہونی چاہیے۔

(۲)**سہولتِ فعل:** یعنی کام میں آسانی پیدا کرنے کے اسباب بھی ہوں۔ تاکہ ان کے ذریعہ موانع کو ہٹا کر اس کام کو کیا جاسکے۔ اور اس کے کرتے وقت دل مطمئن اور دماغ فارغ ہو تاکہ پوری توجہ کے ساتھ اس کو اختتام تک پہنچایا جاسکے۔

(۳)**دعوتِ فعل:** یعنی اس کام کے کرنے کی کچھ ضرورت بھی ہونی چاہئے۔ تاکہ طبیعت اس کے کرنے کی طرف راغب ہوسکے۔

(۴)**ہدایتِ عقل:** اس کام کے کرنے میں عقل بھی مدد کرے۔ تاکہ اسکی ہدایت اور رہنمائی سے وہ کام پورا ہوسکے۔ ورنہ بغیر ہدایت عقل کے انسان ادھر ادھر بھٹکتا رہیگا۔ اب اگر سوچو گے تو یہ چاروں چیزیں یعنی قدرت۔ سہولت۔ دعوت اور ہدایت سب کی سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں۔ اور چونکہ انہی چاروں پر کسی کام کے ہونے یا نہ ہونے کا انحصار ہوتا ہے۔ اس واسطے قرآن پاک نے بعض جگہ ایک انسانی فعل کو اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کیا ہے۔

اعتراض: لیکن پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ان تمام چیزوں کو جن پر کسی انسانی کام کا ہونا یا نہ ہونا موقوف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پیدا فرمایا تو پھر انسان کا گناہ کرنے میں کیا قصور رہا۔ مثلاً ایک شخص زنا کرتا ہے تو اس فعل پر قدرت وغیرہ تو خدا کی طرف سے دی ہوئی ہے۔ اسی طرح ایک آدمی چوری کرتا ہے۔ تو چوری کرنے کی طاقت تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ہے اگر وہ اسے اس کام کے کرنے کی طاقت نہ دیتا تو انسان سے ایسے برے کام کا کبھی ارتکاب نہ ہوتا۔

جواب: اس سوال کا جواب میں آپ کو ایک مثال کے ذریعے سمجھاتا ہوں۔ کیونکہ یہ مسئلہ نہایت باریک ہے اور میں اسے بیان بھی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مگر جب یہ خود بخود چھڑ گیا ہے تو اب اسے بقدر ضرورت آسان لفظوں میں بیان کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

مثال: ایک بہت بڑا پہلوان ہو اس کے پاس ایک پندرہ من کا پتھر ہو جسے سوائے اس کے اور کوئی نہ اٹھا سکتا ہو۔ اب وہ شاگردوں کو یوں کہے کہ دیکھو اس پتھر کو تم میں سے کوئی بھی نہ اٹھائے۔ کیونکہ اس کے اٹھانے میں یہ یہ نقصان ہیں۔ لیکن اس پر بھی اگر تم میں سے کوئی اٹھائیگا تو چونکہ تم میں تو اس کے

اٹھانے کی طاقت نہیں۔ اس لئے میں تمہیں مدد کر کے اٹھوا تو دوں گا۔ مگر ساتھ ہی پچاس روپے جرمانہ بھی کردونگا۔ اسی طرح اللہ جل شانہ نے بھی فرمادیا کہ دیکھو زنا کے قریب تک مت جانا۔ دیکھو چوری مت کرنا۔ کیونکہ ان کاموں میں یہ نقصان ہیں۔ لیکن اس انتباہ کے باوجود بھی اگر تم میں سے کوئی یہ کام کرے گا تو چونکہ تم میں تو اس کے کرنے کی طاقت نہیں۔ اس واسطے میں تم کو اس کے کرنے کی قدرت دے دونگا۔ مگر ساتھ ہی دنیا و آخرت میں یہ یہ عذاب بھی دونگا۔

موٹی اور آخری بات یہ ہے کہ اگر جبریہ کے عقیدہ کو صحیح تسلیم کیا جائے۔ تو پھر سب کی سب شریعتیں اور کتابیں بیکار ٹھہرتی ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کا آنا، نیکوں سے جنت کا وعدہ، بروں سے وعیدِ جہنم، سب کا سب بے معنی ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ سب چیزیں تب ہی با معنی ہو سکتی ہیں۔ کہ انسان کو نیک و بد کے کرنے کا اختیار ہو۔ اور چونکہ شریعتوں، کتابوں اور رسولوں کے سلسلہ کو بیکار ماننا ذاتِ باری پر فعلِ عبث کا الزام دھرنا ہے جس سے وہ بیچوں وبیچگوں ذات مبرا اور منزہ ہے۔ اس لئے جبریہ کا یہ عقیدہ بھی بالکل باطل اور غلط ہے۔

قدریہ: اب کچھ تھوڑا سا قدریہ کا بھی حال سن لیجئے۔ قدریہ وہ فرقہ ہے جو انسان کو مختارِ مطلق سمجھتا ہے۔ اور اس کا عقیدہ کہ انسان خود ہی اپنے اعمال وافعال کا خالق ہے۔ ہاں اتنا فرق ضرور کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کو وہ مطلق اور مستقل خالق سمجھتے ہیں۔ مگر انسان کو بذریعہ آلات اور اسباب کے خالق افعال ٹھہراتے ہیں۔ اور اسے آلات واسباب میں اللہ تعالیٰ کا محتاج سمجھتے ہیں۔ اور وہ ایک دلیل اپنے عقیدے کی صحت و ثبوت کے لئے تو یہ پیش کرتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ انسان کے افعال کا خالق ہے تو نعوذ باللہ اسے چور، زانی اور قاتل وغیرہ کہنا بھی صحیح ہوگا۔ کیونکہ اس کے پیدا کرنے سے چوری، زنا اور قتل کا ارتکاب ہوا ہے۔ اگر وہ پیدا نہ کرتا تو ان کا ارتکاب بھی نہ ہو سکتا۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ کو ایسے قبیح الفاظ سے موسوم کرنا کفر ہے۔ اس لئے نتیجہ یہ نکلا کہ یہ افعال بھی اس نے پیدا نہیں کئے۔ بلکہ بندہ ان افعال کا خالق ہے۔

حالانکہ اگر غور کیا جائے تو یہ کچھ دلیل نہیں۔ بلکہ قدریہ کی صریح غلط فہمی ہے کیونکہ کسی فعل کا فاعل اسی ذات کو ہی قرار دیا جا سکتا ہے کہ جس کے ساتھ فعل کا قیام ہوا ہو۔ نہ کہ خالق یا پیدا کرنے والے کو۔ اس واسطے چور زانی یا قاتل وہی اشخاص کہلائے جا سکتے ہیں کہ جن کے باعث ان افعال کا قیام ہوا ہے۔ نہ کہ وہ ہستی جس

نے انہیں پیدا کیا۔ جیسا سیاہی یا سرخی کے موجد کو سیاہ یا سرخ نہیں کہتے۔ بلکہ سیاہ یا سرخ وہی کہلاتا ہے جس کے ساتھ سیاہی یا سرخی کا قیام ہوتا ہے۔ ان کی دوسری دلیل یہ ہے کہ اگر بندے کے افعال کا خالق اللہ تعالیٰ کو مانا جائے تو پھر انسان کے کام ایک مشین کی حرکت کے مشابہ ہو جاتے ہیں۔ جس میں اس کا اپنا کوئی اختیار نہ رہے تو پھر بندے کو اس کے افعال پر برا بھلا کہنا بھی غلط ٹھہرا۔ اور پھر شارعِ علیہ السلام کے اوامر و نواہی بھی جو موقوف ہیں اختیار پر۔ سب کے سب بیکار ٹھہرتے ہیں۔

جواب: یہ دلیل جو حقیقت میں مجموعہ ہے چند اعتراضوں کا جبریہ کے رد میں کام آسکتی ہیں۔ کیونکہ وہی انسان کو بالکل بے اختیار اور مجبور سمجھتے ہیں۔ مگر اہل سنت والجماعت کا صحیح العقیدہ فرقہ جس کا عقیدہ مَیں ابھی بالتفصیل بیان کرتا ہوں۔ انسان کو باوجود اس کے غیر خالق ماننے کے اس کے لئے اختیار بھی ثابت کرتا ہے جس کی وجہ سے اس کے کام نہ تو مشین کے مشابہ ہوتے ہیں اور نہ ہی دوسرے اعتراض جو دلیل کی صورت میں بیان کئے گئے ہیں وارد ہو سکتے ہیں۔ یہ سب میں نے آپ کے سامنے قدریہ کی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں۔ ان کی نقلی دلیلیں ذرا تفصیل طلب ہیں۔ اس لئے سرِ دست میں ان کو چھوڑ کر اہل سنت والجماعت کے صحیح عقیدہ کی تشریح کرتا ہوں۔ تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ اس معاملہ میں صحیح عقیدہ کیا ہے اور اس کے صحیح ہونے کی کیا وجہ ہے۔

اہل سنت والجماعت کے فرقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ انسان نہ تو لکڑی اور پتھر کی طرح مجبور محض ہے۔ جیسا کہ جبریہ کا عقیدہ ہے اور نہ اپنے افعال کا خالق جیسا کہ قدریہ اعتقاد رکھتے ہیں۔ بلکہ تمام چیزوں کا خالق تو اللہ تعالیٰ ہے۔ ہاں انسان کاسب ہے اور اپنے کسب میں مختار۔

جیسا کہ میں آگے بیان کر چکا ہوں کہ انسان کا وجود اس کا ارادہ اس کی قدرت وطاقت ہر ایک چیز اللہ جل شانہ کی پیدا کی ہوئی ہے اس لئے وہ خالق ہے تمام چیزوں کا۔

چنانچہ قرآن پاک میں آتا ہے:

”وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۔ (الصّٰفّٰت: ۹۶)

یعنی اللہ نے تمہیں اور تمہارے اعمال کو پیدا کیا۔

پھر دوسری جگہ آتا ہے:

”اَللّٰہُ خٰلِقُ کُلِّ شَیْءٍ“۔ (الزمر: ٦٢)

یعنی اللہ ہر چیز کا خالق ہے۔

لیکن اُس انسان کو اپنے دیے ہوئے ارادہ اور قوت کو نیک و بد میں استعمال کرنے کا پورا پورا اختیار دیا ہے۔ اور یہی اختیار تمام شرعی احکام بسلسلہ انبیاء وصحفِ سماویہ کے نزول کا باعث ہوا۔ انسان کے سامنے انبیاء علیہم السلام کے ذریعہ دو رستوں کی تفصیل پیش کر دی گئی اور بتا دیا گیا کہ یہ رستہ برا ہے اور یہ اچھا۔ اس پر چلنے سے تمہارا خالق ناراض ہوگا۔ اور اس پر چل کر اُسے راضی کر سکو گے۔ پھر ان راستوں پر چلنے اور نہ چلنے کی ہدایات بذریعہ کتابوں کے بھی انسانوں کو پہنچا دی گئیں۔

اب انسان جس راستے پر چلنے کا ارادہ کرتا ہے۔ اُسے اُس پر چلنے کی طاقت دے کر سزا و جزا کا نتیجہ مرتب کر دیا جاتا ہے۔ رستے کے چلنے یا نہ چلنے کا اسے اختیار ہے۔ مگر رستہ پر چل کر اس کے نتیجہ سے بچنے کا کوئی اختیار نہیں۔ مثلاً کسی انسان کو یہ تو اختیار ہے کہ کسی کو لاٹھی مارے یا نہ۔ مگر اسے یہ اختیار نہیں کہ لاٹھی مارنے کے بعد اس کے درد کو روک سکے۔ اسی طرح اہل سنت والجماعت کا حق پرست فرقہ نہ تو انسان کو مجبورِ محض سمجھتا ہے اور نہ مختارِ مطلق۔ بلکہ اس کا عقیدہ:

”الاسلام بین الجبر و القدر“ ہے

یعنی اسلام جبر و قدر کے درمیان ہے۔ بعض حصے میں تو انسان کے لئے اختیار مانتے ہیں اور بعض میں اسے مجبور سمجھتے ہیں۔ اسی فرقہ کی تعریف:

”وَ کَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّۃً وَّسَطًا“۔ (البقرۃ: ١٤٣)

کے الفاظ میں قرآن پاک کر رہا ہے۔

یعنی ہم نے تمہیں اُمتِ معتدلہ بنایا۔

نہ اس فرقہ کے عقائد میں افراط ہے نہ تفریط۔ نہ جبر جیسی خرابی ہے نہ قدر جیسا نقص۔ بلکہ ان کا حال تو:

”مِنْ بَیْنِ فَرْثٍ وَّدَمٍ لَّبَنًا خَالِصًا سَآئِغًا لِّلشّٰرِبِیْنَ ()“ (النحل: ٦٦)

کا سا ہے جیسا دودھ خون اور گوبر کے درمیان ہوتا ہے۔ اسی طرح الاسلام بین الجبر والقدر کا منقی و مصفی دودھ بھی جبریہ و قدریہ کے عقیدوں کے درمیان ہے۔

”الاسلام بین الجبر والقدر“ کے ادق مسئلہ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کس طرح چند لفظوں میں سمجھایا:

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ انسان جبر اور قدر کے درمیان کیسے ہوسکتا ہے۔ ایک ہی انسان نہ مجبور ہو نہ مقدور اور وہی انسان مجبور بھی ہو اور قادر بھی۔ آپ نے فرمایا! اے سائل میں تجھے ایک آسان سی مثال میں اس عظیم الشان مسئلے کو سمجھائے دیتا ہوں۔ آپ نے پھر اس سے فرمایا کہ اچھا تو اپنی ایک ٹانگ زمین سے اٹھالے۔ اس نے بموجب ارشاد کے ایک ٹانگ اٹھالی۔ آپ نے پھر فرمایا کہ اب دوسری بھی اٹھالے۔ اس نے عرض کی کہ صاحب میں دوسری کیسے اٹھاؤں۔ دوسری اٹھاتا ہوں فوراً گر جاؤں گا۔ آپ نے فرمایا تو بس اب تیرے سوال کا جواب اسی سے ہوگیا۔ دیکھ تو ایک ٹانگ کے اُٹھانے میں تو مختار ہے مگر دوسری کے اٹھانے میں مجبور۔ اس طرح انسان بھی ہر کام کے بعض حصے میں مختار ہے اور بعض میں مجبور۔ گویا اسے بھی جبر و قدر کی ایک ایک ٹانگ لگی ہوئی ہے۔ اور یہی عقیدۂ حقہ ہے۔ مگر افسوس کہ بعض لوگوں نے اس معتدل متوسط اور صحیح و بلاخطر رستہ کو چھوڑ کر کیوں افراط و تفریط کو پسند کیا۔ اور ”خَیۡرَ الۡاُمُوۡرِ اَوۡسَطُهَا“ کو چھوڑ کر عقلی دلائل کی رو میں کہاں سے کہاں بہہ کر چلے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا ہے!

صِنۡفَانِ مِنۡ اُمَّتِیۡ لَیۡسَ لَهُمَا فِی الۡاِسۡلَامِ نَصِیۡبٌ الۡمُرۡجِئَةُ وَالۡقَدَرِیَّةُ۔

(جامع ترمذی: الجزالرابع، رقم: ۲۱۴۹، دار الغرب الاسلامی بیروت)

یعنی میری اُمت میں سے دو گروہ ایسے ہیں جن میں اسلام سے کچھ حصہ بھی نہیں۔ ایک مرجئیہ یعنی جبریہ اور دوسرے قدریہ۔

جبرئی عقیدہ باش و قدرئی عمل کی توضیح:

بعض صوفیائے کرام نے فرمایا ہے کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنا چاہے اور اسے

خواہش ہو کہ طریقت اور سلوک کے منازل کو جلدی طے کر کے انوارِ ربی کا مشاہدہ کرے۔ تو اسے چاہئے کہ عقیدہ تو جبریہ کا رکھے مگر اعمال قدریہ جیسے ہوں۔ چنانچہ ان کا مقولہ ہے جبرئی عقیدہ باش و قدرئی عمل۔ یعنی تو اپنے عقیدہ میں جبرئی ہو اور اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ کے سامنے مجبور محض خیال کر۔ مگر کام اور عمل قدریہ کی مانند کر۔ اور اپنے آپ کو ہر ایک کام میں قادر سمجھ کے اس کا کوئی عملی پہلو نہ چھوڑ۔ اور کار کن پس تکیہ بر جبار کن کا صحیح فوٹو بن جا۔

قرآن پاک کو اوّل سے آخر تک پڑھو ہر جگہ نعمتوں کا حصول اللہ جل شانہٗ کے فضل و کرم پر موقوف نظر آتا ہے۔ مگر پھر بھی ساتھ ساتھ ’’جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ۝‘‘ فرما کر ظاہر کر دیا ہے کہ فضل الٰہی کے مستحق عاملین ہی ہوتے ہیں نہ غیر۔

تو خلاصہ کلام یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ جل شانہٗ نے ’’اِيَّاكَ نَعْبُدُ‘‘ فرما کر جبریہ کا ردّ کیا۔ کیونکہ اس کا معنی یہ ہے کہ ہم تیری عبادت کرتے ہیں۔ چونکہ جبریہ یہ کہتے ہیں کہ انسان کچھ نہیں کر سکتا بلکہ وہ اپنے افعال و اعمال میں مجبورِ محض ہے۔ اس لئے نعبد کا فاعل انسانوں کو بنا کر ان کو غلطی سے متنبہ کر دیا گیا۔ پھر اس کے بعد ’’اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ؕ۝‘‘ فرما کر قدریہ کا بھی ردّ فرما دیا۔ کیونکہ قدریہ انسان کو قادر و مختار سمجھتے ہیں اور ’’اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ؕ۝‘‘ ظاہر کرتا ہے کہ تکمیلِ عبادت میں ہمارا کچھ اختیار نہیں۔ آپ کی مدد شاملِ حال ہو تو بیڑا پار ہے ورنہ ہم ہیں اور وساوسِ شیطان کا منجدھار ہے۔ تو ان دونوں یعنی ’’اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ؕ‘‘ ملانے سے یہ نتیجہ حاصل ہوا کہ اے لوگو نہ قدریہ بنو اور نہ جبریہ۔ بلکہ اس کے درمیان رہ کر خالق تو رب العزت کو مانو اور کاسِب انسان کو۔ اور یہی خلاصہ ہے مسئلہ تقدیر کا بھی کہ ہم نیک کام کریں اور انجام ’’وَ اُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ؕ‘‘ کہہ کر اللہ جل شانہٗ کے سپرد کریں۔ اور اس سے زیادہ اس مسئلہ میں بحث و تمحیض نہ کریں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

قَالَ خَرَجَ عَلَيْنَا رَسُولُ اللهِ -صلی الله علیه وسلم- وَنَحْنُ نَتَنَازَعُ فِي الْقَدَرِ فَغَضِبَ حَتَّى احْمَرَّ وَجْهُهُ حَتَّى كَأَنَّمَا فُقِئَ فِي وَجْنَتَيْهِ الرُّمَّانُ فَقَالَ » أَبِهَذَا أُمِرْتُمْ أَمْ بِهَذَا أُرْسِلْتُ إِلَيْكُمْ إِنَّمَا هَلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمْ حِينَ تَنَازَعُوا فِي هَذَا الأَمْرِ عَزَمْتُ عَلَيْكُمْ أَلاَّ تَتَنَازَعُوا فِيهِ -

(جامع ترمذی: الجز، ۴، رقم: ۲۱۳۳، دار الغرب الاسلامی بیروت)

کہ حضور ﷺ نکلے اور ہم مسئلہ تقدیر میں جھگڑ رہے تھے حضور اس بات پر نہایت غضبناک ہوئے اور حضور کا چہرہ انور اس قدر سرخ ہو گیا کہ گویا آپ کے رخسار مبارک پر انار توڑ اگیا ہے۔ پھر آپ ﷺ نے فرمایا کہ تمہیں اس بات کا حکم دیا گیا ہے یا میں تمہاری طرف اس لئے بھیجا گیا ہوں تم سے پہلی اُمتیں بھی اسی بات پر جھگڑ کر ہلاک ہوئیں۔ میں تمہیں قسم دیتا ہوں کہ آئندہ تم اس معاملہ میں کبھی بھی نہ جھگڑنا۔

استعانتِ عامہ اور اس کے درجات:

ابھی تک جو میں نے ایاک نستعین کے متعلق بیان کیا وہ سب کا سب بیان استعانتِ خاصہ کے متعلق تھا۔ یعنی استعانت فی العبادۃ۔ چونکہ ایاک نعبد میں بندے نے اپنی عبادت کے متعلق عرض کی تھی اس واسطے ایاک نستعین کی مدد کو بھی اسی عبادت کے ساتھ خاص سمجھ کر اب تک یہ تفسیر وتشریح بیان ہوتی رہی۔ مگر اب استعانت کو عام رکھ کر کچھ عرض کرتا ہوں۔ یعنی ایاک نستعین میں مصلی صرف عبادت ہی کے لئے مدد نہیں مانگتا۔ بلکہ وہ عام طور پر مدد کی التجا کرتا ہے خوہ وہ مدد دینی ہو یا دنیوی۔ اس عبادت کے لئے ہو یا دوسری کے لئے۔ اور وہ اس استعانتِ عامہ کو بھی ذاتِ باری ہی کے ساتھ مختص کرتا ہے۔

استعانتِ عامہ کا پہلا درجہ اور سفیان ثوری کی حکایت:

استعانتِ عامہ میں مدد مانگنے والوں کے تین درجے ہوتے ہیں۔ بعض تو بالکل اسباب اور وسائل پر نظر ہی نہیں کرتے۔ اور ان کا تعلق ذات باری سے ایسا ہوتا ہے کہ اس میں اسباب یا وسیلے کے دخول کو عشق حقیقی کی تحقیر سمجھا جاتا ہے۔

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق آتا ہے کہ آپ جب نماز میں ایاک نستعین پر پہنچتے تو بعض دفعہ بیہوش ہو کر گر جاتے۔ لوگوں نے پوچھا۔ حضرت ایاک نستعین پر آ کر آپ کی حالت دفعتہً کیوں بدل جاتی ہے۔ فرمانے لگے کہ جب میرے منہ سے یہ لفظ نکلتے ہیں کہ اے اللہ ہم آپ ہی سے مدد سے چاہتے ہیں تو فوراً مجھے خیال آجاتا ہے کہ اے سفیان! اگر رب العزت نے قیامت کے دن سوال فرمایا کہ اے مکار جب تو نماز پڑھا کرتا تھا تو ہم ہی سے مدد مانگنے کا دعویٰ کیا کرتا تھا۔ اگر تو اپنے دعوے میں سچا تھا تو پھر بیماری کی

حالت میں طبیبوں کے پاس کیوں جایا کرتا تھا۔ اور دنیوی تکالیف میں دنیاداروں کی مدد کیوں چاہا کرتا تھا۔ بعض دفعہ میں اس خیال سے اس قدر شرمندہ اور مخجول ہوتا ہوں کہ مجھ پر غشی طاری ہو جایا کرتی ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کا استغنا اور احتیاج:

اسی طرح جب ابراہیم علیہ السلام کو نمرود نے آگ میں ڈالا تو زمین و آسمان میں خلیل علیہ السلام کی حالت کے متعلق دربارِ جلیل میں شور و پکار کی گئی۔ جبرائیل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ جاؤ اور ہمارے خلیل سے پوچھو۔ اگر وہ چاہیں تو ہم ان پر آگ کو گلزار بنا دیں۔ چنانچہ جبرائیل علیہ السلام فوراً خدمت میں حاضر ہوئے اور پوچھا! ''یَا خَلِیۡلَ اللہِ، ھَلۡ لَکَ مِنۡ حَاجَۃٍ'' یعنی اے خلیل کیا اللہ سے آپ کو کچھ حاجت ہے۔

آپ نے فرمایا۔ اَمَّا اِلَیۡکَ فَلَا۔ یعنی حاجت ہے تو سہی مگر تیری طرف کچھ نہیں۔ جب حضرت جبرائیل علیہ السلام نے دیکھا کہ آپ باوجود شدتِ حرارت اور سوزشِ آتش کے مجھ سے کسی قسم کی مدد نہیں چاہتے تو عرض کی'' فَسَلۡہُ'' یعنی جب آپ مجھ سے کچھ مدد نہیں چاہتے۔ تو رب العزت ہی سے سوال کیجئے آپ نے فرمایا'' حسبی من سوالی علمہ بحالی''۔ یعنی میری حالت کا اسے معلوم ہونا میرے سوال کرنے سے کفایت کرتا ہے۔ مجھے سوال کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ وہ خود دانا و بینا اور علیم و بصیر ہے۔ اگر وہ چاہیگا تو بلا سوال اور اظہارِ حالت ہی اس تکلیف کو دور کر دیگا۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس طرح اپنے آپ کو رضائے ربی کے سامنے جھکا دیا۔ اور فرمایا!

اَسۡلَمۡتُ لِرَبِّ الۡعٰلَمِیۡنَ ۝ ۔(البقرۃ:۱۳۱)

کہ میں دو جہان کے پروردگار کا فرمانبردار ہوا۔

اور اپنی خواہشِ حاجت اور طلب کو محبوبِ حقیقی کی رضامندی پر قربان کر دیا۔ تو حکم ہوا!

قُلۡنَا یٰنَارُ کُوۡنِیۡ بَرۡدًا وَّ سَلٰمًا عَلٰۤی اِبۡرٰہِیۡمَ ۝ ۔(الانبیاء:۶۹)

یعنی اے آگ ابراہیم پر سلامتی کے ساتھ ٹھنڈی ہو جا۔

لکھا ہے کہ اگر اللہ جل شانہٗ برداً کے ساتھ سلاماً نہ فرماتے تو آگ برف سے بھی زیادہ ٹھنڈی ہو کر تکلیف کا باعث بن جاتی۔

آگ کے برداً وّسلاماً ہونے پر شبہ اور جواب:

بعض عقل کے بندوں کو خیال ہوسکتا ہے کہ آگ کس طرح اپنے جلانے کی خاصیت کو چھوڑ سکتی ہے۔ آگ کا ٹھنڈا ہو کر سلامتی کا باعث بن جانا کسی طرح بھی عقل میں نہیں آتا۔ مولانا روم صاحب نے مثنوی شریف میں ایسے ہی لوگوں کے اطمینان کے لئے ایک قصہ درج فرما کر اس پر چند عقلی دلیلیں دی ہیں۔ مختصراً قصہ یہ ہے کہ یہودیوں کا ایک بادشاہ عیسائیوں پر طرح طرح کے ظلم وستم کرتا ہے۔ اور آخر کار ایک بچے کو آگ میں جلایا جاتا ہے مگر آگ بچے کو کسی قسم کا نقصان نہیں پہنچاتی۔ اس واقعہ سے یہود بہت متاثر اور متعجب ہوتے ہیں۔ اور آگ کو مخاطب کر کے اس کے نہ جلانے کا سبب پوچھتے ہیں۔ آگ مولانا رومؒ کی زبان سے عقلی دلائل کے ساتھ لاجواب کر دیتی ہے۔ مولانا روم صاحب کی زبان سے یہود کا شکوہ اور آگ کا جواب سناتا ہوں۔ فرماتے ہیں۔

مے نہ بخشائی تو بر آتش پرست   آنکہ نہ پرستد ترا اوچوں برست
جادوئے کرداست کسے یا سیمیات   یا خلاف طبع تو از بخت ماست

یعنی اے آگ تو تو آتش پرست کو بھی نہیں چھوڑتی۔ تو پھر وہ جو تیری پرستش نہیں کرتا وہ کیسے چھوٹ سکتا ہے۔ کسی نے تجھ پر جادو کر دیا ہے۔ یا یہ کوئی شعبدہ ہے یا تیرا اخلاف طبع کام ہماری بدبختی کا باعث ہے۔ آگ نے جواب دیا۔

گفت آتش من ہمانم آتشم   اندر آتا توبہ بینی تابشم
طبع من دیگر نگشت و عنصرم   تیغ حقم ہم بدستورے برم

آگ نے کہا کہ میں وہی آگ ہوں تو اندر آتا کہ تجھے میری حرارت کا حال معلوم ہو۔ نہ میری خاصیت بدلی ہے اور نہ میری ماہیت میں کچھ فرق آیا ہے۔ مگر میں اللہ تعالیٰ کی تلوار ہوں اور اجازتِ ربی ہی سے کاٹ سکتی ہوں۔ اب اس کے بعد آگ عقلی دلیل پیش کرتی ہے اور کہتی ہے۔

بر در خرگاہ سگاں ترکماں   چاپلوسی کردہ پیش مہماں
در بجز گاہ بگذرد بیگانہ رو   جملہ بیند ازسگاں شیرانہ او

من زسگ کم نیستم در بندگی   کم زترکی نیست حق در زندگی

یعنی دیکھو ترکمانوں کے کتے جوان کے خیموں کے دروازوں پر پڑے رہتے ہیں۔ مہمانوں اور واقفوں کے ساتھ کس طرح خوشامد اور چاپلوسی سے پیش آتے ہیں۔ اور اگر کوئی اجنبی شخص خیمے کے پاس سے گزرتا ہے۔ تو کتے شیر کی طرح اس پر حملہ آور ہوتے ہیں۔ تو کیا میں فرمانبر داری میں کتوں سے کم ہو جاؤں۔ اور کیا حق تعالیٰ میری اس دنیوی حیات میں ترکی سے بھی کم مرتبہ ہے۔ کیا کتا تو اپنے ترکی مالک کے مہمانوں کا لحاظ رکھے۔ مگر میں مالک حقیقی کے مہمانوں کا لحاظ نہ رکھوں۔

اس پر مولانا روم صاحب فرماتے ہیں۔

باد و خاک و آب و آتش بندہ اند
بامن وتو مردہ باحق زندہ اند

ترجمہ: مٹی پانی اور آگ بندے ہیں۔ ہمارے اور تمہارے لیے بظاہر مردہ ہیں۔ مگر اللہ کے نزدیک زندہ ہیں۔

عناصر ہماری نظر میں مردہ مگر خدا کے نزدیک زندہ ہیں:

ہوا، مٹی پانی اور آگ اللہ جل شانہٗ کے بندے ہیں اور اگرچہ وہ ہماری آنکھوں میں مردہ معلوم ہوتے ہیں۔ مگر حق تعالیٰ کے سامنے زندہ ہیں اور زندوں ہی کی طرح امر و نہی خداوندی پر چلتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں۔

باد آتش مے شود از امر حق
ہر دو سر مست آمد نداز خمر حق

یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہوا آگ بن جاتی ہے کیوں کہ دونوں شرابِ حق سے مست ہیں اور فرمانِ ذیشان کے فرمانبر دار پھر آگے ہوا کے فرمانبر دار۔ ذی شعور اور تیغِ حق ہونے کو ہود علیہ السلام کے واقعہ سے ثابت فرماتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے!

ہود علیہ السلام کے قصے سے ہوا وغیرہ کا تعقل ثابت کرنا:

گر بنود ے واقف از حق جان باد   فرق کے کرد ے درمیان قوم عاد

یعنی اگر ہوا کی جان حق تعالیٰ سے واقف نہ ہوتی۔ تو وہ قومِ عاد کے درمیان فرق کیسے کر سکتی۔ واقعہ یوں ہے کہ ہود علیہ السلام کو قومِ عاد کی طرف پیغمبر بنا کر بھیجا گیا۔ قومِ عاد کے لوگ نہایت قد آور اور قوی ہیکل تھے۔ چنانچہ قرآن پاک میں آتا ہے!

”كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۚ۝“۔ (الحاقۃ: ۷)

گویا کہ وہ کھجور کے تنے تھے۔

آپ نے انہیں زمانہ دراز تک اللہ تعالیٰ کی طرف بلایا۔ مگر وہ اپنے مال و دولت، شان وشوکت اور رزو رِقوت میں ایسے سرشار تھے کہ سوائے سترہ آدمیوں کے کسی نے بھی آپ کی دعوت کو قبول نہ کیا۔ آخر جب ان کی سرکشی اور نافرمانی حد سے بڑھ گئی۔ تو اللہ جل شانہٗ کی طرف سے ایک نہایت سخت و تند ہوا کو بھیجا گیا جس کی وجہ سے تمام کے تمام مشرکین ہلاک ہو گئے۔ چنانچہ سورۃ الحاقہ میں آتا ہے!

وَ اَمَّا عَادٌ فَاُهْلِكُوْا بِرِيْحٍ صَرْصَرٍ عَاتِيَةٍ ۙ۝ سَخَّرَهَا عَلَيْهِمْ سَبْعَ لَيَالٍ وَّ ثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ ۙ حُسُوْمًا ۙ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى ۙ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ ۚ۝۔ (الحاقۃ: ۷،۶)

یعنی قوم عاد کو نہایت تند ہوا سے ہلاک کر دیا گیا۔ اور اسے ان پر سات راتیں اور آٹھ دنوں تک چلایا۔ جو ان کے مکانات بروج آبادیوں اور عمروں کے نشانوں کو مٹاتی تھی۔ پس تو لوگوں کو کھوکھلی کھجوروں کے تنوں کی طرح پڑا ہوا دیکھتا۔

مگر ہود علیہ السلام نے بموجب ارشاد خداوندی کے تمام مسلمانوں کو ایک جگہ جمع کر کے ان کے اردگرد ایک لکیر کھینچ دی۔ جب وہ تند اور مہلک ہوا اس خط کے پاس پہنچتی تو بادِ صبا کی طرح نرم اور خوشگوار بن جاتی۔ اس پر مولانا روم صاحب فرماتے ہیں کہ! اگر ہوا میں شعور اور فرمانبرداری کا مادہ نہ ہوتا تو وہ کس طرح خط کو غیر خط سے اور مشرک کو مومن سے تمیز کر سکتی۔ فرماتے ہیں۔

ہود گرد مومناں خطے کشید   نرم مے شد باد کانجامے رسید

ہر کہ بیروں بود ازاں خط جملہ را   پارہ پارہ مے گست اندر ہوا

ترجمہ: حضرت ہود علیہ السلام نے مومنوں کے اردگرد ایک لکیر کھینچی، جب ہوا وہاں پہنچی تو نرم ہوگئی، جو کوئی اس لکیر (دائرہ) سے باہر تھا اُن تمام کو ہوا نے پارہ پارہ کر دیا (وہ ہوا کے اندر ریزہ ریزہ ہو گئے)

اس بیان سے نتیجہ نکلا کہ عناصر میں ضرر تعقل اور تفہم ہے۔ وہ اگرچہ ہمارے نزدیک جمادات (پتھر) ہیں مگر باری تعالیٰ کے سامنے وہی حیات ہیں۔ تو اب ابراہیم کی آگ کے ٹھنڈے ہونے کا شبہ تفصیل کے ساتھ زائل ہوگیا۔ اس واسطے پھر اس بیان کو مکمل کرنے کے لئے پہلے مضمون کی طرف رجوع کیا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جواب کے نکات:

نکتہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کا جواب غور کرنے کے قابل ہے۔ اور اس میں چند ایک نہایت مفید نکات ہیں۔ جنہیں میں اس مقام پر بیان کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔

اوّل: جب آپ سے حضرت جبرائیل علیہ السلام نے پوچھا۔ کہ کیا آپ کو کچھ حاجت ہے تو آپ نے یوں نہیں فرمایا کہ مجھے کچھ حاجت نہیں۔ بلکہ یوں فرمایا کہ حاجت تو ہے مگر تجھ سے نہیں۔ کیونکہ غناءِ حقیقی تو ذاتِ باری ہی کا خاصہ ہے۔ بندہ تو اس ناپائیدار زندگی کے لمحہ لمحہ پر محتاج ہے۔ ہاں البتہ خاص اور عام بندوں کی احتیاج میں ضرور فرق ہوتا ہے۔ خواص ہر حالت میں اپنی نظر اللہ جل شانہٗ ہی پر رکھتے ہیں۔ وسائط اور اسباب ان کی نظر میں کالعدم ہوتے ہیں۔ مگر عوام اللہ تعالیٰ کو مؤثرِ حقیقی سمجھتے ہوئے اسباب اور وسائل سے تمسک کرتے ہیں۔

دوم: جبرئیل علیہ السلام نے جب دیکھا کہ آپ مجھ سے کچھ نہیں چاہتے تو عرض کی کہ پھر باریِ تعالیٰ سے عرض مطلب فرمائیے۔ اس پر آپ نے جواب دیا کہ وہ میری حاجت سے واقف ہے۔ اس لئے مجھے اپنی حاجت کے بیان کرنے کی کوئی ضرورت نہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ مشاہدۂ جمالِ ذوالجلال میں بالکل محو تھے اور رب العزت کو اپنے سوال سے بھی زیادہ قریب پاتے تھے۔ سچ کہا ہے!

"وَ نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ ۝۔ (ق:۱۶)

یعنی ہم انسان کی شہ رگ سے بھی زیادہ اُس کے قریب ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں!

اتصالے بے تکیف بے قیاس ہست رب الناس را با جان ناس

یعنی اللہ تعالیٰ مخلوقات سے ایسے متصل ہیں کہ اس اتصال کی نہ تو کیفیت بیان کی جا سکتی ہے۔ اور نہ ہی وہ قیاس میں آسکتا ہے۔ تو چونکہ سوال عرضِ مطلب کا واسطہ تھا۔ اس واسطے آپ نے اس واسطے کو بھی ترک فرمایا۔

صوفی وہ ہے جسے اللہ سے بھی حاجت نہ ہو اور اس کی توضیح:

اسی واسطے صوفیائے کرام کا مقولہ ہے کہ!

صوفی حقیقی معنوں میں تب ہی کامل صوفی ہوتا ہے کہ جب اسے اللہ سے بھی کوئی حاجت نہیں رہتی۔

اور اس جملہ کے صوفیاء نے بہت سے معنی کئے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہاں نفی ہے حاجت کی نہ کہ احتیاج کی۔ یعنی چونکہ صوفی جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے پیدا کرنے سے پہلے روزِ اوّل میں میری تمام ضروریات و حاجات کا بندوبست فرما دیا ہے۔ اس لئے پھر دوبارہ ان کو طلب کرنا طالب کے عقیدہ کی کمزوری کی دلیل ہے۔ اس واسطے اگرچہ وہ محتاج تو ہوتا ہے مگر احتیاج کے بندوبست ہو جانے کے باعث پھر وہ اپنی حاجت کا ذکر ہی نہیں کرتا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود ذاتِ خداوندی کا طالب ہوتا ہے۔ اس سے وہ سوائے اس کے اور کوئی حاجت نہیں مانگتا۔ اور اللہ کے طالب اور اللہ سے طالب ہونے میں بہت بڑا فرق ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ حاجت اسے ہوتی ہے۔ جو خواہش رکھتا ہو اور جس نے اپنی خواہش اور طلب کو اللہ تعالیٰ کے فرمانِ عالیشان کے ماتحت کر دیا ہو۔ اور اس کی مراد اللہ کی مراد اور اس کا مطلوب اللہ کا مطلوب ہو گیا ہو۔ تو پھر اسے اللہ تعالیٰ سے کسی حاجت یا ضرورت کے طلب کرنے کا کیا حق رہتا ہے۔ وہ مقام رضا کے غلبہ کی وجہ سے کسی حاجت کا بیان کرنا معشوقِ حقیقی کی نافرمانی سمجھتا ہے۔

اسی مقام رضا کے غلبہ کی وجہ سے ابراہیم علیہ السلام نے ”حسبی من سوالی علمہ بحالی“ فرما کر اپنی حاجت کے بیان سے احتراز فرمایا۔ مگر چونکہ انہوں نے مقامِ رسالت کا پورا پورا حق ادا کیا کہ احتیاج بھی ظاہر فرمائی اور غیر اللہ سے استغنا بھی برتی اس لئے باری تعالیٰ نے انہیں اپنے ہی دروازے سے غنی فرمایا اور آپ کی حاجت کو پورا کر دیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قید کا نمازی کی قید سے مقابلہ:

لطیفہ: حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نمرود نے جب ہاتھ پاؤں باندھ کر آگ میں ڈالا اور جبرائیل علیہ السلام استفسارِ حال کے لئے حاضر خدمت ہوئے تو آپ نے فرمایا کہ مجھے اور کسی کی مدد کی ضرورت نہیں۔ میں صرف ذاتِ خداوندی ہی کی مدد کا محتاج ہوں تو آپ پر فوراً اس آگ کو گلزار بنا دیا گیا۔ اور اس بھڑکتی ہوئی آگ کو برداً وسلاماً کر دیا گیا۔

اسی طرح جب مومن بھی اپنے ہاتھوں کو باندھ کر پاؤں کو قید کر کے دربارِ الٰہی میں کھڑا ہو جاتا ہے۔ کھانا پینا اور بات چیت چھوڑ دیتا ہے۔ زبان ذکرِ الٰہی میں مشغول اور دل یادِ خدا میں مصروف ہو جاتا ہے۔ اور پھر اسبابِ ظاہریہ سے قطع نظر کر کے ایاک نستعین کہتا ہے۔ تو اسے ابراہیم علیہ السلام کی آتشِ نمرودی کی طرح نارِ جہنم کے برداً وسلاماً ہونے کی بشارت دی جاتی ہے۔ چنانچہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جب مومن پل صراط سے گزریگا۔ تو نیچے سے دوزخ شور مچا کر کہے گی:

”جُزْ یَا مُؤْمِنُ فَقَدْ اَطْفَاَ نُوْرُكَ لَهَبِی۔

(معجم الکبیر: الجزء۱۶، رقم: ۱۸۱۲۴)

یعنی اے مومن مہربانی کر کے میرے اوپر سے جلدی گزر جا۔ کیونکہ تیرے نور کی وجہ سے میرا شعلہ بجھتا ہے۔ مولانا روم اس کا یوں ترجمہ فرماتے ہیں۔

گویدش بگذر سبک اے محتشم ورنہ ز آتشہائے تو مرد آتشم

ترجمہ: دوزخ کی آگ اُس سے کہتی ہے اے محتشم تیزی سے گزر ورنہ تیرے (عشق کی) آگ سے میری آگ بجھ جائے گی۔

استعانتِ عامہ کا دوسرا درجہ:

اب اس کے بعد استعانتِ عامہ کے دوسرے درجے کے لوگوں کے متعلق بیان کرتا ہوں۔ یہ گروہ وسائل اور وسائط کو استعمال تو کرتے ہیں۔ مگر وہ ان کو محض وسیلہ اور سبب ہی کی حیثیت سے دیکھتے

ہیں۔ وہ مؤثر حقیقی تو رب العزت ہی کو سمجھتے ہیں۔ مگر ان اسباب اور وسائل کو اس کی مدد کے مظاہر ٹھہراتے ہیں۔ مثلاً وہ طبیب سے علاج کراتے ہیں۔ مگر شافیٔ مطلق حق تعالیٰ ہی کو سمجھتے ہیں۔ البتہ اس علاج کو شفائے خداوندی کا ایک مظہر سمجھتے ہیں۔ اور یہ استعانت شریعت نے جائز رکھی ہے۔ کیونکہ یہ استعانت حقیقت میں استعانتِ بالغیر نہیں۔ بلکہ استعانت باللہ ہی ہے۔ کیونکہ اس استعانت میں وسیلہ یا ذریعہ کا وجود محض ایک مظہر اعانتِ خداوندی کی حیثیت سے ہوتا ہے۔

اسی واسطے تو قرآن پاک میں آتا ہے!

”وَاسۡتَعِیۡنُوۡا بِالصَّبۡرِ وَالصَّلٰوۃِ ؕ“۔ (البقرۃ:۴۵)

یعنی نماز اور صبر کے ساتھ مدد چاہو۔

اب یہ استعانتِ بالغیر کی تعلیم نہیں دی جارہی۔ بلکہ صبر اور صلٰوۃ جو اللہ تعالیٰ کی مدد حاصل کرنے کے کامل ترین مظاہر ہیں بیان فرمائے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے!

”اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیۡنَ۔ (انفال:۴۶)

کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

یا دوسرے الفاظ میں میری مدد صبر کرنیوالوں کو شامل حال ہے۔ تو گویا صبر کو خود رب العزت نے اپنی اعانت کا مظہر قرار دیا۔ اسی پر نماز کے مظہر اعانت ہونے کو سمجھ لو۔

انبیاء اور اولیاء سے استعانت اور اس کی تشریح:

انبیاء اور اولیاء سے استعانت کرنا اور یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ خدا کے مقبول اور مستجاب بندے ہیں۔ اور باذن الٰہی ”فَالۡمُدَبِّرٰتِ اَمۡرًا ۙ﴿۵﴾۔ (النازعات:۵)

پھر کام کی تدبیر کریں“

سے تعلق رکھتے ہیں۔ استعانتِ بالغیر نہیں بلکہ وسیلہ وسبب کے تحت میں آ کر یہ استعانت بھی دوسرے درجے کی استعانتِ عامہ میں داخل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ مسلمان مستعین ان کو محض وسیلہ اور سبب سمجھتا ہے۔ اور وہ یقین رکھتا ہے کہ بغیر اجازتِ خداوندی کے ایک ذرہ تک نہیں ہل سکتا۔

”لَا تَتَحَرَّكُ ذَرَّةٌ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ “۔

اور بغیر اس کی عطاء کے کوئی ایک حبہ تک نہیں دے سکتا۔

”اَمَّنْ هٰذَا الَّذِیْ یَرْزُقُكُمْ اِنْ اَمْسَكَ رِزْقَهٗ ۚ “۔(الملک:۲۱)

بھلا وہ کون ہے جو تمہیں رزق دے اگر وہ اپنے رزق کو روک دے۔

مگر جس طرح دنیا میں کسی بادشاہ کے مقربین کو عوام سے زیادہ اختیار دیے جاتے ہیں۔ تا کہ وہ بادشاہ کے اذن سے ان اختیارات کو استعمال کر کے عوام پر اپنے شاہی قرب کو ظاہر کر سکیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ جل شانہ بھی انبیاء و اولیاء کو بعض اس قسم کے اختیارات دیتے ہیں کہ جن کے ظاہر ہونے سے مخلوقات کو یقین ہو جاتا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے ہیں۔

دنیا کی مثال پر غور کرو۔ فرض کرو کہ ایک شخص کسی بادشاہ کا بڑا مقرب اور ندیم ہو۔ بادشاہ نے اسے اختیار دیا ہوا ہو کہ اگر تمہارے پاس کوئی عرضی لائے تو تم کو میری اجازت ہے کہ خواہ اس عرضی کو قبول کرو یا نامنظور۔ اب اگر کسی شخص کو یہ مقرب عرضی منظور کر کے کچھ انعام دیتا ہے تو یہ انعام بادشاہ ہی کا دینا کہلائے گا۔ اور اگر وہ کسی کی درخواست کو نامنظور کر کے اسے سزا دیتا ہے تو یہ سزا بھی بادشاہ ہی کی طرف سے سمجھی جائیگی۔ کیونکہ یہ منظوری و نامنظوری اور جزا و سزا کا اختیار بادشاہ کا دیا ہوا ہے وہ بالاستقلال نہ تو کسی کو سزا دے سکتا ہے نہ جزا۔

قرآن پاک میں بعض رسولوں کے اختیارات کو بالوضاحت بیان بھی کر دیا گیا ہے۔ مثلاً داؤد علیہ السلام کے متعلق آتا ہے!

”وَّ سَخَّرْنَا مَعَ دَاوٗدَ الْجِبَالَ یُسَبِّحْنَ وَ الطَّیْرَ ؕ وَ كُنَّا فٰعِلِیْنَ () “۔(الانبیاء:۷۹)

یعنی ہم نے پہاڑوں اور پرندوں کو داؤد علیہ السلام کا مسخر بنایا۔ جو ان کے ساتھ تسبیح پڑھا کرتے تھے اور یہ ہم ہی کرنے والے تھے۔ حضرت داؤد علیہ السلام تو ہماری اس طاقت اور قدرت کا کہ ہم پہاڑوں کی زبان بے لسان سے بھی تسبیح کرا سکتے ہیں۔ صرف ایک مظہر تھے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہوتا ہے!

”وَلِسُلَيْمٰنَ الرِّيْحَ عَاصِفَةً تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖۤ اِلَى الْاَرْضِ الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَكُنَّا بِكُلِّ شَيْءٍ عٰلِمِيْنَ () ۔ (الانبیاء:۸۱)

اور سلیمان علیہ السلام کے لئے ہوا کو مسخر کیا جو ان کے حکم سے ارض مبارکہ کی طرف چلتی تھی اور ہم ہر چیز کے جاننے والے ہیں۔

”وَمِنَ الشَّيٰطِيْنِ مَنْ يَّغُوْصُوْنَ لَهٗ وَيَعْمَلُوْنَ عَمَلًا دُوْنَ ذٰلِكَ ۚ وَكُنَّا لَهُمْ حٰفِظِيْنَ
(الانبیاء:۸۲)

اور ان کے لیے دیو مسخر تھے جو ان کے لئے دریا میں غوطہ لگاتے تھے اور اس کے علاوہ دوسرے کام بھی کرتے تھے۔ اور ہم ان کی حفاظت کرنے والے تھے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے قدرت دی ہوئی تھی کہ وہ کیچڑ سے پرندہ بناتے اور پھونک مارتے تو وہ زندہ ہوجاتا۔ وہ اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کر دیتے۔ وہ مردوں کو جلا دیتے۔ مگر ان سب کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا اِذن اور اختیار متعلق ہوتا تھا۔ وہ مستقلاً نہ یہ کام کرتے تھے نہ کر سکتے تھے۔ چنانچہ قرآن پاک میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنے اختیارات کی نسبت فرماتے ہیں!

”اَنِّيْۤ اَخْلُقُ لَكُمْ مِّنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ فَاَنْفُخُ فِيْهِ فَيَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْيِ الْمَوْتٰى بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ ۙ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ؕ
(آل عمران:۴۹)

دیکھئے ہر جگہ ہر بات کے بعد باذن اللہ کو لایا گیا ہے کہ کہیں عیسیٰ علیہ السلام کو مستقلاً ان چیزوں کا کرنے والا نہ سمجھا جائے۔ لیکن اس کے باوجود کہ وہ صرف باذنِ اللہ ان افعال کے مظہر ہیں۔ ان افعال کو اپنی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مجازاً کسی فعل کو بوجہ مظہر ہونے کے اپنی طرف منسوب کرنا جائز ہے۔ دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق آتا ہے!

اَنْ اَغْنٰهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۔ (التوبۃ:۷۴)

ان کو اللہ اور اس کے رسول نے غنی کر دیا۔

اس جگہ اللہ تعالیٰ نے اَغۡنٰىا میں اپنے ساتھ اپنے رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کو بھی شامل فرمایا ہے۔ حالانکہ حقیقی طور پر مغنی تو اللہ تعالیٰ ہی ہے۔

ہاں حضور ﷺ مظہر ہیں اغناء الٰہیہ کے، اس واسطے اغنا کی نسبت آپ ﷺ کی طرف بھی کر دی گئی اور اس قسم کی مثالوں سے قرآن مجید بھرا ہوا ہے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام کے متعلق ہی دیکھو جب بی بی مریم علیہ السلام کے پاس آتے ہیں تو فرماتے ہیں!

’’اِنَّمَاۤ اَنَا رَسُوۡلُ رَبِّكِ ۖ لِاَهَبَ لَكِ غُلٰمًا زَكِيًّا ۝‘‘۔ (مریم:۱۹)

میں تیرے رب کا بھیجا ہوا ہوں۔ تا کہ تجھے ایک پاکیزہ لڑکا بخشوں۔

دیکھئے یہاں پر حضرت جبرئیل علیہ السلام لڑکا دینے کو اپنی طرف منسوب فرما رہے ہیں۔ حالانکہ یہ بخشش حق تعالیٰ کی طرف سے ہو رہی ہے مگر چونکہ جبرائیل علیہ السلام اُس بخشش کے مظہر ہیں اس واسطے وہ مجازاً ’’لِاَهَبَ لَكِ‘‘ فرما رہے ہیں۔

تو اس سب بیان سے یہ نتیجہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ اپنے خاص بندوں کو بعض بعض مخصوص اختیارات عطا فرماتے ہیں کہ جس کے باعث وہ عام مخلوقات میں ممتاز نظر آتے ہیں۔ لیکن اس بات کو پھر بھی ذہن میں محفوظ رکھیں کہ یہ تمام اختیارات اللہ تعالیٰ کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ ان میں بالاستقلال نہ تو کسی کو نفع پہنچانے کی طاقت ہے نہ نقصان کی۔ چنانچہ مولانا روم صاحب فرماتے ہیں ع

توز قرآن باز جو تفسیر بیت   گفت ایزد وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ
گر بپرا نیم تیر آں کے زمانست   ما کمان و تیر اندازش خدا است

یعنی اگر مقربین کے اختیارات وخوارق کے من اللہ ہونے کی تجھے دلیل درکار ہے۔ تو قرآن پاک میں:

’’فَلَمۡ تَقۡتُلُوۡهُمۡ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمۡ ۖ وَمَا رَمَيۡتَ اِذۡ رَمَيۡتَ وَلٰـكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ‘‘۔

کی آیت کو پڑھ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اگر ہم تیر پھینکیں تو وہ ہماری طرف سے نہیں بلکہ ہم تو کمان کی طرح ہیں۔ اور حقیقت میں تیر چلانے والا حق تعالیٰ ہے۔ یعنی جس طرح کمان آلہ ہے رمی کا اور مؤثر تیر انداز ہے۔ اسی طرح ہم بھی آلہ ہیں افعال کا۔ فاعلِ حقیقی یا خالق الافعال تو باری تعالیٰ ہے۔

قُربِ نوافل میں عبد آلہ اور معبود فاعل بن جاتا ھے:

”فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠“۔ (انفال: ۱۷)

یعنی تم نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا۔ اور

”وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ۔ (انفال: ۱۷)

اور اے پیغمبر آپ نے تیر نہیں پھینکا جبکہ پھینکا۔ بلکہ اللہ نے پھینکا۔

مجاہدین اور رسول اکرم ﷺ کے فعل کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا اور ان کو محض آلہ اور مصدر فعل ٹھہرایا۔ چنانچہ ایک حدیث شریف میں آتا ہے:

عَنْ أَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صلى الله عليه وسلم: إِنَّ اللّٰهَ قَالَ مَنْ عَادَى لِي وَلِيًّا فَقَدْ آذَنْتُهُ بِالْحَرْبِ وَمَا تَقَرَّبَ إِلَيَّ عَبْدِي بِشَيْءٍ أَحَبَّ إِلَيَّ مِمَّا افْتَرَضْتُ عَلَيْهِ وَمَا يَزَالُ عَبْدِي يَتَقَرَّبُ إِلَيَّ بِالنَّوَافِلِ حَتَّى أُحِبَّهُ فَإِذَا أَحْبَبْتُهُ كُنْتُ سَمْعَهُ الَّذِي يَسْمَعُ بِهِ وَبَصَرَهُ الَّذِي يُبْصِرُ بِهِ وَيَدَهُ الَّتِي يَبْطُشُ بِهَا وَرِجْلَهُ الَّتِي يَمْشِي بِهَا وَإِنْ سَأَلَنِي لأُعْطِيَنَّهُ۔

(صحیح بخاری: الجزء ۸، کتاب بدء الوحی، رقم: ۶۵۰۲، دار الشعب قاھرہ)

یعنی حضرت ابو ھریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا حضور ﷺ نے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جو شخص میرے ولی کا دشمن ہو تو میں اسے لڑائی کا چیلنج دیتا ہوں۔ اور میرے بندے نے اس فرض کے ادا کرنے سے جو میں نے اس پر مقرر کیا ہے بڑھ کر اور کسی شے سے جو میرے نزدیک زیادہ عزیز ہے مجھ تک تقرب حاصل نہیں کیا۔ اور میرا بندہ ہمیشہ نوافل سے میرے ساتھ تقرب حاصل کرتا ہے۔ یہاں تک کہ میں اس کو دوست بنا لیتا ہوں دوست بنا لینے کے بعد میں اس کے کان بن جاتا ہوں جن سے وہ سنتا ہے۔ میں اس کی آنکھ بن جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے۔ میں اس کے ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے۔ اور میں اس کے پاؤں بن جاتا ہوں جس سے کہ وہ چلتا ہے اور مجھ سے وہ کچھ مانگتا ہے تو میں اس کو ضرور دیتا ہوں۔

یہ درجہ صوفیاء کی اصطلاح میں قربِ نوافل کہلاتا ہے۔ اس میں عبد کی ہستی ایسی مضمحل اور فنا ہو جاتی ہے۔ کہ صرف اس کا نام ہی نام ہوتا ہے۔ اور افعال و اعمال میں محض ایک آلہ کی حیثیت رہ جاتا ہے۔ مولانا

رومؒ فرماتے ہیں۔

اللہ اللہ گفتہ اللہ میشود
ایں سخن حق است باللہ مے شود

ترجمہ: اے مسلمان تو اتنا اللہ اللہ کر کے خود اللہ کی صفات کا مظہر بن جا خدا کی قسم اللہ اللہ کرنے والا خود اللہ (کی صفات کا مظہر) ہو جاتا ہے

اس درجہ میں جبکہ عبد آلہ اور معبود فاعل بن جاتا ہے۔ سالک کو نہایت عجیب وغریب تصرفات اور اختیارات سے نواز دیا جاتا ہے۔ اور اسکی حالت مولانا روم کے اس شعر کے مطابق ہو جاتی ہے یعنی ۔

اولیاء راہست قدرت ازالہ
تیر جستہ باز گردانند زراہ

اللہ کے دوستوں کو حق تعالیٰ کی طرف سے ایسی قوت اور طاقت عطا کی جاتی ہے کہ وہ کمان سے نکلے ہوئے تیر کو بھی واپس کر سکتے ہیں۔

ارہاص، معجزہ، کرامت، معونت اور استدراج کا فرق:

اس عطائی قوت کے باعث جو خوارق انبیاء سے ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ اگر دعوٰی نبوت سے پہلے صادر ہوں تو ارہاص کہلاتے ہیں۔ ورنہ معجزہ۔ اور اگر یہ خلافِ عادت کام نبی کے کسی ممتاز پیرو سے ظاہر ہوں تو کرامت کہلاتا ہے۔ اور اگر کسی مومن صالح سے ظہور پذیر ہو تو اسے معونت کہتے ہیں۔

اُمت کے لوگوں کے خلافِ عادت اُمور ان کے نبی کے معجزہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اور اس کے دعویٰ رسالت کی سچائی پر بطور ثبوت پیش کئے جاسکتے ہیں۔ کیونکہ اُمتی اپنے نبی کی مکمل پیروی ہی سے ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچ سکتا ہے۔ اور اگر ایسا ہی خوارق عادت کسی کافر سے ظاہر ہو تو استدراج کہلاتا ہے۔ اگر یہ کافر ان استدراجات کے ذریعے نبوت کا دعویٰ کرے تو فوراً ان کا اثر پلٹ جاتا ہے۔ اول تو اس سے خوارق ظاہر ہونے بند ہو جاتے ہیں اور اگر ہوں بھی تو اس کو رسوائے عام کرنے کے لئے ہمیشہ اس کی خواہش کے مخالف صادر ہوتے ہیں۔

انبیاء واولیاء مرتے نہیں بلکہ ان کی موت نقل مکانی ہے:

انبیاء واولیاء سے ان کی زندگی کے علاوہ رحلت کے بعد بھی استعانت کی جاسکتی ہے۔ کیونکہ ان کی حیات وممات میں کچھ فرق نہیں ہوتا۔ بلکہ بمطابق حدیث پاک:

اَوْلِیَاءُ اللّٰہِ لَا یَمُوْتُوْنَ وَلٰکِنْ یُنْقَلُوْنَ مِنْ دَارٍ اِلٰی دَارٍ ”

(تفسیر الرازی: الجزء ۹، آلِ عمران، ص ۴۲۷، داراحیاء التراث العربی بیروت)

(مرقاۃ المفاتیح: جلد ۳، رقم: ۱۳۶۶، باب الجمعۃ، دارالفکر بیروت)

وہ فوت نہیں ہوتے بلکہ ایک مکان سے دوسرے مکان میں منتقل ہوجاتے ہیں۔ جیسے کوئی آدمی ایک گھر چھوڑ کر دوسرے گھر میں جابسے۔ اسی طرح انبیاء واولیاء بھی اس دار دنیا کو چھوڑ کر دار آخرت میں جا آرام فرماتے ہیں۔ حافظ شیرازی فرماتے ہیں۔

ہر گز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

ترجمہ: وہ کبھی نہیں مرتا جس کا دل عشق سے زندہ ہوگیا، ہمارا (عشاق کا) دوام دنیا کی تاریخ میں ثبت ہو چکا ہے۔

قرآن پاک میں آتا ہے!

”وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوٰتٌ ط بَلْ اَحْیَآءٌ وَّلٰکِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ()

(البقرۃ: ۱۵۴)

یعنی جولوگ اللہ کے رستے میں مارے گئے ہیں تم انہیں مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم نہیں جانتے۔

اللہ تعالیٰ کے رستے میں مرنا دوطرح کا ہے۔ ایک تو جہادِ اصغر کے ذریعہ اپنی گردن کٹوانا یعنی اسلام کی حفاظت اور دفاع کے لئے مشرکین اور کافروں سے لڑ کر اپنی جان کو قربان کرنا۔ دوسرے جہاد اکبر میں اپنے نفس کو معشوق حقیقی پر بھینٹ چڑھانا۔ اور وہ یہ ہے کہ اپنے نفس کی خواہشوں کو پامال کرے۔ اس مغرور ومتکبر کو اللہ جل شانہٗ کے احکام کے سامنے جھکادے۔ اور حقیقت میں یہی بڑا جہاد ہے کیونکہ گردن کے کٹنے

میں تو ایک سیکنڈ کے اندر موت طاری ہو جاتی ہے۔ ہاں زندہ رہ کر مرجانا اور ”مُوْتُوْا قَبْلَ اَنْ تَمُوْتُوْا“ (مرقاۃ المفاتیح: ۸، رقم: ۵۲۰۰، کتاب الرقاق، دار الفکر بیروت) کا مصداق ہو جانا بہت بڑا جہاد ہے۔

بوالعجب قومے کہ پیش از مردن خود مردن اند
پیش ازاں کاید نویدے رخت آنجا بردہ اند

قاضی ثنا اللہ صاحب پانی پتی اپنی مشہور و معروف کتاب ”تذکرۃ الموتی“ میں اسی آیت کے متعلق فرماتے ہیں کہ!

”حکم مخصوص بشہدا نیست بلکہ انبیا و صدیقاں از شہدا افضل اند، و اولیاء ہم در حکم شہدا اند۔ زیرا کہ جہاد با نفس کردہ اند، کہ اکبر جہاد است“

یعنی آیت ”لِمَنْ یُّقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللہِ“ کا حکم شہیدوں ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ انبیاء اور صدیق شہدا سے افضل ہیں۔ اور اولیاء بھی شہیدوں کے حکم میں داخل ہیں کیونکہ انہوں نے نفس کے ساتھ جہاد کیا جو کہ بہت بڑا جہاد ہے۔ (تذکرۃ الموتی والقبور، مترجم ص ۸۲، واحد بک ڈپو کراچی)

اسی واسطے حضور ﷺ جب جہاد سے واپس آئے تو آپ نے فرمایا!

”رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَی الْجِهَادِ الْاَکْبَرِ“۔

(مرقاۃ المفاتیح، الجز ۶، کتاب الجہاد، فصل اوّل، دار الفکر بیروت)

کہ ہم چھوٹے جہاد سے کہ جنگ کفار ہے بڑے جہاد کی طرف کہ مجاہدۂ نفس ہے لوٹے۔

اس حدیث پاک کی رو سے اولیائے عظام تو شہدائے اکبر ٹھہرے۔ تو جب شہدائے اصغر نہیں مرتے تو پھر شہدائے اکبر کی زندگی کا انتقال دنیا کے بعد کیا کہنا۔

کشتگان خنجرِ تسلیم را — ہر زماں از غیب جانے دیگر است

ترجمہ: جو تسلیم و رضا کے خنجر سے مقتول ہو جائیں۔ انھیں غیب سے ہمہ وقت نئی زندگیاں عطا ہوتی رہتی ہیں۔

پس ان سے استعانت کرنا گویا حقیقی زندوں سے استعانت کرنا ہے۔ لیکن افسوس کہ آج کل کفار اور نصرانی

ڈاکٹروں سے جن کو قرآن مردہ کہتا ہے استعانت کیجاتی ہے۔ مگر وہ جو حقیقت میں زندہ اور باقی باللہ ہیں ان کی استعانت کو باعتقاد توسل وتسبب بھی شرک وکفر قرار دیا جاتا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں!

”مَثَلُ الَّذِی یَذْ کُرُ رَبَّہٗ وَالَّذِی لَا یَذْ کُرُ رَبَّہٗ مَثَلُ الْحَیِّ وَالْمَیِّتِ “۔

(صحیح بخاری: الجزء، ۸، رقم: ۶۴۰۷، کتاب بدء الوحی، دار الشعب قاھرہ)

تو حقیقی زندہ تو واسلینِ حق تعالیٰ ہیں خواہ وہ یہاں ہوں یا وہاں۔ مردے تو ہم ہیں کہ ہمارا جسم ہمارا قلب اور ہمارا دماغ ذکرِ الٰہی کی روح سے محروم ہے ۔

زندگی نتواں گفت حیاتے کہ مراہست
زندہ آنست کہ بادوست وصالے دارد

ترجمہ: ہماری جو زندگی ہے اُسے زندگی نہیں کہا جا سکتا۔ زندہ درحقیقت وہ ہے جو اپنے دوست کے ساتھ وصال رکھتا ہے جسے اپنے محبوبِ حقیقی کا وصال حاصل ہے۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ!

”استمداد کردہ شود بوے درحیات استمداد کردہ می شود بوے بعد از وفات۔

ترجمہ: جس سے زندگی میں مدد مانگی جائے اس سے بعد وفات بھی مدد مانگی جائے گی۔

(اشعۃ اللمعات، ص: ۷۱۵، ج: ۱)

روایت ہے کہ!

”اِذَا تَحَیَّرْتُمْ فِی الْاُمُوْرِ فَاسْتَعِیْنُوْا بِاَھْلِ الْقُبُوْرِ “۔

(مرقاۃ المفاتیح: الجزء، ۴، باب زیارۃ القبور، رقم: ۱۷۶۹، دار الفکر بیروت)

یعنی جب تم کسی کام میں حیران وسرگردان ہو جاؤ تو اصحاب قبور سے مدد مانگو۔

پھر یہی نہیں بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے طبرانی میں ایک اور حدیث بروایت عتبہ بن مروان بایں الفاظ آتی ہے:

”اِذَا اَضَلَّ اَحَدُکُمْ شَیْئًا اَوْ اَرَادَ اَحَدُکُمْ عَوْنًا وَھُوَ بِاَرْضٍ لَیْسَ بِھَا اَنِیْسٌ، فَلْیَقُلْ: "یَا عِبَادَ

اللّٰهِ اَغِيْثُوْنِي، يَا عِبَادَ اللّٰهِ اَغِيْثُوْنِي، فَاِنَّ لِلّٰهِ عِبَادًا لا نَرَاهُمْ ''۔

(معجم الکبیر: ، الجز، ۱۷، رقم: ۲۹۰، مکتبۃ ابن تیمیہ قاھرہ)

یعنی جب تم میں سے کسی کی کوئی چیز گم جائے اور وہ مدد کا طالب ہو مگر جگہ ایسی ہو کہ وہاں پر اس کا کوئی رفیق نہیں تو تین دفعہ یوں کہے اے اللہ کے بندو میری مدد کرو۔ کیونکہ اللہ کے بعض بندے ایسے بھی ہیں جن کو وہ نہیں دیکھتا۔

اس حدیث پاک سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ استعانت بعباد اللہ جائز ہے اور اولیائے کرام حیات و ممات میں عبدیت کے کامل افراد ہونے کی وجہ سے استمداد کے بلا شبہ اہل ہیں۔

مولانا روم صاحب فرماتے ہیں۔

آب خواہ از جو بجو یا از سبو   کاں سبورا ہم مدد باشد زجو
نور خواہ ازمہ طلب خواہی زخور   نور مہ ہم زآفتاب است اے پسر

یعنی خواہ پانی نہر سے لے یا ٹھلیا سے کیونکہ ٹھلیا میں بھی نہر ہی سے آیا ہے اسی طرح چاند سے اجالا حاصل کر یا آفتاب سے کیونکہ چاند کا نور بھی سورج ہی سے مستعار ہے۔ اسی طرح استعانتِ مقربین بھی استعانتِ غیر اللہ نہیں بلکہ ان کی طاقت کا سرچشمہ بھی وہی قادر مطلق ہے اس لیے انبیاء و اولیاء سے استمداد جائز ہے مگر بایں شرط کہ ان کو مستقل حاجت روا نہ سمجھے بلکہ ان کو آلہ، واسطہ، توسل اور سبب سمجھ کر استعانت کرے کیونکہ غیر اللہ کو مستقل حاجت روا یا کار برآر سمجھنا شرک اور کفر ہے۔ اور میرے خیال میں ایسا کوئی مسلمان نہ ہوگا جو ان کو بالاستقلال قاضی الحاجات سمجھ کر طالبِ امداد ہوتا ہو۔

اولیاء اللہ کی محبت:

آج کل کی آزاد خیالی کا ایک یہ نتیجہ بھی ہے کہ ہم میں سے بعض لوگوں کے دلوں سے اولیاء و صلحاء، علماء و فقراء کی عزت اُٹھ گئی ہے اور عزت تو بجائے خود رہی بعض کور باطن تو ان کی شان میں بے ادبی کے کلمات تک کہہ دیتے ہیں۔ حالانکہ جیسا دنیا میں قاعدہ ہے کہ کسی شخص کے محبوب اور منظور نظر سے محبت کرنا عین اس سے محبت کرنا ہوتا ہے اور اس کے محبوب سے دشمنی کرنا عین اس سے دشمنی کرنا ہوتا ہے۔ اسی طرح

اللہ کے دوستوں کی دشمنی عین اللہ کی دشمنی ہوتی ہے۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ تیرے تین دشمن ہوتے ہیں:

''عدوك وعدو حبيبك و حبيب عدوك''

یعنی ایک تیرا دشمن دوسرا تیرے دوست کا دشمن اور تیسرا تیرے دشمن کا دوست۔ اسی واسطے قرآن پاک میں آتا ہے!

''مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ۝

(البقرۃ:۹۸)

یعنی جو اللہ کا دشمن ہو یا فرشتوں کا یا رسولوں کا یا جبرائیل کا یا میکائیل کا تو اللہ ایسے کافروں کا دشمن ہے۔

تو دیکھئے خدا کے پیاروں کی دشمنی کو خود خدا کی دشمنی قرار دیا جا رہا ہے۔ اولیاء کرام کی محبت ایمان کی زبردست علامت ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں!

''اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ''۔

(صحیح بخاری: ، الجز، ۸، کتاب بدء الوحی، رقم: ۶۱۶۸، دار الشعب القاھرہ)

یعنی قیامت میں انسان اس کے ساتھ ہوگا کہ جس کے ساتھ اسے محبت تھی۔

تو اگر کسی کے محبوب اولیاء کرام ہوں اور وہ ان کے ساتھ قیامت میں اُٹھایا جائے تو پھر اس سے زیادہ خوش قسمتی اور بیدار بختی کیا ہو سکتی ہے۔

اولیاء اللہ کی محبت سے ایک شخص کو کیا فائدہ ہوا:

بعض کتابوں میں نظر سے گزرا کہ ایک شخص نہایت گنہگار تھا مگر اسے اولیاء کے مزارات پر جانے کا بہت شوق تھا۔ مال و دولت تو اسے اللہ نے کافی دیا ہوا تھا۔ ایک دفعہ خیال آیا کہ تمام دنیا کی سیر کی جائے اور جتنے بڑے بڑے مشہور مزارات ہیں ان کی زیارت سے مشرف ہونے کے علاوہ ان کے حالات لکھ کر چھپوائے جائیں تا کہ لوگوں کو ان بزرگانِ دین کے حالات سے واقفیت ہو، چنانچہ اس خیال سے اس نے سفر کرنا شروع کیا اور جہاں کہیں کسی بزرگ کے مزار کا سنتا وہاں جا کر حاضری دیتا اور پھر وہاں کے واقف لوگوں

سے صاحبِ قبر کے سب حالات پوچھ کر لکھ لیتا۔ دو تین سال کے سفر میں اس نے ہزاروں بزرگانِ دین کے مزارات کو دیکھا اور ان کے حالات کو کتابی صورت میں جمع کیا ایک دفعہ ایک ندی سے بذریعہ کشتی کے گذر رہا تھا کہ کشتی عین ندی کے درمیان آ کر اُلٹ گئی۔ بمشکل تمام اس نے اپنی جان بچائی اور ہاتھ پاؤں مار کر کنارے پر پہنچا، جس قدر ساز و سامان اور مال و اسباب ساتھ تھا بمع کتاب کے غرق ہو گیا، جب کنارے پر پہنچا اور اس کے ہوش و حواس درست ہوئے تو سب سے پہلے اسے اپنی اس کتاب کا خیال آیا جس میں اس نے ہزاروں بزرگانِ دین کے حالات کو بصد شوق جمع کیا تھا مال و اسباب کے نقصان سے کتاب کے دریا برد ہونے کا زیادہ رنج ہوا اور اس قیمتی موتی کے گم ہو جانے پر اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش برسنے لگی، روتے روتے اسی مقام پر وہ سو گیا۔

خواب میں کیا دیکھتا ہے کہ ایک نہایت وسیع میدان ہے۔ میدان کے بیچوں بیچ ایک نہایت مکلف فرش بچھا ہوا ہے۔ فرش پر ایک مرصع تخت ہے جس کے ارد گرد قطار در قطار نہایت اعلیٰ کرسیاں پڑی ہوئی ہیں تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ ایک نہایت نورانی شکل کا انسان آیا کہ جس کے نور کے سامنے چاند بھی ماند تھا اور آتے ہی نہایت وقار و تمکنت کے ساتھ تخت پر بیٹھ گیا۔ آپ کے بیٹھنے کے بعد ہزاروں نورانی صورتوں والے انسان اِدھر اُدھر سے آ آ کر حسبِ مراتب کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ اور تھوڑی ہی دیر میں وہ سب کرسیاں اور تمام کا تمام فرش ان مقدس اور بابرکت ہستیوں سے بھر گیا۔

خواب میں اسے بھی اس مجلس میں جانے کا شوق ہوا مگر دربان نے اسے روک لیا اور کہا کہ تو اس مجلس میں داخل ہونے کا اہل نہیں۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ تخت پر آقائے نامدار حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف فرما ہیں اور دربارِ رسالت کے حاضرین اُمت کے بڑے بڑے اولیاء اور صلحا ہیں۔ ایسی پاک مجلس میں تجھے کس طرح داخل ہونے کی اجازت دی جا سکتی ہے۔ اس شخص نے دربان کی بہت کچھ منت و سماجت کی مگر اس نے ایک نہ سنی۔ آخر جب اصرار و انکار کی آوز بلند ہوئی تو حضور ﷺ نے اس طرف توجہ فرمائی اور دربان سے تکرار کی وجہ پوچھی۔ اس نے عرض کیا کہ حضور یہ شخص مجلس مبارک میں داخل ہونے کے لئے اصرار کرتا ہے حالانکہ اس کا نام اولیائے اُمت کے رجسٹر میں کہیں بھی نہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا

!اے دربان اسے بھی مجلس کے ایک کنارے پر جگہ دیدے۔ کیونکہ اگرچہ یہ اولیائے اُمت میں نہیں مگر ان کا محب اور عاشق ہے۔ چنانچہ فرمان عالیشان کے دربانچی نے اس کو بھی ایک کنارے پر بیٹھنے کی اجازت دیدی۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ شخص نیند سے بیدار ہوا اور خواب کے واقعہ پر نظر ڈالی تو اس کا دل خوشی سے اچھلنے لگا فوراً اپنے گناہوں سے توبہ کر کے اہل اللہ کا خادم بن کر منزل مقصود کو پہنچ گیا۔

آپ نے سنا کس طرح اس شخص کو ایک ادنیٰ قسم کی محبت سے منزل مقصود کی طرف رہنمائی کی طرف رہنمائی کی گئی۔ یہی مطلب ہے ’’اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ اَحَبَّ‘‘ کی حدیث کا۔

محبت آدمی رکھتا ہے جس سے
قیامت کو وہ ہوگا ساتھ اس کے

لَاتُشَدُّ الرِّحَالُ والی حدیث کی توضیح:

اعتراض: ہاں اس سے ایک اعتراض ضرور پیدا ہوسکتا ہے کہ اس شخص نے تو زیارت قبور کے لئے سفر کیا۔ حالانکہ حدیث شریف میں آتا ہے!

’’لَا تُشَدُّ الرِّحَالُ اِلَّا اِلٰی ثَلَاثَةِ مَسَاجِدَ مَسْجِدِی هٰذَا وَمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَمَسْجِدِ الْاَقْصٰی۔
(صحیح مسلم: الجزء، ۴، رقم: ۳۴۵۰، دار جیل بیروت)

یعنی تین مسجدوں کے علاوہ اور کسی کے لئے کجاوہ نہ باندھو اور سفر کر کے نہ جاؤ۔ وہ تین مسجدیں یہ ہیں۔ مسجد حرام کہ مکہ معظمہ میں ہے۔ مسجد رسول ﷺ کہ مدینہ منورہ میں ہے۔ اور مسجد اقصیٰ کہ بیت المقدس میں ہے۔ تو پھر اس حدیث کی رو سے اس شخص کا یہ سفر کیسے جائز ٹھہرا۔ اور جب یہ سفر ناجائز ہوا تو پھر اس سے وہ دربار رسالت میں کیسے مقبول ہوگیا۔

جواب: یہ نحو کا قاعدہ ہے کہ مستثنیٰ متصل کا مستثنیٰ منہ اسی کی جنس سے ہوا کرتا ہے۔ تو اس حدیث میں مستثنیٰ منہ مساجد کا لفظ ہے جو محذوف ہے یعنی ان تین مسجدوں کے علاوہ اور کسی مسجد کے قصد سے سفر نہ کرو۔ ہاں کسی اور کام کے لئے گئے اور مساجد کو دیکھا تو ممنوع نہیں مگر مزارات یا تجارت یا ملازمت یا اور کسی غرض کے لئے سفر کرنے کی مخالفت اس حدیث سے نکالی جائے تو پھر اس کی تخصیص کے لئے کونسی دلیل ہے کیوں

نہ پھر تو ہر قسم کے سفر کو ممنوع قرار دیا جائے۔ تو معلوم ہوا کہ مزارات پر جانا اور خصوصاً اولیائے کرام کے روضوں کی زیارت کرنا باعث ثواب و برکت ہے۔

عوام مقربین سے کس طرح فائدہ اٹھا سکتے ہیں اور اس پر ایک حکایت:

تو مطلب یہ بیان ہو رہا تھا کہ اولیاء اللہ کی محبت ایمان کی نشانی ہے اور ان کے بغض سے ایمان کے سلب ہونے کا خطرہ ہے۔ اس واسطے ہر انسان کو چاہئے کہ خدا کے نیک بندوں اور اس کے مقربین سے ان کی زندگی اور ان کے انتقال کے بعد محبت رکھے کیا آپ نہیں دیکھتے کہ جب ایک ریل کے ڈبے کو کسی منزل مطلوب پر پہنچانا ہوتا ہے تو اسے انجن سے جوڑ دیا جاتا ہے۔ جب انجن مقام مقصود پر پہنچتا ہے تو ڈبہ بھی پیچھے پیچھے پہنچ جاتا ہے۔ اسی طرح اولیائے کرام بھی سلوک و طریقت کے انجن ہیں۔ ان کے ساتھ اگر عام انسان اپنے ڈبے جوڑیں گے اور تعلق پیدا کریں گے تو وہ بھی ان طریقت کے انجنوں کے ساتھ کھنچ کھچا کر منزل پر پہنچ جائیں گے۔

کہتے ہیں کہ ایک چیونٹی کو خانہ کعبہ کی زیارت کا شوق ہوا مگر بیچاری میں نہ تو طاقت پرواز کہ اڑ کر جائے اور نہ چلنے کی قدرت کہ طے کر کے پہنچے آخر یک دن کہیں اس نے ایک حرم شریف کے کبوتر کو دانہ چگتے ہوئے پالیا جھٹ اس کے پنجوں سے لپٹ گئی کبوتر جب اڑ کر بیت اللہ شریف میں آیا تو چیونٹی نے بھی اپنی آنکھوں کو خانہ کعبہ کی زیارت سے ٹھنڈا کیا۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

بود مورے ہوسے داشت کہ در کعبہ رود
پنجہ بر پائے کبوتر زد و ناگاہ رسید

ترجمہ: ایک چیونٹی تھی اور یہ شوق و خواہش رکھتی تھی کہ خانہ کعبہ میں جائے وہ کبوتر کے پاؤں پر بیٹھ کر چمٹ گئی اور اچانک کعبہ شریف پہنچ گئی۔

تو اسی طرح جب ہم میں اس قدر ریاضت و عبادت کی طاقت نہیں کہ نفس کی میل کچیل کو پوری طرح دور کر کے ملاء اعلیٰ کی طرف اڑ سکیں تو پھر کیوں نہ ملاء اعلیٰ کے قدسی مآب کبوتروں کے قدموں سے لپٹ جائیں کہ ان

کے ذریعہ سے شاید ہم بھی ان عالی مقامات کی زیارت سے مشرف ہوسکیں۔

جھوٹے مُدعیانِ ولایت کی حالت:

مگر اتنا یہ بھی خیال رہے کہ آج بہت سے جھوٹے اور کذاب طریقت وحقیقت کے رستے کے واقف ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں مگر ان کا دعویٰ صرف دعویٰ ہی ہوتا ہے۔ حقیقت اور سچائی کا ان میں شمہ تک نہیں ہوتا۔ اور آج انہی نقالوں نے حقیقی رہنماؤں کو بھی بدنام کر دیا ہے۔

چو از قومے یکے بیدانشی کرد   نه که را منزلت ماند نه مه را
نمے بینی که گادے درعلف‌زار   بیالا ید همه گادانِ ده را

یعنی جب قوم میں سے ایک شخص کچھ حماقت کرتا ہے۔ تو اس سے اس قوم کے چھوٹے بڑے کی عزت نہیں رہتی۔ کیا تو نہیں دیکھتا کہ چراگاہ کی ایک گائے دیہات کی تمام گایوں کو بدنام کر دیتی ہے۔ جب وہ جا کر کسی کی فصل چرتی ہے تو اس سے چراگاہ کے تمام جانوروں پر دھبہ آتا ہے۔ اسی طرح ان مکاروں کی خسیس حرکات سے یہ قوم آج لوگوں کی نظروں میں گری ہوئی ہے۔ حالانکہ انہیں اس مقدس گروہ سے دور کا بھی تعلق نہیں۔ مگر چونکہ لوگوں میں آج اصل اور نقل کے پرکھنے کا مادہ نہیں رہا۔ پہلے لوگ زیادہ تر صاحب علم ہوتے تھے دین سے تعلق ہوتا تھا۔ علماء صلحاء کی مجلس میں بیٹھنے سے کھرے اور کھوٹے کو کسی حد تک پہچان سکتے تھے۔ مگر آج ہر طرف جہالت اور بددینی کا زور ہے۔ علم دین سے نفرت۔ نہ خود سیکھتے ہیں نہ علماء کے پاس بیٹھتے ہیں ایسی حالت میں جو بھی آتا ہے انہیں اپنے دام میں پھنسا کر اپنا الو سیدھا کر لیتا ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں۔

حرف درویشاں بدزوا ومرددوں   تابه پیش جاہلاں خواند فسوں
زانکه صیاد آورد بانگ صفیر   تا فریبد مرغ را آں مرغ گیر
بشنود آں مرغ بانگ جنس خویش   از ہوا آید بیا بدد ام ونیش

یعنی ان مکار پیروں نے پیران باصفا کے الفاظ کو چرایا کچھ تصوف کی اصطلاحیں یاد کرلیں اور لباس وہئیت کو ان کے سانچے میں بتکلف ڈھال لیا تاکہ اس ہئیت اور تسبیح وسجادہ سے جاہلوں کو اپنے مکر میں پھنسا سکیں۔ دیکھو شکاری پرندے کو دھوکا دینے کے لئے اسی کی آواز نکالتا ہے جس سے وہ پرندہ اسے ہم جنس سمجھ کر ہوا

سے نیچے آتا ہے اور نیچے آ کر غریب دام میں پھنس جاتا ہے۔

آج کل ہر طرف اخباروں میں جھوٹے پیروں اور مصنوعی مرشدوں کی مکاریوں اور دغا بازیوں کی وارداتیں پڑھنے میں آتی ہیں یہ یوں اس لئے کہ لوگوں کے عقیدے متزلزل ہو گئے انہیں پیر کی خدارسی اور اتباع شرع سے کوئی کام نہیں انہیں تو پیر سے بیٹے کے حصول یا مقدمہ کی فتح کی ضرورت ہے وہ گانجا پیئے یا شراب، تاڑی پیئے یا افیون کھائے، زنا کرے یا شریعت کی توہین کرے۔ وہ اس کے اپنے افعال ہیں پیر صاحب اور سائیں جی کی حرکات پر نکتہ چینی کرنے والا کون اور بعض تو کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے پیر صاحب ہر نماز خانہ کعبہ میں جا کر پڑھتے ہیں۔ اس واسطے ہم ان کو یہاں کبھی بھی پڑھتا ہوا نہیں دیکھتے۔ تو بھائی پھر یہ جگہ پیشاب پاخانہ، کھانا پینا، بھنگ چرس، مدک اور افیون ہی کے لئے رہ گئی۔ یہ کام بھی وہ عرب میں کیوں نہیں کرتے کہ ہمارا ان سے پیچھا چھوٹے۔ نیکی کا کوئی کام کریں تو عرب کو چلے جائیں اور شراب یا گانجے سے دل بہلانا منظور ہو تو پھر ہمارے پاس واپس چلے آئیں۔ لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ آج انہی بدنام کنندۂ نکونامے چند بہروپیوں کی وجہ سے تمام کا تمام سلسلہ طریقت مطعون و بدنام ہو رہا ہے۔

اللہ تعالیٰ لوگوں کو توفیق دے کہ وہ علم دین حاصل کریں تاکہ ان کے عقل کی آنکھیں شریعت کے سرمے سے منور ہو جائیں اور وہ یار اور عیار میں فرق کر سکیں اور ان بہروپیوں کو بھی اللہ تعالیٰ توفیق دے کہ وہ اس بہروپ کو اتار کر حقیقت کا رنگ اختیار کریں۔ اور پھر دیکھیں کہ جب اس بہروپ میں یہ مزا ہے تو حقیقت میں کتنا کچھ لطف ہوگا۔

اولیاء کے روپ اور بہروپ کے فرق پر ایک قصہ:

کہتے ہیں کہ چند شخصوں نے اولیاء کا بہروپ بنا کر لوگوں کو ٹھگنا شروع کیا۔ لوگ آتے ہاتھ پاؤں چومتے اور نذرانے پیش کرتے دعائیں ہوتیں اور مرادیں بخشی جاتیں آخر ایک دن ان کی ملاقات ایک صاحبِ حال شخص سے ہوگئی۔ جو ان کے مکر و دجل کو ایک ہی نظر میں بھانپ گئے۔ فرمانے لگے دیکھو تم نے جب یہ خدا کے دوستوں کا روپ بنایا ہے تو کس قدر مخلوقات تمہارے پاؤں پر گر رہی ہے۔ اگر تم حقیقت میں بھی خدا کے دوست بن جاؤ تو پھر تمہاری عزت اور قدر و منزلت کا کیا کہنا۔ وقت تھا دلوں پر چوٹ لگی سب

نے اپنے گناہوں سے توبہ کی اور بزرگ صاحب سے بیعت کر کے تھوڑے ہی عرصے میں ریاضت ومجاہدہ کے ذریعہ نقل کو اصل کر دکھایا۔

جزاک اللہ چشمم باز کردی
مرا باجان جاں ہمراز کردی

ترجمہ: اللہ تجھے بہترین بدلہ عطا کرے کہ تو نے مجھے حقیقت سے آشنا کر دیا۔

مُرشدِ کامل اور اس کی علامات:

مرشدِ کامل کبریت احمر اور کیمیا کا حکم رکھتا ہے ایسے شخص یوں در بدر نہیں بھٹکتے پھرتے وہ لوگوں سے بھاگتے ہیں اور لوگ ان کے پیچھے دوڑتے ہیں۔ ایسے ہی لوگوں کی مجلس اور ایسے لوگوں سے تعلق رکھنے کے متعلق مولانا روم صاحب فرماتے ہیں۔

یک زمانہ صحبت با اولیاء　　بہتر از صد سالہ طاعت بے ریا
گر تو سنگ خارۂ مرمر شوی　　چوں بصاحبدل رسی گوہر شوی

یعنی ایسے اولیائے کرام کی تھوڑی دیر کی صحبت سو سال کی بے ریا عبادت سے بہتر ہے۔ کیونکہ صد سالہ طاعت سے مراد وصول الی اللہ ہوتا ہے اور وہ مرشد کامل کی اپنی صحبت سے حاصل ہو جاتا ہے۔ اور فرماتے ہیں کہ اگر تو سخت پتھر بھی ہو گا تو ایسے صاحب دل کی خدمت میں پہنچ کر ایک گراں قیمت شے بن جائے گا۔ اور مرشد کامل کی سب سے بڑی علامت یہی ہے کہ جب آپ اس کی مجلس میں بیٹھیں گے تو آپ کا دل تھوڑی دیر کے لئے دنیوی جھگڑوں سے آزاد ہو کر اللہ کے ساتھ مشغول ہو جائے گا اور جتنی دیر آپ اس کی مجلس میں بیٹھیں گے آپ کا دل ایک غیر متوقع اطمینان اور سرور محسوس کرے گا۔ اور اسکی مجلس میں زیادہ بیٹھنے کو چاہیگا۔

خواجہ عزیزان علی رامتینی فرماتے ہیں۔

باہر کہ نشستی نشد جمع دلت　　وزتونر مید زحمتِ آب و گلت
زنہار زصحبتش گریزاں مے باش　　ورنہ نکند روح عزیزاں بحلت

ترجمہ: جس کے ساتھ تو بیٹھا ہے (اُس کی مجلس اختیار کی) اور تجھے دل جمعی حاصل نہ ہوئی اور تجھ سے تیرے

آب وگل (پانی ومٹی) کی زحمت دور نہ کی۔ خبردار ایسے آدمی کی صحبت سے دور بھاگ جاورنہ عزیزان علیہ الرحمہ کی روح آپ کے ساتھ نہ ہوگی۔

اسی طرح خواجہ نقشبند رحمۃ اللہ علیہ بھی پیر کامل کی تین علامتیں بیان فرماتے ہیں۔

سہ نشاں بَوَد ولی رازِنخست آں معنی　　کہ چورُوئے او بہ بینی دل تو بدو گراید
دوآں کہ در مجالس چوسخن کند زمعنی　　ہمہ راز ہستی خود بحدیث دور رباید
سوم آں بود بمعنی ولے اواخص عالم　　کہ ز ہیچ عضو اور احرکات بدنیاید

ترجمہ: ولی کی تین نشانیاں ہوتی ہیں پہلی اُن میں سے یہ ہے کہ جب تو اُس کا روئے انور دیکھے گا تیرا دل اُس کا عاشق ہوجائے گا۔ دوسری نشانی یہ ہے کہ جب وہ مجالس میں جہانِ معانی کی بات کرے گا تو تمام کو اپنی ہستی سے حدیثِ حق کے ذریعے دور لے جاتا ہے۔ تیسرا وہ عالم میں خاص فرد ولی کے معنی میں ہوتا ہے کہ جس کے کسی عضو سے بری حرکات سرزد نہیں ہوتیں۔

مگر آج کل کے مصنوعی پیروں کی مجلس میں اول تو دل ہی جانے کو نہیں چاہتا کیونکہ وہاں شریفوں اور خدا طلب لوگوں کا گزر ذرا مشکل ہوتا ہے۔ وہاں کوئی سٹے والے نظر آئیں گے تو کوئی اغوا والے کوئی جوا باز ہوگا تو کوئی اچکا اور اگر ذرا شریف قسم کا پیر ہوا تو پھر وہاں دنیا کے بکھیڑوں کا تذکرہ سنو گے نہ ”قال اللہ وقال رسول“ کا۔

ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ فلانے پیر سے فلانے فلانے نے تجارت، ملازمت اور مقدمے وغیرہ کے لیے دعا کرائی تو انہوں نے جھٹ ہاتھ اٹھا کر لمبی لمبی دعائیں کیں مگر جب میں نے عرض کی کہ پیر صاحب میرے لئے بھی دعا فرمائیں کہ اللہ تعالیٰ میری عاقبت اچھی فرمائے، تو دعا تو خیر، میری بات کی طرف توجہ تک نہ دی، نہ معلوم پیر صاحب مجھ سے کیوں ناراض ہو گئے ہیں۔ میں نے کہا صاحب وہ ناراض نہیں ہوئے مگر چونکہ عاقبت کے بازار میں ان کا اپنا معاملہ بگڑا ہوا تھا اس واسطے وہ اس بارے میں آپ کے لئے کیا دعا کرتے ہاں البتہ دنیا طلبی کے کاموں میں وہ ماہر تھے۔ اس لئے ان مطالب کے لئے انہوں نے دل کھول کر دعا کی تو گویا حقیقت میں انہوں نے اپنی قدر اور اہلیت کو پہچانا۔

مُرشِد بننے کے لئے شرائط:

عالم ربانی، مرتاضِ حقانی عارف باللہ حضرت شاہ ولی اللہ علیہ الرحمہ نے اپنی کتاب القول الجمیل میں مرشد کے لئے چند شرطیں تحریر فرمائی ہیں۔ میں ان کو اس مقام پر بیان کر دینا ضروری سمجھتا ہوں۔ تاکہ اگر آپ کسی پیر کو پرکھنا چاہیں تو یہ بیان بشرط یاد کسوٹی کا کام دے۔ آپ فرماتے ہیں۔

(۱) کہ پیر کے لئے سب سے اول شرط یہ ہے کہ وہ قرآن پاک اور حدیث شریف کا عالم ہو تاکہ مریدوں کو اسلام پر چلنے کا صحیح رستہ بتا سکے۔ اگر وہ جاہل اور قرآن و حدیث سے ناواقف ہو گا تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے کسی اندھے کو رہنما بنایا جائے۔

ے او خود گم ست کرا رہبری کند

اذا کان الغراب دلیل قوم سیھدیھم طریق الھالکینا

(۲) دوسری شرط عدالت اور تقویٰ ہے کیونکہ اگر اس کا اپنا باطن صاف اور مزکیٰ نہ ہو گا تو وہ اپنے مریدوں کو صفائی باطن کی کیا تلقین کر سکے گا۔

(۳) تیسری شرط یہ ہے کہ وہ دنیا کا تارک اور آخرت کا راغب ہو کیونکہ اگر اس کے دل میں دنیا کی محبت بسی ہوئی ہو تو وہ اپنے مریدوں کو کس طرح اللہ تعالیٰ کی طرف راغب کر سکتا ہے۔ اور جبکہ خود اس کا باطن دنیوی آلائشوں اور کثافتوں سے لتھڑا ہوا ہے تو وہ مریدوں کے دلوں کو کس طرح صاف کر کے ان کو خدا و رسول کی محبت سے بھر سکے گا۔

جب تلک حاصل نہ ہو تجھ کو کمال خلق سے بیعت نہ لے اے خوشخصال
کس کو کہتے ہیں کمال اے نیک نام ما سوا حق کے محبت ہو حرام
جس کو دیکھے چشم دل سے اے حبیب نور وحدت سے وہی ہو با نصیب
جب تلک ایسا نہ ہو تجھ میں اثر تیری پیری مکر ہو گی سربسر
پیر جی ہوں یا کہ عالم بے نظیر یہ نہیں پیری کے قابل اے فقیر

(۴) چوتھی شرط پیر کے لئے یہ ہے کہ وہ امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا پورا پورا پابند ہو یعنی مریدوں کو ہر وقت

برے کاموں سے روکتا رہے اور نیک کاموں کی رغبت دلاتا رہے کیونکہ پیر کا کام ہی یہی ہے کہ وہ مریدوں کو برائیوں سے روک کر نیکیوں کی طرف متوجہ کرے اگر پیر خوشامدی ہو یا مرید کی برائیوں سے چشم پوشی کرتا ہو۔ اور ان کی شرعی خرابیوں پر جان بوجھ کر پردہ ڈالتا ہو۔ تو وہ پیر نہیں بلکہ ابلیس ہے۔

اے بسا ابلیسِ آدم روئے ہست
پس بہر دستے نباید داد دست

ترجمہ: اے (مخاطب) بہت سے ابلیس ہیں اُن کے چہرے بنی آدم جیسے ہیں پس ہر کسی کے ہاتھ میں ہاتھ نہیں دینا چاہیے۔

(٦) پانچویں شرط یہ ہے کہ وہ خود کسی مرشد کامل کی خدمت میں ایک عرصہ تک رہا ہو کیونکہ جب تک وہ اس رستے کے کسی واقف سے اپنا تعلق پیدا نہیں کرتا۔ تو نہ تو اس رستہ کی اس پر پوری حقیقت منکشف ہوتی ہے۔ اور نہ ہی وہ اس کی حقیقی لذت سے آشنا ہوتا ہے۔ دنیا کے معمولی معمولی کاموں کے لئے بھی استاد اور رہنما کی ضرورت پڑتی ہے۔ تو اس بے کیف اور پر کیف رستے پر چلنے کے لئے رہنما کی کیسے ضرورت نہ پڑے گی۔

ہر آں کارے کہ بے استاد باشد
یقین است ایں کہ بے بنیاد باشد

ترجمہ: ہر وہ کام جو کسی استاد کی نگرانی میں نہیں کیا جاتا ہے اس بات کا یقین ہوسکتا ہے اس کام کی بنیاد نہیں۔ اسی واسطے صوفیاء فرماتے ہیں!

’’الشجرة اذنبتت من غير غارس فانها تنورق ولا تثمر‘‘۔

یعنی جو درخت خود بخود پیدا ہوگا تو اگر چہ اس کے پتے تو ہوں گے مگر اوّل تو اسے پھل نہ لگے گا اور اگر لگا بھی تو شجر مغروس کی طرح اس کا پھل میٹھا نہ ہوگا اس واسطے پیر بھی شجرِ مغروس کی طرح کسی کامل کا تربیت یافتہ ہونا چاہیئے تاکہ اس کا فیض جاری اور افادہ ساری ہو۔

اس کے علاوہ دوسری کتابوں میں پیر کامل کے لئے بہت کچھ شرائط لکھی ہوئی ہیں جن کا اس مقام

پر بیان کرنا مطلب سے بہت دور لے جائے گا۔ لہٰذا اگر کسی سے تعلق پیدا کرو تو کم از کم ان پانچ شرطوں کو تو اس میں دیکھ لو اور اگر یہ شرائط اس میں نہ پائی جائیں تو ایسے شخص کو کبھی بھی پیر اور مرشد نہ بناؤ۔ بلکہ اس مدعی سے ایسے بھاگو جیسے شیر یا چیتے سے انسان بھاگتا ہے شیر اور چیتا تو صرف جان ہی لیتا ہے مگر یہ مکار تو ایمان پر بھی ہاتھ مار جاتا ہے۔ مولانا صاحب فرماتے ہیں۔

دور شو از اختلاطِ یارِ بد   یارِ بد بدتر بود از مارِ بد
ماربد تنہا ہمیں بر جان زند   یارِ بد بر جان و ایمانِ بر زند

ترجمہ: برے دوستوں کے ملاپ سے دور رہو کیونکہ برا دوست برے سانپ سے بھی بدتر ہے۔ زہریلا سانپ تو صرف جان پر ہی وار کرتا ہے لیکن برے دوست سے جان کے ساتھ ایمان کا بھی خطرہ ہے۔

جاہل پیروں کے علمِ شریعت کے متعلق چند اعتراض اور ان کے جواب:

آج کل جاہل پیر کہتے ہیں کہ علم ظاہر نہ تو کامل پیر کے لئے ضروری ہے اور نہ اسے اس پر عمل کرنے کی ضرورت۔ اور وہ مثال دیتے ہیں کہ حضور ﷺ کہاں پڑھے ہوئے تھے البتہ پیر کو علم طریقت کی ضرورت ہے اور پھر ساتھ ہی کہتے ہیں کہ علم طریقت علم شریعت سے افضل ہے۔ اگر افضل نہ ہوتا تو موسیٰ علیہ السلام جیسے ماہر شریعت کو خضر علیہ السلام جیسے عالم طریقت کے پاس استفادہ کے لئے کیوں بھیجتے اور پھر کہتے ہیں کہ یہ علم ایسا باریک اور دقیق ہے کہ عالم شرع اس کو سمجھ ہی نہیں سکتا اسی واسطے تو موسیٰ علیہ السلام نے خضری افعال پر بار بار اعتراض کیا پھر اسی سے وہ مستنبط کرتے ہیں کہ اگر پیر کچھ خلاف شرع کرے یا کہے تو مرید کو بلا حیل وحجت اس کی اتباع کرنی چاہیے ورنہ وہ مرید کبھی بھی صادق الیقین نہیں کہلا سکتا۔

تشریحِ تقریر: میں اس کو ذرا تفصیل کے ساتھ بیان کرتا ہوں تاکہ آپ اسے پوری طرح سمجھ جائیں اس کے بعد جواب عرض کرتا ہوں۔

آج کل کے جاہل پیر اپنے مریدوں کو گمراہ کرنے کے لئے اور اپنی جہالت پر پردہ ڈالنے کے لئے انہیں سمجھاتے ہیں کہ پیر کامل اور مرشدِ واصل کیلئے علمِ شریعت کے سیکھنے کی کوئی ضرورت نہیں وہ اس علم

کے بغیر ہی اللہ تعالیٰ سے تعلق پیدا کر لیتا ہے۔ علمِ شریعت ظاہری اور عام لوگوں کیلئے ہے اس کا علمِ طریقت اور حقیقت سے کچھ تعلق نہیں جو شخص شرع کی ظاہری باتوں میں پھنس جاتا ہے اور رات دن احکامِ شریعت میں مشغول رہتا ہے تو وہ طریقت میں ترقی کرنے سے رک جاتا ہے کیونکہ علمِ شریعت مجموعہ ہے احکام ظاہری کا اور جو ظاہر میں مشغول ہوا وہ باطن سے محروم رہا۔ دیکھو حضور اُمی محض تھے آپ نے نہ کسی سے پڑھا نہ لکھنا سیکھا نہ کسی کو شرفِ شاگردی بخشا۔ اور نہ کسی کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کیا۔ مگر اس پر بھی اللہ تعالیٰ آپ سے اپنے قرب کو ”فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى“ (دو کمانوں کا یا اس سے بھی کم فاصلہ تھا) بیان فرما رہے ہیں اور باوجود نہ پڑھنے کے آپ کو قیامت تک کے پڑھے ہوئے انسانوں کا پیشوا اور مقتدا بنا دیا گیا۔ تو اگر علمِ طریقت کا علمِ شریعت سے تعلق ہوتا تو حضور پر وحی اسی وقت نازل ہوتی جب کہ آپ ظاہری علوم کی تحصیل فرما چکتے۔ اور پھر علمِ شریعت علمِ طریقت کے مقابلہ میں کچھ مرتبہ نہیں رکھتا بلکہ طریقت شریعت سے بہت افضل اور اعلیٰ ہے۔ دیکھو موسیٰ علیہ السلام ایک اولوالعزم پیغمبر تھے آپ پر توریت نازل ہوئی اور آپ کا درجہ ایک زبردست مبلغِ شریعت کی حیثیت کا تھا مگر اس پر بھی آپ کو خواجہ خضر علیہ السلام کے پاس تکمیل طریقت کے لئے بھیجا گیا۔ چنانچہ قرآن پاک میں آتا ہے!

”فَارْتَدَّا عَلٰۤى اٰثَارِهِمَا قَصَصًا ۙ○ فَوَجَدَا عَبْدًا مِّنْ عِبَادِنَاۤ اٰتَيْنٰهُ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا وَعَلَّمْنٰهُ مِنْ لَّدُنَّا عِلْمًا○ قَالَ لَهٗ مُوْسٰى هَلْ اَتَّبِعُكَ عَلٰۤى اَنْ تُعَلِّمَنِ مِمَّا عُلِّمْتَ رُشْدًا ○ قَالَ اِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيْعَ مَعِيَ صَبْرًا○ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلٰى مَا لَمْ تُحِطْ بِهٖ خُبْرًا○ قَالَ سَتَجِدُنِيْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ صَابِرًا وَّلَاۤ اَعْصِيْ لَكَ اَمْرًا○۔ (الکہف: ۶۹ تا ۶۴)

یعنی موسیٰ علیہ السلام اور ان کا ساتھی یوشع علیہ السلام اپنے پاؤں کے نشان پر لوٹے تو ہمارے بندوں میں سے ایک بندے کو پایا۔ جسے ہم نے اپنے پاس سے رحمت دی ہوئی تھی اور اپنے پاس سے علم سکھایا ہوا تھا۔ موسیٰ علیہ السلام نے اسے کہا کیا میں آپ کی اس شرط پر پیروی کروں کہ آپ مجھے اس بھلائی سے سکھائیں جو آپ کو سکھائی گئی ہے اس نے کہا اے موسیٰ آپ میرے ساتھ صبر نہ کر سکیں گے۔ اور آپ کس طرح اس چیز پر صبر کر سکتے ہیں۔ جس کا آپ کو علم نہیں دیا گیا موسیٰ نے فرمایا کہ آپ ان شاء اللہ صابر پائیں گے اور میں کسی معاملہ

میں آپ کی نافرمانی نہ کروں گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ طریقت کا درجہ شریعت سے اعلیٰ ہے۔ اسی لئے تو موسیٰ علیہ السلام کو خضر علیہ السلام کے پاس بھیجا گیا۔ پھر یہ علم نہایت دقیق اور عوام کی سمجھ سے بہت بلند ہے۔ عوام کا تو کیا ذکر علم شرع کے عالم کامل بھی اس کے اسرار و نکات کے سمجھنے سے قاصر ہیں۔ دیکھو حضرت موسیٰ علیہ السلام جیسے عالمِ شریعت، مبلغ دین اور مرسلِ اعظم خضری طریقت کے اسرار کو نہ سمجھ سکے۔ اور باوجود وعدۂ سکوت کے چپے چپے پر اعتراض کیا۔ آخر حضرت خضر علیہ السلام نے تنگ آ کر صاف کہہ دیا کہ!

”هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ ۚ سَاُنَبِّئُكَ بِتَاْوِيْلِ مَا لَمْ تَسْتَطِعْ عَّلَيْهِ صَبْرًا ۝۔

(الکہف: ۷۸)

یعنی بس اب مجھ میں اور آپ میں جدائی ہے مگر میں ان باتوں کی حقیقت سے آپ کو آگاہ کئے دیتا ہوں جن پر آپ سے صبر نہ ہو سکا۔

چنانچہ انہوں نے کشتی کے عیب دار کرنے لڑکے کے قتل کرنے اور دیوار کے مرمت کرنے کی حقیقت کو ان سے بیان کیا اور پھر ان سے الگ ہو گئے۔ پھر پیر بے پیر اس واقعہ سے مریدوں کی توجہ ایک اور نتیجہ کی طرف مبذول کراتا ہے۔ کہ دیکھو پیر کا کام خواہ کتنا ہی شریعت کے خلاف نہ ہو اس پر کوئی نکتہ چینی نہ کرو۔ بلکہ اس کے تمام کام اور احکام کو اپنی سمجھ سے بلند خیال کر کے تابعداری کرتے چلے جاؤ ورنہ یاد رکھو تمہارا حال بھی موسیٰ علیہ السلام جیسا ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے خضر علیہ السلام کے کام کو ظاہراً خلاف شرع سمجھ کر اعتراض کیا اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ خضر علیہ السلام نے ”هٰذَا فِرَاقُ بَيْنِيْ وَبَيْنِكَ“ کہہ کر انہیں اپنے پاس سے جدا کر دیا۔

شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کی تشریح:

جواب: سب سے پہلے شریعت، طریقت، حقیقت اور معرفت کے متعلق مختصر طور پر سمجھ لیں کیونکہ ان سب اعتراضوں کا دارومدار ان کے سمجھنے پر موقوف ہے۔

شریعت نام ہے ظاہری اور باطنی اعمال کے مجموعہ کا۔ علمائے متقدمین فقہ اور شریعت کو ایک سمجھتے

تھے۔ اور امام صاحب نے فقہ کی تعریف ‘‘معرفة النفس مالها وماعليها’’ بیان فرمائی ہے جس میں نفس کے ظاہری و باطنی دونوں اعمال آجاتے ہیں۔ مگر علمائے متاخرین کی اصطلاح میں فقہ صرف شریعت کے ظاہری اعمال کا نام رکھا گیا۔ اور شریعت کے مختلف اعمالِ باطنیہ کا نام تصوف یا سلوک قرار پایا۔ اس سلوک یا تصوف کے مختلف طریقوں اور رستوں کو طریقت کہنے لگے۔ پھر تصوف کے رستہ پر چلنے یا طریقت پر عمل کرنے سے سالک کے دل پر جو حقائق کونیہ ظاہر ہوتے ہیں ان مکشوفات یا حقائق کو حقیقت کہنے لگے اور اس انکشاف یا اظہار کا نام معرفت ہے۔

پس اس مختصر تقریر سے یہ ظاہر ہوگیا کہ طریقت، حقیقت اور معرفت اصل میں شریعت کے اجزاء اور شاخیں ہیں اور شریعت ان تینوں پر حاوی اور شامل ہے۔ تو گویا شریعت اصل ہے اور طریقت وغیرہ فروع یا وہ کل ہے اور یہ اجزاء۔ تو پھر کس طرح فرع اصل سے یا جزو کل سے افضل ہوسکتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوگیا کہ بناوٹی پیروں کا طریقت کو شریعت سے افضل ٹھہرانا بالکل غلط اور جہالت ہے۔ اور جب شریعت ،طریقت، حقیقت اور معرفت کی ماں ٹھہری تو طریقت کا شریعت کے بغیر وجود میں آنا کیسے ممکن ہے۔

طریقت کے لئے علم شریعت کا جاننا ضروری ہے:

اور اگر علمِ شریعت کو محض علمِ ظاہر ہی مانا جائے اور طریقت کو علمِ باطن۔ تو پھر علمِ باطن کا علمِ ظاہر کے بغیر حاصل ہونا بھی ناممکن ہے۔ کیونکہ علمِ ظاہر بمنزلہ دودھ کے ہے۔ اور علمِ باطن بمنزلہ مکھن کے تو مکھن بغیر دودھ کے کس طرح حاصل ہوسکتا ہے۔ اس لئے اگر علمِ باطن کے مسکہ کی ضرورت ہو تو پہلے علمِ ظاہر کا دودھ حاصل کرو مولانا روم علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

علم باطن ہمچو مسکہ علم ظاہر ہمچو شیر
کے بود بے شیر مسکہ کے بود بے پیر پیر

ترجمہ: علمِ باطن مکھن کی طرح ہے اور علمِ ظاہر دودھ کی طرح ہے کہ دودھ کے بغیر مکھن کیسے ہوسکتا ہے اور مرشد کے بغیر کوئی مرشد کیسے بن سکتا ہے۔

اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے!

"طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَ مُسْلِمَةٍ"۔

(سنن ابن ماجہ: ج،۱، رقم: ۲۲۴، مکتبہ ابی المعاطی)

یعنی علم کا حاصل کرنا ہر ایک مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔

سچ ہے ۔

علم را آموز اول بعدہ ایں جابیا
جاہلاں را پیش حضرت حق تعالیٰ نیست جا

یعنی دربارِ ربی میں حاضر ہونے اور رب العزت سے دوستی کرنے سے پہلے تجھے چاہئے کہ علم ظاہر حاصل کر کیونکہ جاہلوں کو حاضریِ دربار کا شرف عطا نہیں کیا جاتا۔

"مَا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلِيًّا جَاهِلاً"۔

(مرقاۃ المفاتیح: جز،۱، کتاب العلم، دار الفکر بیروت)

اللہ تعالیٰ کسی جاہل کو اپنا دوست نہیں بناتے۔

دنیا کا بھی قاعدہ ہے کہ اگر کسی بادشاہ کے دربار میں جانا ہو اور اس سے ملاقات کرنے کی خواہش ہو تو سب سے پہلے آداب شاہانہ مراسم دربار اور دوسری ضروریات کا علم سیکھنا ضروری ہے۔ ورنہ بفرض محال اگر باز یابی ہو بھی گئی تو آداب حضوری کی ناواقفیت کے باعث بجائے عزت کے ذلت اٹھانی پڑے گی۔ تو جب دنیا کا یہ قاعدہ ہے کہ معمولی بادشاہوں کی دوستی جو بمنزلہ علمِ باطن ہے اسے حاصل کرنے کے لئے مراسمِ دربار جو بحیثیت علمِ ظاہر ہے کا سیکھنا لازمی ہے۔ تو اس احکم الحاکمین کی دوستی اس کے مجوزہ آداب اور قوانین کو جانے بغیر کس طرح حاصل کی جا سکتی ہے۔

اسی واسطے تو جنید بغدادی نے فرمایا ہے!

"من تزھد بغیر علم فقد جن فی آخر عمرہ او تزندق"۔

یعنی جو علمِ ظاہر کے بغیر زہد کرتا ہے۔ آخر کار یا تو وہ پاگل ہو جاتا ہے اور یا گمراہ۔

کیونکہ طریقت کی منزلوں اور وہاں کے مکشوفات کے متعلق اُسے کچھ علم نہیں ہوتا جس کا اثر اس پر یا تو جنون

کی شکل میں ہوتا ہے یا ضلالت کی صورت میں۔

اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے!

”ایک فقیہ ہزار عابد سے زیادہ شیطان پر قوی ہوتا ہے۔

حدیث شریف کے الفاظ ہیں کہ ”فَقِيهٌ اَشَدُّ عَلَى الشَّيْطَانِ مِنْ اَلْفِ عَابِدٍ“۔

(جامع ترمذی: ج ۴، رقم: ۲۶۸۱، دار الغرب الاسلامی بیروت)

اسی طرح دوسری حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں!

”فَضْلَ الْعَالِمِ عَلَى الْعَابِدِ كَفَضْلِ الْقَمَرِ عَلَى سَائِرِ الْكَوَاكِبِ وَاِنَّ الْعُلَمَاءَ وَرَثَةُ الْاَنْبِيَاءِ“

(سنن ابن ماجہ: ج ا، رقم: ۲۲۳، مکتبہ ابی المعاطی)

یعنی عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسی چاند کی ستاروں پر اور علماء ہی انبیاء کے حقیقی وارث ہیں۔

اب آپ خود ان احادیث سے اندازہ لگا سکتے ہیں کہ عالمِ شریعت کا درجہ زیادہ ہے یا عالمِ طریقت کا شریعت کی مثال ایک رہنمائی ہے جو رستہ دکھاتا ہے۔ اور مسافر آخرت کو سیدھے راستے کی تمام علامات اور نشانیاں کھول کر سمجھاتا ہے۔ تاکہ مسافر کسی غلط رستہ پر چل کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالے۔ اب اس رہنما کے بتائے ہوئے رستے پر چلنا اور اس کی بتائی ہوئی نشانیوں سے صراطِ مستقیم کا کھوج نکالتے ہوئے منزلِ مقصود کو جانا طریقت کہلاتا ہے۔ اس کے بعد منزلِ مقصود پر پہنچ جانے کو حقیقت کہتے ہیں۔ اور منزلِ مقصود پر پہنچ جانے کے بعد جو حقائق مکشوف ہوتے ہیں۔

ان مکشوفات کو معرفت اور عرفان کہا جاتا ہے۔ لیکن یہ راہ طریقت پر چلنا اور منزل حقیقت پر پہنچ کر معرفت حاصل کرنا سب کا سب صحیح رستہ کے معلوم ہونے پر موقوف ہے۔ اگر مسافر نے چلتے وقت کسی رہنما سے رستہ کے متعلق نہ پوچھا یا پوچھا تو سہی مگر وہ رہنما رستے کا یا تو بالکل واقف ہی نہ تھا، یا تھا مگر ناقص طور پر۔ جیسا کہ شرائع غیر اسلامیہ ہیں۔ تو ایسا مسافر کبھی بھی منزل مقصود کو نہ پہنچ سکے گا۔ بلکہ تمام عمر غلط راستوں ہی کی بھول بھلیوں میں تباہ ہو کر دنیا سے رخصت ہو جائیگا۔ تو معلوم ہوا کہ سلوک طریقت پر چلنے سے پہلے علم شریعت کے رہنما کی سخت ضرورت ہے۔ ورنہ بجائے منزل حقیقت پر پہنچنے کے مقام ضلالت پر جانکلے گا۔

ایک جاہل عابد کا عبرت انگیز حال:

کہتے ہیں کہ کسی جاہل شخص نے علمِ باطنی کے حاصل کرنے کے لئے سخت سخت ریاضتیں اور چلہ کشیاں شروع کیں۔ جلوت پر خلوت کو ترجیح دے کر پہاڑوں پر جا مقام کیا۔ اور ایک طویل عرصہ تک طریقت کے رستے کو طے کرتے رہے۔ آخر ایک دن خیال آیا کہ قرآن پاک میں آتا ہے!

''اِنَّہٗ لَا یُحِبُّ الْمُسْرِفِیْنَ ۟'' ۔(اعراف: ۳۱)

کہ اللہ تعالیٰ فضول خرچوں کو پسند نہیں کرتے۔

تو میں جب ایک آنکھ سے کام چلا سکتا ہوں تو دو آنکھوں کو استعمال کرنے میں کیا اسراف نہیں؟ چنانچہ یہ خیال آتے ہی ایک آٹے کی ٹکیا بنائی اور ایک آنکھ پر اس کو اچھی طرح لیپ کر اوپر سے پٹی باندھ دی۔ اور مثل سابق کے اپنی ریاضتوں میں مشغول رہنے لگے۔ پھر ایک دن خیال آیا کہ یہاں کثرت سے پھول ہیں۔ جن کی بھینی بھینی خوشبو سے نفس کو ایک خاص قسم کا سرور حاصل ہوتا ہے۔ مجھے اور سرور سے کیا تعلق۔ کیوں نہ نفس کی سرکشی کے لئے اب اسے کچھ زمانہ بد بو سنگھائی جائے۔ تا کہ جتنا زمانہ یہ خوش ہو کر پھولا ہے اتنا ہی زمانہ پریشان ہو کر کمزور ہو جائے۔

چنانچہ جھٹ سے ایک پاخانہ کی بتی بنا کر ایک نتھنے میں چڑھا دی اور پھر بدستور طریقت کی صحرا نوردی میں مشغول ہو گئے۔ اب وہ عبادت کرتا ہے مگر لاحاصل۔ اب وہ بادیہء طریقت میں دوڑتا ہے مگر علم شریعت نہ ہونے کی وجہ سے ''یَتِیْھُوْنَ فِی الْاَرْضِ اَرْبَعِیْنَ سَنَۃً'' کی پھٹکار پڑ گئی کیونکہ قرآن پاک میں آتا ہے۔

''اِذَا قُمْتُمْ اِلَی الصَّلٰوۃِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْھَکُمْ وَاَیْدِیَکُمْ اِلَی الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِکُمْ وَ اَرْجُلَکُمْ اِلَی الْکَعْبَیْنِ ؕ ۔(المائدہ: ۶)

یعنی جب تم نماز کے لئے کھڑے ہو تو پہلے اپنے، منہ ہاتھوں اور پاؤں کو دھو لو اور ربع سر کا مسح بھی کر لو۔

اب اگر ان میں کوئی چیز یا ان کا کوئی جزو دھونے سے باقی رہ گیا تو وضو نہ ہوا اور وضو نہ ہوا تو نماز نہ ہوئی۔ اور نماز نہ ہوئی تو صفائی باطن کہاں سے حاصل ہوگی۔ اسی طرح نماز کے لئے ضروری ہے کہ مصلی کے

کپڑے اور جسم نجاستِ حقیقی اور حکمی سے پاک ہو۔ اگر جسم یا کپڑے ناپاک ہونگے تو ہزاروں ٹکریں لگانے سے بھی دربارِ اعلیٰ میں کچھ شنوائی نہیں ہوگی۔ تو اب اس جاہل عابد کے حال پر نظر کرو ایک آنکھ پر تو آٹا لگا کر پٹی باندھ دی جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ وضو میں خشک رہ جاتی تھی۔ جس سے اس کا کبھی بھی وضو نہ ہوا پر ناک میں نجاست وہ بھی شرطِ طہارت کے خلاف۔

اس سے بھی نماز نہ ہوئی۔ جب وضو نہ ہوا تو نہ نماز تو پھر خواہ مخواہ کی ٹکروں سے اسے کیا فائدہ۔ تو معلوم ہوا کہ راہِ طریقت پر چلنے کے لئے سب سے پیشتر علمِ شریعت کی رہنمائی حاصل کر لینا ضروری اور لابدی ہے۔ بغیر اس کی رہنمائی حاصل کئے ہوئے راہِ طریقت پر گامزن ہونا ہلاکتِ جان اور خطرۂ ایمان ہے۔ اور علمِ شریعت کی مشغولیت اگرچہ اسے علمِ ظاہر ہی سمجھا جائے طریقت میں ترقی کرنے سے روکتی نہیں بلکہ طریقت کی ترقی کی تکمیل اسی سے ظاہر ہوتی ہے۔

”من اراد العبادة بعد الوصول فقد اشرك “کا صحیح مطلب اور حضرت جنید علیہ رحمۃ اللہ کا ارشاد:

کہتے ہیں کہ کسی جاہل نے حضرت جنید علیہ الرحمہ کے زمانے میں وصول الی اللہ کا دعویٰ کیا اور شیطانی غلبہ سے ایک دن کہہ اٹھا۔

”نحن وصلنا ولا حاجة لنا فی الصوم و الصلوة۔
یعنی ہم تو باری تعالیٰ سے واصل ہو گئے۔ اب وصول کے بعد ہمیں نماز اور روزے کی کوئی حاجت نہیں۔

کیونکہ صوفیا کا قول ہے! ”من اراد العبادة بعد الوصول فقد اشرك۔
یعنی جس نے واصل باللہ ہونے کے بعد عبادت کی تو وہ مشرک ہے۔

کیونکہ عبادت کا وصولِ باری کے ساتھ شرک لازم آیا۔ وہاں تو توحیدِ بحث کا مقام ہے نہ کہ شرکِ عبادت کا۔

حضرت جنید علیہ الرحمہ نے جب اس کے ایسے دعاوی اور دلائل سنے تو آپ نے فرمایا!

”صدقوه فی الوصول ولکن الی سقر۔
یعنی اس کا دعویٰ وصول سچا ہے اور تم سب اس کی تصدیق کرو۔ مگر وہ وصول الی اللہ نہیں بلکہ وصول الی جہنم

ہے۔ کیونکہ علم نہ ہونے کے باعث شیطان اسے دوسری طرف بہکا لے گیا اور ”من اراد العبادة بعد الوصول فقد اشرك“ کے ایسے معنی سمجھائے کہ وصول سے پہلے ہی مشرک بنا دیا۔ کیونکہ صوفیاء کے اس قول کا وہ مطلب نہیں جو یہ اندھا سمجھا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وصول الی اللہ کے بعد سالک عبادت کو بالاارادہ نہیں کرتا بلکہ عبادت اُس کی طبیعت اور فطرت بن جاتی ہے۔ جیسے طبعی امر اور فطری کام میں ارادہ کا کوئی تعلق نہیں۔

ایسے ہی واصل باللہ کی عبادت بھی تعلق ارادہ سے منزہ ہو جاتی ہے اور یہ عبادت کا انتہائی درجہ ہے۔ اور یہ بھی مطلب اس کا ہوسکتا ہے کہ واصل وصول کے بعد عبادت کو مراد نہیں سمجھتا۔ بلکہ اس وقت اس کی مراد محبوبِ حقیقی ہو جاتی ہے تو نفی مراد سے نفی عبادت کا نتیجہ نکالنا شیطانی اغوا نہیں تو اور کیا ہے۔

ظاہر و باطن کا تعلق:

ظاہر کا باطن کے ساتھ ایسا تعلق ہے جیسے آگ کا حرارت کے ساتھ یا سورج کا روشنی کے ساتھ۔ بعض پیر صاحب التزویر کہا کرتے ہیں کہ! میاں باطن اچھا ہونا چاہئے۔ نماز، روزہ اور حج وغیرہ یہ سب ظاہری اعمال ہیں۔ ان کا باطن سے کیا تعلق۔

اور اس طرح وہ کتنے ہی عقل کے اندھوں کو اپنے دام تزویر میں پھنسا کر اپنا الو سیدھا کرتے ہیں۔ مگر یہ نادان نہیں سمجھتے کہ جب ایک شخص عاشق الٰہی اور عاشقِ رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور اپنے باطن کو ان کی محبت سے بسا ہوا ظاہر کرتا ہے تو پھر کس طرح وہ ان کے احکام سے سرکشی کرسکتا ہے۔ عاشق کا کام تو معشوق کے ہر ایک حکم کو بلا چوں و چراں تسلیم کر کے عمل کرنا ہوتا ہے۔ یہ کہاں کا عشق، پر کہا جاسکتا ہے کہ دعویٰ تو ہو عشق اور محبت کا مگر حالت ہو مخالفوں اور عداوت والوں کی۔ کسی شاعر نے کہا ہے۔

نمے باشد مخالف قول و فعل راستاں باہم
كه گفتار قلم باشد زرفتار قلم پیدا

ترجمہ: سچوں کا قول اور فعل آپس میں مخالف نہیں ہوتے۔ قلم کی گفتار قلم کی رفتار سے پیدا ہوتی ہے۔

شیخ سعدیؒ نے فرمایا ہے کہ!

''ہرچہ در کوزہ باشد ازاں ہماں طراود''

کہ جو کچھ کوزے میں ہوتا ہے اس سے وہی ٹپکتا ہے۔

اگر خدا اور رسول سے محبت ہے تو کیا محبت کا کوئی قطرہ بھی کوزۂ قلب سے باہر نہ ٹپکے گا۔

تعصی الرسول و انت تظهر حبه   هذا لعمری فی العصال بدیع
لو کان حبك صادقا لا طعته   ان الحب لمن یحب مطیع

یعنی تو حضور ﷺ کی نافرمانی کرتا ہے اور پھر اُن کی محبت کا دعویٰ کرتا ہے۔ خدا کی قسم یہ نہایت ہی عجیب کام ہے۔ اگر تیری محبت سچی ہوتی تو تو ضرور ان کا فرمانبردار ہوتا۔ کیونکہ عاشق اپنے معشوق کا مطیع ہوتا ہے۔

اگر ظاہری حالت قابلِ اعتبار نہ ہوتی اور صرف باطن ہی کی صفائی کا دعویٰ صحیح ہوتا۔ تو پھر اللہ تعالیٰ:

''تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمَاهُمْ ''(البقرۃ:۲۷۳)

تو پہچانتا ہے ان کو ان کی نشانیوں سے۔

اور

''سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ؕ''(الفتح:۲۹)

انکے منہ پر سجدوں کے نشان ہیں۔

فرما کر ظاہری علامات کو معرف اور ذریعہ شناخت نہ بیان فرماتے۔ مولانا روم علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

حق جو سیما را معرف آمد خواندہ است   چشم عارف سوئے سیما ماندہ است
رنگ و بو غماز آمد چوں جرس   از فرس آگہ کند بانگ فرس
بانگ ہر چیزے رساند زد خبر   تا شناسی بانگ خراز بانگ در

یعنی اللہ تعالیٰ نے ظاہری علامات کو چونکہ معرف فرمایا ہے۔ اس واسطے عارف کی نظر ظاہری علامات پر پڑتی ہے۔ ظاہری رنگ و بو گھنٹی کی طرح حالاتِ باطن پر غماز اور مخبر ہیں۔

جیسے گھوڑے کی آواز گھوڑے کا پتہ دیتی ہے اور اسی طرح ہر چیز کی آواز اس کا پتہ دیتی ہے۔ حتیٰ کہ اسی ظاہری آواز کی وجہ سے آواز خر اور آواز در میں تمیز کی جا سکتی ہے۔

شیخ سعدی صاحب نے فرمایا۔

ہر کرا جامہ پارسا بینی
پارسا دان و نیک مرد انگار

یعنی جس کا ظاہر نیکوں کا دِکھے تو اسے نیک اور متقی ہی سمجھ۔

"نحن نحکم بالظواھر واللہ یعلم بالسرائر"

(روح البیان: جز ۹، سورہ الحشر صفحہ ۳۴۳، داراحیاء التراث العربی)

کہ ہمارا حکم تو ظاہر سے متعلق ہے باطن کا حال اللہ ہی جانتا ہے۔

تو جو شخص حقیقی طور پر صفائی باطن، عشقِ رسول اور حُبِ خداوندی کا مدعی ہو۔ اس کا ظاہر بھی ضرور اس کے دعوے کی تصدیق کریگا۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص آگ کے پاس بیٹھے اور گرم نہ ہو۔ برف میں رہے اور ٹھنڈک محسوس نہ کرے۔ اسی واسطے شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

مے تواں داشت نہاں عشق زمردم لیکن — زردئے رنگ رخ و خشکی لب چه علاج
لب خشک چشم تر ہے رنگت ہے زعفرانی — چہرے پہ ان کے ہر اک ہے عشق کی نشانی

عشق کبھی بھی نہیں چھپ سکتا:

لوگوں سے عشق کو تو چھپایا جاسکتا ہے۔ مگر علاماتِ عشق کو کوئی کیسے چھپائے گا۔ عاشق کا چہرہ زرد پڑ جاتا ہے۔ اور اس کے ہونٹ فراقِ یار اور ہجرِ دلدار میں خشک ہو جاتے ہیں۔ اور اسی کو حضرت علی رضی اللہ عنہ یوں بیان فرماتے ہیں۔

"ھم صفر الوجوہ من السھر عمش العیون من العبر۔ خمص البطون من الطوی یبس الشفا من الذوی۔

(روح البیان: ج ۴، سورہ یونس، داراحیاالتراث العربی)

یعنی عاشقوں کا چہرہ بوجہ بیداری کے زرد ہوتا ہے۔ ان کی آنکھیں رونے کی وجہ سے چندھیا جاتی ہیں۔ فاقہ کی وجہ سے ان کا پیٹ پیٹھ سے لگا ہوتا ہے۔ اور ان کے ہونٹ باطنی سوزش کی وجہ سے خشک ہوتے ہیں۔

عشق کے متعلق ایک عجیب نکتہ:

نکتہ: عشق ماخوذ ہے عشقہ سے۔ اور عشقہ وہ بیل ہے کہ جس درخت پر چڑھتی ہے۔ اُسے بالکل سکھا دیتی ہے اور اس کی رطوبت اور تازگی ہمیشہ کے لئے رخصت ہو جاتی ہے۔ اور پھر یہ ایسی بیل ہے۔ کہ اگر اُسے کوئی جانور کھائے اور وہ گوبر بن کر نکلے اور اس گوبر کو جلا کر کہیں پھینک دیا جائے۔ تو یہ پھر اس کی راکھ سے بھی پیدا ہو جاتی ہے۔ جب عشقہ کی بیل کا یہ حال ہے تو پھر خدا اور رسول کے عشق کی بیل کس طرح عاشقِ صادق کو نہ سکھا دیتی ہوگی۔ اور کس طرح عشق کے بھرے ہوئے دل کی کوئی علامت عاشق کے چہرے اور چال ڈھال پر ظاہر نہ ہوگی۔ کسی بدو نے کیا خوب کہا ہے۔

العشق خفی نا یری دالعشق جلی ان یخفی

یعنی عشق ایک مخفی چیز ہے اسے دیکھا نہیں جا سکتا۔ اور اس قدر ظاہر ہے کہ اسے چھپایا نہیں جا سکتا۔ مولانا روم صاحب علیہ الرحمہ فرماتے ہیں ؎

گرچہ تفسیر زباں روشن گر است
لیک عشق بے زباں روشن تر است

یعنی اگرچہ زبان عشق کی تفسیر و توضیح کر سکتی ہے۔ مگر بے زبان عشق اس کے بیان سے بھی زیادہ ظاہر اور واضح ہے۔

سچ ہے ؎

عشق اور مشک چھپائے سے نہیں چھپتے
بر سرِ راہ پٹا ہے ڈھنڈورا ان کا

ایک ہندی شاعر کا مجھے ایک اسی قسم کا شعر یاد آگیا ہے انہوں نے فرمایا ہے۔ چھ چیزیں نہیں چھپائی جا سکتیں۔ ہزار چھپاؤ وہ خود بخود ظاہر ہو جاتی ہیں۔ اور وہ چھ چیزیں یہ ہیں۔

عشق، مشک، کھانسی، کھمس، خیر، خون، مدھو بھان، اکتو چھپایو نہ چھپے پر گھٹ ہوت ندان

مکار پیروں کا اعتراض کہ حضور اُمی تھے۔ لہٰذا طریقت کیلئے

علم شریعت کی ضرورت نہیں اور اس کا جواب:

اب مکار پیروں اور کاذب مدعیانِ ولایت کا یہ کہنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُمی تھے اور باوجود علمِ ظاہری نہ رکھنے کے تمام اولیاء کے مقتدا اور پیشوا ہوئے۔ تو معلوم ہوا کہ تصفیہ باطن کے لئے علمِ ظاہری کی ضرورت نہیں۔ بایں وجہ غلط ہے کہ ہر ایک نبی مبلغِ شریعت ہوتا ہے۔ اور مبلغِ شریعت کے لئے علمِ شریعت سے واقف ہونا نہایت ضروری ہے۔ کیونکہ وہ علمِ شرع کی واقفیت کے بغیر شریعت کے احکام عوام کو کس طرح پہنچا سکے گا۔

لیکن علمِ شریعت کے حاصل کرنے کے لئے ظاہری طور پر پڑھنا اور درس حاصل کرنا ضروری نہیں۔ یہ علم کبھی تو اکتساب سے حاصل ہوتا ہے۔ اور کبھی عطاء سے۔ کبھی کتابیں پڑھ پڑھا کے اس سے واقفیت حاصل کی جاتی ہے اور کبھی اللہ تعالیٰ کی جانب سے بلاکسب و اکتساب ہی اسے علمِ ظاہر سے بہرہ ور کر دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ علمِ ظاہر اکتسابی ہو یا وہبی ہر حالت میں اس کا ظہور ضروری ہوتا ہے۔ اور علم کا ظہور اس پر عمل کرنے سے ہی ہو سکتا ہے۔ اور اسی واسطے انبیاء علیہم السلام اس علمِ وہبی کو ظاہر کرنے کے لئے سب سے زیادہ عامل ہوا کرتے تھے۔

علمِ وہبی کے متعلق مولانا رومؒ صاحب نے ایک نہایت اعلیٰ مثال دی ہے۔ جس سے علمِ عطائی کے حاصل ہونے کی کیفیت کو آپ بخوبی سمجھ جائیں گے۔

علمِ اکتسابی اور وہبی کی مثال:

آپ نے لکھا ہے کہ کسی بادشاہ کے دربار میں چینیوں اور رومیوں میں فنِ نقاشی کے متعلق جھگڑا ہوا۔ رومیوں کا دعویٰ تھا کہ آج دنیا میں کوئی ایسی قوم نہیں جو ہمارے بنائے ہوئے نقش و نگار کا مقابلہ کر سکے۔ چینیوں نے کہا کہ تمہارا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے۔ چین کی نقاشی آج تمام سطح زمین پر مشہور ہے۔ ہمارا مقابلہ تو کوئی کیا کرے گا۔ ہماری بنائی ہوئی چیز کی پوری پوری نقالی کر سکنا بھی بہت مشکل ہے۔ چنانچہ بادشاہ نے جب ان کی یہ باتیں سنیں تو دونوں گروہوں سے اپنے اپنے دعوے کا ثبوت مانگا۔ اور ان کے لئے ایک مکان مخصوص کر دیا اور بیچ میں پردہ لٹکا دیا۔ اور حکم دیا کہ تم دونوں گروہ ایک ایک دیوار پر اپنے اپنے ہنر

دکھاؤ۔ تاکہ میں اور میری سلطنت کے اراکین تمہاری فضیلت کا فیصلہ کر سکیں۔ چنانچہ دونوں گروہ اپنے اپنے فن کا کمال دکھانے کے لیے دیواروں پر نقش ونگار بنانے میں مصروف ہو گئے۔ ایک طرف چینیوں نے نہایت جانفشانی اور کاریگری سے دیوار کو اپنے اعلیٰ قسم کے نقوش سے آراستہ کیا اور دوسری طرف رومیوں نے مقابل کی دیوار کو صاف اور چمکیلا بنانا شروع کیا اور ایسا شفاف کر دیا کہ دیوار کی سطح آئینہ سے بھی زیادہ چمکیلی اور مصفّٰی نظر آنے لگی۔ جو شخص اس کے سامنے کھڑا ہوتا تو اس کا عکس دیوار کی صفائی اور چمک کی وجہ سے اصلی شکل سے بھی زیادہ جاذب اور خوبصورت نظر آتا۔ چنانچہ جب فریقین اپنا اپنا کام پورا کر چکے تو بادشاہ کو بمع امراء و وزراء کے ملاحظہ کرنے کی دعوت دی گئی۔ بادشاہ اور اراکین نے جب چینیوں کے نقش ونگار اور بیل بوٹوں کو دیکھا تو بے ساختہ زبان سے مرحبا اور سبحان اللہ نکل گیا۔ جب چینیوں کا ہنر دیکھا جا چکا تو بادشاہ نے حکم دیا کہ بیچ سے پردے کو ہٹا دیا جائے۔ تاکہ رومیوں کا کام دیکھ کر چینیوں کے کام سے مقابلہ کر کے اعلیٰ و ادنیٰ کا فیصلہ کیا جائے۔ پردہ کا ہٹانا تھا کہ چینیوں کے بنائے نقش ونگار رومیوں کے بنائے ہوئے آئینہ میں منقش ہو گئے۔ اور شیشے کی صفائی و صیقل کے باعث عکس اصل سے زیادہ خوبصورت اور جاذبِ نظر آنے لگا۔ چنانچہ مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

رومیاں آں صوفیاں اند اے پسر　　نے زتکرار و کتاب ونے ہنر
لیک صیقل کردہ اند آں سینہا　　پاک زازو حرص و بخل و کینہ ہا

یعنی انبیاء اور اولیاء اللہ کی مثال ان رومیوں کی سی ہے جو تکرار درس، قرات کتاب اور تحصیلِ فن سے عاری ہیں۔ مگر ان کے سینے ریاضت سے ایسے صیقل اور مصفّٰی ہیں۔ کہ ان میں حرص، بخل یا کینے کا نام ونشان نہیں۔ چونکہ یہی چیزیں انوارِ علوم کے فیضان سے محروم کرتی ہیں۔ اس لئے ان کے ازالہ کے بعد اب ان کے دلوں پر وھبیہ طریق سے علوم شریعت کو منعکس کر دیا گیا۔

تعلمنا بلا حرف و صوت
قراناہ بلا سھو و فوت

ترجمہ: ہم نے بغیر حرف و آواز کے سیکھا اور اُسے بغیر کسی غلطی و بھول کے پڑھا۔

تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بھی وہبی طور پر علومِ شریعت کے عالم تھے۔ ورنہ تبلیغِ احکام کس طرح فرماتے۔ لہٰذا مدعیانِ کذاب کا مدعا اس طرح سے بھی ثابت نہ ہوسکا۔ اور اگر چہ حضور سرورِ عالم کا علم، علمِ لدنی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے آپ کے سینہ بے کینہ کو بغیر کسب و اکتساب کے ماکان ومایکون کے علوم کا خزینہ بنا دیا۔ مگر وہ قرآنِ مجید اور فرقانِ حمید جو آپ پر نازل کیا گیا۔ نہایت صاف اور صریح الفاظ میں مطلق عالم کی تعریف فرما رہا ہے۔ جس میں وہ عالمِ اکتسابی بھی شامل ہو جاتا ہے۔ تو سچ پوچھو تو قرآنِ پاک نے جہاں علم کی تعریف فرمائی ہے وہاں یہی علمِ اکتسابی مراد ہے۔ کیونکہ وہبی کا فضلِ رب اور عطیہ ایزدی ہونا صاف ظاہر ہے۔ اس واسطے اس کی تعریف وتوصیف کو تحصیل حاصل ہے۔ پھر علمِ وہبی اس قدر نادر اور کمیاب ہے کہ اس کو مدنظر رکھتے ہوئے قرآنِ پاک کے الفاظ کو اسی پر منطبق کرنا گویا اللہ کو جو اسم ذات ہے اور مجتمع ہے جمیع صفات کا کسی ایک وصف میں منحصر کرنا ہے۔

اب میں چند ایک آیات اور احادیث آپ کے سامنے فضیلتِ علم کے متعلق بیان کرتا ہوں۔ تا کہ آپ ان فضائل کو مدنظر رکھ کر جاہل پیروں کی لن ترانیوں کی حقیقت کو سمجھ سکیں۔ اور آپ کو معلوم ہو جائے کہ وہ علم کے رفیع ومنیع مرتبہ کو محض اپنی جہالت پر پردہ ڈالنے کے لئے گھٹاتے ہیں۔

’’یَحْسَبُوْنَ اَنَّھُمْ یُحْسِنُوْنَ صُنْعًا ۝ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّھِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمٰلُھُمْ فَلَا نُقِیْمُ لَھُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَزْنًا ۝۔ (الکھف: ۱۰۴، ۱۰۵)

یعنی ایسے جاہل علم کے قدر ومرتبہ کو گھٹا کر اور اس طرح اپنی جہالت اور ضلالت پر ہدایت کا رنگ لگا کر سمجھتے ہیں کہ ہم بہت اچھا کام کر رہے ہیں۔ وہ اچھا نہیں کر رہے بلکہ اس طرح تو وہ علم کی فضیلت اور مرتبت کے متعلق جس قدر آیتیں ہیں۔ ان کا انکار کر رہے ہیں اور یہ انکار اور تحقیر آیات و احادیث ان کی تمام ریاضتوں اور عبادتوں کو ایسا بھسم کر دیگا کہ گویا انہوں نے دنیا میں آ کر کوئی کارخیر کیا ہی نہیں۔ اور جب کوئی کارخیر ان کے نامہ اعمال میں نہ ہوا تو پھر روز قیامت ان کے لئے کوئی وزن بھی قائم نہ ہوگا۔

کیونکہ نامہ اعمال میں کچھ نیکیاں ہوں تو تولی جائیں۔ جب انکار آیات سے سب نیکیاں برباد ہو چکی ہیں تو وزن کس کے لئے قائم کیا جائے۔

فضائلِ علم و علماء:

اللہ تعالیٰ جل شانہٗ قرآن پاک میں ارشاد فرماتا ہے!

”شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ ؕ“۔

(آلِ عمران:۱۸)

یعنی اللہ گواہی دیتا ہے کہ اس کے بغیر اور کوئی معبود نہیں۔ اور اسی بات پر فرشتے، علمائے منصفین بھی گواہی دیتے ہیں کہ میں ایک ہی ہوں اور میرا کوئی شریک وسہیم نہیں۔

دیکھئے اس جگہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدت پر فرشتوں اور علماء کو شاہد قرار دیا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے خود اپنی کلام پاک میں کسی معاملہ کے ثبوت کے لئے دو گواہوں کا ہونا ضروری قرار دیا ہے۔

چنانچہ قرآن پاک میں آتا ہے!

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ“۔

(البقرۃ:۲۸۲)

یعنی اے مسلمانو! جب کوئی معاملہ کرو تو دو مردوں کو گواہ بنالیا کرو۔ یا اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں گواہ ہونی چاہئیں تاکہ اگر ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلاسکے۔

چونکہ دنیا کا معمولی سے معمولی انسان بھی اپنے دعویٰ کے ثبوت کے لئے فاسق گواہوں کو پیش نہیں کرتا۔ بلکہ معزز اور ثقہ گواہوں کو پیش کرتا ہے تاکہ ان کی ثقاہت اور تقدس کے لحاظ سے ان کی شہادت کو قابل اعتبار قرار دیا جائے۔ تو پھر اللہ تعالیٰ کو اپنے دعویٰ وحدانیت پر کس قسم کے عادل اور ثقہ گواہوں کو پیش کرنا چاہیے۔ یہ مدعی کی شان اور دعویٰ کی اہمیت سے آپ خود اندازہ لگاسکتے ہیں۔ سب سے پہلے گواہ تو فرشتوں کا گروہ ہے جن کے تقدس اور ثقاہت کی شان تو یہ ہے کہ!

”لَا يَعْصُوْنَ اللّٰهَ مَاۤ اَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُوْنَ مَا يُؤْمَرُوْنَ ۝“۔(التحریم:۶)

یعنی فرشتے ایسی مخلوق ہیں کہ وہ کسی حال میں اللہ جل شانہٗ کی نافرمانی نہیں کرتے اور وہ اس کے حکم کے

مطابق کام کرتے ہیں۔

اب جب ایک گواہ اس پائے کا ہے تو دوسرا گواہ بھی تو ایسا ہی ہونا چاہیے اب وہ دوسرا مقدس گواہ کون ہے: ”وَاُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًاۢ بِالْقِسْطِ“۔ یعنی عالمِ باعمل۔ کیونکہ عالم کہتے ہیں عالمِ باعمل بے عمل نہ تو عالم کہلانے کے قابل ہے اور نہ ہی اس کی شان کو بیان کر رہا ہوں بلکہ یہ سب کی سب تعریف عالمِ باعمل کی ہے کیونکہ ؎

چو کسب علم کردی در عمل کوش
که علم بے عمل زہر یست بے نوش

ترجمہ: جب تو نے علم حاصل کیا تو عمل کی کوشش کر کہ بغیر عمل کے علم بغیر پینے کے زہر ہے۔

اب آیت کے اس ٹکڑے پر غور کرو اور دیکھو اللہ تعالیٰ نے علماء کی شان کو کن الفاظ میں اور کس طریقہ پر بیان فرمایا ہے۔ ایک تو انہیں فرشتوں کے برابر شاہد کی حیثیت سے پیش کیا دوسرے فرشتوں جیسی پاک مخلوقات کے ساتھ اس مقدس گروہ کو یاد فرمایا۔ اور پھر علماء کے لئے یہ کیا کم فضیلت ہے کہ وہ احکم الحاکمین تعریف کے مقام پر انہیں اپنے کلام ابلغ النظام (بہترین نظام) میں یاد فرما رہا ہے۔ ع

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

ترجمہ: بلبل کیلیے گُل کا قافیہ ہونا ہی بہت ہے۔

آج اگر کوئی دنیا کا بادشاہ کسی عام انسان کو اپنے خاص درباریوں کے ساتھ یاد کرے تو اس شخص کے لیے کس قدر باعثِ فخر اور فرحت ہوتا ہے۔ اسی طرح جب احکم الحاکمین اور رب العلمین علماء کو اپنے مقربینِ بارگاہ کے ساتھ یاد کرے تو پھر ان کی، شان اور فضیلتِ مرتبت کے لئے اور کس دلیل کی ضرورت ہو سکتی ہے۔ اور پھر معمولی طور پر بھی یاد نہیں کیا۔ بلکہ انہیں ان مقربین کی طرح اپنی ذات کے سب سے بڑے اور مہتم بالشان معاملے یعنی وحدانیت پر گواہ بنا کر پیش فرمایا۔ تو پھر خود سوچ لو کہ شہادت میں فرشتوں کے ہم پایہ انسان کتنے بڑے مرتبے اور شرف کا مالک ہوگا۔

پھر دوسری جگہ رب العزت فرماتا ہے!

''یَرۡفَعِ اللّٰہُ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا مِنۡکُمۡ ۙ وَ الَّذِیۡنَ اُوۡتُوا الۡعِلۡمَ دَرَجٰتٍ ؕ''۔(المجادلۃ:۱۱)

کہ اللہ تعالیٰ مومنوں اور عالموں کے درجوں کو بلند فرماتا ہے۔

کفار پر مومنوں کا درجہ تو ظاہر ہے۔ پھر مومنوں کو بیان کر کے خصوصیت سے علمائے کرام کا ذکر فرمایا جس کا مطلب یہ ہے کہ نفس رفعِ درجات میں سب مومن شامل ہیں۔ مگر عام مومنوں سے علمائے مومنین کے درجے بہت رفیع و منیع ہیں۔ اسی واسطے ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ عام ایمان والوں پر عالموں کا مرتبہ سات سو درجے بلند ہوتا ہے۔ اور پھر فرمایا کہ ہر دو درجوں کا درمیانی فاصلہ اتنا ہوتا ہے جیسے پانچ سو برس کی راہ۔ پھر تیسری جگہ ارشاد ہوتا ہے!

''قُلۡ ہَلۡ یَسۡتَوِی الَّذِیۡنَ یَعۡلَمُوۡنَ وَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ ؕ''۔(الزمر:۹)

کہ اے حبیب انہیں کہہ دیجئے کہ کیا عالم اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں۔

پھر چوتھی جگہ فرمایا!

''اِنَّمَا یَخۡشَی اللّٰہَ مِنۡ عِبَادِہِ الۡعُلَمٰٓؤُا ؕ''۔(فاطر:۲۸)

کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کا ڈرنا علماء ہی کو نصیب ہوتا ہے۔

اور محبت بھرا ڈرنا اس لئے کہ ڈرنا دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو خوف کا اور ایک محبت کا۔ خوف کا ڈر تو ایسا ہے جیسے شیر، چیتے وغیرہ سے ڈرنا اور محبت کا ڈر ایسا ہے جیسے معشوق کے خلافِ طبیعت کام کر کے اسے ناراض کرنے سے ڈرنا۔ اور علماء کا ڈر ہی محبت بھرا ڈر ہے۔ کیونکہ خوف کا ڈر تو عوام کو ہوتا ہے نہ کہ خواص کو۔

پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں!

''فَضۡلُ الۡعَالِمِ عَلَی الۡعَابِدِ کَفَضۡلِی عَلَی أَدۡنَی رَجُلٍ مِنۡ أَصۡحَابِی''۔

(احیاء علوم الدین: ج ۱، کتاب العلم وفیہ سبعۃ ابواب، دار المعرفۃ بیروت)

یعنی عالم کی بزرگی عابد پر ایسی ہے جیسے میری بزرگی میرے اصحاب میں سے ادنیٰ آدمی پر ہے۔

پھر فرمایا!

فَضۡلُ الۡعَالِمِ عَلَی الۡعَابِدِ کَفَضۡلِ الۡقَمَرِ لَیۡلَۃَ الۡبَدۡرِ عَلٰی سَائِرِ الۡکَوَاکِبِ۔

(سنن ابی داؤد: الجز۵، رقم: ۳۶۴۱، باب الحث علی طلب العلم، دار الرسالۃ العالمیہ)

یعنی عالم کی بزرگی عابد پر ایسی ہے جیسے چودھویں رات کے چاند کی بزرگی باقی ستاروں پر ہوتی ہے۔

علم و علماء کی فضیلت سے قرآن اور کتب احادیث بھری پڑی ہیں۔ ان سب کا اس جگہ ذکر کر کے ان کے نکات کو بیان کرنا اصلی بات سے بہت دور لے جائے گا۔ مگر ''الاشارہ تکفی للعاقل'' عاقل کو اشارہ ہی کافی ہے۔ ایک سمجھدار انسان اس مختصر بیان سے بھی ان بہروپیوں کی لن ترانیوں کو اچھی طرح سمجھ سکے گا۔ شیخ سعدی صاحب علیہ الرحمہ نے فرمایا ہے۔

پئے علم چوں شمع باید گداخت
کہ بے علم نتواں خدا را شناخت

کہ علم کے پیچھے شمع کی طرح پگھل جانا چاہیئے کیونکہ علم کے بغیر خدا شناسی بمشکل حاصل ہوتی ہے۔

لیکن پھر بھی دوبارہ میں آپ کہے دیتا ہوں کہ عالم سے مراد عالِم باعمل ہے۔ نہ کہ:

''کَمَثَلِ الْحِمَارِ یَحْمِلُ اَسْفَارًا ط'' (الجمعۃ: ۵)

یعنی چار پائے بروکتابے چند۔ گدھے کی مثال ہے جو پیٹھ پر کتابیں اٹھائے۔

میں اس مبحث کو حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے ایک شعر پر ختم کرتا ہوں

العلم اشرف شئی ناله رجل من لم یکن فیه علم لم یکن رجلا
تعلم العلم و اعمل یا اخی به فا لعلم زین لمن بالعلم قد عملا

یعنی جو چیزیں انسان نے حاصل کی ہیں۔ ان سب سے زیادہ شریف اور اعلیٰ علم ہے اور جس میں علم نہ ہو وہ آدمی ہی نہیں۔ اے بھائی علم حاصل کر کے اس پر عمل کر۔ کیونکہ علم اسی کے لئے زینت ہے۔ جس نے اپنے علم پر عمل بھی کیا۔ ورنہ ایک اندھا ہے جو ہاتھ میں چراغ رکھتا ہے۔ مگر اسے اس سے کیا حاصل۔ کیونکہ۔

العلم بلا عمل عقیم
والعمل بلا علم سقیم
والعلم بالعمل صراط مستقیم

ترجمہ: عمل بغیر علم کے سقیم و بیمار ہے اور علم بغیر عمل کے عقیم یعنی بانجھ و بے کار ہے۔ علم کے ساتھ عمل ہدایت کا راستہ ہے۔

پیرانِ بے پیر کا آخری اعتراض اور جواب:

اب سب سے آخری پیرانِ بے پیر کا یہ اعتراض کہ علمِ شریعت علمِ طریقت کے مقابلہ میں کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ ورنہ موسیٰ علیہ السلام جو ایک الوالعزم پیغمبر اور ماہرِ شریعت عالم تھے۔ خواجہ خضر علیہ السلام کے پاس نہ بھیجے جاتے۔

جواب: علمِ شریعت اور علمِ طریقت کی تفصیل کے متعلق پوری تفصیل کر چکا ہوں اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ علمِ طریقت علمِ شریعت کی ایک شاخ ہے جس طرح شاخ اپنے وجود میں درخت کی محتاج ہوتی ہے۔ اسی طرح طریقت اپنے وجود میں شریعت کی محتاج ہے۔ اور محتاج الیہ کا درجہ محتاج سے بڑا ہوتا ہے۔
اب رہا یہ امر کہ پھر موسیٰ علیہ السلام خضر علیہ السلام کے پاس تکمیل و تحصیل کے لئے کیوں بھیجے گئے؟

بات یہ ہے کہ ایک دفعہ آپ نے نہایت پر اثر اور اعلیٰ وعظ بیان فرمایا جس سے حاضرین پر بے انتہا اثر ہوا۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے موسیٰ علیہ السلام سے پوچھا کہ یا حضرت کہ کیا موجودہ زمانے میں آپ سے بھی بڑا کوئی عالم دنیا میں موجود ہے۔ آپ نے فرمایا!
”انا اعلم“ کہ اس وقت مجھ سے بڑا اور کوئی عالم روئے زمین پر موجود نہیں۔
اگرچہ آپ کا دعویٰ حقیقت کے اعتبار سے بالکل سچا اور ٹھیک تھا۔ کیونکہ آپ کے مقابل میں اس وقت اور کوئی صاحبِ کتاب رسول علیہ السلام موجود نہ تھا۔ ہارون علیہ السلام یا باِختلافِ روایات خضر علیہ السلام محض نبی اور شریعتِ موسوی کے متبع تھے۔ مگر چونکہ ظاہراً آپ کے الفاظ اور دعویٰ میں کبر کا شائبہ محسوس ہوتا تھا۔ اس لئے تعلیمِ احتیاط کی غرض سے اللہ تعالیٰ نے بعض ایسے مخفی اُمور کو حضرت خضر علیہ السلام پر کھول دیا جن سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آگاہی نہ تھی۔ چنانچہ خود خضر علیہ السلام جب آخر میں اپنے کاموں کی تفصیل و تشریح حضرت موسیٰ علیہ السلام سے بیان کرتے ہیں تو صاف اقرار کرتے ہیں کہ!
”وَمَا فَعَلْتُهٗ عَنْ اَمْرِیْ ؕ“۔ (الکھف: ۸۲)

کہ میں نے یہ کام اپنے اختیار سے نہیں کئے۔

بلکہ اللہ جل شانہ کے اِذن اور اجازت سے یہ کام کئے ہیں۔ جس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو محض تعلیمِ احتیاط کے لئے حضرت خضر علیہ السلام پر چند پوشیدہ اور سری اُمور کو ظاہر کر کے بھیجا گیا۔ اور حقیقت میں جس طرح طریقت شریعت سے کم مرتبہ ہے اسی طرح ان کے فروعات اور متعلقات بھی آپس میں وہی نسبت رکھتے ہیں مگر جس طرح ایک تھیلی کی بند چیزوں کے متعلق ایک چھوٹے بچے کو معلوم ہو پھر ایک نہایت عالم، فاضل اور قابل انسان سے تھیلی کی خفیہ چیزوں کے متعلق سوال کیا جائے اور وہ جب ان کو نہ بتا سکے تو پھر اس چھوٹے بچے سے ان چیزوں کے متعلق سوال کر کے علم حاصل کیا جائے۔ تو کیا اب اس فاضل انسان کا درجہ اس بچے سے کم ہو جائیگا۔ یا وہ بچہ ان بتائی ہوئی چیزوں کے بتانے سے اس عالم شخص سے زیادہ مقتدر بن جائیگا۔

ہاں مگر بہت کھینچا تانی کی جائے تو زیادہ سے زیادہ جزوی فضیلت ثابت ہوتی ہے مگر فضیلتِ جزوی کے حصول سے فضیلتِ کلی کیسے حاصل ہوگئی۔ اور فضیلتِ جزوی تو تمام انبیاء اور اولیاء میں رکھی گئی ہے۔ مثلاً کسی کو کسی معجزہ سے نوازا تو کسی کو کسی سے۔ کسی میں جمالی رنگ غالب کیا تو کسی میں جلالی۔ کسی پر رقت طاری کی۔ تو کسی پر خشونت۔ کوئی رحمۃ للعالمین ہے تو کوئی!

”رَّبِّ لَا تَذَرۡ عَلَى الۡاَرۡضِ مِنَ الۡكٰفِرِيۡنَ دَيَّارًا ۝۔ (نوح:۲۶)
اے میرے رب زمین پر کافروں میں سے کوئی بسنے والا نہ چھوڑ۔ کی شان رکھتا ہے۔

جو میوہ بی بی مریم کو کھلایا گیا وہ ذکریا علیہ السلام نے نہ چکھا۔ ابو البشر آدم علیہ السلام پر وہ کچھ ظاہر کیا گیا کہ وہ مسجودِ ملائک بنے۔ اور ملائکہ کرام سے اسی کی بابت سوال ہوا تو انہوں نے!

”سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَاۤ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ“۔ (البقرۃ:۳۲)
پاک ہے تجھے ہمیں کچھ علم نہیں مگر جتنا تو نے ہمیں سکھایا۔
کا عذر پیش کیا۔

حیوانات کو دیکھو۔ چیونٹی ایسی قوتِ شامہ رکھتی ہے کہ ہاتھی اور انسان تک نہیں رکھتا۔ سانپ وہ قوتِ

مقناطیسی رکھتا ہے کہ دوسرے حیوانات میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں ہوتا۔

مولانا روم فرماتے ہیں ؎

آنچہ حق آموخت مر زنبور را　　آں نباشد شیر را و گور را
خانہ ہا سازد پُر از حلوٰے تر　　حق برو آں علم را بکشاد در
آنچہ حق آموخت کرم پیلہ را　　ہیچ پہلے داند آں گوں حیلہ را

ترجمہ: حق تعالیٰ نے جو علم زنبور (بھڑ) کو سکھایا وہ علم شیر اور گور (جنگلی گدھے) کو حاصل نہیں۔ زنبور حلویٰ سے بھرے ہوئے بے شمار گھر بناتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس علم کے دروازے اس پر کھول دیئے ہیں۔ جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ریشم کے (کیڑے) کو سکھادیا ہے کوئی ہاتھی اس قسم کے حیلے کو نہیں جانتا۔

تو گویا فضیلتِ جزوی سے فضیلتِ کلی کا حکم نہیں لگایا جاسکتا۔ اس تقریر کے سمجھ جانے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اسے جاننے سے نہ تو طریقت کا تفاضل شریعت پر ثابت ہوتا ہے اور نہ خضر علیہ السلام کا موسیٰ علیہ السلام پر۔

علمِ طریقت ہم مانتے ہیں کہ نہایت دقیق علم ہے۔ مگر جیسا کہ ہم ثابت کر چکے ہیں کہ علمِ شریعت تو علمِ طریقت کی اصل اور جڑ ہے تو اس لحاظ سے شرع دقیق نہیں بلکہ اِدق کہلایا جاسکتا ہے۔ اور دقیق تب ہی تک دقیق رہتا ہے کہ جب تک اس پر وقت کا پردہ پڑا رہے۔ مگر جونہی کہ وہ کسی کو بتادیا گیا تو اب وہی دقیق اس بتائے ہوئے شخص کے حق میں ایک عام اور آسان بات ہو جاتی ہے۔ دیکھو اقلیدس کی شکلیں دیکھنے میں کیسی عجیب، باریک اور مشکل معلوم ہوتی ہیں۔ مگر جونہی استاد ان کو حل کر کے سمجھا دیتا ہے۔ تو وہی دقیق اشکال نہایت آسان اور سہل ہو جاتی ہیں۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کو منظور ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کو الفاظ کے استعمال کرنے کے طریقہ کے متعلق متنبہ کر دیا جائے۔ تو آپ نے چند دقیق رازوں کو خواجہ خضر علیہ السلام پر منکشف فرما کر ان کی دقت اور عُسر کو دور فرمادیا۔ مگر چونکہ موسیٰ علیہ السلام کو ان سے اطلاع نہ تھی اس واسطے وہ دقت آپ کے حق میں قائم رہی۔ جس کی وجہ سے آپ خواجہ خضر علیہ السلام کے کاموں کو نہ سمجھ سکے اور چپے چپے پر اعتراض فرمانا شروع کیا مگر اس سے یہ نتیجہ کہاں نکلا کہ علمِ طریقت سب کا سب ایسا ہے کہ عالمِ شریعت

اسے کسی طرح سمجھ ہی نہیں سکتا۔ علمِ طریقت تو علمِ شریعت کی جزو ہے۔ تو شریعت کا عالم طریقت کا عالم کیسے نہ ہوگا۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ طریقت کے بعض جزوی مکشوفات اللہ تعالیٰ ایک شخص پر کشف فرمائیں۔ مگر دوسرے کو ان اسرار سے ناواقف رکھا جائے۔ اس سے عالمِ شرع کے کمال میں کچھ نقص نہیں آتا اور نہ ہی کیا ہوا اعتراض پیدا ہوسکتا ہے۔ جس طرح ایک کم علم والے کو یہ معلوم ہو کہ دیوار کے پیچھے کیا ہے۔ مگر ایک عالم فاضل اس سے بے خبر ہو تو کیا محض اس ایک جزوی واقعہ کے جان لینے سے یہ شخص اس فاضل سے افضل ٹھہرایا جائیگا۔

وقوعہِ سابقہ سے جاہل پیروں کا غلط استنباط اور اسکی تغلیط:

اس کے علاوہ ان جہال نے جو اس وقوعہ سے یہ مسئلہ مستنبط کیا ہے۔ کہ مرید کو پیر کے خلافِ شرع احکام اور افعال کی اتباع کرنی چاہیے ورنہ نافرمانی کی صورت میں وہ مریدوں کے زمرہ میں رہنے کے قابل نہیں ہوتا ہے۔ بناء فاسد علی الفاسد ہے۔ اول تو موسیٰ علیہ السلام کو ان کے اولوالعزم اور برگزیدہ ہونے کا حال بذریعہ وحی معلوم ہو چکا تھا۔ جس کی وجہ سے وہ اگر ان کے خلاف شرع کاموں کو دیکھ کر چپ بھی رہتے تو گنجائش اور توسیع تھی مگر اس کے باوجود جب موسیٰ علیہ السلام نے خواجہ خضر علیہ السلام کے کاموں کو اپنی شریعت کے مخالف پایا تو فوراً اعتراض کر دیا اور باوجود!

”سَتَجِدُنِیۡۤ اِنۡ شَآءَ اللّٰہُ صَابِرًا وَّلَاۤ اَعۡصِیۡ لَكَ اَمۡرًا ○۔ (الکھف: ٦٩)

عنقریب اللہ چاہے تو تم مجھے صابر پاؤ گے اور میں تمہارے کسی حکم کے خلاف نہ کروں گا۔

کے وعدہ کے چپ نہ رہ سکے۔ تو پھر کس طرح ان جہال کے خلافِ شرع احکام میں اتباع کی جاسکتی ہے۔ ان کے تقویٰ، تقدس اور بزرگی کے متعلق کوئی خصوصی احکام تو ہیں نہیں کہ ان کے ذریعہ سے ان کو اولیاء ومقرب مان لیا جائے۔ بلکہ انکے تقرب وتقدس کا ثبوت تو اتباعِ شرع سے ہوتا ہے۔ اور جب وہ خود شرع کی اتباع کیا کریں تو دوسروں کو بھی خلافِ شرع کاموں کی رغبت دلائیں۔ تو وہ بزرگ تو کیا انسان کی شکل میں گُرگ (بھیڑیا) ہیں۔ ایسے بے پر پیروں سے بُعد ہی اچھا ہے۔ ان کا قرب، قربِ جہنم ہے۔ اور ان کے فراق ہی میں وصالِ خداوندی کا راز مضمر ہے۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی تفسیر:

اے اللہ ہمیں سیدھا راستہ دکھائیے۔

جس طرح ایک انسان جب اپنے کسی دوست یا رشتہ دار سے ملاقات کرنی چاہتا ہے۔ تو سب سے پہلے وہ اس سے ملنے کے اسباب کی توفیق پیدا کرتا ہے۔ مثلاً اسبابِ سفر، کرایہ زادِ راہ اور دوسرے تمام وہ ضروریات جو اس کو اثنائے سفر یا بعد سفر کام آنے والی ہیں۔ ان سب کو حاصل کرتا ہے۔ جب یہ سب کچھ تیار ہو چکتا ہے تو اس کے بعد سب سے مختصر اور چھوٹا رستہ تلاش کرتا ہے۔ ریلوے کا ٹائم ٹیبل لیتا ہے اور مقابلہ کر کے دیکھتا ہے کہ کونسی گاڑی مجھے منزل مقصود پر جلدی پہنچائے گی۔

اسی طرح جب انسان نے دربارِ ربی میں حاضر ہو کر اپنے عبد اور غلام ہونے کا اقرار کیا تو اب اس تعلق کی بناء پر وہ اپنے معبود و مسجود کو ملنے کا ملتجی ہوا۔ مگر ملنے میں اسباب کا مہیا کرنا، سفر کی ضروریات کا پورا کرنا اس کی طاقت سے باہر تھا۔ اس واسطے اس نے صراحت کے ساتھ اپنی عاجزی کا اقرار کر کے ایاک نستعین کہا۔ یعنی اے معبود میں آپ کی اعانت اور امداد کا محتاج ہوں۔ آپ کی رحمت و رافت اور آپ کا انعام و اکرام شامل حال ہو تو باریابی کی نعمت سے مشرف ہو سکتا ہوں۔ جب مصلی یہ سب کچھ کہہ چکا تو گویا باریابی کے اسباب اسے عطا کر دیئے گئے۔

دل کو خطرات و وساوس سے خالی کر دیا گیا۔ خضوع و خشوع نے قلب کو انوارِ الٰہیہ کا مورد بنالیا اور تھوڑی دیر کے لئے دنیا و مافیہا (دنیا اور اس میں جو کچھ ہے) سے بے خبر ہو کر عاشقانہ اور والہانہ عہد و پیمان میں ایسا مصروف ہو گیا کہ حقیقت میں اسبابِ ملاقات پیدا کر دیئے گئے۔ اب اسبابِ ملاقات کے پیدا ہو جانے کے بعد اسے چھوٹے مختصر اور پر امن رستہ کی ضرورت ہوئی۔ اس واسطے حصولِ اسباب اور امداد کی التجا کے بعد راہِ راست اور صراطِ مستقیم کی تمنا کرتا ہے۔

الحمدللہ رب العٰلمین سے مالک یوم الدین تک تو مصلی نے مالکُ الملک اور خالقُ الکل کی تعریف اور القاب کو بیان کیا۔ ایاک نعبد اور ایاک نستعین میں اپنے تعلق اپنی عاجزی، اپنی بے کسی و بے بسی کا اظہار کیا کہ اے رب ہم تیرے بندے ہیں۔ تیرے محتاج ہیں۔ تجھ سے ملنے اور واصل بالحق ہونے کے لئے

آرزومند ہیں۔ لہٰذا آپ ہمیں اب چھوٹے سے چھوٹا رستہ اپنی طرف آنے کا بتا دیجیے تا کہ ہم تھوڑی مدت میں تھوڑی ریاضت اور عبادت کے ساتھ آپ کے انوار حاصل کرنے کے قابل ہو جائیں۔

توفیق کے بعد منزلِ مقصود کو جانے کے رستے تو بہت ہیں۔ مگر بعض اس قدر ٹیڑھے اور پر خطر کہ مسافر ان کی بھول بھلیوں میں پھنس کر شاذ و نادر ہی منزلِ مقصود کو پہنچتا ہے۔ رستہ میں ہی یا تو کسی شیر، چیتے کا شکار ہو جاتا ہے۔ یا رستے کی صعوبتیں اور تکالیف بھوک اور پیاس وغیرہ اس کی تباہی کا باعث بن جاتی ہیں۔ جس طرح دو نقطوں کے درمیان سیدھا خط ایک ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح عبد و معبود کے دو نقطوں کو ملانے والا خط بھی ایک ہی ہے۔ اور وہ خطِ اسلام ہے۔ جیسے قرآن پاک خود ایک جگہ!

’’وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِیْ مُسْتَقِیْمًا‘‘۔ (انعام: ۱۵۳)

یہ ہے میرا سیدھا راستہ تو اس پر چلو۔

کے الفاظ میں ظاہر فرماتا ہے۔

اور دوسری جگہ!

’’وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِیْمًا ؕ‘‘۔ (انعام: ۱۲۶)

اور یہ تمہارے رب کی سیدھی راہ ہے۔

سے تعبیر کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جس قدر رستے ہیں سب کے سب ٹیڑھے اور خطرناک ہیں ان پر چلنے والے عبد کا معبود تک پہنچنا نہایت ہی مشکل ہے۔ کیونکہ وہ رستے کے پیچ پاچ اور بھول بھلیوں میں ہی اپنی عُمرِ عزیز کو کھو دیتا ہے۔

اسلام سب انبیاء کا دین تھا:

اس سے یہ سمجھ لینا کہ پھر تو حضور ﷺ سے پہلے کے لوگ کبھی بھی واصل باللہ نہ ہوئے ہوں گے غلط ہے کیونکہ اسلام کچھ حضور ﷺ کا نیا لایا ہوا دین نہیں بلکہ اسلام تو آدم علیہ السلام کی پیدائش کے ساتھ ہی دنیا میں آیا۔ ہاں ہر نبی کی شریعت ایک دوسرے سے کچھ نہ کچھ مختلف رہی۔ مگر جس طرح ایک بچے کو پیدائش کے وقت ایک قسم کے کپڑوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ تو مراہق (قریب البلوغ) ہوتے وقت اور قسم کی۔ پھر جب

بالغ ہو جاتا ہے تو وہ کپڑے بھی بیکار ہو جاتے ہیں۔ پھر اس کے قد و قامت، موسم اور مقام کو مدِ نظر رکھ کر اور سلا کر دیے جاتے ہیں۔ اسی طرح اقوام کے بدلنے اور زمانہ کے گزرنے اور لوگوں کے جسموں عقلوں اور گرد و پیش میں فرق ہونے کی وجہ سے شریعتیں بھی بدلتی رہتی ہیں۔ مگر جس طرح کپڑوں کے بدلنے کے باوجود وہ شخص طفولیت سے لے کر کہولیت (**پختہ عمر**) تک اسی نام سے پکارا جاتا ہے اور وہی ہوتا ہے۔ اسی طرح اسلام باوجود شریعتوں کے چولے بدلنے کے وہی اسلام ہے۔ جو حضرت آدم علیہ السلام کو رب العزت نے دے کر نبوت کے مرتبہ سے سرفراز فرمایا تھا۔

شریعت اور دین کا فرق:

یاد رکھئے کہ دین اور شریعت میں بڑا فرق ہے۔ اور لوگ اسی فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اس قسم کے شکوک میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ دینِ موسوی اور عیسوی دینِ محمدی ﷺ سے الگ تھا۔ لیکن یہ ان کی غلطی ہے۔ آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک سب پیغمبروں کا دین ایک ہی رہا۔

دین: دین لغت میں کہتے ہیں اطاعت اور فرمانبرداری کو۔ یعنی دین یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری و اطاعت کی جائے۔ اور اس کے احکام پر سرِ تسلیم کو رکھ دیا جائے۔ اطاعت کو عربی میں اسلام بھی کہتے ہیں۔ یعنی اسلام کے معنی قوانینِ الٰہیہ کا تسلیم کرنا اور ان کے سامنے سر کو جھکا دینا ہے۔ تو گویا دین اور اسلام کے الفاظ ہم معنی یا مترادف ہیں اور اسلام دین ہے۔

اسی حقیقت کو قرآن پاک نے!

"اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ" (آلِ عمران:۱۹)

میں بیان فرمایا ہے۔ یعنی اللہ جل شانہ کے نزدیک دین اسلام ہی ہے۔ کیونکہ دین کا مفہوم و مطلوب اسلام میں ہی پورا ہوتا ہے۔

شریعت: اب رہی شریعت، تو شریعت کہتے ہیں۔ طریقے اور رستے کو یعنی دین کے مقتضیات (تقاضوں) پر عمل کرنے کا رستہ۔ مثلاً اللہ کی اطاعت دین ہے اس اطاعت کرنے کے طریقہ کا نام شریعت ہے۔ تو گویا رسولوں کی فرمانبرداری دین ہے ان کی فرمانبرداری کرنے کا طریقہ شریعت ہے تو گویا

دین تو مقصد کا نام ہے مگر حصول مقصد کے طریقوں کا نام شریعت ہے۔ اب اس کے بعد معلوم ہو کہ ازل سے ابد تک مقصد ایک ہی رہا اور رہے گا، یعنی اطاعت۔ ہاں اس مقصد کے حاصل کرنے کے طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ مثلاً جیسے پچاس شخصوں کو حج کرنے کے لیے جانا ہو۔ اب یہ سب اشخاص مقصد میں تو متحد ہیں کیونکہ سب کا مقصد تو حج کرنا ہے۔ مگر ایک حج کے لئے بادبانی جہاز پر جاتا ہے۔

دوسرا دخانی پر۔ تیسرا فضائی پر چوتھا پیدل۔ پانچواں موٹر میں۔ چھٹا گھوڑا گاڑی میں۔ اب دیکھئے یہ اشخاص باوجود اتحادِ مقصد کے حصول کے طریقوں میں ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اسی طرح دین کے لحاظ سے سب انبیاء ایک اور متحد تھے۔ لیکن شریعت یا دین پر عمل کرنے کے طریقوں میں وہ آپس میں ایک دوسرے سے مختلف ہوا کرتے تھے۔ ہاں اس سے آپ عتراض کر سکتے ہیں کہ پھر تو شریعتِ محمدی کی ضرورت ہی نہیں رہتی خواہ شریعتِ موسوی پر عمل کیا جائے یا عیسوی پر۔

بہر حال نتیجہ کے لحاظ سے سب برابر ہیں۔ لیکن اگر یہ اعتراض پیدا ہو تو قلتِ تدبر سے پیدا ہوگا۔ کیونکہ دنیا کا قاعدہ ہے کہ جو بادشاہ بھی برسرِ اقتدار آتا ہے۔ وہ اپنی رعیت میں امن و امان قائم رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اب سب بادشاہ مقصدِ امن میں تو متحد ہوتے ہیں مگر ان کے قائم کرنے کے طریقوں میں وہ آپس میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔ کیونکہ قیامِ امن کے قوانین، قوم کے تمدنِ حالات اور واقعات پر موقوف ہوتے ہیں۔ ایک قوم وحشی اور جنگلی ہو تو ان میں امن اور طریقہ سے قائم کیا جائے گا۔ ایک قوم متمدن اور مہذب ہو تو ان میں امن اور طرح سے قائم کیا جائے گا۔ کسی جگہ پر سخت ضابطے کی ضرورت ہوتی ہے اور کسی جگہ پر نرم کی، کسی جگہ ترغیب سے کام نکلتا ہے تو کسی جگہ پر ترہیب سے۔

اب ایک شخص بادشاہِ وقت کے مروجہ قانون سے انحراف کرے اور کہے کہ مقصد تو امن رکھنا ہے خواہ وہ اس بادشاہ کے قانون کی اتباع سے حاصل ہو یا دوسرے بادشاہ کے قانون کی اتباع سے، اس سے ہم کو کیا سروکار ہے ہمیں تو صرف حصولِ نتیجہ کی غرض ہے اور بس۔ تو کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ اس کی یہ حجت قانون کی خلاف ورزی کرنے سے اسے سزا سے بچا سکے گی۔ نہیں بلکہ اس کی دلیل کا جواب پولیس کے ڈنڈے اور حوالات کی کال کوٹھڑی کی صورت میں دیا جائے گا۔ اسی طرح جب پہلی روحانی سلطنتیں اور

شریعتیں منسوخ ہو کر آقائے نامدار اور سرور کائنات حضرت محمد ﷺ کی سلطنت آ گئی تو آپ کو بھی بذریعہ وحی قوم کے علم وعقل ان کی ضروریات وحالات کے مطابق مجموعہ قانون دیا گیا۔ تو اب اس قانون کا انحراف اور ان کے زمانہ سلطنت میں دوسرے منسوخ شدہ قوانین کا اتباع کس طرح صریح بغاوت قرار نہ دیا جائے گا۔ اور دین کے طریقوں کو نظرانداز کر کے حاصل کرنے کی کوشش کرنا دین نہیں بلکہ بے دینی ہوگی۔

حضور ﷺ کی نبوت تمام عالم کے لئے ہے:

اس کے علاوہ پہلے روحانی بادشاہوں کی سلطنت ایک محدود وقت اور مخصوص قوم کے لئے ہوا کرتی تھی جس کی وجہ سے اس معین وقت کے گزرنے پر دوسرا بادشاہ اپنے ساتھ جدید ضابطہ لایا کرتا تھا۔ مثلاً قرآن پاک میں آتا ہے!

”اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِہٖۤ۔ (نوح:۱)

یعنی بے شک ہم نے نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف روانہ کیا۔

اور ہود علیہ السلام کے متعلق ارشاد ہے!

”وَاِلٰی عَادٍ اَخَاھُمْ ھُوْدًاؕ “(ھود:۵۰)

اور عاد کی طرف ان کے ہم قوم ہود کو۔

اسی طرح قوم ثمود کی طرف ”وَاِلٰی ثَمُوْدَ اَخَاھُمْ صٰلِحًاۘ “(ھود:۶۱)

فرمایا جا رہا ہے۔

مگر حضور محمد رسول اللہ ﷺ کو تمام جن وانس بلکہ کل کائنات کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا۔ تو پھر آپ ﷺ کے زمانہ سلطنت میں دوسرے محدود ومعدود طاقتوں والے روحانی بادشاہوں کے قوانین پر کس طرح عمل کیا جا سکتا ہے۔

قرآن پاک میں ارشاد ہوتا ہے!

”وَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّ نَذِیْرًا ۔(سبا:۲۸)

یعنی ہم نے آپ کو تمام انسانوں کی طرف بشیر ونذیر بنا کر بھیجا۔

دوسری جگہ آتا ہے!

"قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّىْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا ۔(اعراف: ۱۵۸)

یعنی اے حبیب آپ فرما دیجئے کہ اے لوگو میں تم سب کی طرف خدا کا رسول بنا کر بھیجا گیا ہوں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جنات کا ایمان لانا:

انسان تو کیا جنات بھی آپ پر ایمان لا کر بے ساختہ پکار اٹھے۔

اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا ۙ۝ يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۙ۝

(الجن: ۱،۲)

کہ ہم نے ایک عجیب قرآن سنا ہے جو بھلائی کی طرف ہدایت کرتا ہے۔ پس ہم اس پر ایمان لائے اور ہم اپنے رب کے ساتھ کسی کو شریک نہیں کریں گے۔

چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ!

ایک دفعہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلام کی تبلیغ کے لئے میلہ عکاظ میں تشریف لیجارہے تھے تو مقام نخلہ پر آپ نے رات گزارنے کے لئے قیام فرمایا۔ صبح کے وقت جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے ساتھیوں کو نماز پڑھانے کے لئے کھڑے ہوئے اور صوتِ نبوی میں جب قرآن پاک کو جہر سے پڑھنا شروع کیا تو کائنات کا ذرہ ذرہ تک وجد میں آگیا۔ صبح کا سہانا وقت، ریگستانی مقام خاموشی کی حالت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قرأت اللہ جل شانہٗ کے ساتھ بالمشافہ راز و نیاز کہ اچانک ایک جنوں کی جماعت جو تہامہ کو جا رہی تھی اس مقام سے گزری قرآن کی آواز کا ان کے کانوں میں پہنچنا تھا کہ پکار اٹھے:

فَاٰمَنَّا بِهٖ ۭ وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا ۙ۝ ۔

(صحیح بخاری: ج۱، رقم: ۷۷۳، باب الجہر بقراۃ صلاۃ الفجر، طبع دار طوق النجاۃ)

جنات کے حاضرِ دربار ہونے کا دوسرا واقعہ:

اور مسند احمد میں حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی زبانِ مبارک سے ایک اور واقعہ منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکہ معظمہ میں رفقاء کے ساتھ باتوں میں مشغول تھے کہ اچانک

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کون ہے جو میرے ساتھ جائیگا۔ مگر جانے والا مضبوط دل کا ہونا چاہئے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں آپ کے ساتھ جانے پر آمادہ ہوا جب ہم مکہ معظمہ سے بالکل باہر آ گئے تو میں نے چند ایک پرچھائے دیکھے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مجھے ایک جگہ کھڑا کر کے میرے ارد گرد خط کھینچ دیا اور فرمایا ۔ اے عبد اللہ تو اس سے باہر بالکل نہ نکلنا۔ اس کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ذرا آگے تشریف لائے اور وہ پرچھائے بھی آپ کے پیچھے پیچھے تھے۔ تھوڑی دور جا کر حضور بیٹھے اور ان کے ساتھ دیر تک باتیں کرتے رہے میں صرف آدمیوں کی آواز سنتا تھا مگر سوائے پرچھائیوں کے اور کچھ نظر نہ آتا تھا۔

چنانچہ بہت دیر بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم واپس آئے اور وضو فرمایا۔ تو میں نے عرض کی کہ حضور! یہ کون لوگ تھے؟ آپ نے فرمایا کہ! یہ شہر نصیبین کے چند جنات تھے اپنے قبیلے کے کچھ معاملات فیصلہ کروانے کے لئے لائے تھے۔ اور مجھ سے انہوں نے کچھ تحفہ بھی مانگا تو میں نے دے دیا۔ میں نے عرض کی حضور آپ کے پاس کچھ توشہ تو نہ تھا پھر آپ نے انہیں کیا عنایت فرمایا۔ فرمانے لگے اے عبد اللہ میں انہیں گوبر اور ہڈی بطور توشہ دیا ہے کہ یہ ان کی اب ہمیشہ کیلئے خوراک ہوگی۔

(مسند احمد: الجزء، ۷، مسند عبد اللہ بن مسعود، ۴۳۸۱، موسسۃ الرسالۃ)

گوبر اور ہڈی سے استنجا کرنے کی کیوں ممانعت ہے:

اس واسطے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا!

لَا تَسْتَنْجُوا بِالرَّوْثِ، وَلَا بِالْعِظَامِ، فَإِنَّهُ زَادُ إِخْوَانِكُمْ مِنَ الْجِنِّ۔

(سنن الترمذی: ج ۱، رقم: ۱۸، دار الغرب السلامی بیروت)

یعنی گوبر اور ہڈی پر استنجا نہ کیا کرو کیونکہ وہ تمہارے بھائی جنوں کی خوراک ہے۔

انسان اور جنات ہی نے آپ کی رسالت پر ایمان نہیں لایا بلکہ آپ کو تو!

وَمَآ اَرۡسَلۡنٰكَ اِلَّا رَحۡمَةً لِّلۡعٰلَمِيۡنَ ۝ ۔(الانبیاء: ۱۰۷)

کی بشارت دے کر مبعوث کیا گیا۔ عالمین جمع ہے عالم کی اور عالم جس طرح ماسوی اللہ کو کہا جاتا ہے۔ اسی طرح اس کا اطلاق مخلوق کی ہر ہر قسم پر ہوتا ہے مثلاً عالمِ جماد، عالمِ نباتات، عالمِ انس اور عالمِ جن وغیرہ، تو گویا اس

طرح ظاہر کر دیا گیا ہے کہ آپ انبیائے سابقہ کی طرح کسی خاص قوم، وقت یا ملک کے لیے نہیں بھیجے گئے بلکہ آپ کو تمام عالموں یا بالفاظ دیگر تمام موجودات و مخلوقات کیلئے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا گیا ہے۔ اس لیے آپ کی رسالت پر جنات و انسان تو خیر تمام مخلوقات کی ہر ہر نوع نے گواہی دی ہے کہ آپ اللہ کے سچے اور برگزیدہ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

عالم کی موٹی تقسیم:

مثلاً اگر آپ دنیا میں غور کریں تو آپ کو سب سے پہلے عالم کی دو قسمیں نظر آئیں گی۔ ایک عالمِ مجردات، دوسرے عالمِ مادیات۔ عالمِ مجردات تو وہ عالم ہے کہ جس کی چیزیں اس جسم عنصری سے پاک ہوتی ہیں۔ اور بوجہ لطافت کے ہمیں نظر نہیں آتیں۔ مثلاً فرشتے اور ارواح وغیرہ اور عالمِ مادیات وہ عالم ہے کہ جس کی چیزیں جسم عنصری رکھتی ہیں۔ مگر ان کے جسم عنصری میں کثافت کی کمی و زیادتی کا فرق ضرور ہوتا ہے۔ جو زیادہ کثیف ہوتی ہے وہ اچھی طرح نظر آتی ہے۔ اور جو کم ہو وہ اپنی لطافت کے درجے کے مطابق کم یا بالکل نظر نہیں آتی اسکے بعد عالمِ مادی کی دو قسمیں ہیں۔ علوی اور سفلی۔ علوی وہ ہے جو آسمانوں سے تعلق رکھے اور سفلی وہ ہے جو زمین سے متعلق ہو۔

علوی کی مثال جیسے چاند، سورج، ستارے وغیرہ۔ اور سفلی کی پھر اپنی جگہ تین قسمیں ہیں۔ عالمِ جمادات، عالمِ نباتات اور عالمِ حیوانات اور پھر ان میں سے ہر ایک عالم کی اپنی اپنی جگہ پر ہزاروں قسمیں ہیں مگر میں ان موٹی موٹی قسموں کو لے کر صحیح روایات سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہوں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو رحمۃ للعالمین اور تمام موجودات کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا ہے یہ دعویٰ واقعات کے ساتھ کہاں تک مطابق ہے اس لئے ہر ہر نوع سے جو بجائے خود ایک جنس ہے ایک ایک فرد کے متعلق مختصراً بر روایت صحیحہ یہ ثابت کر دینا کہ اس نے حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت پر شہادت دی ہے تمام نوع کی طرف سے دعویٰ کو پایۂ ثبوت تک پہنچا دیتا ہے۔ ہاں اگر کسی کو تفصیل کا شوق ہو تو وہ اس فن کی مطول و مفصل کتابوں کو دیکھ کر اپنی تسکین کر سکتا ہے۔

ملائکہ کا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان لانا:

اب سب سے پہلے لیجئے عالمِ مجرد کو جس کے انواعِ ملائکہ اورارواح وغیرہ بیان ہوئے ملائکہ کے متعلق قرآن پاک میں آتا ہے!

مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۔(البقرۃ:۹۷)

یعنی جو جبرئیل کا دشمن ہوتو ہو۔ وہی تو اے پیغمبر تیرے دل پر باذنِ الٰہی نازل کرتا ہے۔

یعنی جبرائیل علیہ السلام جونہایت مقتدر فرشتے ہیں۔ آپ ﷺ پر وحیِ رسالت لے کر اترتے ہیں اور احکامِ تبلیغ وغیرہ پہنچاتے ہیں۔ تو گویا دوسرے لفظوں میں وہ خود حضور ﷺ کی رسالت کا اقرار کرتے ہیں۔ اور آپ کے منجانب اللہ رسول ہونے کو تسلیم کرتے ہیں۔

معجزہ شق القمر:

اب عالم مادیات سے عالمِ علوی یا سماوی کو لیجئے کون شق القمر کے معجزہ سے ناواقف ہوگا قرآن پاک ببانگِ دہل فرماتا ہے!

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَ انْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ وَ اِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَ يَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ ۝ وَ كَذَّبُوْا وَ اتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَ كُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝ ۔(القمر:۱،۳)

یعنی قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا اور اگر یہ کافر کوئی نشان دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے طاقتور۔ اور انہوں نے نبی (ﷺ) کو جھٹلایا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی اور ہر کام اپنے وقت پر قرار پکڑنے والا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ!

ہجرت سے قبل ابو جہل۔ ولید بن مغیرہ اور عاص بن وائل وغیرہ کفار قریش نے جمع ہو کر حضور ﷺ سے کہا کہ اگر آپ سچے نبی ہیں تو اپنی نبوت کو ثابت کرنے کیلئے چاند کے دو ٹکڑے کر دیجئے اگر آپ ایسا کر دیں گے تو ہم آپ کو سچا رسول سمجھ کر ضرور ایمان لے آئینگے۔ چنانچہ حضور ﷺ نے دربار ربی میں دعا کی اور چاند کی طرف انگلی مبارک سے اشارہ فرمایا چاند خدا کے حکم سے شق ہو گیا۔ آپ نے سب لوگوں کو پکار کر فرمایا کہ اے لوگو میرے دعویٰ کی صداقت کے گواہ رہو دیکھو چاند بھی میری رسالت کی شہادت دے رہا ہے اس پر

ہٹ دھرم کفار نے کہا کہ یہ تو جادو ہے مسلمانوں نے کہا کہ اگر یہ جادو ہے تو اس کا اثر تم ہی پر ہونا چاہئے نہ کہ غائب لوگوں پر اس لئے کل آنے والے قافلوں سے اس کے متعلق پوچھو اگر وہ اس کی تصدیق کریں تو تمہیں بھی چاہیے کہ اس ہٹ دھرمی اور تکذیب کو چھوڑ دو اور اگر وہ انکار کریں تو تم سمجھ لینا کہ واقعی تم پر جادو کیا گیا ہے۔ چنانچہ جب دوسرے دن باہر سے آنیوالے لوگوں سے انشقاقِ قمر کے متعلق پوچھا گیا کہ ایک نہیں سینکڑوں نے اپنی آنکھوں سے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھنے کے واقعہ کو دہرایا۔ مگر اس پر بھی کم نصیبوں کے دلوں سے کفر کی مہر نہ ٹوٹی۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے!

وَ كَذَّبُوْا وَ اتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَ كُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝ ۔(القمر:۳)

بعض عقل پرست اور نئی روشنی کے نابینوں نے اس وقوعہ پر طرح طرح کے اعتراض کئے ہیں اور اگرچہ ان کے جواب کے لئے قرآن پاک کی وہی آیت کافی ہے جو اس وقت کے منکرین کے جواب میں نازل کی گئی مگر پھر بھی میں ان کے اعتراض کو نہایت اختصار کے ساتھ بیان کرکے ان کا جواب دے دیتا ہوں تاکہ سامعین میں سے بھی اگر کسی کے دل میں کچھ شک وشبہ ہو تو اس کا پورا پورا ازالہ ہو جائے۔

شق القمر کے معجزہ پر اعتراضات اور ان کے جوابات:

(۱) اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝ کی آیت میں انشقاقِ قمر کا واقعہ قربِ قیامت میں ہونا معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ آیت کا معنی یہ ہے کہ قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا لہٰذا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہ وقوعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں ہو چکا ہے۔

(۲) اجرامِ فلکیہ میں خرق والتیام اور شکست وریخت محال ہے اس لئے چاند جو اجرامِ فلکیہ کا ایک مقتدر فرد ہے اس کا انشقاق بھی محال ہے۔

(۳) اگر یہ معجزہ واقعہ ہو چکا ہوتا تو ایسے عجیب وغریب وقوعہ کو صرف اہل مکہ ہی نہ دیکھتے بلکہ تمام دنیا دیکھتی اور پھر اس کا ذکر دنیا کی تمام تاریخوں میں پایا جاتا۔ کیونکہ مؤرخین ایسے نادر اور عجیب واقعہ کو کس طرح نظرانداز کر سکتے تھے۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ کسی ملک کے کسی مؤرخ نے بھی اس واقعہ کو بیان نہ کیا۔ ہاں اگر

کچھ ملتا ہے تو عربوں کی ضعیف ورکیک روایات میں ۔

(۴) علمِ ہیئت اور نجوم کی رو سے یہ اس قدر حیرت انگیز واقعہ ہے کہ علمِ ہیئت کا کوئی ماہر بھی اسے بغیر ذکر کیئے ہوئے نہ چھوڑتا اور پھر وہ اپنے ذہن کے مطابق اس کے اسباب وعلل پر کچھ نہ کچھ رائے زنی کر کے اس واقعہ کے ظہور کا ثبوت چھوڑ جاتا مگر دنیا کے لاکھوں علمائے نجوم وہیئت کی لکھی ہوئی کتابوں میں اس واقعہ کی طرف اشارہ تک نہیں پایا جاتا ۔

اس کے سوا اور بھی کئی ایک اعتراض ہیں جو انہی چار اعتراضوں کے جواب میں حل ہو جاتے ہیں ۔ اس واسطے ان کے بالاستقلال بیان کی کچھ ضرورت محسوس نہیں ہوتی ۔ اب اس کے بعد میں ان اعتراضات کا جواب نہایت ہی اختصار کے ساتھ عرض کرتا ہوں کیونکہ اگر ان کا جواب پوری تفصیل سے دیا جائے تو خواہ مخواہ کلام کے غیر مرتبط مقام پر لمبا ہو جانے کا خوف ہے ۔

ورنہ علمائے کرام نے ان سب اعتراضوں کے ایسے دندان شکن ، مفصل اور مسکت جواب دیے ہیں کہ ان کی روشنی میں انشقاقِ قمر کے معجزہ کو جھٹلانا گویا روزِ روشن میں آفتاب کے وجود کا انکار کرنا ہے ۔

جواب اعتراض اوّل: سب سے پہلے یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ مناسب آیت کی رو سے یہاں قیامت کے متعلق بیان ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے لیکن ایسی صورت میں پھر بھی تو خیال کرنا چاہیئے کہ انشق ماضی کا صیغہ ہے اگر یہاں واقعہ قیامت کے متعلق ہو تو پھر اس انشق کے معنی بغیر ضرورت وقرینہ کے مستقبل کے لینے پڑیں گے ۔ کیونکہ پھر معنی بجائے چاند پھٹ گیا کے چاند پھٹ جائے گا کرنے پڑیں گے ۔ مگر مستقبل کے معنی کو پچھلی آیتیں غلط قرار دے رہی ہیں ۔ کیونکہ اس کے بعد ارشاد ہوتا:

”وَاِنۡ يَّرَوۡا اٰيَةً يُّعۡرِضُوۡا وَيَقُوۡلُوۡا سِحۡرٌ مُّسۡتَمِرٌّ ()

یعنی اگر یہ کافر کوئی بھی نشان دیکھتے ہیں تو منہ پھیر لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ طاقت ور جادو ہے ۔

اب اگر یہ انشقاق قیامت کے وقت ہوتا تو پھر قیامت کے آجانے کے بعد کفار کا اسے جادو ٹھہرانا اس سے اعراض کرنا اور اسکی تکذیب کرنا کچھ معنی نہیں رکھتا اللہ تعالیٰ تو سورۃ انعام کے چوتھے رکوع میں فرماتے ہیں !

قَدۡ خَسِرَ الَّذِيۡنَ كَذَّبُوۡا بِلِقَآءِ اللّٰهِ‌ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتۡهُمُ السَّاعَةُ بَغۡتَةً قَالُوۡا يٰحَسۡرَتَنَا عَلٰى مَا

فَرَّطْنَا فِيْهَا ۔(انعام:۳۱)

تحقیق وہ لوگ نقصان میں رہے جنہوں نے اللہ کی ملاقات کو جھٹلایا یہاں تک کہ ان پر قیامت اچانک آجائے گی تو کہیں گے ہائے افسوس ہمارے حال پر کہ ہم نے اس کے ماننے میں کمی کی۔

یعنی جب کفار قیامت کے وقوعہ کو دیکھ لیں گے۔ اس وقت ان کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ اور وہ جو انبیاء علیہم السلام کے اقوال کو لقائے خداوندی اور قیامِ قیامت کے متعلق نہیں مانا کرتے تھے۔ کف افسوس مل کر اپنے اعمال وافکار پر سر پیٹیں گے۔ تو معلوم ہوا کہ یہ واقعہ قیامت کے متعلق نہیں ورنہ پچھلی آیتوں میں ان کا انکار اور قیامت کو دیکھتے ہوئے جادو کہنا قرآن پاک کی دوسری آیات کے مناقض ٹھہرتا ہے اور پھر ''وَ كَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْا اَهْوَاءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝'' کی رو سے تکذیبِ قیامت، اتباعِ خواہشات اور امرِ مستقر بھی بالکل غیر مربوط ہو جاتا ہے تو معلوم ہوا کہ اس میں کسی گذشتہ واقعے کا بیان ہو رہا ہے۔ اور ''اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ'' کا مطلب یہ ہے کہ اس معجزہ شق القمر کا وقت آگیا اور اسی کی طرف کفار کے انحراف و اعراض کو بیان کر کے فرمایا ہے ''وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ'' کہ ہر ایک کام اپنے وقت پر قرار پاتا ہے۔ اور وہ اپنے موعود وقت سے آگے پیچھے نہیں ہوا کرتا تو گویا شق القمر کے معجزے کے ظہور کا وقت آگیا۔ وہ معجزہ جس کے متعلق تخلیقِ کائنات سے اوّل لوحِ محفوظ میں درج کر دیا گیا تھا کہ یوں ہمارا حبیبِ لبیب عرب کے ملک میں مبعوث ہوگا۔ یوں کفار ناہنجار ہٹ دھرمی کریں گے۔ اور آخر کار یوں ان کے مطالبہ پر شق القمر کا معجزہ دکھایا جائیگا۔ تو گویا ''اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ'' اس ساعتِ موعودہ کے اقتراب کو بیان کر رہی ہے نہ کہ قیامت کو۔

الساعۃ کے لفظ پر ایک شبہ اور اس کا ازالہ:

ہاں اس سے پڑھے لکھے لوگوں کے دل میں ضرور یہ خیال پیدا ہوگا اور جیسا کہ بعض تفاسیر میں لکھا بھی ہے کہ قرآن پاک میں جہاں کہیں بھی الساعۃ کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں اس سے مراد قیامت ہے اور جہاں پر صرف وقت کا اظہار فرمایا ہے تو اس جگہ ساعۃ بغیر الف لام کے استعمال کیا ہے جیسے:

''لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ۝۔ (اعراف: ۳۴)

لیکن اگر غور کیا جائے تو الساعۃ اور ساعۃ ایک ہی لفظ ہے مگر ساعۃ نکرہ اور عام ہے اور الساعۃ معرفہ اور خاص ہے۔ جب بھی کوئی معہود یا مقرر گھڑی یعنی مطلوب ہو گی تو ساعۃ کو معرف باللام کر کے الساعۃ بولیں گے، اب اس سے آخری معہود و ساعۃ مراد ہو جسے قیامت کہتے ہیں۔ یا اس سے پہلے کی کوئی معہود و مقرر گھڑی چنانچہ الساعۃ کا استعمال خود حضور ﷺ نے حدیث پاک میں غیرِ قیامت کیلئے فرمایا ہے۔ امام راغب نے بھی ساعۃ کی تشریح فرماتے ہوئے اس حدیث کو اپنی مفردات میں سنداً پیش کیا ہے۔

چنانچہ لکھتے ہیں!''

انّه ﷺ رأى عبد الله بن أنيس فقَالَ :(إنْ يَطُلْ عُمُرُ هٰذَا الْغلَامِ لَمْ يَمُتْ حتّٰى تَقُوْمَ السَّاعَةُ) فَقِيْلَ : إِنَّهٗ اٰخِرُ مَنْ مَاتَ مِنَ الصَّحَابَةِ''

(مفردات القرآن: ج،۱، کتاب السین، دار العلم الدار الشامیۃ بیروت)

تو گویا یہاں الساعۃ فرما کر قیامت مراد نہیں لی۔ بلکہ اقران کی موت کو الساعۃ سے تعبیر فرمایا ہے۔ تو ثابت ہوا کہ الساعۃ کو قیامت کے معنوں میں خاص کر دینا ٹھیک نہیں۔

اور اگر ''اقتربت الساعة'' سے مراد قیامت کا قرب ہی لیا جائے۔ تو بھی انشقاقِ قمر کے وقوعہ پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ کیونکہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے!

بُعِثْتُ اَنَا وَالسَّاعَةُ كَهَاتَيْنِ وَاَشَارَ بِالسَّبَّابَةِ وَالْوُسْطٰى۔

(مسند احمد: الجزء،۱۹، رقم: ۱۲۲۴۵، مسند انس بن مالک، طبع موسسۃ الرسالۃ)

یعنی میں اور قیامت کا آنا مثل ان دو انگلیوں کے ہیں اور آپ نے کلمے اور بیچ کی انگلی کی طرف اشارہ فرمایا۔

یعنی جس طرح انگشتِ سبابہ اور وسطیٰ میں اتصال اور قرب ہے۔ اسی طرح قیامت کا آنا میرے بعد بالکل قریب ہو گا تو جب حضور ﷺ کی آمد سے قیامت کا آنا متصل اور قریب ہے تو پھر انشقاقِ قمر کے متعلق بیان فرمانے سے مطلب یہ ہے معجزات اور خوارق ایمان لانے کے لئے رغبت دیتے ہیں اور ایمان ہی قیامت کے دن نجات کا باعث ہو گا۔ تو گویا بتایا جا رہا ہے کہ قیامت قریب ہے معجزہ شق القمر کو دیکھ کر ایمان لے آؤ۔ تاکہ اس ہولناک دن میں تمہاری نجات کا باعث بن سکے۔ غرضیکہ معجزہ کی غرض و غایت اور اس کے

اہتمامِ شان کیلئے قیامت کو بیان کر کے اس کے بعد اسے لایا گیا۔ اور ہوسکتا ہے کہ تحقیق وقوع کے لحاظ سے قرب مراد لیا گیا ہو۔ کیونکہ جس چیز کا وقوع اٹل ہوا گرچہ وہ حالاً بعید ہو مگر مآلاً قریب ہوا کرتی ہے۔

جواب اعتراض دوم: اجرامِ فلکی میں خرق والتیام کا ماننا فلاسفہ قدیم کا مذہب ہے اور وہ بھی صرف ادعائی رنگ میں۔ آج تک اس عقیدہ کے متعلق کوئی وقیع دلیل نہ پیش کی جاسکی۔ بلکہ اس کے برعکس متکلمین نے نہایت شستگی اور پختگی سے اجرامِ سماویہ میں شکست وریخت کا ممکن ہونا ثابت کیا ہے۔ اور آج جب دنیا سائنس اور علومِ جدیدہ کی روشنی میں کہاں سے کہاں چلی گئی ہے۔ اور رات دن مختلف ستاروں کے تصادم اور ٹوٹنے کو عیاناً دیکھ رہی ہے۔ اس وقت ایسا اعتقاد رکھنا یا اس قسم کی بحث چھیڑنا ہی غلطی ہے۔ اور تو چھوڑیئے آج بڑے بڑے ماہرین سائنس اس بات پر آرہے ہیں کہ ابتدا میں زمین و آسمان آپس میں متصل تھے مگر بعد میں تصادم یا اور کسی وجہ سے زمین آسمان سے شق ہو کر ہٹ گئی اور قرآنِ پاک نے تو آج سے ساڑھے تیرہ سو سال پیشتر فرمادیا ہے:

اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ۔ (الانبیاء: ۳۰)

کہ زمین اور آسمان باہم پیوستہ تھے پھر ہم نے ان دونوں کو جدا کر دیا۔

اس سے زیادہ قرآنِ پاک کی سچائی اور حضور ﷺ کی صداقت کی دلیل کیا چاہیے کہ وہ بات جس پر آج دنیا کے عقلاء نہایت سر ماری اور غور وخوض کے بعد پہنچ رہے ہیں وہ آج سے ساڑھے تیرہ سو برس پیشتر خدا کی کتاب قرآنِ پاک حضور پرنور ﷺ کے مبارک ہونٹوں سے اعلان کرواچکی ہے۔

جواب اعتراض سوم: مؤرخین کا کسی واقعہ کو نہ لکھنا اس کے کذب کی دلیل نہیں ہوسکتا۔ لاکھوں بلکہ کروڑوں ایسے ایسے عظیم الشان وقوعے دنیا میں ہوئے ہیں کہ جن کو اسی ملک کے مؤرخین نے نقل کیا مگر دوسرے ملکوں کی تاریخ میں ان کا نام ونشان تک نہیں تو کیا وہ سب کے سب واقعات محض اس لئے کہ دوسرے ممالک کے لوگوں نے اسے نقل نہیں کیا جھوٹے قرار دیئے جائینگے۔ اگر ایسا ہو تو پھر ہندوؤں کی مہابھارت کا انکار کیا جاسکتا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تمام واقعاتِ زندگی کو جھٹلایا جاسکتا ہے۔ کیونکہ ان کا حال دنیا کی سب تاریخوں میں نہیں ملتا۔ اس کے علاوہ یہ کہنا بھی غلط ہے کہ دنیا کے تمام ملکوں

سے صرف عرب ہی کے بعض مؤرخین نے اسے نقل کیا ہے اور دوسرے ممالک کے مورخین نے اس کا کہیں ذکر تک نہیں کیا کیونکہ ہندوستان کی تاریخِ فرشتہ میں صاف تحریر ہے کہ ملیبار کے ایک راجہ نے مسلمانوں سے معجزہ شق القمر کے متعلق سن کر اپنے پنڈتوں اور برہمنوں سے اس واقعہ کو حضور ﷺ کی ہم زمانہ کتابوں میں ڈھونڈنے کا حکم دیا۔ چنانچہ تلاش کے بعد جب پنڈتوں نے اس واقعہ کی تصدیق کی تو وہ راجہ مسلمان ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ واقعہ پرانی کتابوں میں بھی ضرور درج تھا مگر عدم طباعت اور فقدان وسائل کے باعث اس کی کماحقہ شہرت نہ ہوسکی۔

اسی طرح دریائے چنبل کے کنارے ایک شہر دھار نامی تھا جس کے راجہ کا نام بھوج تھا۔ ایک رات اس نے دیکھا کہ چاند شق ہوگیا ہے اس سے اس کو بڑا تعجب لاحق ہوا، چنانچہ فوراً اپنے علماء کو بلوا کر ان سے اس معاملہ کی تحقیق کروائی، انہوں نے عرض کی کہ ہم کو کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ ایک نبی کا معجزہ ہوگا اور وہ نبی عرب میں پیدا ہوگا۔ چنانچہ راجہ بھوج کو اس بات کی تفتیش سے اور زیادہ شوق پیدا ہوا جس سے اس نے چند شخصوں کو ملک عرب کی طرف تحقیق حال کے لیے بھیجا ان میں سے ایک قاصد واپس آیا اور اس نے آکر بیان کیا کہ واقعی عرب میں ایک شخص محمد ﷺ نامی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور یہ معجزہ شق القمر اس نے منکرین کے مطالبہ پر دکھایا ہے۔ یہ سن کر راجہ بھوج مسلمان ہوگیا اس کے علاوہ عرب اور شام کے دوسرے معتبر اشخاص کی تاریخی گواہیاں حدِ تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں۔

بالفرض اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ دنیا کے کسی دوسرے مؤرخ نے اس واقعہ کو بیان نہیں کیا تو بھی اس سے ہمارے دعوی پر کچھ اثر نہیں پڑتا کیونکہ یہ معجزہ رات کو دکھایا گیا تھا جبکہ دنیا کا اکثر حصہ خوابِ شیریں میں مشغول ہوگا جو بیدار ہوں گے ان میں سے بھی اکثر اپنے کاموں میں مشغول ہوں گے پھر جنہوں نے دیکھا ہوگا ان میں لکھے پڑھے بہت کم ہوں گے کیونکہ وہ زمانہ جاہلیت کا تھا۔ پھر دنیا کے تمام حصوں پر رات نہ تھی کہ سب دیکھ سکتے۔ اس پر چاند کے مطالع ومغارب میں بڑا فرق ہوتا ہے کہ ایک جگہ چاند گہن ہوتا ہے تو دوسری جگہ نہیں ہوتا، ایک جگہ اندھیری ہوتی ہے تو دوسری جگہ چاندنی، ایک جگہ غروب ہوتا ہے تو دوسری جگہ طلوع، ایک جگہ بادل ہوتا ہے تو دوسری جگہ صاف۔ غرضیکہ اتنے اختلافات کی موجودگی میں تمام دنیا کی

گواہی کا طلب کرنا غلطی نہیں تو اور کیا ہے۔

جواب اعتراض چہارم: تمام مذہبی کتابوں میں مختلف سماوی حادثوں کا ذکر پایا جاتا ہے مگر علمِ ہیت کی کتابیں ان حوادث کے ذکر سے بالکل خاموش نظر آتی ہیں، اگر یہ خاموشی ان حوادث کے عدمِ وقوع کی دلیل ہو سکتی ہے تو پھر دنیا کی کوئی کتاب بھی جو آسمانی ہونے کا دعویٰ کرتی ہے سچی نہیں ٹھہر سکتی مثلاً انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کے وقت ایک دمدار ستارہ طلوع ہوا، دوسری جگہ آتا ہے کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی گئی تو تمام دنیا دفعۃً تاریک ہوگئی۔ کیا کوئی عیسائی جرأت کر کے ان واقعات کو اس زمانہ کی ہیت کی کتابوں سے ثابت کر سکتا ہے۔ ہندوؤں کی کتابوں میں جو چندرماں اور سورج دیوتا کے مشہور مشہور آسمانی حوادث درج ہیں وہ کونسی ہیت کی کتاب میں دکھائے جا سکتے ہیں۔ تو معلوم ہوا کہ ہیت کی کتابوں میں کسی واقعہ کا درج نہ ہونا اس کے عدمِ وقوع کی دلیل نہیں ہو سکتا بلکہ اس دنیا میں لاتعداد آسمانی انقلابات ہوئے اور ہو رہے ہیں کہ جن کے بیان سے ہیت کی کتابیں بالکل ساکت اور خاموش ہیں۔ لہٰذا عدمِ ذکرِ شئی سے عدمِ شئی کا نتیجہ اخذ کرنا سراسر حماقت اور غلطی ہے۔

اور سب سے اخیر میں میں ایک فیصلہ کن بات عرض کرتا ہوں کہ مان لیجئے یہ واقعہ صرف مکہ معظمہ کے لوگوں ہی نے دیکھا کیونکہ مطالبہ بھی ان ہی کا تھا۔ اگر اس کا وقوع عام طور پر دیکھا جاتا تو لوگ اسے بھی آسمان کے طبعی انقلابات سے ایک انقلاب سمجھ کر کچھ زیادہ اہمیت نہ دیتے مگر جب دوسری تمام دنیا نے نہ دیکھا اور صرف اہلِ مکہ ہی نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ چاند کا انشقاق صرف ایک محدود طبقہ کے لیے معجزانہ طور پر تھا۔ اگر طبعی ہوتا تو تمام دنیا دیکھ سکتی لہٰذا دوسرے لوگوں کا نہ دیکھنا اور ان کی اس واقعہ پر عدمِ شہادت ہمارے دعوے کے لیے کسی طرح بھی مضر نہیں ہو سکتی بلکہ عربوں کی حدِ تواتر کو پہنچی ہوئی گواہی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہر ایک صاحب نظر اس معجزہ کے وقوعہ کو بلا حیل و حجت تسلیم کر سکتا ہے۔

اس کے بعد عالمِ سفلی ہے جس کی تین قسمیں بیان ہوئی ہیں۔ یعنی عالمِ حیوانات، بناتات اور جمادات۔ عالمِ حیوانات کے اشرف ترین افراد انسان اور جنات کا ذکر تو ہو چکا اب رہے دوسرے حیوانات ان میں سے بھی چند ایک کا ذکر بالاختصار کئے دیتا ہوں۔ جس سے آپ طبقہ حیوانات کی تمام انواع کے متعلق

قیاس کر سکتے ہیں ؎

قیاس کن زگلستان من بہار مرا

ترجمہ: میرے گلستاں سے میری بہار کا اندازہ کر۔

مشتے نمونہ از خروارے:

اونٹ کا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو رسول سمجھ کر سجدہ کرنا:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک دفعہ ایک انصاری کا اونٹ باؤلا ہوگیا اور لوگوں کو کتے کی طرح کاٹنے کو دوڑنے لگا لوگوں نے اسے پکڑ کر مار ڈالنے کی کوشش کی مگر نا کامیاب رہے جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو آپ لوگوں کے ہر چند منع کرنے کے باوجود اونٹ کی طرف گئے۔ اونٹ نے جب آپ کو دور سے آتے ہوئے دیکھا تو فوراً آپ کی طرف دوڑ کر آیا۔ لوگوں نے خیال کیا کہ شاید حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کچھ گزند پہنچائے گا۔ مگر ان کے تعجب کی انتہا نہ رہی کہ جب اونٹ نے آ کر اپنے سر کو آپ کے مبارک قدموں پر رکھ دیا۔ آپ نے اس پر اپنا مقدس ہاتھ پھیرا اور پکڑ کر اسے مالک کے حوالے کر دیا۔ پھر فرمایا کہ مجھے کائنات کا ذرہ ذرہ جانتا ہے کہ میں خدا کا رسول اور فرستادہ ہوں مگر گنہگار انسان اور جنات مجھے تسلیم کرنے سے انکار کرتے ہیں۔ اس پر صحابہ کرام علیہم الرضوان نے عرض کی کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب حیوانات آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سجدہ کرتے ہیں تو ہم انسان آپ کو کیوں سجدہ نہ کریں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے صحابہ یاد رکھو کہ سجدہ اللہ کے بغیر اور کسی کو کرنا جائز نہیں اگر جائز ہوتا تو میں حکم کرتا کہ عورت اپنے خاوند کو سجدہ کرے۔

اسی طرح کا ایک دوسرا واقعہ بھی کتب احادیث میں مروی ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک انصاری کے باغ میں تشریف لے گئے، جب آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اندر پہنچے تو ایک اونٹ آپ کو دیکھ کر زور زور سے بلبلانے لگا۔ اور اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے تھپکا اور انصاری کو بلا کر فرمایا کہ اے شخص تو اس سے زیادہ کام لیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں تمہارا اس لئے مسخر نہیں کیا کہ تم ان پر ظلم کرو۔ دیکھو یہ اونٹ شکایت کر رہا ہے کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میرا مالک مجھے بھوکا رکھتا ہے اور اس پر میری طاقت سے زیادہ کام لیتا ہے۔

استنِ حنّانہ کا واقعہ:

اس کے بعد عالمِ نباتات کی ایک آدھ مثال سنو کہ کس طرح عالمِ نباتات کے افراد حضور پرنور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رسالت پر شہادت دیتے ہیں۔ استنِ حنانہ یا ستونِ گریاں کا قصہ تو آپ نے سنا ہوگا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ پہلے پہل مسجد نبوی میں ممبر نہ تھا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک کھجور کے خشک تنے کے ساتھ جو ستون کی حیثیت سے نصب تھا ٹیک لگا کر خطبہ دیا کرتے تھے جب ایک انصاریہ عورت نے منبر بنوا کر بھیجا تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر خطبہ دینا شروع کر دیا۔ اثنائے خطبہ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ عظام نے سنا کہ ستون کے اندر سے بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے کی آواز آرہی ہے۔ آپ نے خطبہ کو بند فرما کر منبر سے اتر آئے اور ستون کے پاس جا کر اس سے اس گریہ وزاری کا سبب دریافت فرمایا۔ ستون نے جو کچھ عرض کی وہ مولانا روم صاحب کی زبان فیض ترجمان سے سننے کے قابل ہے مولانا فرماتے ہیں۔

استنِ حنانہ از ہجرِ رسول ناله مے زد ہمچو اربابِ عقول
درمیاں مجلس وعظ آں چناں کزدے آگه گشت ہم پیرو جواں
در تحیر مانده اصحابِ رسول کزچه مے نالہ ستوں با عرض و طول
گفتِ پیغمبر چه خواہی اے ستوں گفت جانم از فراقتِ گشت خوں
از فراق تو مرا چوں سوخت جاں چوں ننالم بے تو اے جانِ جہاں
مسندت من بودم از من تاختی برسرِ منبر تو مسند ساختی
پس رسولش گفت کا ے نیکو درخت اے شده باعتر تو ہمراز بخت
گر تو میخواہی ترا نخلے کنند شرقی و غربی زتو میوه چنند
یادراں عالم حقت سردے کند تا تروتازه بما فی تا ابد
گفت آں خواہم که دائم شد بقاش بشنو اے غافل کم از چوبے مباش

یعنی استنِ حنانہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فراق میں اصحابِ عقل کی طرح مجلسِ وعظ میں اس طرح زار و قطار رونے لگا کہ اس کے رونے کی آواز سب جوان اور بوڑھوں نے سنی۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ستون

کی اس گریہ وزاری سے نہایت متحیر ہوئے کہ یہ کیوں عرض اور طول سے رو رہا ہے یعنی کس لیے اس کی ہر ہر جز مصروفِ بکا ہے حضور ﷺ نے ستون سے اس رونے کا سبب پوچھا تو اس نے عرض کی کہ اے رسول ﷺ جب میری جان آپ کے فراق میں خون اور سوختہ ہوگئی تو پھر میں کس طرح آپ ﷺ کے فراق میں نہ روؤں، میں آپ کی ٹیک تھا اور آپ نے مجھے اس سے محروم فرما کر منبر کو مسند بنالیا ہے۔

حضور ﷺ نے ستون کے اس عشق ومحبت کو دیکھ کر فرمایا کہ اے نیک درخت تو بڑا ہی بانصیب ہے اگر تو چاہے تو میں دعا کروں تا کہ رب العزت تجھے میوہ دار درخت بنادیں تا کہ اہل مشرق ومغرب تجھ سے میوہ حاصل کیا کریں اور یا یہ دعا کروں کہ حق تعالیٰ تجھے اس جہان میں ایک سرو بنادے تا کہ تو ابدالآباد کے لیے تروتازہ رہے۔ ستون نے عرض کی کہ حضور ﷺ مجھے اس چیز کی خواہش ہے جس کو ہمیشہ کے لیے بقا اور دوام ہے اس پر مولانا صاحب فرماتے ہیں کہ اے غافل تو اس تنے کا جواب سن کہ وہ کس طرح دارالبقا کو دارالفنا پر ترجیح دے رہا ہے مگر تو ہے کہ دنیا کو آخرت پر اختیار کیے ہوئے ہے۔

دنیا عجب سرائے فانی دیکھی
ہر چیز یہاں کی آنی جانی دیکھی
جو آ کے نہ جائے وہ بڑھاپا دیکھا
جو جا کے نہ آئے وہ جوانی دیکھی

حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے روایت ہے کہ ایک دفعہ میں حضور ﷺ کے ساتھ جا رہا تھا راستے میں میں اپنے کانوں سے سنتا تھا کہ آپ ﷺ جس درخت کے پاس سے گزرتے تھے اس میں آواز آتی کہ! السلام علیك یا رسول الله۔

عالمِ جمادات کی شہادت:

اب اس کے بعد عالمِ جمادات کو لیجئے۔ جب حضور ﷺ نے مکہ معظمہ کو فتح کیا تو اُس وقت موجودہ خانہ کعبہ جو آج ستر کروڑ مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ ۳۶۰ بتوں کا بتکدہ بنا ہوا تھا۔ روزانہ نیا نیا بت پوجا جاتا ہے۔ چنانچہ مولانا الطاف حسین حالی فرماتے ہیں۔

وہ دنیا میں گھر سب سے پہلا خدا کا　　　خلیل ایک معمار تھا جس بنا کا
ازل میں مشیت نے تھا جس کو تاکا　　　کہ اس گھر سے اُبلے گا چشمہ ہُدٰی کا
وہ تیرتھ تھا اک بت پرستوں کا گویا
جہاں نام حق کا نہ تھا کوئی جویا
قبیلے قبیلے کا بُت اک جُدا تھا　　　کسی کا ہبل تھا کسی کا صفا تھا
یہ عُزّٰی یہ وہ نائلہ پر فدا تھا　　　اسی طرح گھر گھر نیا اک خدا تھا
نہاں ابرِ ظلمت میں تھا مہر انور
اندھیرا تھا فاران کی چوٹیوں پر

ایسی حالت میں جب حضور سرور عالم ﷺ مکہ معظمہ میں ایک فاتح کی حیثیت سے داخل ہوئے تو سب سے پہلے آپ کعبہ مکرمہ میں تشریف لے گئے۔ سیر کی کتابوں میں آتا ہے کہ آپ ﷺ کے ہاتھ میں ایک چھوٹی سی لکڑی تھی۔ آپ اپنی زبان درفشاں سے!

”جَآءَ الْحَقُّ وَ زَهَقَ الْبٰطِلُ ؕ اِنَّ الْبٰطِلَ كَانَ زَهُوْقًا “۔ (بنی اسرائیل: ۸۱)

حق آیا اور باطل بھاگ گیا اور باطل تو بھاگنے ہی والا ہے۔

پڑھ کر جس بت کی طرف اس چھڑی سے اشارہ فرماتے بت بلا ہاتھ لگائے زمین پر اوندھا گر کر ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتا اور اندر سے آواز آئی اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له واشهد ان محمدا عبده ورسوله-

سنگریزوں کی شہادت کا واقعہ مولانا روم کی زبان سے:

سنگریزوں کا حضور ﷺ کی رسالت پر شہادت دینے کا ایک واقعہ مولانا روم صاحب کی زبان سے عرض کر کے اس بحث کو ختم کرتا ہوں۔ کیونکہ اس کا زیادہ بیان کرنا بیجا طوالت کا باعث ہو جائیگا۔

سنگہا اندر کف بو جہل بود!　　　گفت اے احمد بگو ایں چیست زود
گر رسولی چیست درد ستم نہاں　　　چوں خبرداری زراز آسماں

گفت چوں خواہی بگویم کاں چہا ست　　یا بگؤیند آنکہ ما مقیم وراست حقیم
گفت بو جہل ایں دوم نادر تراست　　گفت آرے حق ازاں قادر تراست
گفت شش پارہ حجر در دست تست　　بشنواز ہریک تو تسبیحے درست
ازمیان مشت اوہر پارہ سنگ　　درشہادت گفتن آمد بید رنگ
لا الہ گفت والا اللہ گفت　　گوہر احمد رسول اللہ سفت
چوں شنید از سنگہابوجہل ایں　　زد زخشم آں سنگہارا بر زمین
گفت نبود مثل تو ساحر دگر　　ساحراں را سرتوئی وتاج سر

یعنی ابو جہل کے ہاتھ میں کچھ کنکریاں تھیں۔ کہنے لگا کہ اے محمد مصطفیٰ ﷺ جلد بتائے کہ یہ کیا ہے۔ جب آپ پیغمبر ہیں اور آسمانوں کے راز سے واقف ہیں تو بتائیے کہ میرے ہاتھ میں کیا ہے۔ آپ نے فرمایا اگر تو چاہے تو میں بتادوں کہ تیری ہتھیلی میں کیا ہے۔ اور اگر چاہے تو تیری ہتھیلی کی چیز میری حقانیت وسچائی پر گواہی دے۔ ابو جہل کہنے لگا کہ یہ دوسری بات تو بڑی عجیب ہے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا ہاں اگر اللہ تعالیٰ اس سے بھی زیادہ قدرت والا ہے۔ آپ نے فرمایا! تیرے ہاتھ میں پتھر کے چھ ٹکڑے ہیں اور تو اب اُن میں سے ہر ایک کی تسبیح کو صاف طور پر سن۔ بس آپکا یہ فرمانا تھا کہ ابو جہل کی مٹھی سے ہر ایک سنگریزہ بلا توقف کلمۂ شہادت پڑھنے لگا۔ لا الہ الا اللہ کہہ کر اُس کے ساتھ محمد رسول اللہ کے موتیوں کو بھی پرودیا۔

جب ابو جہل نے کنکروں سے کلمۂ سنا تو غصے میں آ کر اُن کو زمین میں دے مارا اور کہنے لگا کہ اے محمد آپ جیسا کوئی اور جادوگر نہ ہوگا۔ حقیقت میں آپ ساحروں کے سرتاج اور سردار ہیں۔ (نعوذ باللہ)

حضور ﷺ سید المرسلین ہونے کے علاوہ خاتم النبین بھی ہیں:

اس سب تقریر سے ثابت ہوگیا کہ آپ صرف ایک قوم یا ایک ملک یا ایک نوع کی طرف پیغمبر ہو کر نہیں آئے بلکہ آپ تمام مخلوقات اور عالم کیلئے رسول بنا کر بھیجے گئے اور پھر یہی نہیں بلکہ جس طرح آپکی دعوت کسی خاص ملک یا قوم میں محدود نہیں اسی طرح آپکی نبوت و رسالت کا زمانہ بھی محدود نہیں۔ یہ نہیں کہ اگلے

پیغمبروں کی طرح ہزار دو ہزار برس بعد نبوت محمدیہ ﷺ کے زمانہ کو ختم کر کے کسی دوسرے نبی کو مبعوث کیا جائیگا۔ نہیں بلکہ جیسا آپکو تمام مخلوقات کی طرف بھیجا گیا ہے۔ اسی طرح آپکے زمانہ نبوت کو بھی تا قیامت تک لمبا کر دیا گیا۔ آپ ﷺ سید المرسلین ہونیکے علاوہ خاتم النبین بھی ہیں۔ آپ کے بعد کسی شخص کو بھی اب دنیا میں بحیثیت نبی کے نہیں بھیجا جائے گا۔

ختم نبوت کے مسئلے پر بحث کی ضرورت:

ختمِ نبوت کا مسئلہ چونکہ نہایت اہم ہے اور آج کل کے بعض فرقوں نے اس کو موڑ توڑ کر ایسی دور از کار تاویلیں کی ہیں کہ سطحی نظر کے انسان کا اُن کے جال میں پھنس جانیکا قوی خدشہ ہے۔ اس واسطے اگرچہ اس مسئلہ کی توضیح اس مقام پر بے محل سی نظر آتی ہے۔ مگر اس کی اہمیت اور ضرورت کو دیکھ کر بلا بیان کئے ہوئے گزر جانا بھی مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ ہاں بیان میں اختصار کو ضرور مدنظر رکھا جائیگا۔

مطلق نبوت کی ضرورت کا بیان:

ختمِ نبوت کے متعلق کچھ بیان کرنے سے پہلے یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ مطلق نبوت کے مطلق کچھ عرض کروں تا کہ ختمِ نبوت کا مسئلہ جو کہ مطلق نبوت کے سمجھنے پر موقوف ہے بخوبی ذہن نشین ہو سکے۔ پہلے یہ بیان ہو چکا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو پیدا فرمایا۔ اور اسے طرح طرح کی نعمتوں سے نواز کر خلافتِ ارضی کا تاج پہنایا۔ جس کی وجہ سے انسان پر ایسے منعم و محسن کا شکریہ ادا کرنا اور اُس کی رضامندی حاصل کرنا ضروری ٹھہرتا ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ ایک انسان جب اپنے جیسے انسان کی رضامندی بغیر اُس کے بتائے ہوئے حاصل نہیں کر سکتا۔ تو پھر اُس خدائے لایزال اور مالک بے مثال کی رضا و غیر رضا بغیر اُس کی ہدایت کے کیسے معلوم کر سکتا اس واسطے ضروری ہوا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رضا و غیر رضا سے اس انسان ضعیف البیان کو مطلع فرماتا رہے تا کہ وہ فرمانِ عالیشان کے مطابق عمل کر کے رضامندی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ ہر کس و ناکس بالمشافہ اس اطلاع کو حاصل کرنے کی طاقت نہیں رکھتا اور نہ ہی ہر کس و ناکس کو منہ لگانا شانِ شہنشاہی کے مناسب ہے اس واسطے!

’’یُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ بِالرُّوْحِ مِنْ اَمْرِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ‘‘۔ (النحل: ۲)

ملائکہ کو ایمان کی جان یعنی وحی لے کر اپنے جن بندوں پر چاہے اتارتا ہے۔

کے مطابق وہ اپنے حکم سے فرشتوں کو وحی دیکر بندوں میں سے جس پر چاہتے ہیں نازل فرماتے ہیں اور وہ بندہ نہایت مقرب، نہایت مقدس اور معصوم ہوتا ہے۔ جسے اصطلاحِ شرع میں نبی یا رسول کہتے ہیں۔ تمام انبیا اور رسول اصول یا دین میں متفق ہیں ہاں فروع یا شریعتوں میں اختلاف ہے۔ ایک رسول کے وقت کچھ شریعت تھی تو دوسرے کے وقت وہ منسوخ ہو کر کچھ اور آ گئی۔

نسخِ شرائع غزارتِ علم پر دلالت کرتا ہے:

اس نسخ سے جیسا کہ پہلے مفصل بیان ہو چکا ہے۔ علمِ الٰہی پر کسی قسم کا اعتراض وارد نہیں ہو سکتا جیسا کہ بعض کم فہم لوگ کہا کرتے ہیں۔ کہ اس سے تو (نعوذ باللہ) اللہ تعالیٰ کا علم ناقص ٹھہرتا ہے۔ کیوں نہ اُس نے ایک ہی دفعہ ایسی کتاب یا قانون بھیجا کہ جو تا قیامت چل سکتا۔ بار بار کی ترمیم و تنسیخ علم کی کمی پر دلالت کرتی ہے۔ اور یہ اعتراض وارد نہ ہو سکنے کی وجہ یہ ہے کہ رب العزت حکیم ہیں اور اُن کا کوئی فعل بھی حکمت سے خالی نہیں۔ دیکھو طبیب ایک مریض کے لئے ابتداء میں ایک نسخہ تجویز کرتا ہے مگر چند روز کے بعد مریض کی حالت کو متغیر پا کر وہ اپنے نسخے میں بھی تبدیلی کر دیتا ہے اور اسی طرح وہ اس تغیر و تبدل کو جاری رکھتا ہے۔ تا آنکہ مریض بالکل صحت یاب ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ بھی اس انسان کے عقلی، ذہنی، جسمانی اور روحانی امراض کے حالات و واقعات کے مطابق اپنے نسخۂ ہدایت کو تبدیل فرماتا رہتا ہے۔ جس طرح طبیب کا نسخہ بدلنا اُس کی حذاقت و مہارت پر دلالت کرتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ کا نسخۂ ہدایت میں تبدیلی فرمانا اُس علیم کے علمِ بے پایاں پر دلالت کر رہا ہے۔

نسخ کی ضرورت پر عقلی دلائل:

اور دیکھئے ایک بچہ کی پیدائش سے بلوغ اُس کی خوراک و پوشاک بدلتی رہتی ہے۔ جب بچہ بالغ ہو جاتا ہے۔ تو پھر اُسے کوئی عاقل بھی ماں کے پستانوں سے دودھ پینے یا بچپن کی پوشاک پہننے کو مشورہ نہیں دے سکتا۔ اسی طرح اس انسان کو وہی روحانی غذا جو اسے عالمِ طفولیت میں آدم علیہ السلام کے زمانے میں دی جاتی تھی سنِ بلوغت میں استعمال کرنے کی صلاح دینا کس طرح دانشمندی کہلائی جا سکتی ہے۔ تو معلوم ہوا

کہ شرائع کا بدلنا اور نسخۂ ہدایت کا تبدیل کرنا عین حکمت کے اصول پر مبنی ہے۔

نسخ ضرورت کی مطابقت کا دوسرا نام ہے:

اب پھر اسی بچہ کی مثال کو لیجئے۔ دیکھو جب بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے۔ تو قدرت اُس کیلئے غذا کا یہ انتظام کرتی ہے کہ عورت کا وہ خون جو ماہواری کی صورت میں خارج ہوا کرتا تھا اُس کی خوراک میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ جب حمل پوری مدت کا ہو جاتا ہے تو قضا و قدر کے کارندے اسے دنیا میں لاتے ہیں۔ اب وہ پہلی خوراک منقطع ہو جاتی ہے اور زندگی کا دوسرا دور شروع ہونے کی وجہ سے غذا کا طرز بھی بدل جاتا ہے۔ اب اُسی خون کو سفید، لذیذ اور مقوی بنا کر ماں کے پستانوں سے بچہ کو پلایا جاتا ہے۔ پھر جب دو برس ہو جاتے ہیں اور کھانے کے لئے دانت عنایت کر دیئے جاتے ہیں تو بتدریج چھاتیوں کی نہروں کو بھی خشک کر دیا جاتا ہے۔ اب پہلے نرم اور زود ہضم غذائیں کھاتا ہے۔ پھر جب معدہ میں دیر ہضم اور ثقیل چیزوں کے لینے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے تو وہ اس طرح کی خوراکیں بھی کھانی شروع کر دیتا ہے۔ اب جبکہ قدرت بتدریج اُس کو حد بلوغ تک پہنچا دیتی ہے اور اُسے تمام ضروریات عطا کر دیتی ہے تو پھر اسے اسباب ظاہری کے حوالے کر کے براہ راست غذا پہنچانے کے سلسلے کو منقطع کر دیتی ہے۔ اب یہ نہیں ہو سکتا کہ بالغ ہونے کے بعد بھی کسی انسان کو آنول نال یا پستانوں سے خوراک دی جائے نہیں بلکہ اب اُسے حکم ہوتا ہے کہ ہمارے دیئے ہوئے اسباب کو استعمال کر کے خوراک حاصل کر۔ اب عقل سے سوچ، پاؤں سے چل، ہاتھوں سے کما اور دانتوں سے چبا۔ جب تک تیرے پاس اسباب نہ تھے یا تو ان کے استعمال کرنے پر قادر نہ تھا تو ہم نے تجھے براہ راست بلا کسب و اکتساب کے غذا بہم پہنچائی۔ اب جبکہ اسباب دیکر اسباب کی قدرت بھی دیدی ہے تو اب ان سے کام لے کر اپنی ضروریات کو پورا کر۔

جسمانی غذا کے طریقے پر روحانی غذا کا انطباق:

یہ طریقہ تو تھا جسمانی غذا کا، بعینہٖ یہی طریقہ روحانی غذا کا بھی ہے۔ لہٰذا اس جسمانی غذا پر روحانی غذا کو منطبق کر کے ختمِ نبوت کے مسئلہ کی تشریح کرتا ہوں۔

دینِ فطرت یا مذہبِ اسلام کا بچہ جب تک صغیر السن تھا تب تک اس کی پرورش کا انتظام قدرت

نے دایہ وحی کے ہاتھ میں دیئے رکھا۔ لیکن جب یہ بچہ حدِ کمال کو پہنچ گیا اور قدرت نے صاف اور صریح الفاظ میں فرمایا کہ!

"اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلٰمَ دِیْنًا ط"۔

(المائدہ: ۳)

یعنی آج میں نے تمارا دین کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور مذہب اسلام کو تمہارے لئے پسند کیا

تو جس طرح ایک بالغ اور کامل انسان کو آنول نال یا پستانوں سے غذا حاصل کرنے کی ضرورت نہیں رہتی اسی طرح دینِ کامل اور بالغ ہو جانے کے بعد دائیہ وحی کی تربیت کا محتاج نہ رہا بلکہ اُس کے لئے جو اسباب یا شریعت حضور پر نور محمد رسول ﷺ نے لائے اس کی تربیت اور نشونما کیلئے بالکل کافی ووافی ہیں اب دین کے کمال اور اس شریعت کے ہوتے ہوئے پھر وحی کی التجا کرنا یا وحی نبوت کی ضرورت سمجھنا گویا بالغ انسان کے لئے چھاتیوں سے دودھ پینے یا آنول نال سے غذا حاصل کرنے کے مترادف ہے۔

مثال سابق سے ختم نبوت کا ثبوت:

ہاں جس طرح ایک بالغ انسان حدِ کمال کو پہنچ کر زوال کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور جیسے قرآن فرماتا ہے!

"وَمَنْ نُّعَمِّرْهُ نُنَكِّسْهُ فِي الْخَلْقِ ط"۔ (یٰسین: ۶۸)

اور جسے ہم لمبی عمر دیتے ہیں اسے ہم بناوٹ میں اوندھا کر دیتے ہیں۔

کے الفاظ سے تعبیر فرماتا ہے۔ یعنی جب انسان کی عمر زیادہ ہو جاتی ہے تو پھر اس کی طاقت، اس کا علم، اس کی عقل اور اسکی حرکات قریب قریب بچوں کی سی ہو جاتی ہیں۔ اور اب پھر وہ قدرت کی توجہ کا محتاج ہو جاتا ہے۔ مگر اس وقت قدرت کے وہ فطرتی ذرائع جنہوں نے اسے حدکمال تک پہنچایا تھا۔ اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ نہ تو اسے پھر پستانوں کے ذریعے دودھ پلایا جاتا ہے۔ اور نہ آنول نال سے اس کو غذا دی جاتی ہے۔

بلکہ ایسی احتیاج کی حالت میں دوسرے اسباب کے ساتھ اس کی مدد کی جاتی ہے۔

مثلاً اگر بہت کمزور ہے اور ہاتھ سے نہیں کھا سکتا تو چمچہ کے ذریعے اس کے منہ میں ڈلوایا جاتا ہے۔ اگر وہ چل نہیں سکتا تو ٹیک کیلئے اسے عصا دیا جاتا ہے بدن کے ضعف کو دور کرنے کے لئے مقوی

ادویہ عنایت فرمائی جاتی ہیں۔ اسی طرح جب دین اسلام پر اس کے کمال کے بعد انحطاط کا غلبہ ہوا یا ہوگا۔ تو پھر اسے دایہ وحی کے سپرد نہ کیا جائے گا۔ بلکہ اس کی کمزوری کو:

”عُلَمَاءُ أُمَّتِي كَأَنْبِيَاءِ بَنِي إِسْرَائِيلَ“

(تفسیر الرازی: جلد ۱۷، سورہ یونس، دار احیاء التراث العربی بیروت)

(میری امت کے عالم احیاء دین میں بنی اسرائیل کے پیغمبروں جیسے ہوں گے) کے ذریعے سے دور کیا جائے گا۔ ہر صدی کے سرے پر ایک مجدد کو اس کے اضمحلال اور ضعف کو دور کرنے کے لئے بھیجا جائے گا۔ اور امت محمدیہ (علیہ السلام) کے محدثین و مفسرین کو اس کی تحدیث وتثبیت کے لئے مقرر کر دیا جائے گا۔ اور اسی کا نام ہے ختم نبوت۔

ختمِ نبوت کا ثبوت نقلی طور پر:

یہاں تک تو ختمِ نبوت پر عقلی رنگ میں بحث ہوئی اب اسی مسئلہ پر قرآن و حدیث کی روشنی میں ایک مختصر سی تقریر کرتا ہوں۔ تاکہ وہ لوگ جو حضور ﷺ کے خاتم النبیین ہونے کے منکر ہیں یا منکر تو نہیں مگر قرآن پاک کے الفاظ خاتم النبیین میں ایسی کچھ تحریفات اور تاویلات کرتے ہیں کہ ختمِ نبوت کا درجہ محض ایک بے حقیقت سی شے رہ جاتا ہے۔

ان پر اپنے نقلی دلائل کی غلطیاں بھی بخوبی روشن ہو جائیں اور سامعین اس بیان سے اگر کچھ بھی یاد رکھیں گے تو انشاءاللہ وہ اس قسم کی ذلالت (پھسلن) سے محفوظ رہیں گے۔

ختمِ نبوت کا ثبوت ایک نہایت آسان طریقے سے:

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں حضور ﷺ کے متعلق فرماتے ہیں!

”وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا۔ (سبا:۲۸)

یعنی ہم نے آپ کو تمام انسانوں کی طرف بشیر اور نذیر بنا کر بھیجا۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے!

”قُلْ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنِّيْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَيْكُمْ جَمِيْعًا۔ (اعراف:۱۵۸)

یعنی اے حبیب آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سب کی طرف اللہ کا بھیجا ہوا پیغمبر ہوں۔

تیسری جگہ آتا ہے!

”تَبٰرَكَ الَّذِیْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰی عَبْدِهٖ لِیَكُوْنَ لِلْعٰلَمِیْنَ نَذِیْرَا ۙ۝“۔ (الفرقان:۱)

یعنی بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل کیا۔ تاکہ وہ تمام جہان والوں کو ڈرائے

اور منکرین اور مولین سے ہم پوچھتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو تمام انسانوں کی طرف رسول بنا کر بھیجا گیا تو تمام انسانوں سے کیا مراد ہے۔ کیا وہی انسان جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے یا بعد کے آنے والے بھی اس حکم میں شامل ہیں۔ اگر یہ نہیں کہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کے لوگ ہی مراد ہیں اور بس۔

تو ایک تو اس بات کا غلط ہونا صاف ظاہر ہے اور پھر اگر وہ اپنے زمانہ ہی کے نبی تھے تو پھر ہم تم خود کیسے اُن کے نام لیوا بنے اور اگر سب موجودہ اور آئندہ انسانوں کے لئے رسول ہیں اور یہی صحیح اور درست ہے تو اس سے صاف ختمِ نبوت ثابت ہوگئی، کیونکہ جب آئندہ تمام انسانوں کے لئے بھی آپ رسول ہیں تو آئندہ کا تعلق تو قیامت تک ہے تو نتیجہ یہ نکلا کہ تا قیامِ قیامت کسی دوسرے شخص کا دعوٰی نبوت مسموع و مقبول نہیں ہوسکتا۔ بلکہ آقائے نامدار تاجدار مدینہ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نبوت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔

آیت خَاتَمُ النَّبِیّٖن پر دلچسپ بحث:

اس کے بعد آیت خاتم النبیین کو لے کر نبوت کو بیان کیا جاتا ہے تاکہ مؤلین ومحرفین کے بقدرِ کفایت اعتراض و جواب بھی بیان ہو جائیں۔ اور اس مبحث میں سامعین کی پوری پوری تسلی ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ جل شانہ قرآن پاک میں سورہ احزاب کے پانچویں رکوع میں فرماتا ہے!

”مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِیّٖنَ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمًا ۧ۝“۔ (احزاب:۴۰)

یعنی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمہارے مردوں میں کسی کے باپ نہیں بلکہ وہ اللہ کے رسول اور تمام انبیاء کے ختم کرنے والے ہیں اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔

حضرت زید نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کو والدین کی محبت پر

ترجیح دی:

شانِ نزول:

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے آزاد کردہ غلام تھے۔ بچپن میں قید ہو کر اُم المؤمنین بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے ہاتھ فروخت ہوئے۔ مگر بی بی صاحبہ رضی اللہ عنہا جب حضور پرنور ﷺ کے نکاح میں آئیں تو آپ نے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کو دے دیا حضور ﷺ حضرت زید رضی اللہ عنہ سے بہت محبت کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت زید رضی اللہ عنہ شام کی طرف سفر پر گئے تو وہاں انہیں ان کے والد نے پہچان لیا۔ وہ اپنے بھائی اور دوسرے بیٹے کو لے کر حضور ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ تاکہ قیمت ادا کر کے حضرت زید رضی اللہ عنہ کو واپس لے جائیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا مجھے قیمت کی ضرورت نہیں۔ اگر یہ تمہارے ساتھ جانا چاہتا ہے تو میں اسے بلا معاوضہ تمہارے ساتھ بھیجنے کو تیار ہوں۔ چنانچہ جب حضرت زید رضی اللہ عنہ سے جانے کے متعلق پوچھا گیا تو آپ نے عرض کی:

ترجمہ: یارسول اللہ ﷺ قسم ہے ذات کبریائی کی۔ میں آپ پر کسی کو ترجیح نہیں دیتا۔

دیکھا حضور سرورِ عالم ﷺ کی محبت کو کیسے حضرت زید رضی اللہ عنہ حضور پرنور ﷺ کی محبت کو اپنے باپ، چچا اور بھائی کی محبت پر ترجیح دیتے ہیں۔ حضور ﷺ کی ساتھ تنگی پریشانی، فاقہ کشی اور کفار کی ایذا رسانی کو قبول فرمایا۔ مگر اس جانِ دو جہاں کی جدائی کو گوارا نہ کیا۔ دیکھو کسی شاعر نے محبت کے اس فلسفے کو نہایت عجیب طرز پر بیان کیا ہے۔

نین سگا سوئی سگا۔ ہاڑ نہیں ہوئے
مان ہاٹھی تریا چرے۔ اچرج جگ کو ہوئے

ہم اور محبت رسول ﷺ:

ایک طرف صحابہ عظام کی شیفتگی اور محبت کو دیکھو اور دوسری طرف اپنے دلوں کو ٹٹولو۔ آج کفار کی ایذا ہے اور نہ عسر و تکلیف کا زمانہ۔ آج نہ حضور ﷺ کے ساتھ محبت کرنے کی کچھ سزا ہے اور نہ دعویٰ محبت کے اظہار پر کچھ پابندی۔ مگر ہم ہیں کہ یا تو محبت سے بالکل ہی خالی ہیں اور یا ہماری محبت صرف زبان تک محدود

ہے۔ ہمارے افعال، ہمارے اعتقاد اور اعمال سب کے سب محبوبِ ربّ العالمین کے طریقے کے مخالف ہیں۔

ایک انصاریہ کی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بے مثال محبت:

خیر حضرت زید رضی اللہ عنہ تو مرد تھے۔ مگر میں آپ کو حدیث شریف سے ایک انصاریہ کا واقعہ سناتا ہوں۔ جسے سنکر ہر مسلمان کو عبرت حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہئے۔

جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنگِ اُحد میں زخمی ہوئے اور آپ کا ایک مبارک دانت شہید ہو گیا۔ تو کفارِ ناہنجار نے یہ خبر مشہور کر دی۔ کہ نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم شہید ہو گئے۔ یہ خبر اڑتے اڑتے جب مدینہ شریف پہنچی اور ایک انصاریہ کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شہادت کا حال معلوم ہوا تو عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں دیوانہ وار گھر سے نکل پڑی۔ نہ پردہ کا خیال نہ غیر محرموں کا لحاظ، اور بات یہ ہے کہ جب عشق حقیقی طور پر مسلط ہو جاتا ہے۔ تو پھر پردہ اور محرم و غیر محرم کا سوال ہی اُٹھ جاتا ہے۔

کیونکہ دعوٰے عشق کے ساتھ ان چیزوں کا وجود معشوق کے بغیر دوسری چیزوں کو بھی ثابت کر رہا ہے اور مذہبِ عشق میں دوئی کا وجود شرکِ خفی سمجھا جاتا ہے۔ مولانا روم فرماتے ہیں۔

عشق آں شعلہ است کہ چوں بر فروخت
ہر چہ جز معشوق باشد جملہ سوخت

یعنی عشق وہ شعلہ ہے کہ جب یہ جلتا ہے تو اس کی آگ معشوق کے علاوہ ہر چیز کو جلا دیتی ہے۔

خواجہ عبد الخالق رحمۃ اللہ علیہ کا ایک عورت سے سبقِ عشق پڑھنا:

خواجہ عبد الخالق غجدوانی علیہ الرحمہ کے متعلق کسی کتاب میں دیکھا کہ ایک دفعہ آپ نماز میں مشغول تھے کہ آپ کے سامنے سے ایک عورت ننگے سر گزری۔ آپ نے جلدی سے سلام پھیر دیا اور اس عورت سے فرمایا کہ اے فلانی کیا تو دیکھتی نہ تھی کہ میں نماز پڑھ رہا تھا اور تو میرے سامنے سے گذر گئی۔ اور پھر صرف گذرنے کا ہی گناہ نہیں کیا بلکہ اپنے سر کو بھی ننگا کیا ہوا ہے۔ عورت نے آپ کو حیرت سے دیکھا اور عرض کی۔

نمازی کے آگے سے گذرنے کا شرعی مسئلہ:

لیکن عورت کا جواب سننے سے پہلے اس مسئلہ کو بھی یاد رکھو کہ اگر بڑی مسجد، جنگل یا میدان وغیرہ ہو اور نمازی کے آگے سترہ نہ ہو تو نمازی کے آگے سے اس کی حدِ نظر کے اندر گزرنا منع ہے۔ اور حدِ نظر یہ ہے کہ اگر مصلی حالت تشہد میں اپنی نظر سینے پر رکھے اور پھر جس قدر فاصلہ اس کی نظر میں آئے وہ حدِ نظر کہلاتا ہے۔ اور اس کی مقدار فقہا نے قد آدم رکھی ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ بڑی مسجد، صحرا یا کھلی جگہ میں نمازی کے سامنے قدِ آدم کے فاصلہ کے اندر گزرنا گناہ ہے۔ ہاں اس سے زیادہ فاصلہ چھوڑ کر گذر جائے تو جائز ہے۔ مگر مسجد صغیر یا تنگ جگہ میں تو کسی حالت میں بھی نمازی کے سامنے سے نہ گذرے۔

کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں!

''لَوْ يَعْلَمُ الْمَارُّ بَيْنَ يَدَيِ الْمُصَلِّي مَاذَا عَلَيْهِ لَكَانَ أَنْ يَقِفَ اَرْبَعِينَ خَيْرًا لَهُ مِنْ اَنْ يَمُرَّ بَيْنَ يَدَيْهِ (رواه الشيخان)۔

(صحیح البخاری: ج،ا، رقم: ۵۱۰، کتاب بدء الوحی، دار الشعب قاھرہ)

اگر نمازی کے سامنے سے گزرنے والے کو پتہ چل جائے کہ اس کا کیا وبال ہے تو وہ چالیس سال بھی کھڑا ہونا اُس کے آگے سے گزرنے سے بہتر سمجھے۔

تو عورت نے آپ کو حیرت سے دیکھا اور عرض کی کہ صاحب میری اور میرے خاوند کی آپس میں بہت محبت ہے۔ مگر میرے ہاں زمانے سے کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ اب میرا خاوند دوسرا نکاح کرنا چاہتا ہے۔ مگر میں خاوند کے ساتھ ہر ایک مصیبت اور تکلیف کو برضا و رغبت برداشت کرتی رہی ہوں۔ میں نے ہر ایک پریشانی میں اس کا ساتھ دیا۔ اور کسی حالت میں بھی میں نے اسکی رفاقت سے منہ نہیں موڑا لیکن میں اسے یہ اجازت کس طرح دے سکتی ہوں کہ وہ میرے ہوتے ہوئے کسی دوسری عورت کو بیاہ لائے۔ اور اپنی محبت میں میرے ساتھ دوسروں کو بھی شریک کرے۔ مگر وہ نہیں مانتا۔ اور اسی غرض سے وہ تھوڑی دیر ہوئی گھر سے نکلا۔ میں نے بہت صبر کرنے کی کوشش کی۔ مگر جذبِ محبت دیوانہ وار مجھے ستر و پردہ سے بیگانہ بنا کر اس کے پیچھے کھینچ لایا۔

عشق تا خام است باشد بستہ ناموس و ننگ

پخته کاران جنون را که حیا زنجیر پاست

ترجمہ: عشق جب تک خام (ناپختہ) ہوتا ہے وہ عزت وشہرت کا پابند ہوتا ہے اور جنون (دیوانگیٔ عشق) کے پختہ کار لوگوں کے لیے حیاء کیسے پاؤں کی زنجیر بن سکتی ہے۔

اور حضرت۔ واللہ میں آپ سے سچ عرض کرتی ہوں کہ اس انجذاب میں نہ تو مجھے اپنی ہی سدھ بدھ رہی اور نہ آپ کی۔ خواجہ علیہ الرحمہ نے جب اس عورت کی زبان سے یہ الہامی تقریر سنی تو اپنے آپ سے فرمانے لگے کہ! اے عبد الخالق! دیکھ ایک عورت پنے مجازی خاوند کے عشق میں ایسی خود رفتہ اور دیوانہ ہو گئی کہ اسے اپنے آپ تک کا ہوش نہ رہا۔ مگر ایک تو ہے کہ حقیقی خاوند کے عشق کا دعویٰ کرتے ہوئے بھی اپنے آپ کو نہیں چھوڑتا۔ اور خیر اگر عام حالت میں نفس شناسی کا امتیاز باقی رہتا تو پھر بھی زیادہ قبیح نہ تھا مگر تو نماز کی حالت میں بھی کہ ”اَلصَّلٰوۃُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْن“ ہے مخاطب باری سے سرفراز ہوتے ہوئے بھی آپ تو آپ غیر کی برہنگی اور حالت کا بھی امتیاز کرسکتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے۔ کہ تیرا عشق بھی کچا ہے تجھے تو چاہئے کہ بجائے لوگوں کو مرید کرنے کے اس عورت کو اپنا مرشد بنا اور اس سے ذوقِ محبت اور شوقِ مودّت کو سیکھ۔

عشق مولیٰ که کم از لیلیٰ بود
کوئی گشتن بهر او اولیٰ بود

ترجمہ: مولیٰ کا عشق اگر لیلیٰ کے عشق سے کم ہو تو اس کے لیے اس کی گلیوں میں پھرنا ہی بہتر ہوتا ہے۔

اور دیکھ۔ ایک عورت اپنے خاوند کی تمام دھمکیوں، جھڑکوں اور تکلیفوں کو تو برداشت کرلیتی ہے۔ مگر اپنی محبت کو تقسیم ہوتا ہوا نہیں دیکھ سکتی۔ جب شرک اس صنفِ ضعیف کے نزدیک اتنا بڑا جرم ہے تو اللہ جل شانہٗ کی محبت اور معبودیت میں کسی غیر اللہ کو شریک کرنا کتنا بڑا پاپ اور گناہ ہوگا۔

اور یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی پاک کلام میں فرماتا ہے!

”اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَكَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ یَّشَآءُ ج۔ (النسآ: ۴۸)

ترجمہ: بے شک اللہ اسے نہیں بخشتا کہ اس کے ساتھ کفر کیا جائے اور کفر سے نیچے جو کچھ ہے جسے چاہے معاف فرما دیتا ہے

رجوع بقصہ انصاریہ:

تو بات یہ بیان ہو رہی تھی کہ وہ انصاریہ حضور پرنور ﷺ کی شہادت کا سن کر دیوانوں کی طرح گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ رستے میں چند اشخاص ملے ان سے حضور ﷺ کے متعلق دریافت کیا۔ وہ کہنے لگے کہ ہمیں حضور ﷺ کے متعلق تو کچھ معلوم نہیں ہاں اتنا کہہ سکتے ہیں کہ تیرے دولڑکے جنگ میں شہید ہو گئے ہیں۔ اس مقدس خاتون نے فرمایا اے بزرگو میں تم سے اپنے بیٹوں کے متعلق نہیں پوچھ رہی مجھے تو حضور سرور عالم ﷺ کی خبر کی ضرورت ہے۔ ذرا آگے بڑھیں تو پھر چند شخصوں سے ملاقات ہوئی۔ بی بی صاحبہ نے ان سے بھی حضور ﷺ کے متعلق سوال کیا۔ وہ بھی کہنے لگے کہ ہمیں حضور ﷺ کے متعلق تو کچھ خبر نہیں ہاں البتہ اتنا جانتے ہیں کہ تیرے تین بھائی جنگ میں کام آ چکے ہیں۔ اس پاک عورت نے فرمایا کہ اے لوگو! میں بیٹوں اور بھائیوں کا نہیں پوچھتی مجھے تو اس آقائے نامدار کی خیریت کی خبر سناؤ جن کیلئے یہ دارین اور کون ومکان کو بنایا گیا۔ تھوڑی اور آگے چلیں تو ایک دوسرا گروہ آتا ہوا ملا۔ ان سے بھی بی بی صاحبہ نے وہی سوال کیا۔ انہوں نے جواب دیا کہ اے بی بی ہمیں حضور ﷺ کے متعلق تو کچھ اطلاع نہیں ہاں اتنا معلوم ہے کہ تیرا بہادر خاوند آج نہایت زبردست جہاد کرتے ہوئے اللہ کی رحمت کو پہنچ چکا ہے۔ اس شریف انصاریہ نے فرمایا کہ خدا معلوم ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ میں سوال کیا کرتی ہوں اور یہ جواب کیا دیتے ہیں۔ میں تو پوچھتی ہوں حبیب رب العالمین کے متعلق اور یہ خبر دیتے ہیں۔ میرے عزیزوں کی، چند ہی قدم آگے چلی تھی دیکھا کہ حضور ﷺ اپنے خون آلودہ ماتھے پر پٹی باندھے آہستہ آہستہ تشریف لا رہے ہیں۔ دوڑ کر گئی اور جا کر پاؤں سے لپٹ گئی۔ کہنے لگی کہ اے رسول ﷺ اگر آپ کی شمع رسالت موجود ہے تو میرے خاوند، بیٹوں اور بھائیوں جیسے ہزاروں پروانے بھی اس پر نثار ہو جائیں تو کم ہیں۔ مولانا شبلی نے اس واقعہ کو منظوم کیا ہے۔ جس میں سے چند ایک اشعار مجھے یاد ہیں۔ وہ میں عرض کئے دیتا ہوں۔

اس عفیفہ نے یہ سب سن کے کہا تو یہ کہا
یہ تو بتلاؤ کہ کیسے ہیں شہنشاہِ امم
اس نے دی اس کو بشارت کہ سلامت ہیں حضور ﷺ

گرچہ زخمی ہے سر و سینہ و پہلو وشکم
بڑھ کے اس نے جو رُخِ اقدس کو دیکھا تو کہا
تو سلامت ہے تو پھر ہیچ ہے سب رنج و الم
میں بھی اور باپ بھی شوہر برادر بھی فدا
اے شہِ دیں ترے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

ہم اور عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم:

بھائیو دیکھو عورت کا عشق رسول کہ کس طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خیریت، صحت اور خبر کو اپنے عزیزوں کی خیر خیریت پر ترجیح دی۔ مگر آج ہم مرد ہو کر، عشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مدعی ہو کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دینِ متین کو توہین وتحقیر کی نظروں سے دیکھتے ہوئے ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ کیونکہ ہمارے دلوں میں آج اپنی جان کی اپنے مال وعیال کی محبت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ ہوگئی۔ مگر یاد رکھو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں!

”لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْہِ مِنْ وَالِدِہٖ وَوَلَدِہٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ۔
(صحیح بخاری: ج،۱، رقم: ۱۵، کتاب بدء الوحی، دار الشعب قاھرہ)

یعنی تم کامل مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ تم مجھے اپنے ماں باپ اور اولاد اور تمام انسانوں سے محبوب نہ سمجھو۔

عزیزو اپنے دلوں کو ٹٹولو اور اس حدیث کی کسوٹی پر اپنے ایمان کو پرکھو۔

اصل صدیوسف جمال ذوالجلال
اے کم اززن شو خدائے آن جمال

اللھم ارزقنا حبك وحب حبيبك وحب من يحبك۔

رجوع بسوئے شان نزول آیت:

تو بیان یہ ہو رہا تھا کہ حضرت زید بن حارثہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے آزاد کردہ غلام تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس قدر محبت تھی کہ والدین اور بھائیوں کی محبت پر آپ کے عشق کو ترجیح دے کر آپ ہی کے ساتھ رہنا پسند کیا اور

صاف عرض کر دی۔!

"یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَاللّٰہِ لَا اَخْتَارُ عَلَیْكَ اَحَدًا"۔

یارسول اللہ! اللہ کی قسم میں آپ پر کسی کو ترجیح نہیں دوں گا۔

اسی محبت کے باعث حضور ﷺ نے ان کو اپنا متبنی یا لے پالک بیٹا بنالیا تھا اور لوگ آپ کو بجائے زید بن حارثہ کے زید بن محمد کہا کرتے تھے۔ اب حضور ﷺ کی بعثت سے پہلے عرب میں یہ رسم تھی کہ لوگ جسے متبنی بناتے تھے اُسے ہر ایک بات میں حقیقی بیٹوں کی طرح سمجھتے تھے۔ وراثت میں وہ دوسرے بھائیوں کی طرح حقدار ہوتا، اُس کی بیوی سے حقیقی بیٹے کی بیوی کی طرح نکاح کرنا ناجائز سمجھا جاتا، چونکہ اس میں بہت سی خرابیاں تھیں کہ ایک غیر وارث کو جبراً وارث بنا کر اصلی وارثوں کی حق تلفی کی جاتی اور متبنی کی عورت کو جو طلاق یا متبنی کی موت کے بعد نکاح میں لانی جائز تھی اُسے حقیقی بہو کی طرح ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حرام قرار دے دیا جاتا اور پھر اس کے باعث آئندہ کتنے ہی فروعی جھگڑے اُٹھ کھڑے ہوتے۔ اس لیے جب حضرت زید رضی اللہ عنہ نے زینب بنت جحش کو طلاق دی جو حضور ﷺ کی پھوپھی اُمیمہ کی لڑکی اور عبد اللہ بن جحش کی بہو تھی تو اللہ تعالیٰ نے لے پالک بیٹے کے متعلق جو خرابیاں مروج تھیں اُنھیں دور کرنے کے لیے حضور ﷺ کو بی بی زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح کرنے کا حکم دیا اور قرآن پاک میں بذریعہ وحی اعلان کروا دیا گیا کہ!

"وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ؕ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِي السَّبِيْلَ ۝ اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ" (احزاب: ۴)

یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لے پالکوں کو تمہارے بیٹے نہیں بنایا، یہ تمہاری منہ بولی بات ہے۔ اللہ سچ فرماتا ہے اور وہی رستہ سُجھاتا ہے۔ اُنھیں اُن کے باپوں کے نام سے پکارو۔ یہ اللہ کے نزدیک زیادہ انصاف کی بات ہے۔

اس آیت کے نزول کے بعد لوگوں نے حضرت زید کو پھر زید بن حارثہ کہنا شروع کیا۔

چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے!

"عَنِ ابْنِ عُمَرَ قَالَ مَا كُنَّا نَدْعُوْ زَيْدَ بْنَ حَارِثَةَ اِلَّا زَيْدَ بْنَ مُحَمَّدٍ حَتّٰى نَزَلَ الْقُرْاٰنُ (اُدْعُوْهُمْ

لِاٰبَآئِہِمۡ ہُوَ اَقۡسَطُ عِنۡدَ اللّٰہِ ‘‘۔

(سنن ترمذی: الجزء ۵، رقم: ۳۲۰۹، دار الغرب الاسلامی بیروت)

اب جب ایک طرف متبنیٰ بیٹوں کو ان کے باپوں کی طرف سے منسوب کر کے بلانے کا حکم آ گیا اور دوسری طرف حضور ﷺ کو سب سے اوّل عملاً اس رسم کو توڑ کر بی بی زینب سے نکاح کرنے کا فرمان ہوا تو کفار نے زمین و آسمان کو سر پر اٹھا لیا۔ اور کہنے لگے کہ دیکھو اس نبی نے تو اپنی بہو سے نکاح کر لیا ہے۔ کفار کے اس طعن و تشنیع کا جواب رب العزت نے یوں دیا کہ!

‘‘مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِكُمۡ وَلٰكِنۡ رَّسُوۡلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ ۔

(احزاب: ۴۰)

یعنی محمد ﷺ تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں بلکہ وہ تو اللہ کے رسول اور آخر الانبیاء ہیں۔

اس آیت میں کفار کو بتایا گیا کہ حضرت زید رضی اللہ عنہ کو حضور ﷺ کا بیٹا قرار دے کر اُس کی مطلقہ عورت سے نکاح کو ناجائز ٹھہرانا بالکل منع ہے۔ کیونکہ حضرت زید رضی اللہ عنہ آپ کے بیٹے نہیں۔ اور ایک حضرت زید رضی اللہ عنہ کیا وہ تو مردوں میں سے کسی کے بھی باپ نہیں۔ تو وہ شخص کہ جس کا کوئی بیٹا نہیں اس پر یہ اتہام لگانا کہ اُس نے اپنے بیٹے کی بیوی سے نکاح کر لیا ہے کیسا سفید جھوٹ ہے اور کھلا بہتان ہے۔

‘‘مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِكُمۡ ‘‘پر ایک اعتراض اور اسکا جواب:

ہاں اس سے ایک اعتراض ہوسکتا ہے۔ کہ حضور ﷺ کے تو چار صاحبزادے ہوئے پھر یہ کہنا کہ وہ مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں کس طرح صحیح ہوسکتا ہے۔

جواب: حضور ﷺ کے سب بچے عالم طفولیت میں انتقال فرما گئے۔ کوئی جوان ہو کر حد جولیت کو نہیں پہنچا کہ رجال کا لفظ اُن پر منطبق ہوسکے۔ اور یا یہ کہ آیت کے نزول کے وقت اُن میں سے کوئی بھی بقیدِ حیات نہ تھا۔

اس لئے حضور ﷺ کے متعلق مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنۡ رِّجَالِكُمۡ کہنا بالکل صحیح اور درست ہے۔

”مَا كَانَ کا وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَ خَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ط“ سے تعلق:

اب اس مقام پر غور کرنے سے ایک اور سوال بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ یہ کہ ”مِّنْ رِّجَالِكُمْ“ تک تو کفار کو ان کی افترا پردازی کا جواب دیا گیا۔ مگر اس کے ساتھ اس محل پر ”وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ“ کہنے کا کیا مطلب ہے۔ کیونکہ ان دونوں جزوں کا جوڑ بے محل سا معلوم ہوتا ہے۔ بات چل رہی تھی اَبُوَّت اَدْعِيَاء میں اور اس کا انتقام مِنْ رِجَالِكُمْ تک کی جزو میں پورا پورا کر دیا گیا۔ اب رسول اللہ و خاتم النبیین کو ملانے کی کیا ضرورت تھی؟

جواب: ابوتِ ذاتی کی نفی کرنے سے یہ خیال پیدا ہوسکتا تھا کہ ابوت کا خاصہ تو شفقت پیار اور محبت ہے۔ جب حضور ﷺ کی ابوت کی ایسے صاف اور صریح الفاظ میں نفی کر دی گئی تو معلوم ہوا کہ آپکو اپنی اُمت پر پدرانہ شفقت اور پیار بھی نہ ہوگا۔ اسی شک کو اللہ تعالیٰ ”لکن“ فرما کر دور فرما رہے ہیں۔ کیونکہ ”لکن“ عربی زبان میں استدارک یا کلامِ سابق میں جو شک پیدا ہوتا ہے یا ہوسکتا ہے اسکے دور کرنے کے لئے لایا جاتا ہے۔ یہاں پر چونکہ بعض اشخاص کو یہ شک پیدا ہوسکتا تھا اس واسطے ”لکن“ لا کر اس کے شک کو یوں رفع کیا جاتا ہے کہ! اے لوگو: ابوتِ جسمانی کی نفی سے یہ نہ سمجھ بیٹھنا کہ پھر تو آپ کو اُمت سے پیار و شفقت بھی نہ ہوگا بلکہ آپ تو رسول ہیں اور یہ ظاہر ہے کہ رسول اپنی اُمت کا جسمانی نہیں بلکہ روحانی باپ ہوتا ہے۔ تو گو یا لفظ رسول لا کر بیک کرشمہ دو کار یا ایک بات سے دو کام یوں نکالے کہ ایک تو آپکی رسالت ثابت فرمائی جس سے آپ کا ہادی، رہنما، معصوم اور مامور من اللہ ہونا ثابت ہوگیا اور جب آپ مامور من اللہ ٹھہرے تو پھر آپ کی شانِ ذیشان کے کب لائق ہے کہ رب العزت کی رضامندی یا احکام کے برخلاف کوئی کام کریں۔ لہذا بی بی زینب رضی اللہ عنہا سے نکاح مرضی الٰہی اور امرِ خداوندی کے مطابق ہوا ہے۔ دوسرے لفظ رسول سے یہ ظاہر فرما دیا کہ اگرچہ آپ کسی مرد کے جسمانی باپ تو نہیں۔ مگر رسول ہونے کی حیثیت سے آپ تمام اُمت کے روحانی باپ ہیں۔ کیونکہ رسول اُمت کا روحانی باپ ہوتا ہے۔ اسی واسطے حضرت لوط علیہ السلام نے قرآن پاک میں ”هٰٓؤُلَاءِ بَنَاتِيْ هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ“ فرما کر اُمت کی عورتوں کو اپنی بیٹیاں قرار دیا ہے۔ اور پھر حضور ﷺ کی روحانی ابوت کو خاتم النبیین فرما کر اور پیغمبروں کی روحانی ابوت پر فضیلت عطا فرمائی۔ کیونکہ

اگلے پیغمبر اگرچہ وہ بھی اُمت کے روحانی باپ تو تھے مگر اُن کی یہ ابوت ایک محدود قوم اور محدود وقت تک ہونے کی وجہ سے کم درجہ کی تھی لیکن اُس کے برعکس حضور ﷺ کو خاتم النبیین بیان فرما کر یہ ظاہر کر دیا کہ آپ ﷺ کی ابوت کا تعلق اتنا وسیع اور مستحکم ہے کہ نہ تو آئندہ کوئی قیامت تک آنیوالا آپکی روحانی ابوت سے محروم رہ سکتا ہے اور نہ ہی آپکی ﷺ ابوت کسی دوسرے رسول کے آنے سے منقطع ہو سکتی ہے۔ بلکہ تا قیامت آپ ﷺ ہی کی ابوت قائم رہے گی۔

یہ تو اس آیت کی تشریح تھی جس سے آپکو اس کا شانِ نزول اور ارتباطِ باہمی معلوم ہوا۔ اب میں اصلی مطلب یعنی ختم نبوت کی طرف آتا ہوں اور خاتم النبیین کی توضیح کر کے مؤلین کی تمام رکیک تاویلوں کا جواب دیتا ہوں۔

لفظ خاتم کی تشریح:

خاتم میں دو قرأتیں ہیں۔ ایک ''تا'' کی زیر سے اور دوسرے ''تا'' کی زبر سے۔ اگرچہ اس لفظ کے معنی اور بھی ہیں مگر آیت میں سوائے دو معنوں کے اور کسی کا احتمال نہیں۔ یعنی خاتم زیر کے ساتھ ختم کرنیوالا اور خاتم زبر کے ساتھ آخر قوم کو کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی معنی مجازی ہیں اور مجازی معنی اُسی وقت لیا جاتا ہے جبکہ حقیقت متعذر ہو اور یہاں حقیقت متعذر نہیں بلکہ حقیقی معنی ہی مقصود ہیں۔ اور اگر غور کرو تو آپ کو قرینہ کی رو سے مجاز کا متعذر ہونا معلوم ہوگا۔ تو اب خاتم النبین کا معنی انبیاء کے سلسلہ کو ختم کرنیوالا اور خاتم النبین کا معنی آخر النبین ہوئے اور اسی کی موید ہیں احادیث صحیحہ مثل:

''أَنَا خَاتَمُ الْأَنْبِيَاءِ لَا نَبِيَّ بَعْدِي'' (المستدرک: ج، ۴، رقم: ۸۳۹۰، دار الکتب العلمیہ)

یعنی میں آخر الانبیاء ہوں اور میرے بعد کوئی نبی نہیں۔

دوسری حدیث میں حضور ﷺ نے فرمایا!

''اِنَّ مَثَلِي وَمَثَلَ الاَنْبِيَاءِ مِنْ قَبْلِي كَمَثَلِ رَجُلٍ بَنَى بَيْتًا فَاَحْسَنَهُ وَاَجْمَلَهُ اِلاَّ مَوْضِعَ لَبِنَةٍ مِنْ زَاوِيَةٍ فَجَعَلَ النَّاسُ يَطُوفُونَ بِهِ وَيَعْجَبُونَ لَهُ وَيَقُولُونَ هَلاَّ وُضِعَتْ هَذِهِ اللَّبِنَةُ قَالَ فَأَنَا اللَّبِنَةُ وَأَنَا خَاتِمُ النَّبِيِّينَ''۔

(صحیح بخاری: ج، ۴، رقم: ۳۵۳۵، کتاب بدء الوحی، دار الشعب قاھرہ)

یعنی میری اور سابقہ انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے کسی شخص نے گھر بنایا ہو اور اُسے اچھا اور خوبصورت بنایا ہو۔ مگر کونے میں ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی ہو۔ تو لوگ اس کے گرد گھومتے اور تعجب کرتے ہوں اور کہتے ہوں کہ یہ اینٹ کیوں نہ رکھی گئی۔ سو میں وہ اینٹ ہو جس سے اب قصرِ نبوت مکمل ہو گیا اور میں خاتم النبیین ہوں۔

تیسری حدیث شریف میں ارشاد ہوتا ہے!

" فُضِّلْتُ عَلَی الاَنْبِیَاءِ بِسِتٍّ اُعْطِیْتُ جَوَامِعَ الْکَلِمِ وَنُصِرْتُ بِالرُّعْبِ وَاُحِلَّتْ لِیَ الْغَنَائِمُ وَجُعِلَتْ لِیَ الاَرْضُ طَھُوْرًا وَمَسْجِدًا وَاُرْسِلْتُ اِلَی الْخَلْقِ کَافَّۃً وَخُتِمَ بِیَ النَّبِیُّوْنَ۔

(صحیح مسلم: ج، ۲، رقم: ۱۱۹۵، دار الجیل بیروت)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے تمام انبیاء پر چھ وجود سے فضیلت دی گئی ہے۔ ایک تو مجھے کلمات جامعہ عطا ہوئے۔ دوسرے رعب کے ذریعے میری مدد کی گئی۔ تیسرے میرے لئے مالِ غنیمت کو حلال کیا گیا۔ چوتھے میرے لئے تمام روئے زمین کو نماز پڑھنے کی جگہ اور پاک بنایا گیا۔ اور پانچویں یہ کہ مجھے تمام مخلوقات کی طرف مبعوث کیا گیا۔ اور چھٹے یہ کہ میرے ساتھ سلسلہ انبیاء کو ختم کر دیا گیا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آپ کو کونے کا پتھر فرما کر ایک بہت بڑے راز کی طرف اشارہ فرمایا:

دوسری حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے آپکو کونے کے پتھر کے ساتھ مشابہت دیکر ایک بہت بڑے راز کی طرف اشارہ فرمایا۔ جسے عاشقوں نے سمجھ لیا اور کوچۂ عشق کے ناواقف بھٹکتے بھٹکتے کہاں سے کہاں نکل گئے۔ سچ ہے۔

نکتہ گفتن پیش اقصر فہماں ز حکمت بے گماں
جوہرے چند از جواہر ریختن پیش خر است

ترجمہ: ناسمجھ لوگوں کے سامنے حکمت کے نکات اور دانائی کی باتیں بیان کرنا بے شک ایسا ہے جیسا کہ کچھ قیمتی جواھر گدھے کے سامنے بکھیریں جائیں۔

حضور سرورِ عالم کی آمد سے صدیوں پہلے تصویری زبان کا رواج تھا۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعث کے بعد بھی بعض ممالک میں بجائے حروف کے تصویروں کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کو بیان کیا کرتے تھے۔ چنانچہ آج بھی لنڈن برٹش میوزیم میں سینکڑوں کتابیں تصویری زبان میں موجود ہیں۔ پرانے کتبے اور تحریرات جو زمینوں سے مدفون نکلتی ہیں۔ ان میں بھی اکثر تصویری زبان کا استعمال نظر آتا ہے۔ کہیں گھوڑا ہے، کہیں درخت ہے، کہیں برتن۔ اُن تصویروں سے وہ لوگ ایسے ہی مطلب حاصل کیا کرتے تھے۔ جیسے آج ہم حروفِ تہجی کے ملانے سے حاصل کرتے ہیں۔

اب جب آپکے ذہن میں یہ بات صحیح طور پر آگئی کہ دنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قبل عام طور پر اور بعد میں بعض خاص ممالک میں تصویری زبان میں لکھنے کا رواج تھا۔ تو اب سمجھو کہ تصویری زبان میں پتھر سے کیا مراد ہوتا ہے۔؟ تصویری زبان میں پتھر سے مراد معزز انسان۔ بادشاہ یا اور کوئی مقدس ہستی مراد ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ اسی واسطے یوشع بن نون نے یرون سے گزرتے وقت بارہ پتھر اٹھائے۔

یوشع باب ۶ جو بقول علمائے بائبل بارہ حواریوں کی پیشن گوئی تھی۔ انجیل نے پطرس کو پتھر کے ساتھ تشبیہ دی کیونکہ وہی کلیسا کے لئے بنیادی پتھر بنا۔ تو معلوم ہوا کہ خود انجیل و توریت نے تصویری زبان کی مطابقت میں پتھر سے دین و دنیا کا کوئی مقتدر انسان مراد لیا ہے۔ تو اب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذرا اُن پیشنگوئیوں پر نظر ڈالو جو توریت اور انجیل میں بیان کی گئی ہیں۔ اور پھر اُن کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ ”انا البنۃ“ کو مطابق کرکے ان کی صداقت کو انصاف کے ترازو پر جانچو۔

لوقا باب ۲۰ آیت ۱۷۔ وہ پتھر جسے راج گیروں نے ردّ کیا وہی کونے کا سرا ہوا۔ ایسا ہی متی باب ۲۱ آیت ۴۲ اور توریت و زبور میں بھی مذکور ہے۔ اب غور کرو کہ وہ کون سی مقدس ہستی ہے جو کونے کا پتھر بنی اور جس سے عمارت بالکل مکمل اور پوری ہوگئی۔ وہ بقول انجیل اور پھر بمطابقت احادیث اور پھر بتائیدِ قرآن حضور سید المرسلین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی ذاتِ گرامی ہے۔ جو اگر انجیل میں کونے کے پتھر ہی تو احادیث میں ”لَبِنَۃٍ مِنْ زَاوِیَۃٍ“ اور قرآن میں ”خاتم النبیین“ کے الفاظ سے تعبیر کئے جا رہے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قصر نبوت کا آخری پتھر ہونے پر عملی پیشین گوئی:

اور پھر یہی نہیں کہ پہلی کتابوں میں سے تحریری طور پر قصرِ نبوت کے آخری پتھر کے متعلق پیشگوئیاں کی گئیں۔

بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے صدیوں پیشتر عملی طور پر ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کو خانہ کعبہ بناتے وقت ایک کونے میں حجر اسود کو رکھنے کو حکم دیا گیا۔

تا کہ ملت ابراہیمی پر چلنے والی آئندہ نسلیں حجر اسود سے یہ نتیجہ نکال سکیں کہ وہ کونے کا پتھر عرب کے ملک مکہ معظمہ کے شہر میں مبعوث ہوگا اور جسکا قبلہ یہ کعبہ ابراہیمی ہوگا۔

حجر اسود کی موجودہ جگہ اللہ تعالیٰ نے متعین فرمائی:

اور حجر اسود کی موجودہ جگہ پر رکھنے کے متعلق کتابوں میں آتا ہے کہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے اسمٰعیل کی معیت میں خانہ کعبہ کی دیواروں کو قد آدم سے بلند کیا۔ تو اوپر ہاتھ نہ پہنچ سکنے کے باعث کسی ایسے پتھر کی ضرورت پڑی کہ جس پر کھڑے ہو کر کام کو جاری کیا جا سکے۔

چنانچہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام ایسے پتھر کی تلاش میں نکلے۔ رستے میں حضرت جبریئل نے آپکی رہنمائی کی اور فرمایا کہ! فلانے غار میں دو پتھر پڑے ہوئے ہیں۔ ایک بڑا ہے اور ایک چھوٹا۔ بڑے پر تو کھڑے ہو کر اپنا کام کریں اور چھوٹے کو کعبے کے فلاں مقام پر جما دیجئے۔ اور یہ پتھر آدم علیہ السلام اپنے ساتھ جنت سے لائے تھے جسے نوح علیہ السلام نے طوفان کے باعث یہاں رکھ دیا تھا۔

چنانچہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام دونوں پتھر لائے اور حسبِ ہدایت حجر اسود کو تو جبرائیل علیہ السلام کے بتائے ہوئے مقام پر نصب فرما دیا اور دوسرے پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہو کر کام کرنے لگے جس میں حضرت کے قدم مبارک کا نشانِ معجزہ آج تک موجود ہے اور جو مقامِ ابراہیم میں محفوظ پڑا ہوا ہے۔

حجرِ اسود کے ابتداء میں سفید ہونے پر تاریخی شہادتیں:

تو خلاصہ مطلب یہ ہے کہ حجر اسود اس روایت کی رُو سے بہشتی پتھر ہے اور اس کا موجودہ مقام

جبرئیل علیہ السلام کا بتایا ہوا ہے، اور پھر بعض کتابوں میں تو یہ بھی ہے کہ حرم شریف کی حد اس پتھر کی چمک اور روشنی سے مقرر ہوئی۔ جہاں تک اس پتھر کی روشنی پہنچی وہاں تک حرم کے نشانات کو قائم کر دیا گیا۔ نصب کرتے وقت یہ پتھر بالکل سفید تھا مگر کروڑوں گناہگاروں کے چھونے اور چومنے سے اس کی سفیدی سیاہی میں تبدیل ہوگئی اور وہ حجرابیض آج اُمت کے گناہوں کی ظلمت کو جذب کر کر کے حجراسود ہو چکا ہے۔ اور یہ بات جو مشہور ہے کہ حجراسود میں کچھ سفیدی باقی ہے جب وہ بھی سیاہ ہو جائے گی تو اُس وقت قیامت قائم ہو جائے گی تو یہ قول صرف زبانی ہی نہیں بلکہ عرب کی قدیم تاریخوں میں اس کا تحریری ثبوت بھی ملتا ہے۔ چنانچہ تواریخِ عربیہ میں مسطور ہے کہ ابن جبیر فرماتے ہیں کہ میں نے حجراسود میں متعدد سفید نقطے دیکھے ہیں اور ابن جبیر کی تاریخ وفات ۵۷۹ھ ہے۔ اس کے بعد فقیہ سلیمان عسقلانی نے اپنی مناسک میں بیان فرمایا ہے کہ میں نے حجراسود میں تین جگہ سفیدی دیکھی ہے اور اُن کی یہ تحریر ۷۰۹ھ کی ہے۔ اُس کے بعد متعدد آدمیوں نے اُس سفیدی کو دیکھا۔ تو معلوم ہوا کہ ابھی صرف ایک نقطہ باقی ہے اور اب تو اُس ایک نقطے کی سفیدی بھی بہت دھندلی پڑ چکی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب

حجرِاسود کی تبدیلیوں پر اعتراضات اور اُن کے جوابات:

اعتراض: اس پر بعض لوگوں نے اعتراض کیا ہے کہ یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ ایک پتھر ابتدا میں سفید ہو اور محض گناہگار لوگوں کے چھونے کی وجہ سے اس کی سفیدی، سیاہی میں تبدیل ہو جائے۔ اوّل تو اس پتھر میں قوتِ جاذبہ کی موجودگی محلِ تامل ہے۔ اور پھر بشرط وجودِ گناہ کچھ محسوس ہونیوالی تو چیز نہیں۔ کہ اس میں جذب ہو جاتے ہونگے۔ گناہ تو ایک صفت ہے منجملہ دوسری صفات کے تو پھر ایک غیر مرئی وغیر محسوس صفت کا پتھر میں جذب ہو جانے کا کیا مطلب۔ اور پھر بفرضِ محال اگر جذب وہ بھی گئے تو گناہوں کو سیاہی کی صورت میں کیوں دکھایا گیا۔ کیا اور رنگ نہ تھے کہ بجائے حجراسود کے حجراخضر یا احمر یا ازرق بنا دیا جاتا۔

جواب: قوتِ جاذبہ کی موجودگی میں تامل کرنا خود محلِ تامل ہے۔ کیونکہ معترض کے پاس اس کے عدمِ وجود کی کوئی دلیل نہیں۔ اور ہمارے پاس اس کے وجود پر یہ صاف دلیل موجود ہے۔ کہ وہ معتبر

تاریخی شہادتوں کی رو سے پہلے سفید تھا۔ اور بعد میں سیاہ ہوگیا۔ اور یہ تغیر قوتِ جاذبہ کے وجود کی بین دلیل ہے۔ اور صفت کے متعلق یہ عرض ہے کہ جیاری بھی ایک صفت ہے مگر غیر مرئی صفت کو بعض پتھر جذب کرنے میں بڑا کمال رکھتے ہیں۔ مثلاً سنگِ یشپ اختلاجِ قلب اور خفقان کے لئے کہ صفات غیر مرئیہ ہیں۔ بقول اطباء نہایت نافع ہے۔ اور آدمیوں کے مابین عداوت پیدا کرنے لئے بحر الکلب کو استعمال کیا جاتا ہے۔ اور اسی طرح عقیق، الماس وغیرہ بھی اپنی مخصوص قوتوں کی وجہ سے بعض بیماریوں کے ازالہ یا جذب کے لئے نہایت مجرب علاج تسلیم کئے گئے ہیں۔ تو سب جسمانی بیماریوں کا انجذاب پتھروں کے ذریعے ہر ذی عقل تسلیم کرلیتا ہے۔ تو پھر روحانی امراض کے انجذاب کو تسلیم کرلینے میں کیا حجت ہوسکتی ہے۔

اور پتھر کی سفیدی کا سیاہی میں تبدیل ہوجانیکی وجہ یہ ہے کہ جب انسان پاک ہوتا ہے اور نورِ الٰہی سے اس خاکی جسم کو منور کرلیتا ہے تو اس پر حقائقِ کونیہ کا انکشاف ہونے لگتا ہے۔ تو وہ اس نورِ باطن کی وجہ سے وہ کچھ دیکھتا ہے کہ جس کا تعلق دید سے ہے نہ کہ شنید سے۔

پر سید یکے کہ عاشقی چیست
گفتم چوما شوی بدانی

ترجمہ: کسی نے پوچھا کہ عاشقی کیا چیز ہے تو میں نے اس کو کہا کہ تیرا حال مجھ جیسا ہوجائے گا تو پھر تمہیں عشق کی حقیقت کا پتہ چل جائے گا۔

مگر جب وہ شخص اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کی حدود کو توڑتا ہے تو یہ نور بتدریج کم ہوتے ہوتے ختم ہوجاتا ہے۔ جس طرح ظلمتِ امتیاز اشیاء میں مانع ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ بھی نیک و بد اور اچھے اور برے میں تمیز نہیں کرسکتا۔ تو گویا اس کی حالت بعینہٖ اسی انسان کی سی ہوجاتی ہے۔ جو اندھیری رات میں منزلِ مقصود کو جاتے ہوئے بھٹک رہا ہو۔ اس کے علاوہ نور کی مدمقابل اور ضد کامل ظلمت ہے کیونکہ باقی رنگ نور یا سفیدی کے پورے پورے ضد نہیں۔ اس لئے گناہوں کو سیاہی کے رنگ میں ظاہر کرنا ہی انسب و اعلیٰ تھا۔

تو مطلب یہ بیان ہورہا تھا۔ کہ حجر اسود کا خانہ کعبہ میں نصب کیا جانا تورات و زبور کی پیشینگوئیوں کے

ساتھ عملی پیشنگوئی تھی۔ اور پھر حضور ﷺ کا اپنے آپ کو قصرِ نبوت کی آخری اینٹ فرمانا اور اللہ جل شانہ کا آپ کو خاتم النبیین سے یاد فرمانا۔ سرورِ عالم ﷺ کے آخر الانبیا ہونے پر آفتاب سے زیادہ روشن دلیلیں ہیں مگر ؎

گرنہ بیند بروز شب پرہ چشم
چشمۂ آفتاب راچہ گناہ

ترجمہ: اگر چمگادڑ دن کے وقت سورج کو نہ دیکھ سکے تو اس میں چشمۂ آفتاب یعنی سورج کی ٹکیہ کا کیا گناہ ہے۔

اَلنَّبِیّن کا الف لام عہدِ ذہنی نہیں بلکہ استغراقی ہے:

بعض نے اگرچہ خاتم کے معنوں میں تو کوئی انکار نہ کیا مگر النبیین کے الف لام کو عہدِ ذہنی قرار دے کر یوں معنی کئے کہ! آپ اپنے پہلے انبیاء یا معہودہ پیغمبروں کے خاتم ہیں۔ البتہ آپ کے بعد اگر کوئی نبی آپ کے رنگ میں رنگا ہوا اور اتباعاً اور بروزاً آپ سے نبوت حاصل کر کے آئے تو اس سے اس کی نفی ثابت نہیں ہوتی۔

مگر وہ اتنا خیال نہیں کرتے کہ پھر حضور ﷺ کے لئے خاتم النبیین ہونا کونسی خصوصیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ پھر تو حضرت آدم علیہ السلام کے سوا سب پیغمبر خاتم النبیین ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک پہلوں کے بعد آیا اور پچھلوں کا آنا ختمِ نبوت کے منافی نہیں۔ اس سے تو ختمِ نبوت کا وہ مہتم بالشان مرتبہ کہ جسے قرآن پاک نے حضور ﷺ کی انتہائی فضیلت قرار دے کر بیان کیا ہے کہ آپ کے لئے کوئی امتیازی چیز نہیں رہتی۔ اور حضور ﷺ کا اپنے متعلق ”ختم بی النبیون“ فرمانا بالکل بے معنی ہو جاتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ النبیین کا الف لام عہدِ ذہنی نہیں بلکہ استغراقی ہے۔ اب حضور ﷺ پر سلسلۂ نبوت کو ختم کر دیا گیا ہے اور آپ کے ساتھ قصرِ نبوت کو مکمل فرما کر ”اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ“ کا تمام دنیا میں اعلان کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا اب کمال کے بعد ”یوحیٰ الیہ“ کی مکمل ضرورت سمجھنا اعلانِ خداوندی کی تکذیب نہیں تو اور کیا ہے؟

دیکھئے بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ بیان یہ ہو رہا تھا کہ سب انبیا علیہم السلام کا دین اسلام ہی تھا۔ ہاں ان کی شریعتیں ضرور آپس میں مختلف تھیں۔ پھر شریعت اور دین کا فرق بیان کرتے کرتے ختمِ نبوت کی

طرف چلے آئے۔ تو اب پھر اصلی مطلب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ یعنی اسلام تمام پیغمبروں کا مذہب رہا ہے۔ اور وہی مذہب جو آدم، نوح، ابراہیم علیہم السلام اور موسیٰ علیہ السلام کا تھا، شریعتوں کا چولہ بدلتے بدلتے حضرت محمد رسول اللہ کی ذاتِ گرامی تک پہنچا۔

اسی واسطے قرآنِ پاک اسلام کو کسی جگہ دینِ محمدی یا جدید مذہب نہیں کہتا بلکہ وہ تو بار بار صاف اور صریح اعلان فرماتا ہے!

”شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَ عِيْسٰى ۔۔۔ الخ۔ (الشوریٰ: ۱۳)

یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے دین کا وہی راستہ مقرر فرمایا جس کا حکم نوح علیہ السلام کو دیا جو ہم نے تیری طرف وحی کیا۔ اور جس کا ہم نے ابرہیم اور موسیٰ اور عیسیٰ کو حکم دیا۔

اسلام دینِ فطرت ہے:

اسلام کا لفظ ہی ظاہر کرتا ہے۔ کہ یہی وہ مذہب ہے جو انسان کی فطرت کے مطابق اور خالقِ فطرت کا بھیجا ہوا ہے۔ کیونکہ اسلام لغت میں کہتے ہیں۔ اطاعت کو، فرمانبرداری اور تسلیم کو۔ تو گویا اسلام وہ مذہب ہے۔ جو بندے میں اپنے معبود کی فرمانبرداری اور اطاعت کے مادہ کو پورا پورا پیدا کر دیتا ہے۔ اور اسی معنی کی جامعیت اور وسعت کے باعث اللہ تعالیٰ اسے دینِ فطرت کے مقدس لقب سے یاد فرماتے ہیں۔ ارشاد ہوتا ہے!

فَاَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّيْنِ حَنِيْفًا ؕ فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ؕ لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ الدِّيْنُ الْقَيِّمُ ۙ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۙ ○۔ (الروم: ۳۰)

پس قائم کر اپنی توجہ کو دینِ حنیف کے لئے اور یہ دین رب العزت کی وہ فطرت ہے جس پر اس نے تمام انسانوں کو پیدا کیا۔ خدا کی تخلیق میں کچھ ردوبدل نہیں ہوسکتا اور وہ فطرت کیا ہے یہی دینِ قیم ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں!

”مَا مِنْ مَوْلُودٍ يُولَدُ اِلا عَلَى فِطْرَةِ الاِسْلامِ ، حَتّٰى يُعْرِبَ فَاَبَوَاهُ يُهَوِّدَانِهِ ، اَوْ يُنَصِّرَانِهِ ، اَوْ يُمَجِّسَانِهِ ۔

(معجم الکبیر: ج۱، رقم: ۸۲۷، مکتبۃ ابن تیمیہ قاہرہ)

کہ کوئی بچہ ایسا نہیں جو اسلامی فطرت پر پیدا نہ ہو۔ یعنی اگر وہ باہر کے اثر سے بچا رہے اور غیروں کا اثر اس پر نہ پڑے تو وہ فطرتاً اور طبعاً اسلامی قوانین کی طرف مائل ہوگا۔ مگر والدین کے اثر سے وہ کبھی یہودی ہو جاتا ہے اور کبھی مجوسی یا عیسائی۔

اور اس طرح فطرتی میلان خارجی اثرات میں دب کر رہ جاتا ہے۔ تو گویا اسلام ہر انسان کا فطرتی مذہب ہے۔ اس واسطے اسے کسی انسانی ہستی کی طرف منسوب نہیں کر سکتے۔ جیسا کہ عام طور پر دوسرے مذاہب میں کیا جاتا ہے کیونکہ ان کے موجودہ مذہب واقعی انسانی اختراع و ایجاد معلوم ہوتے ہیں۔ اور ان کی محدود نامکمل تعلیمات صاف ظاہر کرتی ہیں۔ کہ یہ مذہب نہ جامع ہے کہ تمام دنیا کا مذہب کہلایا جاسکے۔ اور نہ قدیم حالت پر قائم ہے کہ اس کا نام اسلام کی طرح اپنے اندر آسمانی مذہب جیسی وسعت اور کشادگی رکھے۔ اس واسطے قدامت کی نفی اور حدوث کے ثبوت کیلئے ان کے کسی تاریخی نام سے منسوب کرنا ہی زیادہ مناسب ہے۔

اسلام کیوں صراطِ مستقیم ہے:

اب بحث یہ رہ جاتی ہے کہ اسلام ہی صرف صراطِ مستقیم کیوں ہے۔ دوسرے مذاہب صراطِ مستقیم کہلائے جانے کے کیوں قابل نہیں؟

اس کا مختصر جواب تو یہ ہے۔ کہ جیسا دو نقطوں کے درمیان سیدھے سے سیدھا خط ایک ہی ہوتا ہے۔ اسی طرح عبد و معبود کے دو نقطوں کو ملانے والا خط بھی ایک ہی ہے۔ اب وہ خط اتنا قدیم اور پرانا ہونا چاہئے۔ جیسا کہ نوعِ انسانی کا وجود قدیمی ہے اور یہ اس سے پہلے بیان کر چکا ہوں۔ کہ اسلام ہی اس شرط پر پورا اترتا ہے اور بس۔ اس کی تعلیم کی جامعیت۔ اس کے نام کی وسعت۔ اس کے تعلقات کا قدم سب چیزیں اسے ہی عبد و معبود کے درمیانی خط ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔ اور جب یہ سب خطوں سے قدیم ہے تو قدیم تو وہی ہوسکتا

ہے۔ جونقاط کے تقابل ہوتے ہی پیدا ہوجاتا ہے۔

کیونکہ دوسرے تو بعد کی پیدائش ہوتے ہیں۔ اس لئے اسلام کا خطِ مستقیم یا صراطِ مستقیم ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ اور دوسرے خطوط یا مذاہب کے عدمِ قدم اور حدوث کے متعلق تو عرض کر ہی چکا ہوں کہ ان کے نام مثلاً یہودی، نصرانی، بدھ، ہندو، جین وغیرہ صاف کہہ رہے ہیں کہ ہم اس نام یا مقام کے پہلے دنیا میں موجود نہ تھے۔ اور ان ناموں یا مقاموں کا حادث ہونا تو ظاہر ہے۔

لہٰذا ان کی طرف منسوب دینوں کا حادث ہونا بھی ظاہر ہوجاتا ہے۔ اور جب حادث ہوئے تو معلوم ہوا کہ ان میں سے ایک بھی خط ایسا خط نہیں کہ جو عبد و معبود کے نقاط کے متقابل ہوتے ہی پیدا ہوا ہو۔ اور جب ایسا نہ ہوا تو پھر خطِ مستقیم بھی نہ رہا، بلکہ منحنی ہوگیا۔

اسلام کے صراطِ مستقیم ہونے کی واضح تفصیل:

اور مفصل جواب یہ ہے کہ صراطِ مستقیم وہی مذہب ہوسکتا ہے جو حدِ اعتدال پر قائم ہو نہ افراط پر نہ تفریط پر۔ نہ کمی نہ زیادتی۔ بلکہ اس کا ہر ایک قانون عدل وعقل کے ترازو پر بالکل جچا تلا ہوا ہو۔ اور وہ میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جو اگر ایک طرف عقل کی سب ضروریات پوری کرتا ہے۔ تو دوسری طرف افراط وتفریط کے عین بیچوں بیچ عدل وانصاف کے صراطِ مستقیم پر چلنے کی تلقین کرتا ہے۔ مگر دوسرے مذاہب صراطِ مستقیم سے کوسوں دور ہیں۔ اور ان پر چلنے والا۔

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی
کہیں راہ تو میروی بترکستان است

ترجمہ: اے بدو مجھے ڈر ہے کہ تو کعبہ نہ پہنچ پائے گا کیونکہ جو راستہ تو نے اختیار کر رکھا ہے وہ کعبہ کی بجائے ترکستان جا رہا ہے۔

کے شعر کے مصداق ہے۔

اسلام نے کس طرح ہر چیز اور قانون میں حدِ اعتدال کو قائم رکھا۔ اور دوسرے مذاہب نے کس طرح تجاوز کیا۔ اس کا مختصر ذکر بھی کر دیتا ہوں تاکہ میرا یہ دعویٰ کہ اسلام صراطِ مستقیم ہے بلا دلیل نہ رہ جائے۔

صراطِ مستقیم کو خاص رکھتے ہوئے تشریح:

اھدنا الصراط المستقیم کی دو حالتیں ہیں ایک خاص، دوسری عام۔ خاص یہ ہے کہ مصلی اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو کر الحمدللہ رب العٰلمین کہتا ہے۔ اس میں مصلی نے اللہ تعالیٰ کے لیے دو چیزیں ثابت کیں۔ ایک تو ذاتِ باری کے وجود کو مانا۔ دوسرے اس کے لئے صفاتِ محمودہ کو ثابت کیا۔ اس کے بعد ’’الرحمٰن الرحیم ‘‘میں اس نے ذاتِ بابرکات کے لئے رحمانیت و رحیمیت کی صفات کو بیان کیا۔ اب اس کے بعد اللہ جل شانہٗ کی ’’مالكِ یوم الدین ‘‘ تعریف بیان کی اس میں صفت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے عادلانہ افعال کی طرف بھی اشارہ کیا۔ وہ بڑا عدل و انصاف کرنے والا ہے۔

اب اس کے بعد ایاك نعبد اس کے لئے عبادت کو مختص کیا۔ اور پھر سب کے بعد **ایاک نستعین** کہہ کے عبادت کی طرح استعانت کو بھی ذاتِ باری کے ساتھ خاص کر دیا۔ گویا مصلی نے یہاں تک پانچ چیزوں کا اقرار کیا۔ اول ذاتِ باری کا۔ دوم صفاتِ باری کا۔ سوم افعالِ باری کا۔ چہارم عبادت کا۔ اور پنجم استعانت کا۔ اب ان پانچوں کے اقرار و اعتقاد کے بعد مصلی دربارِ ربی میں التجا کرتا ہے۔ کہ اے مالک مجھے ان اعتقادات، عبادات اور مطلوبات میں صراطِ مستقیم کی ہدایت فرمائیں۔ ایسا نہ ہو کہ میں ان باتوں میں صراطِ مستقیم سے منحرف ہو کر کہیں افراط و تفریط کی ہولناک خندقوں میں گر کر ہلاک نہ ہو جاؤں۔ میں جو آپ کی ذات، صفات اور افعال کے متعلق اعتقاد رکھتا ہوں۔ ان میں اعتدال، صحت اور میانہ روی عطا فرمائیں۔ پھر جو عبادت کرتا ہوں وہ بھی صراطِ مستقیم کی مد میں داخل ہو اور استعانت کے معاملے میں بھی میرا قدم صحیح رستے سے نہ ڈگمگائے۔

اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور افعال کے اعتقاد کے متعلق صراطِ مستقیم:

اب یہ سمجھنا چاہئے کہ ذات، صفات اور افعال ’’معبود‘‘ میں اور عبادت و استعانت ’’عبد‘‘ میں افراط و تفریط کس طرح ہو جاتی ہے۔ اور اسلام ان کے درمیان کون کون سے بین بین رستے کی ہدایت کرتا ہے۔ مثلاً بعض گروہ ایسے ہیں کہ وہ باری تعالیٰ کے وجود کے تو مقر ہیں۔ مگر رات دن اس کی ذات میں بے جا تفکر اور

تصور دوڑانے میں مشغول ہیں۔ اور اس کی کنہ و ماہیت کے دریافت کرنے میں سرگرداں نظر آتے ہیں۔ اور یہ افراط ہے مگر اسلام نے ایک طرف تو لاالہ الااللہ کی تعلیم دے کر ذاتِ باری کے ماننے کے متعلق ہدایت فرمائی۔ اور دوسری طرف ''لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ'' ارشاد فرما کر ذاتِ باری میں بے جا تفکر کرنے سے منع کر دیا۔ کیونکہ جب اس جیسی کوئی چیز ہی نہ ہوئی اور ہمارا ادراک اور عقل تو انہی محسوسات سے نتیجہ اخذ کر سکتا ہے۔ تو پھر بے مثال کا تصور کیا کر سکے گا۔ اب صفات میں بعض نے تنزیہہ کے خیالِ صفات کی بالکل نفی کر دی۔ مثلاً جن آیتوں یا حدیثوں میں اللہ تعالیٰ کے لئے منہ، ہاتھ، پاؤں اور پنڈلی وغیرہ ثابت ہوتی ہے تو انہوں نے ان الفاظ کے معنوں میں تاویلیں کر دیں۔ مثلاً منہ سے مراد ذاتِ الٰہی لے لی۔ ہاتھ سے مراد قبضہ اور قدرت لی۔ اس اس تاویلِ ضرورت میں ''لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ'' کو بطور دلیل پیش کیا۔ دوسرا گروہ ان صفات کے لفظی معنوں اللہ تعالیٰ پر منطبق کرتا ہے اور کہتا ہے کہ ہاتھ، منہ، پاؤں وغیرہ جو الفاظ آیتوں یا حدیثوں میں آئے ہیں۔ ان مراد ویسے ہی ہاتھ منہ وغیرہ ہے۔ انہیں کسی قسم کی تاویل نہیں کرنی چاہئے۔ اور وہ دلیل میں انہی الفاظ کو لغوی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ تو یہ دونوں گروہ افراط و تفریط کے مرضوں میں مبتلا ہیں۔

صراطِ مستقیم یا اسلام یہ سکھاتا ہے کہ تم ان صفاتِ خداوندی پر ایمان لاؤ۔ مگر ان کی حقیقت کو خدا کے سپرد کر دو۔ ہماری جوابدہی اتنی ہے کہ ہم نے ایمان لایا۔

جیسے آیات متشابہ کے متعلق قرآن پاک میں ارشاد ہے!

''فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِہِمْ زَیْغٌ فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشٰبَہَ مِنْہُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَۃِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِہٖ ۚ وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَہٗۤ اِلَّا اللّٰہُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِہٖ ۙ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّاۤ اُولُوا الْاَلْبَابِ ○۔ (آلِ عمران: ۷)

پس جن کے دلوں میں کجی ہے وہ اس کی متشابہ آیتوں کے پیچھے لگ جاتے ہیں فتنے طلب اور ان کی مراد کی جستجو کے لیے حالانکہ ان کی حقیقی مراد کو اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں جانتا اور پختہ اور مضبوط علم والے یہی کہتے ہیں کہ ہم تو ان پر ایمان لا چکے ہیں یہ ہمارے رب کی طرف سے ہیں اور نصیحت تو صرف عقلمند حاصل کرتے

ہیں۔

دیکھئے یہاں تاویلیں کرنے والوں کو کجرو قرار دیا گیا ہے۔ تعریف انہیں کی کی گئی ہے جنہوں نے کہا:

"اٰمَنَّا بِهٖ ۙ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ"۔

کہ ہم ایمان لائے یہ سب ہمارے رب کی طرف سے ہے۔

تو یہاں پر بھی ایسے الفاظِ متشابہ پر ایمان لا کر ان کی کیفیت کو اللہ جل شانہٗ کے سپرد کر دینا ہی قابلِ تعریف کام ہے۔ اور افعالِ باری میں افراط وتفریط یہ ہے کہ بعض لوگ بندے کے سب افعال کو اللہ کے افعال سمجھتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ بندے کو اپنے کاموں میں کچھ اختیار نہیں۔ بلکہ اس کے سب کام ایک مرتعش کی حرکت سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ اور اس طرح گویا بندہ کو ایک پتھر اور جماد کی طرح بے اختیار قرار دے کر سزا وجزا، جہنم وجنت اور اوامر ونواہی کو بالکل بے کار قرار دیتے ہیں۔ ان کے مقابل میں دوسرا گروہ اللہ کے افعال کو بندے میں بالکل دخیل ہی نہیں سمجھتا۔ اور وہ انسان کو اس کے کاموں میں مختارِ مطلق سمجھتا ہے۔ اور اس طرح وہ مسئلہ تقدیر کا انکار کرتا ہے۔ مگر اسلام ان کے درمیانی رستے کی تلقین کرتا ہے۔ وہ اللہ جل شانہٗ کو خالقِ افعال اور انسان کو کاسبِ افعال ٹھہراتا ہے۔ وہ انسان کو نہ تو مجبورِ محض قرار دیتا ہے اور نہ مختارِ مطلق۔ بلکہ انسان کو "الصراط بین الجبر و القدر" کی رہنمائی کرتا ہے۔

اب عبادت میں افراط یہ ہے کہ جہاں کہیں خدا کی کسی صفت کا ظہور دیکھا۔ اور وہاں ہی اس کے آگے سربسجود ہو گیا۔ جیسے بعض فرقے، آگ، درخت، سانپ اور پتھر وغیرہ کو پوج رہے ہیں۔ اور تفریط یہ ہے کہ دنیا کے کاموں میں ایسا مشغول ہو جائے۔ کہ اس خالق و مالک کو بالکل ہی بھول جائے۔ جیسا کہ آج کل دنیا پرست اور زر مرید قومیں کر رہی ہیں۔ اعتدال یہ ہے کہ دنیا کے کام بھی کرے۔ کیونکہ حضور ﷺ کا فرمان ہے!

"لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْاِسْلَامِ۔

(المبسوط للسرخسی: ج، ۴، کتاب النکاح، دار المعرفۃ بیروت)

کہ اسلام میں رہبانیت نہیں۔

کمائے، کھائے پیئے ، اور دنیا کے طیبات سے متمتع بھی ہو۔ مگر رب العزت کو کسی حال یا وقت میں نہ بھولے۔ اس کے حبیب کے لائے ہوئے فرامین اور قوانین کی اتباع کرے۔ اور دنیا ومافیہا کو اپنا خادم سمجھ کر ان سے خادموں کی حیثیت کا سلوک رکھے۔ اب رہی استعانت۔ تو اس میں افراط یہ ہے کہ کہیں ستاروں کی نحوست وسعادت سے امدادِ طلب کرے کہیں سورج ومہتاب کو قاضی الحاجات سمجھ کر سوال کرے۔ اور تفریط یہ ہے کہ دوا اور غذا وغیرہ تک سے مدد حاصل نہ کرے۔ نہ خدا سے دعا کرے۔ اور نہ اسبابِ عادیہ کو استعمال کرے۔ بلکہ ان سب اشیاء کو فضول اور بیکار سمجھ بیٹھے۔ مگر اسلام نے ان دونوں کے درمیانی رستہ کی ہدایت فرمائی۔ کہ مدد اللہ جل شانہٗ سے مانگو۔ مگر اس کے پیدا کردہ ذرائع اور اسباب کو بھی استعمال کرو، کیونکہ ان کا توسل غیر اللہ سے استعانت نہیں۔ بلکہ وہ وسیلہ اور سبب خود اعانتِ خداوندی کا ایک مظہر ہے۔ اب اس جگہ تک تو اھدنا الصراط المستقیم کا بیان خاص صورت کے متعلق ہوا۔ کہ نمازی کی ''اھدنا'' کی التجا کو اس کے پہلے الفاظ کے ساتھ مختص کر دیا تھا۔ مگر اب ''اھدنا'' کی دعا کو عام حالات کے متعلق لے کر تھوڑا سا بیان کرتے ہیں۔

صراطِ مستقیم کو عام رکھتے ہوئے تشریح:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو مدنی الطبع بنایا ہے۔ وہ دوسرے ہم جنسوں کے ساتھ مل جل کر دنیا میں گزارہ کرتا ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ جہاں چند آدمی جمع ہوں گے۔ اختلافِ رائے، اختلافِ طبائع اور اختلافِ خواہشات کے باعث کسی نہ کسی وقت ان میں جھگڑا ہو جانے کا امکان ہے۔ اب اس نزاع کو دو طریقوں سے دور کیا جا سکتا ہے۔ ایک تو ظاہری سیاست سے کہ مظلوم کی مدد کی جائے۔ اور ظالم کو سزا دی جائے۔ اور ایسے قواعد اور قوانین بنائے جائیں۔ کہ جن کی پابندی سے کوئی انسان اپنی مقررہ حدود اور طاقتوں سے آگے نہ بڑھ سکے۔ مگر ایسے قواعد کا تعلق صرف ظاہر ہی سے ہو سکتا ہے۔

مثلاً ایک شخص نے ظاہراً کسی کا مال چرایا۔ تو چور کو سیاسی حکام اپنے قاعدے کے مطابق سزا دے سکتے ہیں۔ لیکن اگر وہ کسی ایسے طریقے سے چوری کرتا ہے۔ کہ حکامِ وقت اس کا سراغ لگانے سے عاجز ہو جاتے ہیں۔ اس لئے کسی دوسرے ایسے قانون کی بھی ضرورت باقی رہتی ہے۔ جو انسان کے اندر کو تبدیل کر کے اس کے دل کو پورا پورا ظاہری قوانین کا پابند بنا سکے۔ کیونکہ جب کسی انسان کا اندر تبدیل ہو جاتا ہے۔ تو وہ

خفیہ اور اعلانیہ دونوں جرائم سے خود بخود رک جاتا ہے۔ جیسے حضور ﷺ کی خدمت میں ایک شخص حاضر ہوا۔ جس میں دنیا کے سب قبائح موجود تھے۔ جب اسلام لایا تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اب جاہلیت کے کام مثل۔ زنا، شراب، جھوٹ، دغابازی، فریب وغیرہ نہ کرنا۔ اس نے عرض کی حضور ﷺ یہ سب یکلخت نہیں چھوٹ سکتے۔ سرِ دست تو میں آپ کے ایک پسند کردہ کام سے توبہ کرسکتا ہوں۔ ہاں آئندہ آہستہ آہستہ سب برائیوں کو چھوڑ دوں گا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تو اسی پر مصر ہے تو میں تجھے ہدایت کرتا ہوں کہ آج سے جھوٹ بولنا چھوڑ دے۔ اس نے حضور ﷺ کی اس بات کو دل و جان سے منظور کرلیا۔ اور عرض کی کہ حضور ﷺ آج سے میں بالکل جھوٹ نہ بولوں گا۔ چنانچہ وہ یہ وعدہ کے کر حضور ﷺ پرنور کی خدمت سے اٹھ کر گھر آگیا۔ گھر آیا تو پھر اپنی پرانی عادتوں کے خیالات نے آگھیرا۔ دل نے کہا کہ آج کہیں سے کچھ بڑی چوری کرنی چاہئے۔ تاکہ شراب وکباب اور عیش وعشرت کی مجلس خوب گرم کی جائے۔ ارتکابِ جرم کے لئے تیار ہو کر اٹھا ہی تھا۔ کہ معاً دل میں خیال آیا کہ اگر کل حضور ﷺ نے اس چوری کے متعلق پوچھا تو کیا جواب دوں گا۔ جھوٹ تو بول نہیں سکتا۔ اور سچ بولوں گا تو مالکِ مکان میرے گرد ہو جائیگا۔ اور پھر اگر مال نہ ہو تو شراب وکباب کا انتظام بھی مشکل ہے۔ غرضیکہ ہزاروں ترکیبیں نفسِ لعین نے ارتکابِ معاصی کی سمجھائیں۔ مگر انجام کار حضور ﷺ کا وعدہ ان کا خاتمہ کردیتا۔ اور اس کا سب مکروفریب بیکار ہو جاتا۔

دیکھئے یہ اعرابی حضور ﷺ سے صرف ایک جھوٹ نہ بولنے کا پکا وعدہ کر کے ہر قسم کے ظاہری و باطنی گناہوں سے بچ گیا۔

انسان کا اندر تبدیل ہو جانے سے خفیہ اور ظاہری جرائم ختم ہو سکتے ہیں:

اسی طرح جب انسان کا اندر تبدیل ہو جائے۔ تو پھر یہ ظاہری احکام بھی اس کے لئے بیکار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ جب وہ خفیہ گناہ کرنا جرمِ عظیم سمجھتا ہے۔ تو پھر ظاہراً کس طرح جرم کا ارتکاب کر سکے گا۔ تو معلوم ہوا کہ سیاسی احکام سے بھی زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ انسانوں کے اندر کو تبدیل کر کے انکے باہمی تنازعات ومخاصمات کو مٹایا جائے۔

اندرونی تبدیلی کی ترکیب:

اندرونی تبدیلی کے متعلق بیان کرنے سے پہلے یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسان کے باہمی نزاع اور جھگڑے کن باتوں پر ہوا کرتے ہیں۔ اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہو جائے گا کہ ہر ایک انسان کو دنیا میں تین چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ سب سے پہلے غذا کی کہ جس سے وہ اپنا پیٹ بھر سکے۔ اس کے بعد لباس کی کہ جس سے وہ اپنے جسم کو ڈھانک سکے۔ اور تیسرے درجے پر اسے مکان کی ضرورت ہوتی ہے کہ جس سے وہ اپنے آپ کو سردی گرمی، مینہ اور برسات سے بچا سکے۔ اپنے آپ کو ہر قسم کے دشمنوں سے محفوظ رکھ سکے۔ اور اپنے غلہ و دیگر ضروریاتِ زندگی یعنی غذا، لباس اور مکان کے حاصل کرنے کیلئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو تین قوتیں عطا فرمائی ہیں۔ جن کی وجہ سے وہ ان تمام ضروریات کو پورا کر سکتا ہے۔ سب سے پہلی قوت کا نام شہوت ہے۔ شہوت کہتے ہیں خواہش کو۔ یہی خواہش انسان کو غذا، لباس اور مسکن کے حاصل کرنے کی رغبت دلاتی ہے۔ مگر یہ ظاہر ہے کہ صرف رغبت سے کام نہیں چل سکتا۔ بلکہ ان مرغوبات کو حاصل کرنے کا ذریعہ بھی ہونا چاہیے۔ اور ایسی تجویزیں سوچنے اور ایسے ذریعوں کے سمجھنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے انسان کو قوتِ عقلیہ عطا فرمائی ہے۔ مگر اب خواہش کے پورا ہو جانے کے بعد ایک تیسرا مرحلہ باقی رہ جاتا ہے۔ یعنی اس حاصل شدہ شے کی حفاظت۔ کیونکہ اگر اس کی حفاظت نہ کی جائے۔ تو وہ چیز تھوڑے ہی عرصہ میں فنا ہو جائے گی۔ اس واسطے یہ بھی ضروری ہے کہ انسان کو ایک ایسی قوت بھی دی جائے۔ جو قوتِ شہویہ کی مرغوبات اور قوتِ عقلیہ کی محصولات کو محفوظ رکھ سکے۔ اس قوت کا نام قوتِ غضبیہ ہے۔ تو معلوم ہوا کہ انسانوں کے باہمی نزاع، غذا، لباس اور مسکن سے تعلق رکھتے ہیں۔ اور غذا لباس اور مسکن کا تعلق قوتِ شہویہ۔ قوتِ عقلیہ اور قوتِ غضبیہ سے ہے۔ تو گویا اگر ان قوتوں کا صحیح اور ٹھیک استعمال کیا جائے۔ تو اس سے انسانوں کے باہمی نزاع کا قریب قریب خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اب ان قوتوں کی اصلاح کے متعلق کچھ عرض کرتا ہوں۔ تا کہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ ان کو کس طرح ان کے ٹھیک محل اور مقام پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اب اگرچہ ان میں سے ہر ایک قوت کے کثرت سے فروع ہیں۔ مگر فروعات کا بیان بہت طویل اور وقت طلب ہے۔ اس واسطے فروع کو چھوڑ کو سر دست انہیں

اصولی قوتوں کے متعلق بیان کرتا ہوں۔

اگر آپ غور کریں گے۔ تو ان بیان کی ہوئی قوتوں میں سے ہر ایک قوت کے استعمال کے لئے زیادہ سے زیادہ تین محل سمجھ میں آسکتے ہیں۔ یعنی یا تو اس کو ٹھیک محل پر استعمال کیا گیا ہے۔ یا محل سے بڑھا کر استعمال کیا گیا ہے۔ یا محل سے گھٹا کر۔ تو گویا ٹھیک محل بڑھانے اور گھٹانے کے درمیان رہا۔ یا دوسرے الفاظ میں افراط و تفریط کے درمیانی رستہ کا نام صراطِ مستقیم ہے۔

قوتِ شہویہ کے متعلق:

اب مثلاً قوتِ شہویہ کو لو۔ اس کی افراط یہ ہے کہ کھانے پینے، لباس وثیاب اور طعام ولذائذ کا ایسا دلدادہ بن جائے کہ حرام حلال، اپنے اور غیر، نجس اور طیب سب کے امتیازات کو ہی اٹھادے۔ اور رات دن ان چیزوں کی فکر میں ایسا منہمک رہے کہ

خواجہ رابیں کہ از سحر تا شام دازرد اندیشۂ شراب و طعام
شکم از خوش دلی وخوش حالی گاہ پر کند گہے خالی
فارغ از خلد و ایمن از دوزخ جائے او مزبلست یا مطبخ

ترجمہ: آج کے اس مادی انسان کو دیکھئے تو صبح شام بس کھانے پینے میں نظر آتا ہے۔ اپنی خوشحالی کے باعث اپنے پیٹ کو بھرتا ہے، پھر خالی کرتا ہے، پھر بھرتا ہے۔ یہ جنت سے بے نیاز اور دوزخ سے بے خبر ہے۔ اس کی جگہ یا باورچی خانہ ہے یا بیت الخلاء۔

اس افراط اور انہماک کا نام **فجور یا خلاعت** ہے۔ اور تفریط یہ ہے کہ حلال یعنی طیب اور بقائے نفس کیلئے ضروری خوراک و پوشاک کو بھی ترک کردے۔ جوگی اور راہب بن کر تمام لذائذ طیبہ طبیعہ سے منہ موڑ لے۔ اور یہ **درجہ خمود** کہلاتا ہے۔ فجور اور خمود کے درمیانی رستہ کا نام **عفت** ہے۔ یعنی نہ تو حیوانات کی طرح حرام و حلال کا امتیاز اٹھا کر خواہشات میں منہمک ہوجائے اور نہ ہی خدا کی حلال وطیب مرغوبات کو چھوڑ دے۔ بلکہ شہوت کی افراط و تفریط سے بچ کر وسطی رستہ کو اختیار کرے۔

چنانچہ اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے!

”قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط۔ (اعراف: ۳۲)

یعنی اے حبیب آپ کہہ دیجیے کہ کس نے اللہ کی زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لئے نکالی ہے۔ اور کھانے کی ستھری چیزوں کو حرام کیا۔

مگر آیت کے سرے پر خداوندی زینتوں اور طیب رزقوں کے استعمال کے لئے!

”وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا “(اعراف: ۳۱) لگادی گئی۔ یعنی کھاؤ، پیؤ مگر اسراف نہ کرو۔

عربی میں اسراف کا اطلاق افرط اور تفرط دونوں پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ تاویلات النجمیہ میں ہے:

”الاسراف نوعان۔ افراط و تفریط۔ فالا فراط مایکون فوق الحاجة الضرورية او على رفق الطبع والشهوة و على الغفلة او على ترك الادب اوغيرذلك۔ والتفريط ينقص من قدر الحاجة الضرورية۔ ويقصر فى حفظ القوة والطاقة للقيام بحق العبودية۔ الخ۔

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ اسراف دو قسم کی ہے۔ ایک افراط اور دوسرے تفریط۔ غرضیکہ دونوں قسموں کو اسراف میں داخل کیا گیا ہے۔

نکتہ: کسی کتاب میں نظر سے گزرا کہ ایک نصرانی ڈاکٹر ہارون الرشید کے دربار میں ملازم تھا۔ ایک دن اس نے ایک مسلمان عالم سے کہا۔ کہ دنیا میں دو علم ہوتے ہیں۔ علم الادیان و علم الابدان۔ میں مانتا ہوں کہ پیغمبرِ عربی نے علم الادیان کے متعلق تو ایک جامع مانع کتاب اُمت کے لئے چھوڑی ہے، مگر افسوس کہ علم الابدان کے متعلق نہ تو آپ لوگوں کو کچھ واقفیت ہے اور نہ ہی آپ کے نبی اور کتاب نے اتنے بڑے مسئلہ کے متعلق کچھ بیان کیا۔ انہوں نے فرمایا کہ اے طبیب! چونکہ تو ہمارے قرآن اور ہمارے نبی آخر الزمان کے اقوال سے واقف نہیں۔ اس لئے تجھے یہ غلطی لگی ہے ورنہ قرآن و حدیث سے واقف شخص ایسا کبھی بھی اعتراض نہیں کرتا۔ طبیب نے حیرت زدہ ہو کر پوچھا کہ کیا آپ کا قرآن علمِ طب سے متعلق کچھ کہتا ہے۔ اگر کہتا ہے تو آپ پیش کر دیں۔ آپ نے فرمایا۔ قرآنِ پاک نے تمہارے تمام علمِ طب کو صرف نصف آیت میں بیان کر دیا ہے۔ اور وہ ”وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا تُسْرِفُوْا“ ہے۔ اور اسراف کی حقیقت جب افراط و تفریط کے پہلوؤں کو بیان کر کے سمجھائی تو نصرانی طبیب حواس باختہ ہو گیا۔ پھر انہوں

نے فرمایا کہ اے طبیب۔ اب ہمارے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان سن۔ اور دیکھ کہ آپ نے بھی کس طرح تمام علمِ طب کو چند الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں!

”اَلْمَعِدَةُ بَیْتُ الدَّاءِ، وَالْحِمْیَةُ رَأْسُ کُلِّ دَوَاءٍ۔

(مقاصد الحسنة: ج ۱، کتاب الجنائز والفتحته بالطب، دار الکتاب العربی بیروت)

یعنی معدہ تمام بیماریوں کا گھر ہے۔ اور پرہیز سب دواؤں کا سرتاج ہے۔

اس پر نصرانی کو اقرار کرنا پڑا کہ واقعی تمہارے اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تمام طب کا خلاصہ چند الفاظ میں اس طرح بیان کر دیا ہے کہ جس پر عمل کرنے سے نہ تو جالینوس کے نسخوں کی ضرورت رہتی ہے اور نہ بقراط کی کاوشوں کی۔

تو اب غور کرو کہ اسلام نے کس طرح قوت شہوی کے درمیانی اور صحیح رستہ کو بیان فرمایا کہ جس پر عمل کرنے سے اس قوت کی کسی فرع میں جھگڑے کا امکان نہیں رہتا۔

قوتِ عقلیہ کے متعلق:

اب اس کے بعد قوتِ عقلیہ ہے۔ قوتِ عقلیہ میں بھی قوتِ شہویہ کی طرح تین صورتیں ہیں۔ افراط، تفریط اور اعتدال۔ قوتِ عقلیہ میں افراط تو یہ ہے کہ مرغوبات کے حاصل کرنے میں جائز اور ناجائز ذریعوں میں تمیز نہ کرے۔ نہ عزت کا لحاظ ہو نہ غیرت کا۔ مکر سے فریب سے، دھوکے سے بے ایمانی سے جس طرح بھی بن پڑے۔ قوتِ شہویہ کی خواہش کو پورا کرے۔ اور اسے علمِ اخلاق کی اصطلاح میں **جربزہ** کہتے ہیں۔ اور تفریط یہ ہے کہ انسان قوتِ شہویہ کے مرغوبات کو حاصل کرنے کے جائز طریقوں پر بھی غور نہ کرے۔ اور اپنے آپ کو اور اپنی تجویزوں کو جبریوں کی طرح مجبور اور معذور سمجھے۔ اور اصطلاحی الفاظ میں اس کو **غباوت** یا **بلاوت** کہا جاتا ہے۔ مگر اسلام جربزہ اور غباوت کے درمیانی رستہ کی تلقین کرتا ہے۔ جس کا نام **حکمت** ہے۔ اس میں نہ افراط ہے نہ تفریط۔ نہ جبرِ محض ہے نہ اختیارِ کل۔ بلکہ اسلام کہتا ہے کہ قوتِ شہویہ کی جائز مرغوبات کو حاصل کرنے کی بیشک تدابیر عمل میں لاؤ۔ اور تدبیر کرتے وقت عقل کو شرعی اور مذہبی حدود کا پابند رکھتے ہو

ئے کام لو۔ تاکہ افراط وتفریط کے دونوں مذموم پہلوؤں سے بچے رہو۔ اور قوتِ عقلیہ کی نالائق اولادِ سفہ، ریا، نمیمہ، تبذل، حمق، کذب، جھل، مکر، خبث اور بلاوت وغیرہ تم میں کسی قسم کا فساد نہ پھیلا سکیں۔

قوتِ غضبیہ کے متعلق:

اب رہی قوتِ غضبیہ۔ جو عقلیہ کے مجوزہ محصولات کو محفوظ رکھنے کا کام دیتی ہے۔ اس میں افراط تو یہ ہے کہ انسان ان اشیاء کی حفاظت میں مصلحتِ وقت موقعہ اور مقام کو نہ پہچانے بلکہ جا و بے جا اپنے غصے اور غضب کا اظہار کرے۔ کبھی درندوں کی طرح اپنے مطالب کی حفاظت میں اپنے ابنائے جنس کو پھاڑنے کے لئے دوڑے۔ اور کبھی ایک سے بدلہ لینے کی بجائے ہزاروں کا خون کر دے۔ کبھی صرف ناک کاٹنے کے استحقاق میں گردن اڑا دے۔ اور کبھی ایک پیسے کے انتقام کے لئے گھر لوٹ لے۔ اخلاقی اصطلاح میں اس کو **تھور** اور بعض دفعہ **ظلم** بھی کہتے ہیں۔ اور تفریط یہ ہے کہ غیرت اور بہادری کے مقام پر نامردی اور بزدلی دکھائے اور باوجود طاقتِ دفاع کے مفسدین کے ظلم وستم کا ایسا تختۂ مشق بن جائے کہ عزت وناموس تک خطرہ میں پڑ جائے۔ اور اس تفریط کا نام **جبن** ہے۔ مگر اسلام نے اس افراط وتفریط کے درمیانی رستہ کی تلقین فرمائی ہے۔ حکم ہوتا ہے۔

’’وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْكُمْ اِلَى التَّهْلُكَةِ ۛ صلے۔ (البقرۃ: ۱۹۵)

یعنی اپنی جانوں کو اپنے ہاتھوں سے ہلاکت میں مت ڈالو۔

بلکہ موقع و مصلحت کا خیال رکھو۔ بعض دفعہ مصلحت کے لحاظ سے قرار سے فرار مفید ہوتا ہے۔ اسی واسطے عرب کہتے ہیں۔ ’’الفرار فی وقتہ ظفر ‘‘یعنی موقع کے لحاظ سے بھاگنا بھی فتح مندی ہے۔

پھر قوتِ غضبیہ کے جوش کو روکنے کے لئے فرمایا!

’’اَنَّ النَّفْسَ بِالنَّفْسِ ۙ وَالْعَیْنَ بِالْعَیْنِ وَ الْاَنْفَ بِالْاَنْفِ وَالْاُذُنَ بِالْاُذُنِ وَالسِّنَّ بِالسِّنِّ ۙ وَالْجُرُوْحَ قِصَاصٌ ؕ فَمَنْ تَصَدَّقَ بِهٖ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهٗ ؕ۔ (المائدہ: ۴۵)

کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخموں میں بھی بدلہ ہے۔ اور پھر جو شخص اس بدلہ لینے کو معاف کر دے۔ تو یہ عفو اس کے

گناہوں کا کفارہ ہو جائے۔

تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کوئی شخص بدلہ لینے میں حد سے گزر کر قوتِ غضبیہ کی خندقِ افراط میں جا گرے اور یہی حکم قوتِ غضبیہ کے جانب تفریط سے بھی روکتا ہے کیونکہ جب انتقام لیا تو جبن نہ رہا۔ اور معاف کیا تو بھی جبن نہ ہوا۔ کیونکہ عفو یہ ہے کہ انتقام پر قادر ہونے کے باوجود بدلہ نہ لینا اور اگر بدلہ کی طاقت ہی نہیں اور یہ اسے معاف کرتا ہے۔ تو یہ عفو نہیں بلکہ مظلومیت ورنہ جبن کہلائیگا۔ اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی اندھا کہے کہ میں تو کسی غیر محرم پر نظر ہی نہیں ڈالتا کیونکہ یہ غضِ بصر نہیں بلکہ عجزِ بصر ہے۔

تو معلوم ہوا کہ اسلام نہ تو تہور کی اجازت دیتا ہے اور نہ جبن کو پسند کرتا ہے۔ بلکہ ان دونوں کے درمیانی رستہ **شجاعت** پر چلنے کی تلقین کرتا ہے۔ جس کے وقار، صیانتہ، انتظام، حریت، صبر، ورع، سخاوت، قناعت وغیرہ تمام فروع ہیں۔ تو خلاصہ تقریر یہ نکلا کہ صراطِ مستقیم کو انسان کے عام حالات سے متعلق رکھ کے اللہ جل شانہٗ سے ہدایت کا سوال کرنا گویا عفت، حکمت اور شجاعت کو بمع ان کے فروع کے دیے جانے کی التجا کرنا ہے۔ ان قوتوں کے مجموعہ کا نام **عدل** ہے اسی کو اللہ جل شانہٗ نے! ''اِعْدِلُوْا ۣ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ۫''

(المائدہ: ٨) میں بیان فرمایا ہے۔

یعنی اے لوگو قوتِ شہویہ، غضبیہ اور عقلیہ کو حدِ اعتدال پر لا کر صفتِ عدالت کو پیدا کرو۔ کیونکہ یہی صفتِ تقویٰ کے قریب تر ہے اور اسی کی حکومت میں اخلاقِ ذمیمہ کا نشوونما بمشکل ہو سکتا ہے۔ تو گویا مصلی نے دعا کی کہ اے اللہ آپ ہمیں صفتِ عدالت کی رہنمائی فرمائیں۔ تا کہ دنیا کی بے چینیوں اور خرخشوں سے نجات ملے۔

مصلی نے اھدنی کی جگہ اھدنا کیوں کہا:

نمازی نے یہاں اھدنی کہہ کر صرف اپنے لئے ہدایت کی دعا نہ مانگی بلکہ یوں کہا کہ اھدنا یعنی ہم سب کو ہدایت دیجئے اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر اسے صرف اکیلے ہی ہدایت دی جائے۔ اور باقی سب گمراہی میں رہیں تو اس مہتدی کیلئے نہایت مشکل ہوگی کیونکہ اگر یہ ان باقی گمراہوں کی موافقت کریگا تو کتمانِ حق کے ساتھ ساتھ اپنے آپکو ہلاکت میں ڈالدیگا۔ اور اگر ان کی مخالفت کرے گا تو تمسخر و استہزاء کا نشانہ بن جائیگا اور تعجب نہیں کہ لوگوں کے ہاتھوں بدنی اور مالی آزمائشوں کا بھی نشانہ بن جائے۔

اھدنا کے متعلق ایک حکایت:

لکھتے ہیں کہ ایک بادشاہ اور وزیر اپنی رعیت سے بہت تنگ آ گئے کیونکہ رعیت جاہل اور ان پڑھ تھی۔ یہ لوگ جو بھی اصلاحی پروگرام مرتب کرتے رعیت بوجہ جہالت اسکی مخالفت میں کھڑی ہو جاتی۔ ایک دفعہ اس شہر میں کہیں سے کوئی بزرگ صاحب تشریف لائے۔ بادشاہ نے ان کی حد سے زیادہ تعظیم وتکریم کی اور مہمانی کا حق پورے طور سے ادا کیا بزرگ بہت خوش ہوئے اور رخصت ہوتے وقت بادشاہ سے کہا کہ اے بادشاہ اگرچہ میں فقیر ہوں۔ اور میرے پاس دنیوی اشیاء سے کوئی بھی ایسی چیز نہیں کہ میں تیری مہمانی کا اس کے ساتھ شکریہ ادا کر سکوں۔ لیکن میں اپنے تعلق مع اللہ کو مدِ نظر رکھ کر آپ سے پوچھتا ہوں کہ اگر کوئی مراد ہو تو بیان کیجیے تا کہ میں اس کے لئے دربارِ ربی میں ہاتھ اٹھاؤں۔ بادشاہ نے موقعہ کو غنیمت جانا اور ہاتھ جوڑ کر عرض کی کہ فقیر صاحب میری رعیت کے لوگ نہایت جاہل اور ضدی ہیں۔ میں جو کام بھی ان کی بہتری کیلئے کرتا ہوں۔ وہ اس کی مخالفت کرتے ہیں۔ لہٰذا آپ دعا فرمائیں کہ وہ سب کے سب بیوقوف ہو جائیں تا کہ ذہابِ وقوف کے بعد جو بھی میں ان کے لئے کروں وہ اس میں آڑے نہ آ سکیں۔

فقیر صاحب نے فرمایا کہ اے بادشاہ میں حسب وعدہ اس بات کیلئے بھی دعا کرنے کو تیار ہوں۔ لیکن یوں دعا کیوں نہ کروں کہ وہ بھی سب تیرے اور تیرے وزیر کی طرح دانا ہو جائیں۔ اس پر وزیر اور بادشاہ کہنے لگے کہ صاحب اگر وہ سب کے سب دانا ہو گئے تو پھر تو اور بھی مشکل ہو جائے گی۔ پھر تو وہ ہماری ہر بات کی مخالفت کریں گے۔ اور پھر عجب نہیں کہ سلطنت کے بعض قانون اور ٹیکسوں پر نکتہ چینی بھی کریں اس واسطے بہتر یہی ہے کہ آپ ان کے بیوقوف ہونے ہی کی دعا کریں چنانچہ انہوں نے دعا کی اور تھوڑا سا پانی پڑھ کر دیا اور فرمایا کہ اس پانی کو کسی کنویں میں ڈال دینا اور تین دن تک جو بھی اس کا پانی پیئے گا وہ بیوقوف ہو جائے گا۔ چنانچہ بادشاہ نے اس پانی کو ایک کنویں میں ڈال کر منادی کروا دی کہ کل ایک بزرگ صاحب ہمارے ہاں تشریف لائے تھے ہم نے ان سے پانی دم کروا کے فلاں کوئیں میں ڈلوا دیا ہے اس واسطے سب لوگوں کو لازم ہے کہ اسی کنویں کا پانی پئیں تا کہ پانی کی برکت سے ہماری جسمانی اور روحانی بیماریاں دور ہو جائیں۔ چنانچہ دوسرے دن سب لوگوں نے اسی کوئیں کا پانی پیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سب کے سب لوگ بیوقوف

ہو گئے۔ اب بادشاہ اور وزیر کو بہت خوشی ہوئی کہ سب لوگ بیوقوف تو ہو چکے ہیں۔ اب ہم جیسا چاہیں گے ان سے کروائینگے۔

چنانچہ چند دنوں کے بعد ایک اصلاحی سکیم لوگوں کے سامنے پیش کی مگر ان کے تعجب کی انتہا نہ رہی کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ آگے تو چند ایک ہماری رائے کا ساتھ دیتے تھے مگر اب تو سب کے سب اہل قریہ چھوٹے اور بڑے متفقہ طور پر مخالفت کر رہے ہیں۔ کیونکہ اب وہ سب بیوقوف ہونے کی وجہ سے ہمرائی ہو چکے تھے۔ بادشاہ اور وزیر نے جب ان پر کچھ جبر کرنا چاہا تو اتفاقِ رائے سے سب لوگوں نے پاس کیا کہ موجودہ بادشاہ اور وزیر دونوں پاگل ہو گئے ہیں۔ اس واسطے ان کو اول تو معزول کر دینا چاہیئے اور اگر تخت کو چھوڑنے میں کچھ حیل وحجت کریں تو فوراً مار ڈالنا چاہیئے۔

بادشاہ نے جب لوگوں کی اس الٹی تدبیر اور اتفاق رائے کا حال سنا تو وزیر کو فوراً اس فقیر صاحب کو ڈھونڈنے کیلئے بھیجا کہ اگر کسی طرح ان کے لئے دعا کریں کہ پھر وہ پہلے جیسے ہو جائیں ورنہ ہماری خیر نہیں چنانچہ وزیر نے نہایت تلاش کے بعد فقیر صاحب کو پالیا اور منت سماجت کی تا کہ سب کے سب لوگ پھر پہلی حالت میں آجائیں۔ چنانچہ فقیر صاحب نے پھر دعا کی جس سے لوگ پہلے جیسے ہو گئے۔

تو بیان یہ ہو رہا تھا کہ اگر نمازی صرف اکیلے اپنے ہی لیے ہدایت چاہتا اور باقی سب لوگ گمراہی میں رہتے تو یہ اس کے لئے نہایت پریشانی اور اضطراب کا باعث بن جاتا اسلئے یہ دعا مانگتا ہے کہ اے اللہ ہم سب کو سیدھے رستے کی ہدایت فرما۔ اب اس کے بعد اھدنا الصراط المستقیم کی لفظی تفسیر عرض کرتا ہوں۔ تا کہ آپ وضاحت کے ساتھ اس کی تفسیر کو سمجھ سکیں اور اس کے الفاظ کے باریک مطالب کی بھی تشریح ہو جائے۔

اھدنا کی لفظی تفسیر اور اس کے نکات:

سب سے پہلے اھدنا کو لیجئے اس کا معنی یہ ہے کہ ہم کو ہدایت عنایت فرما۔ یہ لفظ چند چیزوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ سب سے پہلے دعا کی طرف۔

جب بندہ نے ایاک نعبد کہہ کے اللہ جل شانہٗ کی عبادت کرنے کا اقرار کر لیا اور اپنے تعلق عبدیت

کومعبودِ لایزال سے پختہ اور مضبوط بنالیا۔ تو اب اسے حکم ہوتا ہے کہ اچھا جب تو ہمارے شاہانہ دربار میں آکر مجرا بجالیا تو اب مانگ کیا مانگتا ہے۔ کیونکہ ایسے مالک الملک کے دربار میں جا کر شرفِ نیاز حاصل کرنا اور پھر اپنی سراپا محتاجی کے باوجود بغیر کچھ مانگے ہوئے واپس آنا یا تو تکبر پر دلالت کرتا ہے اور یا حماقت پر۔ اس واسطے عبادت کے بعد اھدنا کے لفظ کے ساتھ دعا کی تعلیم دی گئی اور یہ سکھایا گیا کہ اے انسان تو جب بھی میری عبادت کرے۔ تو عبادت کے اختتام پر مجھ سے کچھ مانگ کیونکہ میں سراپا غنی ہوں مجھے نہ تو تیری عبادت کی ضرورت ہے اور نہ بندگی کی۔

”مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَاءَ فَعَلَيْهَا“۔ (حم السجدہ:۴۶)

یعنی جو کوئی نیک عمل کرتا ہے تو وہ اپنے لئے کرتا ہے اور جو برائی کرتا ہے اس کا وبال اسی پر ہے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ مثلاً ایک غلام اپنے مالک کی رضامندی کے لیے کام کرتا ہے ہر وقت اس کی مرضی کے مطابق چلتا ہے تو مالک کی خوشی اس غلام پر انعام و اکرام کا باعث بن جاتی ہے۔ جو وہ مانگتا ہے مالک اسے دیتا ہے اور وہ جو کہتا ہے مالک اس کی سنتا ہے لیکن اگر یہی غلام مالک کی نافرمانی کرتا ہے اور مالک کے حکم کے مطابق نہیں چلتا تو مالک کی ناراضگی کا نتیجہ خود اس کی جان پر ظاہر ہوتا ہے۔ کھانے میں وہ تکلیف دیتا ہے یا بوجھل اور بھاری کاموں میں مشغول رکھتا ہے۔ اور تھوڑی دیر کے لئے بھی اس کا آرام و آسائش مالک کو پسند نہیں آتا۔

اسی طرح جب انسان نیک کام کرتا ہے تو وہ مَا لِکُ الْمُلک راضی ہوتا ہے اور اس مالک کی رضامندی کا پھل انسان کے انعام کی زیادتی اور احسان کی فراوانی کی صورت میں دیا جاتا ہے مگر جب یہ انسان اپنے رب کو ناراض کرتا ہے تو انعام و اکرام کی بارشیں اس کی امیدوں کے باغات کو شاداب نہیں کرتیں بلکہ یا تو رحمت کے چشموں کو بالکل بند کر دیا جاتا ہے اور یا ایسے کھول دیے جاتے ہیں کہ وہ رحمت زحمت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

دیکھئے جب ہود علیہ السلام کی قوم حد سے زیادہ نافرمان ہوگئی اور انکی بداعمالیوں کا پیالہ بالکل لبریز ہوگیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے آسمانی چشموں کو روک لیا۔ اور ان پر نہایت قحط کو مسلط فرما دیا بھوک اور پیاس کی

بیتابیوں کی وجہ سے قوم کا ہر ایک فرد رونے پیٹنے لگا۔ اس پر ہود علیہ السلام نے ان سے فرمایا!

”وَ یٰقَوْمِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْۤا اِلَیْهِ یُرْسِلِ السَّمَآءَ عَلَیْكُمْ مِّدْرَارًا وَّیَزِدْكُمْ قُوَّةً اِلٰى قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِیْنَ ۝۔ (ھود:۵۲)

یعنی اے میری قوم اپنے رب سے بخشش مانگو اور پھر اسی کی طرف لوٹو تا کہ وہ تم پر موسلا دھار مینہ برسائے۔ اور تمہاری طاقت کو بڑھائے اور مجرمانہ طور پر نہ لوٹو۔

دیکھو حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو نزولِ غیث اور دفعِ قحط کے لئے عملِ صالح کی تلقین فرمائی تو معلوم ہوا کہ رحمت کے چشمے کبھی تو عملِ صالح کی وجہ سے بقدرِ ضرورت کھول دیئے جاتے ہیں اور کبھی رحمت زحمت کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔

جیسا کہ نوح علیہ السلام کی قوم پر یہی مینہ کے چشمے جن کو ہود علیہ السلام نے رحمتِ ربی کے طور پر پیش کیا ہے زحمت بن گئے تھے چنانچہ قرآنِ پاک میں آتا ہے کہ جب نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال تک تبلیغ کی اور سوائے اسّی (80) آدمیوں کے اور کوئی حلقۂ اسلام میں داخل نہ ہوا بلکہ الٹے آپ کی تکذیب اور مخالفت کرنے لگے۔ اور ان کا ظلم حدِ برداشت سے بڑھ گیا تو نوح علیہ السلام نے دربارِ ربی میں دعا فرمائی۔

”قَالَ رَبِّ اِنَّ قَوْمِیْ كَذَّبُوْنِ ۝ فَافْتَحْ بَیْنِیْ وَ بَیْنَهُمْ فَتْحًا وَّ نَجِّنِیْ وَ مَنْ مَّعِیَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝۔ (الشعرا:۱۱۷،۱۱۸)

یعنی اے میرے رب میری قوم نے مجھے جھٹلایا پس آپ میرے اور میری قوم کے درمیان کھلا فیصلہ فرما دیجئے اور میرے مسلمان ساتھیوں کو بچا لیجئے۔ اس پر حکم ہوا۔

”وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْیُنِنَا وَوَحْیِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِیْ فِی الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا ۚ اِنَّهُمْ مُّغْرَقُوْنَ ۝۔ (ھود:۳۷)

کہ اے نوح ہم زمین و آسمان کی سوتوں کو کھول کر تمام ظالموں کو غرق کرنے والے ہیں۔

اسی واسطے آپ تو ہماری حفاظت میں ہماری ہدایت کے مطابق ایک کشتی بنا لیجئے۔ اور باقی ظالموں کو ہم غرق

کر دیں گے۔ اور اب آپ ان میں سے کسی ظالم کے بارہ میں کچھ عرض معروض نہ کرنا۔ چنانچہ حضرت ہود علیہ السلام کی موعودہ رحمت کو زحمت بنا کر مومنین کے سوا باقی سب قوم کو غرق کر دیا جاتا ہے۔

دعا کے متعلق:

تو خلاصۂ کلام یہ نکلا کہ اعمالِ صالحہ اور طالحہ کا نتیجہ خود انسان کے لئے ہے انسانوں کی عبادت سے نہ تو کچھ اس کی خدائی میں بڑھتا ہے اور نہ ان کے کفران و عصیان سے اس کی شانِ عالی شان میں کچھ فرق آتا ہے۔ بلکہ ہماری عبادت خود ہمارے ہی فائدے کے لئے ہے تو اب عبادت کے بعد اگر کوئی شخص دعا کر کے اپنی حاجت اور مقصود کو باری تعالیٰ سے نہیں مانگتا تو گویا وہ تجارت کرتا ہے بلا نفع اور مزدوری کرتا ہے مگر بلا اُجرت۔

اس واسطے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں!

”اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ۔ کہ دعا عبادت کا مغز ہے۔

(سنن ترمذی: ج، ۵، رقم: ۳۳۷۱، دار الغرب الاسلامی بیروت)

جو شخص اخروٹ کا چھلکا اتارنے کے بعد مغز کو نہیں لیتا تو گویا اس نے اخروٹ کے توڑنے میں تکلیف تو اٹھائی مگر بے سود۔ ایک دوسری حدیث شریف میں آتا ہے!

”اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ۔ کہ دعا بھی عبادت ہے۔

(سنن ترمذی: ج، ۵، رقم: ۳۳۷۲، دار الغرب الاسلامی بیروت)

اور اعلیٰ عبادت ہے کیونکہ عبادت جیسا کہ آگے بیان ہو چکا ہے۔ غایتِ تذلل اور نہایت عاجزی کو کہتے ہیں۔ اور رب العزت کے سامنے اور عبادتوں کے ساتھ ساتھ ہاتھ پھیلانا، گڑگڑا کے مانگنا، اسے ہی ملجا و ماویٰ جان کے اپنی دینی و دنیوی حاجات چاہنا۔ عاجزی، انکساری اور بے بسی کا کامل نمونہ ہے۔ اسی واسطے تو اللہ تعالیٰ نے دعا نہ مانگنے والوں کو قرآن پاک میں متکبر قرار دیا ہے۔

سورۂ مومن کے چھٹے رکوع میں ارشاد ہوتا ہے!

”اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ؕ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ ۠۔

(المومن:٦٠)

یعنی مجھ سے دعا کرو میں اس کا تمہیں جواب دوں گا۔ اور جو لوگ میری عبادت میں تکبر کرتے ہیں وہ ذلیل ہو کر جہنم میں داخل ہوں گے۔

یہاں عبادت سے مراد دعا ہے۔ کیونکہ اوّل تو سرے پر"**ادعونی**"موجود ہے۔ لہٰذا یہاں عبادت کے استکبار سے استکبار فی الدعا ہی ہوگا۔ دوسرے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود فرمایا ہے!

"اَلدُّعَاءُ هُوَ العِبَادَةُ۔ کہ دعا بھی عبادت ہے۔

اس لحاظ سے بھی یہاں دعا ہی مقصود ہے۔ اس کے علاوہ قرآن واحادیث دعا کرنے اور دعا کی تاثیر کے برحق ہونے سے بھرے ہوئے ہیں۔ دعا کی تاثیر کا منکر گویا روزِ روشن میں آفتاب کا انکار کر رہا ہے۔ آپ میں سے ہر ایک نے اپنی ہزاروں دعائیں مانگی ہونگی جن میں سے کتنی ہی درجہ قبولیت سے نوازی ہوں گی۔ اور آپ نے انبیاء علیہم السلام اور بزرگان دین کی دعاؤں کے فوری اثر ظاہر ہونے کے متعلق پڑھا اور سنا ہوگا۔ تو پھر ایسی بات کہ جس کا تجربہ ہم میں سے ہر ایک نے کیا ہے اور جس پر امت کے ثقہ اور معتبر لوگوں کی شہادتیں حد تواتر تک پہنچی ہوئی ہیں انکار کرنا صریح ضلالت اور کھلی گمراہی نہیں تو اور کیا ہے۔

میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چند ایک دعاؤں کے متعلق بیان کر کے پھر دعا کے منکرین کی دلیلوں کا رد پیش کرتا ہوں تا کہ اگر ایک طرف آپ کے ذہن میں دعا کے اثر کے برحق ہونے کا عقیدہ راسخ ہو جائے تو دوسری طرف منکرینِ دعا کی لایعنی دلیلوں سے بھی واقف ہو جائیں۔ تا کہ کسی جگہ ٹھوکر اور لغزش کا باعث نہ بن سکے اور میں تمام جدید تعلیم یافتہ حاضرین سے عرض کروں گا کہ اگر ان کو دورانِ تقریر یا اختتامِ بیان پر کسی قسم کا شبہ رہے تو وہ بلاحجاب اعتراض کر کے اطمینان حاصل کر سکتے ہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہزاروں دعاؤں سے مشتے نمونہ از خروارے:

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اسلام:

جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا اور ثویبہ کے دودھ شریک ہونے کے باعث رضاعی بھائی تھے مسلمان ہوئے تو قریش کے دلوں پر بڑا کاری تیر لگا۔ فوراً دارلندوہ میں جمع ہوئے اور اسلام کے

نونہال پودے کو جڑوں سے اکھاڑ پھینکنے کے متعلق مشورے کرنے شروع کئے مگر سچ ہے!

”یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّطْفِئُوْا نُوْرَ اللّٰهِ بِاَفْوٰهِهِمْ وَیَاْبَى اللّٰهُ اِلَّاۤ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَهٗ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُوْنَ

(التوبۃ: ۳۲)

ترجمہ: یہ چاہتے ہیں کہ اللہ کے نور کو بجھا دیں اپنے منہ (کی پھونکوں) سے اور اللہ کو ہرگز منظور نہیں ہے مگر یہ کہ وہ اپنے نور کا اتمام فرما کر رہے۔ چاہے یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار گزرے۔

یعنی

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائیگا

ابوجہل کفارِ قریش کو اپنی جوشیلی تقریر سے بھڑکانے کی کوشش کرنے لگا۔ کہتا ہے کہ اے قریش کے بہادرو سخت افسوس اور شرم کی بات ہے کہ محمد جیسا ایک کمزور اور ضعیف انسان ہماری مخالفت پر کھڑا ہو کے ہمارے معبودوں کو برا کہے ہماری رسوم کے برخلاف کہے اور ہمارے چیدہ چیدہ سرداروں کو اپنے حلقہ میں داخل کر کے ہمارے اتحاد و اتفاق کو پراگندہ (منتشر) کر رہا ہے۔ اگر ہم باوجود طاقت، قوت اور تمول کے اس فتنے کے انسداد کی طرف توجہ نہ کریں گے تو ابھی تو ابتداء ہے اگر اس وقت تم نے تغافل برتا تو وہ دن دور نہیں کہ پھر اس خرابی کا سدِ باب تمہاری طاقت سے باہر ہو جائیگا۔

سر چشمه شاید گرفتن به میل
چو پرشد نشاید گذشتن به پیل

ترجمہ: چشمہ کے سر کو پہلے سلائی کے ساتھ بند کر دینا چاہیے لیکن جب بھر جائے تو ہاتھی کے ذریعے بھی اُس سے گزرنا ممکن نہیں رہتا۔

جب حضور ﷺ نے دیکھا کہ کفار کی دشمنی حدِ برداشت سے تجاوز کر گئی ہے اور تبلیغ کی چابی کفارِ مکہ کے کفر کے تالوں کو کھولنے میں کماحقہٗ کامیاب نہ ہوئی۔ تو آپ نے ”آخر الدواء“ کے حربہ کی طرح دعا کا آخری حربہ استعمال فرمایا۔ حضور ﷺ نے دربارِ ربی میں التجا فرمائی۔

’’اللهمَّ أَعِزَّ الإِسْلَامَ بِأَحَبِّ هَذَيْنِ الرَّجُلَيْنِ إِلَيْكَ بأَبِي جَهْلٍ أَوْ بِعُمَرَ بْنِ الخَطَّابِ۔

(سنن ترمذی: ج،۶، رقم: ۳۶۸۱، دار الغرب الاسلامی بیروت)

یعنی اے اللہ اسلام کے ابوجہل یا عمر کے ساتھ جوان میں سے آپ کے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہو عزت دیجئے۔

اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کو زیادہ محبوب تھے تو پھر حضور کا محبوب اللہ جل شانہٗ کیسے نہ بنتا اللہ تعالیٰ تو صاف فرماتا ہے!

’’قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ۔ (آلِ عمران: ۳۱)

یعنی اے نبی آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری اتباع کرو میری پیروی سے تم خدا کے محبوب بن جاؤ گے۔

اور یہ ظاہر ہے کہ اتباع خاصہ ہے محبت کا تو نتیجہ نکلا کہ اگر خدا کے محبوب بننا چاہتے ہو تو پہلے میرے محبوب بنو کیونکہ باری تعالیٰ کی محبوبیت میری محبت سے مل سکے گی۔ تو مطلب یہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کے محبوب ہوں تو اللہ تعالیٰ کے محبوب کیسے نہ ہوتے۔

ابن ماجہ میں ایک حدیث حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے جس میں آپ نے صرف حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نام لیا ہے۔ ابوجہل کا اس میں نام نہیں۔

حَدَّثَنَا مُحَمَّدُ بْنُ عُبَيْدٍ أَبُو عُبَيْدٍ الْمَدِينِيُّ، حَدَّثَنَا عَبْدُ الْمَلِكِ بْنُ الْمَاجِشُونِ، حَدَّثَنِي الزَّنْجِيُّ بْنُ خَالِدٍ، عَنْ هِشَامِ بْنِ عُرْوَةَ، عَنْ أَبِيهِ، عَنْ عَائِشَةَ، قَالَتْ: قَالَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى الله عَلَيْهِ وسَلَّمَ: اللَّهُمَّ أَعِزَّ الإِسْلَامَ بِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ خَاصَّةً۔

(سنن ابن ماجہ: ج ۱، فضائل عمر، رقم: ۱۰۵، دار الفکر بیروت)

خیر جو کچھ بھی ہو دیکھنا تو یہ ہے کہ حضور ﷺ کی دعا کا اثر کیا ہوتا ہے۔ وہ عمر جو ایک قاتل کی حیثیت سے حضور رسالت مآب ﷺ کا گلا گھونٹنے کو جاتا ہے۔ کس طرح اپنا گلا دعائے نبوی ﷺ کے اثر سے لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ کی تلوار سے خوشی خوشی کٹوا دیتا ہے۔

حضرت عمر ہاتھ میں تلوار لیے ہوئے دارِ ارقم کی طرف چلے کیونکہ حضور ﷺ اسوقت صحابہ کے ساتھ کوہِ صفا کے دامن میں ارقم ؓ کے گھر میں اقامت پذیر تھے۔ اتنے میں حضرتِ عمر کی ملاقات حضرت نعیم بن عبداللہ سے ہوئی۔ حضرت نعیم نے حضرت عمر کے تیور چڑھے ہوئے اور تلوار کو بے نیام دیکھ کر پوچھا اے عمر کہاں جارہے ہو۔ حضرت عمر نے جواب دیا اے نعیم محمد کا سر کاٹنے کیلئے جارہا ہوں۔ کیونکہ اسکی وجہ سے تمام قبیلوں میں پھوٹ پڑی ہوئی ہے۔ بتوں کی مذمت اور قدیم معبودوں کی تذلیل سے وہ لوگوں کے دلوں کو بہت ایذا پہنچا رہے ہیں۔ اس واسطے میں آج اس فساد کی جڑ ہی کاٹ دیتا ہوں۔ تاکہ یہ فتنہ دنیا سے ناپید ہوجائے۔ حضرت نعیم رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے عمر تم اپنے ارادوں میں قطعاً کامیاب نہیں ہوسکتے۔ اور اگر ایسا ہی ہے تو تجھے پہلے اپنے گھر کی خبر لینی چاہئے جو چراغ کہ قریب کو روشن نہیں کرسکتا وہ دور کو کیا روشن کرے گا۔ دیکھو تیری بہن فاطمہ اور بہنوئی سعید بھی تو اسلام کے حلقہ بگوش ہوچکے ہیں۔ پہلے جاکر ان کی خبر لے اور اس کے بعد دوسرے ارادوں کی تکمیل کرنا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب یہ سنا کہ ان کی بہن اور بہنوئی کی بھی مسلمان ہوچکے ہیں تو غصے سے تھرتھرانے لگے۔ چہرے کا رنگ غصے کی وجہ سے تمتمانے لگا۔ اور نہایت تیزی کے ساتھ اپنے بہنوئی کے مکان کو روانہ ہوئے۔ حضرت خباب بی بی فاطمہ رضی اللہ عنہا اور حضرت سعید رضی اللہ عنہ کو قرآن پاک پڑھا رہے تھے۔ حضرت عمر کی آہٹ سن کر حضرت خباب تو گھر کے ایک کونے میں جا چھپے اور بی بی صاحبہ نے سورہ طٰہٰ کے حصے کو اپنے ران کے نیچے چھپالیا حضرت عمر رضی اللہ عنہ اندر آئے اور آتے ہی اپنے بہن اور بہنوئی سے پوچھا کہ ابھی ابھی تم کیا پڑھ رہے تھے۔ پہلے تو انہوں نے اس بات کو ٹالنا چاہا مگر جب حضرت عمر نے حضرت سعید رضی اللہ عنہ پر دست درازی شروع کردی اور بی بی فاطمہ کو چھڑاتے بہت کچھ زخم آئے تو فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کے خاوند نے حضرت عمر کو صاف کہہ دیا کہ ہم حضور ﷺ پر ایمان لاچکے ہیں۔ اب جو تو کرنا چاہتا ہے کر گزر۔ ہمیں اپنا ایمان اپنی جان سے زیادہ عزیز ہے۔ جان جائے تو بلا سے۔ مگر ہم نہ ایمان کو جانے دیں گے اور نہ اسے چھپائیں گے۔ بہن کی اس غیر متوقع دلیری اور ایک ضعیف عورت کے انکار اور اصرار نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے غصے کے بھڑکتے ہوئے شعلوں پر پانی کا کام کیا۔ قلبی دنیا کے اندھیرے میں حق کی بجلی چمک اٹھی بہن کے زخموں اور بہنوئی کے خون

آلود جسم کو دیکھ کے دل بھر آیا۔ تھوڑی دیر تک متفکر و مغموم بیٹھ گئے۔ جب طبیعت کچھ سنبھلی تو کہنے لگے۔ اے فاطمہ کیا وہ صحیفہ جو تو پڑھ رہی تھی مجھے دکھا سکتی ہے بی بی صاحبہ نے فرمایا اے عمر مجھے اندیشہ ہے کہ تم اسے پھاڑ دو گے۔ یا اس سے اور کسی قسم کی گستاخی کرو گے۔ حضرت عمر نے قسم کھا کر اپنی بہن کو یقین دلایا کہ ایسا کبھی نہ ہوگا۔ بلکہ میں ایک نظر دیکھ کر تجھے واپس کر دوں گا۔ اس پر بھی بی بی صاحبہ کا قرآنی عشق اور اسلامی محبت دیکھنے کے قابل ہے کہ آپ اپنے جری اور بہادر بھائی کی خفگی کا بالکل لحاظ نہیں فرماتیں اپنی بے بسی اور زخموں کا خیال نہیں کرتیں فرماتیں ہیں اے بھائی ہمارے مقدس قرآن کا حکم ہے۔

"لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَؕ ۝"

یعنی اسے سوائے پاکوں کے کوئی نہیں چھوتا۔

اسلئے اس کے چھونے سے پہلے اپنے ظاہر کو پوری طرح صاف کرلو۔

اُم المومنین اُم حبیبہ رضی اللہ عنہا کا ایک واقعہ:

اور یہ واقعہ ایسا ہی ہے جیسے کہ حضرت ام حبیبہ رضی اللہ عنہا نے اپنے باپ ابوسفیان کو آتا دیکھ کر حضور کے بستر مبارک کو تہہ کر کے ایک کونے میں رکھ دیا تھا جس پر ابوسفیان نے پوچھا کہ اے بیٹی یہ بستر تو کیوں تہہ کر کے ہٹا دیا ہے کیا میں اس بستر کے لائق نہیں یا یہ بستر میرے لائق نہیں۔ بی بی صاحبہ نے اپنے باپ کی سرداری اور مال و دولت کا کچھ لحاظ نہ فرمایا ابوت کی قرابت کو حضور ﷺ کے تقدس پر نثار کرتے ہوئے بولیں کہ اے میرے باپ یہ بستر رسول اکرم ﷺ کا ہے اور آپ مشرک ہیں اور ہمارے قرآن کا حکم ہے!

"اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ"۔ (التوبۃ:۲۸)

یعنی مشرک قلبی اور بدنی نجاست میں لتھڑے ہوئے ہیں۔

تو پھر میں کس طرح عمداً حضور ﷺ کے بسترے کو نجاست سے آلودہ کر سکتی ہوں۔ ابوسفیان بیٹی کے اس سلوک سے نہایت غصے ہوئے اور بلا بات چیت کئے واپس لوٹ آئے۔ تو یہ اسلام کا اثر ہے کہ اس نے مستورات و مخدرات تک کے نازک دلوں کو استقلال کے لحاظ سے ایک مستحکم چٹان کی صورت میں تبدیل

کر دیا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ بہن کے کہنے پر ظاہری طہارت کرنے کے لئے بھی تیار ہو گئے۔ ظاہر اندام کے دھلنے کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا کی برکت سے باطنی زنگار بھی صاف ہو گیا۔ طہارت کے بعد بہن نے سورہ طٰہٰ کا کاغذ دیا۔ جسے آپ ادب سے پڑھنے لگے جب پڑھتے پڑھتے آپ اس آیت پر پہنچے۔

''اِنَّنِیْٓ اَنَا اللّٰہُ لَآ اِلٰہَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِیْ وَ اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ ۝''۔ (طٰہٰ: ۱۴)

یعنی میں ہی خدا ہوں اور کوئی معبود نہیں مگر میں پس تو مجھے ہی پوج اور میری ہی یاد کے لئے نماز قائم کر۔

اس آیت نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دل پر ایسا اثر کیا جیسا اکسیر تانبے پر کیا کرتی ہے۔ آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ بدن جلالِ کبریائی سے کانپنے لگا۔ بے ساختہ پکار اٹھے۔ لا الہ الا اللہ حضرت خباب جو چھپے بیٹھے تھے۔ آپ کی یہ حالت دیکھ کر فوراً باہر نکل آئے اور پکار کر فرمایا اے عمر رضی اللہ عنہ خوش ہو کہ تیرے حق میں رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعا قبول ہو چکی ہے۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت خباب رضی اللہ عنہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کا ارادہ ظاہر کیا۔ وہ انہیں لے کر فوراً دارارقم کی طرف چلے حضرت عمر نے اپنی تلوار کو گلے میں لٹکایا، پگڑی سے ہاتھوں کو باندھ کے غلامانہ ہئیت کے ساتھ ارقم رضی اللہ عنہ کے گھر پر پہنچے۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے دستک دی۔ صحابہ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو کواڑ کی درزوں میں سے دیکھ کر دروازہ کھولنے میں تامل کیا مگر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دروازہ کھول دو اگر عمر کسی نیک نیت سے آیا ہے تو بہتر ورنہ اس کا سر اسی کی تلوار سے قلم کر دیا جائے گا۔ دروازہ کھولا گیا۔ حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی معیت اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی غلامانہ صورت سے اندازہ لگایا کہ نیت بخیر ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھتے ہی پکار اٹھے اشھد ان لا الہ واشھد ان محمد عبدہٗ ورسولہ۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اٹھ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سینے سے لگا لیا اور آپ نے اسے اتنے زور سے بھینچا کہ بقول حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کا بند بند ہل گیا۔

اور یہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو اتنے زور سے اس لئے دبایا تھا کہ ان پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صداقت کے ساتھ ساتھ قوت کا بھی اظہار ہو جائے اور انہیں معلوم ہو جائے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو صادق مان کر

گردنیں نہ جھکائی جائیں تو آپ رب العزت کی دی ہوئی طاقت کے ذریعے لوگوں کے سروں کو نیچا کر دکھائیں گے۔

حضور ﷺ کی قوت اور رکانہ رضی اللہ عنہ کا امتحان واسلام:

حضور ﷺ میں اس قدر قوت تھی کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک دفعہ مشہور ومعروف پہلوان رکانہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور عرض کی کہ میں مسلمان ہوتا ہوں مگر اس شرط پر کہ آپ مجھے کشتی میں پچھاڑیں۔ آپ نے ہر چند اسے سمجھایا کہ پیغمبروں کا کام کشتیاں لڑنا اور جسمانی زور بتانا نہیں ہوتا بلکہ وہ تو اللہ کے حکم سے لوگوں کو خدا کی طرف بلاتے ہیں۔ مگر رکانہ اپنی ضد پر اڑا رہا۔ آخر حضور ﷺ نے فرمایا تو پھر تیار ہو جا۔ جونہی وہ حضور ﷺ کے سامنے آیا آپ نے چشم زدن میں اسے زمین پر دے مارا۔ وہ دوبارہ کشتی کا طالب ہوا اسے دوبارہ بھی اسے پچھاڑ دیا۔ اس نے جب حضور ﷺ کی اس بے حد قوت کا تجربہ کر لیا تو بلا تامل کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو گیا۔

متمم الاربعین سے اسلام کو کیا قوت ملی:

اسی طرح حضور ﷺ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھینچ کر اپنی قوت بھی اسے بتادی۔ چنانچہ اس وقت تک مسلمانوں کی تعداد صرف (۳۹) انتالیس تھی۔ آپ کے اسلام لانے سے اسلام کے حلقہ بگوشوں کی تعداد پوری چالیس ہوگئی۔ اسی واسطے آپ کو متمم الاربعین بھی کہا جاتا ہے۔ تو دیکھئے حضور ﷺ کی دعا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں کیسی قبول ہوئی کہ وہ عمر جو کافروں کی طرف سے حضور ﷺ کو قتل کرنے کے لئے آئے ہیں۔ اب اسلام لانے کے بعد خود حضور ﷺ کے محافظ اور آپ کے پسینے کے قطرے پر خون کا دریا بہانے کو تیار ہو جاتے ہیں ؎

شد غلامے کہ آبِ جو آرد آبِ جو آمد و غلامِ بِبُرد

ترجمہ: غلام گیا کہ ندی سے پانی لائے، ندی کا پانی آیا اور غلام کو لے گیا۔

اور پھر یہی نہیں بلکہ حضور ﷺ نے فرمایا!

”اَللّٰھُمَّ اَعِزَّ الْاِسْلَامَ“ یعنی اے اللہ اسلام کو عزت دے۔

تو آپ کے اسلام کے بعد اسلام کو وہ طاقت اور رونق پہنچی کہ ایک طرف تو باری تعالیٰ کا فرمان آگیا!

”یٰاَیُّهَا النَّبِیُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ ۝۔ (انفال: ۶۴)

اے نبی آپکو اللہ اور تابعدار مسلمان کافی ہیں۔

تو دوسری طرف حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بخاری شریف کی رو سے گواہی دیتے ہیں!

”مَا زِلْنَا اَعِزَّةً مُنْذُ اَسْلَمَ عُمَرُ۔

(صحیح البخاری: الجزء، ۵، رقم: ۳۶۸۴، کتاب بدء الوحی، دار الشعب قاھرہ)

کہ جب سے عمر رضی اللہ عنہ اسلام لائے ہم مسلمانوں کو عزت اور غلبہ حاصل ہوگیا۔

اس ایک دعا میں دو قبولیتوں کا اثر ظاہر ہوا کہ ایک تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے اور دوسرے ان کی ذاتِ گرامی سے اسلام کو وہ قوت اور رونق حاصل ہوئی جس کا بیان آج ساڑھے تیرہ سو برس بعد بھی نہایت فخر و مباہات سے کیا جارہا ہے۔ اللھم صلی علیٰ سیدنا وسندنا ومولانا محمد وعلیٰ اٰلہٖ واصحابہٖ وسلم۔

اے اللہ آج مسلمانوں کی حالت نہایت قابلِ رحم ہے ان کا شیرازہ بکھر گیا ان کی عزت رخصت ہو گئی۔ ان کی حکومتیں یکے بعد دیگرے مٹ رہی ہیں۔ ان کی تجارتیں برباد ہوگئیں غیر قومیں مسلمانوں کو اور ان کے دینِ قیم کو صفحۂ ہستی سے نابود کرنے کی مکروہ سے مکروہ کوشش کر رہی ہیں۔ تو **مُقَلِّبُ الْقُلُوب** ہے تو **مَالِکُ الْمُلْک** ہے مسلمانوں کے دلوں کو اپنی طرف پھیر کر انہیں اپنے ملک کا سچا وارث بنا اور اپنے حبیب کے صدقے انہیں اپنی رحمِ بیکراں سے نواز۔

مناجات بدرگاہ قاضی الحاجات:

طعنہ زن ہیں آج مشرک مسلمِ بدنام پر
کفر غالب ہو رہا ہے شوکتِ اسلام پر
بجھ رہی ہے روشنی دنیا سے اب قرآن کی
کفر کے دریا میں پھنسی ناؤ اب ایمان کی
قومِ مسلم گھر گئی ہے رنج وغم میں اے خدا
وہ سراپا درد ہے تو دردمندوں کی دوا
ہم غریبوں کو بشارت شوکتِ اسلام دے
ہم مسلماں دل سے ہوں عاشق تیرے قرآں کے
سینۂ مسلم میں دل ہو دل میں ہو صدق وصفا
ہر طرف آنے لگے اسلام و قرآں کی صدا

صدق ہو صدیق کا اور پیروی حسنین کی
دل میں ہو عشقِ رسالت اُلفت حرمین کی
طارق و خالد کی ہمت پھر مسلماں کو ملے
دینِ حق کو زندہ کر دیں نعرۂ تکبیر سے
ساری دنیا پر اسے حاصل حکومت ہو وہی
جو خدا سے حضرتِ فاروق اعظم کو ملی
قومِ مسلم اُٹھ کے پھر اب نیند سے بیدار ہو
بازوئے مسلم کو زورِ حیدر کرار ہو
مومنوں کو دردِ رومی فقرِ بسطامی ملے
عشقِ سلمان و اویس و نورِ عثمانی ملے
ہم مسلماں ہوں ہمیں شانِ مسلمانی ملے
عاشقِ اسلام ہوں ایمانِ قرآنی ملے
باغ ہو اسلام کا سرسبز پھر دیکھیں بہار
یاد میں تیری رہیں بے چین بے کل بیقرار
مشرق و مغرب پہ ہر جا جھنڈا اسلام ہو
یاد پھر مسلم کو وہ بھولا ہوا پیغام ہو
پھر وہی الفت محبت کا سبق سیکھیں تمام
جس سے شوکتِ دین و دنیا کی ہماری ہو مدام
جو تیرا فرمان ہے مسلم کا وہ دستور ہو
سامنے آنکھوں کے پھر وہ نقشۂ پر نور ہو

اب اس کے بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک دعا کو بیان کرتا ہوں جس کی قبولیت کے فوری اثر کو ہزاروں صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنی مقدس آنکھوں سے دیکھا اور اس کے بعد ان شاء اللہ منکرینِ دعا کے دلائل کی تردید پیش کروں گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دعائے استسقاء اور اس کی فوری قبولیت:

ایک دفعہ مدینہ شریف اور اس کے گرد و نواح میں سخت قحط پڑا زمانہ تک بارش نہ ہوئی اور فصلیں وغیرہ برباد ہو گئیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جمعہ کے دن مسجد نبوی میں خطبہ دے رہے تھے۔ کہ ایک شخص نے اُٹھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بارش کے لئے دعا کرنے کی عرض کی چنانچہ بخاری شریف کی پوری حدیث نقل کر کے اسکا ترجمہ کر دیتا ہوں تاکہ آپ خود قبولیتِ دعا اور اس کے فوری اثر کا اندازہ کر سکیں۔

عَنْ أَنَسِ بْنِ مَالِكٍ قَالَ أَصَابَتِ النَّاسَ سَنَةٌ عَلَى عَهْدِ النَّبِيِّ صلى الله عليه وسلم فَبَيْنَا النَّبِيُّ صلى الله عليه وسلم يَخْطُبُ فِي يَوْمِ جُمُعَةٍ قَامَ اَعْرَابِيٌّ فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ هَلَكَ الْمَالُ وَجَاعَ الْعِيَالُ فَادْعُ اللهَ لَنَا فَرَفَعَ يَدَيْهِ وَمَا نَرَى فِي السَّمَاءِ قَزَعَةً فَوَالَّذِى نَفْسِى بِيَدِهِ مَا وَضَعَهَا حَتَّى ثَارَ السَّحَابُ اَمْثَالَ الْجِبَالِ ثمَّ لَمْ يَنْزِلْ عَنْ مِنْبَرِهِ حَتَّى رَاَيْتُ الْمَطَرَ يَتَحَادَرُ

عَلَى لِحْيَتِهِ صلی اللہ علیہ وسلم فَمُطِرْنَا يَوْمَنَا ذٰلِكَ وَمِنَ الْغَدِ وَبَعْدَ الْغَدِ وَالَّذِىْ يَلِيْهِ حَتّٰى الْجُمُعَةِ الْاُخْرٰى وَقَامَ ذٰلِكَ الْاَعْرَابِىُّ، اَوْ قَالَ غَيْرُهُ - فَقَالَ يَا رَسُوْلَ اللهِ تَهَدَّمَ الْبِنَاءُ وَغَرِقَ الْمَالُ فَادْعُ اللهَ لَنَا فَرَفَعَ يَدَيْهِ، فَقَالَ : اَللّٰهُمَّ حَوَالَيْنَا ، وَلاَ عَلَيْنَا فَمَا يُشِيْرُ بِيَدِهِ إِلَى نَاحِيَةٍ مِنَ السَّحَابِ اِلاَّ انْفَرَجَتْ۔

(صحیح بخاری: ج۱، باب رفع الیدین فی الخطبۃ، رقم: ۸۹۱، دار ابن کثیر بیروت)

یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ لوگ خشک سالی میں مبتلا تھے۔ جمعہ کے دن جب کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبہ دے رہے تھے۔ تو ایک دیہاتی نے کھڑے ہو کر عرض کی۔ یارسول اللہ مال برباد ہو گئے۔ اور بال بچے ضائع ہو گئے۔ پس آپ ہمارے لئے دعا فرمائیں۔ تو آپ نے دونوں ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے اور ہم آسمان میں بادل کا کوئی ٹکڑا ابھی نہ دیکھتے تھے مگر قسم اس ذات پاک کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ ابھی آپ نے دونوں ہاتھ نیچے بھی نہیں کئے تھے کہ بادل آسمان پر پہاڑ کی طرح پھیل گیا اور ابھی آپ منبر سے نہ اترے تھے کہ میں نے دیکھا کہ ابر کی وجہ سے آپ کی داڑھی مبارک سے بوندیں ٹپک رہی تھیں غرضیکہ اس دن اور اس کے دوسرے دن اور اس سے تیسرے دن حتی کہ دوسرے جمعہ تک بارش ہوتی رہی پھر جمعہ کے دن دیہاتی یا اور کوئی اور کھڑا ہوا اور عرض کی حضور مکانات گر گئے اور مال ڈوب گئے۔ پس آپ ہمارے لئے دعا فرمائیے اس پر آپ نے ہاتھ اٹھائے اور فرمایا اے اللہ ہمارے اطراف میں برسا اور ہم پر نہ برسا۔ اور آپ اپنے دست مبارک سے بادل کو جس طرف اشارہ فرماتے بادل اس جانب سے پھٹ جاتا تھا۔

اور ایک روایت میں ہے کہ!

اَللّٰهُمَّ حَوَالَيْنَا، وَلاَ عَلَيْنَا اَللّٰهُمَّ عَلَى الآكَامِ وَالْجِبَالِ وَالآجَامِ وَالظِّرَابِ وَالْاَوْدِيَةِ وَمَنَابِتِ الشَّجَرِ قَالَ فَانْقَطَعَتْ وَخَرَجْنَا نَمْشِي فِي الشَّمْسِ۔

(صحیح بخاری: ج۱، باب الاستسقاء فی المسجد، رقم: ۹۶۷، دار ابن کثیر بیروت)

(آپ نے دعا فرمائی کہ) اے اللہ ہمارے اطراف میں برسائیے اور ہم پر نہ برسائیے اور اے اللہ ٹیلوں پر بلندیوں پر نالوں پر اور درختوں کے اگنے والے مقامات پر برسا۔ راوی کا بیان ہے کہ ابر بالکل صاف ہو گیا

اور ہم دھوپ میں گھروں کو واپس چلے۔

منکرینِ دعا اور ان کے شبہات:

اب اس کے بعد منکرینِ دعا کے دلائل بیان کر کے تردید کرتا ہوں تاکہ دعا کے اثر وغیرہ کے متعلق کسی قسم کا اشتباہ باقی نہ رہے۔ منکرینِ دعا کہتے ہیں:

(۱) کہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ شریعت کی رو سے قیامت تک ہونے والے واقعات کو لوحِ محفوظ میں درج کر دیا گیا ہے۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صاف فرما دیا ہے کہ!

”جَفَّ الْقَلَمَ بِمَا هُوَ كَائِنٌ“

(مسند احمد: الجزء ۵، رقم: ۲۸۰۳، مسند عبداللہ بن عباس، طبع موسسۃ الرسالۃ)

کہ قلم ہونیوالے واقعات کی تحریر سے فارغ ہو کر خشک ہو چکی ہے۔ اب ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔

تو ہم پوچھتے ہیں کہ داعی جس امر کے لئے دعا کرتا ہے تو وہ اس کا مقدر ہے یا نہیں۔ اگر مقدر ہے تو وہ امر اس کی دعا کے بغیر بھی ہو کر رہے گا۔ اور اگر وہ مقدر نہیں تو لاکھ دعا کرنے سے بھی کچھ اثر نہ ہوگا۔ تو گویا دعا ہر دو صورتوں میں ایک بیکار سی چیز رہ جاتی ہے۔

(۲) اللہ تعالیٰ تو علام الغیوب اور ناظر القلوب ہے۔ اس کی شان تو:

”عٰلِمُ الْغَيْبِ وَ الشَّهٰدَةِ ؕ وَ هُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ۝“ (انعام: ۷۳)

ہے۔ وہ ہمارے دلی حالات اور جملہ ضروریات سے بلا کہے واقف ہے۔ شعر ؎

شکایت کرنی ان کے سامنے سوءِ ادب ناطق
کہ جن کا کام ہے فریادِ بے آواز سن لینا

اور یہ ظاہر ہے کہ کسی سے اپنے مطلب کو زبانی طور پر بیان کرنے سے تین غرضیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو جاہلِ حالات کو اپنے حالات سے آگاہ کرنا۔ یا کسی کو کوئی بھولی ہوئی بات کا یاد کرانا۔ یا بخیل کو اپنے حالات سنا کے سخاوت و احسان کی طرف توجہ دلانا اور یہ ظاہر ہے کہ یہ سب کی سب باتیں شانِ الٰہی کے بالکل منافی ہیں۔ تو

دوسرے الفاظ میں مطلب یہ نکلا کہ دعا کرنا گویا اللہ تعالیٰ پر نعوذ باللہ جہالت، نسیان یا بخل کا الزام لگانا ہے۔ اسی واسطے تو جب حضرت ابرہیم علیہ السلام کو نمرود نے ہاتھ پاؤں باندھ کر آگ میں ڈالا اور حضرت جبرئیل نے حاضرِ خدمت ہو کر دعا کرنے کے متعلق عرض کی تو آپ نے فرمایا!

"حسبی من سوالی علمه بحالی۔ یعنی وہ عیاں ونہاں کا جاننے والا ہے۔ اس کا علم مجھے عرضِ حال سے کفایت کرتا ہے۔

(۳) ایک فرمانبردار بندے کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اپنے مالک کے کئے اور کہے پر راضی رہے اور جیسا وہ رکھے ہر حال میں صبر شکر بجا لاوے اور اسی وصف کو تصوف کی اصطلاح میں رضا بالقضاء (**تقدیر پر راضی ہونا**) کہا جاتا ہے۔ اور یہی صفت حقیقت میں تمام کتبِ تصوف کا نچوڑ ہے۔ لیکن جو شخص دعا مانگتا ہے تو گویا وہ اپنے مالک کے کئے پر اپنی ناراضگی کو ظاہر کرتا ہے اور اس سے اس حکم کے بدلنے کی خواہش اور استدعا کرتا ہے اور ایسی استدعا محبت و رضا کے بالکل خلاف ہے۔

(۴) ہم دنیا میں دیکھتے ہیں کہ جب ایک انسان کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ ضرورت کے وقت وہ جس کے سامنے اپنا دستِ سوال لمبا کرے گا۔ اس سے کچھ نہ کچھ وصول ہو جائے گا۔ تو یہ یقین بالآخر اس کی قوتِ عمل کو بیکار کر دیتا ہے اور وہ اسباب کے استعمال کو چھوڑ کر دوسروں کی جود و سخا پر تاک لگا بیٹھتا ہے اسی طرح جب ایک انسان کو یہ یقین ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ اس کی دعا کو سن کر خزانہ غیب سے اس کے مطالب و مقاصد کو پورا کر دیگا۔ تو یہ یقین اس کی قوتِ عمل کو بھی بالکل بیکار بنا دیگا۔ کیونکہ جب اسے اپنا مقصد بلا محنت و بلا کسب و عمل کے حاصل ہو جانے کا یقین ہو گیا۔ تو پھر اسے محنت اور استعمالِ اسباب کی کیا ضرورت ہے تو گویا بد دعا قوتِ عمل کیلئے بھی سم قاتل ہے۔

اسی طرح اور بھی وہ طرح طرح کے شبہات دعا کے متعلق پیش کرتے ہیں جن کا جواب کم و بیش انہی چاروں کے جواب میں آجاتا ہے اور ایک عاقل انسان کے ٹھوکر کھانے کا خدشہ نہیں رہتا۔

جواب شبہ اول بطریق الزام: منکرینِ دعا جب یہ مانتے ہیں کہ جو کچھ ہونا تھا یا ہوگا وہ سب کچھ اللہ تعالیٰ نے مقدر فر دیا ہے اور اب اس تقدیر میں سرِ مو تفاوت نہیں ہو سکتا تو پھر وہ کس

لئے مریضوں کی دوا کرتے ہیں۔ کیونکہ اگر حیات وصحت مقدر ہے تو بلا دوا ہی حاصل ہو جائے گی اور اگر موت مقدر ہے تو ہزار دوا کرنے سے بھی کچھ نہ ہوگا۔ تو گویا دوا کا کرنا ہر طرح سے لغو اور بیکار ٹھہرتا ہے اسی طرح اگر رزق مقدر میں ہے تو ضرور ملے گا۔ اور اگر مقدر نہیں تو ہزار کوشش کرنے سے بھی نہ ملے گا۔ لہٰذا منکرین کو چاہئے کہ وہ کسب وعمل بھی چھوڑ دیں۔ لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ وہ بیماروں کا علاج کراتے ہیں رزق کے حاصل کرنے کے لئے اسباب کا تمسک بھی کرتے ہیں۔ تو پھر وہ دعا پر کس طرح اعتراض کرسکتے ہیں کیونکہ جو جواب وہ ان شبہات کا دیں گے وہی جواب انہیں دعا کے متعلق بھی دیا جائے گا۔

جوابِ تحقیقی: یہ سچ ہے کہ ما کان وما یکون کو اللہ تعالیٰ نے مقدر فرما دیا۔ مگر اس تقدیر کا چونکہ ہمارے پاس علم نہیں۔ اسلئے دیے ہوئے اسباب کو استعمال کرنے کے بعد نتیجہ کو تقدیرِ الٰہی پر چھوڑ دینا چاہئے۔ اگر استعمالِ اسباب تقدیر کے موافق ہوگا۔ تو نتیجہ خاطر خواہ نکلے گا ورنہ نہیں۔ لیکن ہمیں لازم ہے کہ جس طرح ہم دنیا میں اپنے مقاصد کو حاصل کرنے کے لئے دوسرے اسبابِ عادیہ کو استعمال کرتے ہیں اسی طرح دعا کو بھی منجملہ اسباب کے سمجھ کر استعمال کریں اور یہ وہ اعلیٰ سبب ہے کہ جس کے سامنے دوسرے اسباب کچھ وقعت نہیں رکھتے۔ کیا نہیں دیکھتے کہ جب ایک منکرِ دعا دنیا کے اسباب استعمال کرنے کے باوجود ناکامیاب رہتا ہے تو آخر کار یا تو خودکشی کر بیٹھتا ہے اور یا اس کی قوتِ عمل کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ مگر ایک دعا پر ایمان رکھنے والا انسان جب ہر طرف سے ناکامیاب ہو جاتا ہے تو وہ ربُّ الارباب اور احکم الاحاکمین کی طرف متوجہ ہو کر حصولِ مقصد کیلئے تیسرے اسباب کی دعا کرتا ہے اس سے وہ اپنے اندر ایک نئی قوت کو محسوس کرتا ہے اور اپنے سامنے اسباب وذرائع کا ایک نیا دروازہ کھلا ہوا دیکھتا ہے۔ اور عین اس جگہ پر جہاں منکرِ دعا ہار کر خودکشی کا ارتکاب کرتا ہے معتقدِ دعا منزلِ مقصود کی طرف ایک نیا راستہ پاتا ہے اور اس کے چمنِ امید کو بارانِ رحمت سے سرسبز کیا جاتا ہے۔

مولانا روم فرماتے ہیں

ہر کجا آبِ رواں سبزہ بود   ہر کجا اشکِ رواں رحمتِ شود
باش چوں دولاب نالاں چشمِ تر   تاکہ صحن جانت بر روید خضر

ترجمہ: ہر وہ جگہ جہاں پانی جاری رہتا ہے وہ سبز ہوتی ہے اور جہاں آنسو بہتے ہیں وہاں اللہ کی رحمت برستی ہے اے شخص تو بھی جاری کنویں کی طرح اپنی آنکھوں کو آنسوؤں سے تر کرلے تاکہ تیرے قلب کی زمین نیکیوں کی سبزہ گاہ بن جائے۔

تو گویا دعا، التجا اور التماس بھی بارانِ رحمت کے لئے استسقاء کی نماز ہے۔

تقدیر کی دو قسمیں:

اس کے علاوہ تقدیر یا قضا کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک مبرم یعنی حتمی۔ دوسری معلق یعنی مشروط بالشرط۔ قضائے مبرم میں تو کسی قسم کا تغیر و تبدل نہیں ہوتا اور یہی قضا ہے۔

’’لَا یَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّلَا یَسْتَقْدِمُوْنَ۔ (اعراف: ۳۴)

تو جب ان کا وعدہ آئے گا ایک گھڑی نہ پیچھے ہو نہ آگے۔

مگر معلق کسی شرط کے ساتھ مشروط ہوتی ہے یعنی اگر ہمارا بندہ یوں کرے گا تو ہم یوں کرینگے۔ حالانکہ اس کے کرنے یا نہ کرنے کا علم بھی اللہ جل شانہٗ کو ہوتا ہے۔ مگر اس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو اختیار دیا ہوا ہوتا ہے کہ وہ اپنے ارادہ اور اختیار سے ایک کام کر کے سزا اور جزا کا مستحق ہو ورنہ بحالتِ جبر سزا کا دینا صریح ظلم کہلاتا تو چونکہ بعض امور معلق بشرط الدعا ہوتے ہیں اور دعا کے اسباب و ارادہ کو ہمارے اختیار میں دے دیا گیا ہے۔ اور پھر وہ امور جو معلق بشرطِ دعا ہیں سب کے سب مجہول ہیں۔ اس لئے نتیجۃً ہر امر کیلئے دعا کا کرنا نہایت بہتر اور مفید ہے (اس شبہ کا جواب اس سے بھی زیادہ مفصل مسئلہ تقدیر میں بیان ہو چکا ہے۔ طالبِ تفصیل کو اس کی طرف رجوع کرنا چاہیے)

جواب شبہ دوم: بعض دفعہ عرضِ مطلب سے مقصود وہ نہیں ہوا کرتا جو شبہ دوم میں بیان ہو چکا ہے بلکہ کبھی اس سے اظہارِ تذلل اور انکسارِ مقصود ہوتا ہے۔ اور اللہ جل شانہٗ کے سامنے دعا کرنے میں یہی معنی ملحوظ ہوتے ہیں۔ کیونکہ تذلل اور انکساری ہی انسان کے تکبر اور نخوت کا بہترین علاج ہے جب وہ اپنے آپ کو دعا مانگ کے فقیر، محتاج، ذلیل اور مسکین ظاہر کرتا ہے تو گویا وہ اس معبودِ لایزال کو غالب عزیز اور محسن تسلیم کر رہا ہے۔ اور یہی اقرار عبودیت کا احساس پیدا کرتا ہے اسی واسطے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دعا کو ’’مُخُ

الْعِبَادَۃ ”یعنی عبادت کا مغز اور نچوڑ فرمایا ہے۔

دُعا معجونِ عبادت ہے: دعا کو اگر معجونِ عبادت کہا جائے تو بجا ہے کیونکہ اس کے ضمن میں کتنی ہی دوسری عبادتیں جمع ہو جاتی ہیں مثلاً اخلاص، حمد، شکر، تہلیل، استعانت، محبت اور خوفِ خداوندی، اللہ جل شانہ کے سامنے تذلل، انکسار اور احتیاج کا اقرار یہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ پر مستقل عبادتیں ہیں۔ تو گویا ایک دعا جامع ہے اس قدر عبادات کی۔ تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کرنے میں معترض کا بیان کردہ اعتراض وارد نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ داعی کا مطلب اس مقام پر اظہارِ تذلل اور اقرارِ احتیاج ہے۔

اب رہا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا سوال نہ کرنا اور جبرئیل کو ”حسبی من سوالی علمہ بحالی“ فرمانا اس کا جواب توکل کے سمجھنے پر موقوف ہے جب آپ توکل کے معنوں کو صحیح طور پر سمجھ جائیں گے تو اس کا جواب بھی آپ کو خود بخود معلوم ہو جائے گا۔

توکل کی تشریح اور اس کی اقسام:

اس واسطے سب سے پہلے میں توکل کے متعلق کچھ مختصراً بیان کر دیتا ہوں۔ توکل دو طرح کا ہوتا ہے۔ توکلِ علمی اور توکلِ عملی۔ توکلِ علمی تو یہ ہے کہ ہر کام مدبرِ حقیقی اور متصرفِ اصلی اللہ جل شانہ کو سمجھے اور کائنات کے ذرہ ذرہ تک کے عدم سے وجود میں آنے یا ایک حالت سے دوسری حالت میں متغیر ہونے کی علتِ علل اسی مالک الملک کو ٹھہرائے یہ توکل تو اسلامی عقائد کا بنیادی پتھر ہے اور اس پر ہر مسلمان کو عقیدہ رکھنا فرض ہے۔

اب رہا توکلِ عملی۔ توکلِ عملی اسباب عادیہ کے ترک کرنے کے ساتھ تعلق رکھتا ہے لیکن یہ اسباب اپنی جگہ دو قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک دینی دوسرے دنیوی، دینی اسباب تو وہ ہیں جن کے ترک کرنے سے کچھ دین میں نقصان پہنچتا ہو ایسے اسباب کا ترک کرنا شریعت کی رو سے گناہ ہے۔ بلکہ ایسے اسباب کا استعمال بعض اوقات فرض اور بعض اوقات واجب ہوتا ہے۔ اب رہے دنیوی اسباب کہ جن کے ذریعے سے دنیا کا فائدہ حاصل ہوتا ہے اب وہ فائدہ یا تو حلال ہے یا حرام۔ اگر حرام ہے تو ان اسباب کا ترک ضروری ہے اور

اگر وہ فائدہ حلال ہے تو ان اسباب سے وہ تین طریقوں پر حاصل ہوسکتا ہے۔ یا تو یقینی طور پر یعنی ان اسباب کے استعمال کرنے پر نتیجہ کا ترتب یقینی ہوتا ہے جیسے کھانے کے بعد سیری، پینے کے بعد دفع تشنگی وغیرہ۔ تو ایسے اسباب کا چھوڑنا بھی جائز نہیں یا وہمی طور پر۔ یعنی ان اسباب سے اس فائدہ کا حاصل ہونا ایک امرِ موہوم سا ہوتا ہے اور اسے زیادہ حریص اور طامع افراد اختیار کرتے ہیں۔ اور اسی کا نام طولِ امل ہے۔ ایسے اسباب کا ترک ضروری ہے۔ اور تیسرا طریقہ ظنی ہے یعنی ان اسباب سے فائدہ کا حاصل ہونا ظنی ہوتا ہے۔ غالب طور پر تو وہ فائدہ اسباب پر مرتب ہی ہوتا ہے۔ مگر بارہا تخلف بھی ہو جاتا ہے۔ جیسے علاج کے بعد صحت کا حاصل ہونا یا مزدوری کے بعد رزق کا ملنا۔ اور اس کا حکم یہ ہے کہ ضعیف النفس اور کمزور اعتقاد والے کے لئے اس کا چھوڑنا جائز نہیں۔ ہاں قوی النفس اور پکے اعتقاد والے کے لئے اس کا چھوڑنا محمود اور پسندیدہ ہے اور حقیقت میں توکل انہی اسبابِ ظنیہ کے چھوڑنے کا نام ہے اسبابِ یقینیہ یا وہمیہ کے چھوڑنے کو توکل کہنا یا سمجھنا سرے ہی سے غلط ہے۔

یقین، ظن اور وہم کا فرق:

چونکہ توکل کے بیان میں ان تینوں لفظوں کا استعمال کیا گیا ہے اور ہوسکتا ہے بعض اصحاب ان کے صحیح مفہوم سے بے خبر ہوں اس واسطے ان کی تشریح کیے دیتا ہوں۔ آپ مختصراً یوں سمجھئے کہ اگر کسی اعتقاد میں جانبِ مخالف کا احتمال نہ ہو تو یہ یقین کہلاتا ہے۔ اور اگر جانبِ مخالف کا احتمال ہو تو اسکی دو صورتیں ہونگی یا تو دونوں طرفین برابر ہونگی یا نہ۔ اگر دونوں طرفین برابر ہوں تو شک اور برابر نہیں تو جانبِ غالب کو ظن اور جانبِ مغلوب کو وہم کہا جاتا ہے۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ زید اور عمر تمہارے دوست ہیں دونوں تمہیں لینے آئے ان کے جانے کے بعد تم نے دیکھا کہ میز پر پچاس روپے کا نوٹ پڑا تھا وہ غائب ہے اب آپ کو خیال آیا کہ زید نے یہ کام کیا ہے کیونکہ عمر اس قسم کا آدمی نہیں، تو اب یہ خیال زید کے متعلق اس حد تک پہنچا ہوا ہو کہ عمر کے متعلق چوری کرنے کا خیال ایک لمحے کے لیے بھی نہیں آتا تو آپ کو زید کے چور ہونے کا یقین ہے اور کبھی یہ خیال آئے کہ ہوسکتا ہے کہ عمر نے کی ہو تو اب اگر زید اور عمر کے چور ہونے کا خیال بالکل مساوی ہے اور اس خیال میں

کسی جانب بھی قوت وضعف کا حکم نہیں لگایا جاسکتا تو یہ خیال تساویٔ جانبین کے باعث شک کہلائے گا اور اگر اس خیال میں قوت وضعف کا حکم لگ سکتا ہے تو جانب قوی ظن اور جانب ضعف وہم کہلائے گا۔

تو اب جب آپ توکل کے معنوں کو اچھی طرح سے سمجھ چکے اور آپ کو معلوم ہوگیا کہ اسبابِ ظنیہ کا چھوڑنا ضعیف النفس لوگوں کے لیے تو جائز نہیں ہاں قوی النفس اور راسخ العقیدہ افراد کے حق میں ترک کرنا محمود اور ستودہ ہے تو پھر آپ ہی بتائیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے اولوالعزم پیغمبر سے زیادہ راسخ العقیدہ اور کون ہوسکتا ہے لہٰذا آپ کا اسبابِ ظنیہ کو ترک کرکے ”حسبی من سوالی علمه بحالی“ فرمانا آپ کی شانِ ذیشان کے بالکل مناسب اور لائق تھا مگر اس پر ہما وشما کو قیاس کرکے دعا جیسے سببِ ظنی کو چھوڑنے کی تلقین کرنا کس طرح صحیح کہا جاسکتا ہے ہمارے حق میں تو ایسے اسباب کا چھوڑنا تفصیلِ سابق کے مطابق بالکل برا اور مذموم ہے۔

جواب شبہ سوم: رضا بالقضاء (**تقدیر پر راضی ہونا**) یہ ہے کہ انسان اللہ جل شانہ کی تقدیر پر راضی رہے مگر دعا کچھ تقدیر کے مخالف اور منافی نہیں کیونکہ دعا کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی ذلت اور مسکنت کا اظہار کیا جائے اور پھر اس کے بعد قضائے ربی کے سامنے سرِ تسلیم کو جھکا دیا جائے اور یہ اقرارِ ذلت اور مسکنت پہلے ظاہر کیا جاچکا ہے کہ ایک اعلیٰ درجہ کی عبادت ہے اور پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ عبادت رضائے الٰہی کے برخلاف نہیں ہوسکتی تو پھر دعا کو جو دوسرا نام ہے عبادت کا کس طرح رضائے الٰہی کے خلاف قرار دیا جاسکتا ہے۔

اور حقیقت تو یہ ہے کہ اس شبہ کا جواب بھی قضائے مبرم اور معلق کو سمجھ جانے کے بعد بالوضاحت ذہن میں آجاتا ہے اور جس کی تفصیل آگے پورے طور پر ہوچکی ہے تو اسی تفصیل وتوضیح کی بنا پر ہم کہتے ہیں کہ جس طرح ایک امرِ مقدر کے ساتھ اس کے لیے استعمال اسباب اور کسب وعمل مقدر ہوتا ہے۔ اس طرح اس کے ساتھ ساتھ دعا بھی مقدر کردیجاتی ہے۔ مگر چونکہ دعا والے مقدرہ امور کی تعیین مشکل ہے۔ اسواسطے سب امور کیلئے دعا کرنا محبوب ومحمود ہے اور اس تفصیل سے دعا کا مانگنا رضا بالقضاء (**تقدیر پر راضی ہونے**) کے بھی مخالف نہیں رہتا بلکہ عین موافق ہوجاتا ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے جب اسی قسم کا سوال کیا گیا تو آپ نے کیا

فرمایا؟ اس جواب سے بھی اس شبہ کا ازالہ ہوجاتا ہے حدیث شریف میں آتا ہے!

”عَنْ اَبِیْ خِزَامَۃَ ، عَنْ اَبِیْہِ قَالَ : سَاَلْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فَقُلْتُ : یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ ، اَرَاَیْتَ رُقًی نَسْتَرْقِیْھَا وَدَوَاءً نَتَدَاوٰی بِہٖ وَتُقَاۃً نَتَّقِیْھَا ، ھَلْ تَرُدُّ مِنْ قَدَرِ اللّٰہِ شَیْئًا ؟ قَالَ : ھِیَ مِنْ قَدَرِ اللّٰہِ۔

(سنن ترمذی: ج ۳، رقم: ۲۰۶۵، دار الغرب الاسلامی بیروت)

یعنی ابوخزیمہ رضی اللہ عنہ اپنے باپ سے روایت بیان فرماتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کی کہ حضور ﷺ ہم جو مریض کو جھاڑ پھونک کرتے ہیں یا دوا کرتے ہیں یا پرہیز کرتے ہیں تو کیا یہ امور اللہ تعالیٰ کی تقدیر کو بدلا سکتے ہیں؟۔ آپ نے فرمایا کہ یہ امور بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہوتے ہیں۔ اگر وہ مرض کو مقدر فرماتا ہے تو ساتھ ہی دعا کو بھی مقدر فرمادیتا ہے تو جیسے کسبِ معاش علاج ومعالجہ رضا بالقضاء (**تقدیر پر راضی ہونے**) کے مخالف نہیں ہوتے اسی طرح دعا بھی رضا بالقضا کے مخالف نہیں بلکہ عین محبت ومودّت کا نشان ہے کیونکہ محبت کسی کے ساتھ دو خیال سے کی جاتی ہے یا تو بوجہ خوف کے اور یا سببِ رجا کے اور شریعت کا مسئلہ ہے کہ ایمان خوف اور رجاء کے درمیان ہونا چاہیے۔ تو گویا داعی ایک طرف تو مقدر سے ڈرتا ہے اور دوسری طرف دعا والتجا کر کے رافت ورحمت کا امیدوار بنتا ہے۔

جواب شبہ چہارم: دُعا قوتِ عمل کیلئے سم قاتل نہیں۔ بلکہ غور کرنے سے قوتِ عمل کے گھوڑے کے لئے مہمیز کا کام دیتی ہے۔ جہاں پر ایک منکرِ دعا ہار کر بیٹھ جاتا ہے وہاں پر دعا کا معتقد یاس (**ناامیدی**) کی گھٹا ٹوپ اندھیریوں میں رحمانی روشنی کو چمکتا ہوا دیکھ کر کمر ہمت کو اور چست اور قدمِ عمل کو اور تیز کر دیتا ہے ہاں اتنا ضرور ہے کہ جسطرح سخاوت کے غلط مصرف سے گداگر اور بھکاری پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح دعا کے غلط مفہوم سے بھی قوتِ عمل کو نقصان پہنچتا ہے مگر جس طرح سخاوت اور خیرات بذاتہ نہایت اچھے کام ہیں۔ اسی طرح دعا بھی بذاتہ ایک نہایت اعلیٰ اور بہترین سبب ہے ان کے غلط استعمال سے سخاوت یا دعا کی ذات پر کچھ اثر نہیں پڑسکتا۔

اب اس کے بعد میں مختصراً دعا کے آداب اسکے شرائط اور اسکی قبولیت کے اوقات کے متعلق چند

ایک حدیثیں پیش کرتا ہوں تا کہ آپکو معلوم ہو جائے کہ بعض دفعہ جو ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتی۔ تو ان میں کونسی کمی رہ جاتی ہے۔ کہ انہیں دربارِ اجابت میں داخل ہونے سے روک دیا جاتا ہے۔

دعا کی فضیلت:

(۱) قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَةُ ثُمَّ قَرَاَءَ {اُدْعُوْنِي اَسْتَجِبْ لَكُمْ''

(مسند احمد: الجز، ۳۰، رقم: ۱۸۳۵۲، حدیث نعمان بن بشیر طبع موسستہ الرسالۃ)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ دعا بھی عبادت ہے۔ اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت پڑھی وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِي۔۔۔ الخ

(۲) مَنْ فُتِحَ لَهُ مِنْكُمْ بَابُ الدُّعَاءِ فُتِحَتْ لَهُ اَبْوَابُ الرَّحْمَةِ، وَمَا سُئِلَ اللّٰهُ شَيْئًا يَعْنِي اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ اَنْ يُسْاَلَ العَافِيَةَ. وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : اِنَّ الدُّعَاءَ يَنْفَعُ مِمَّا نَزَلَ وَمِمَّا لَمْ يَنْزِلْ، فَعَلَيْكُمْ عِبَادَ اللّٰهِ بِالدُّعَاءِ۔

(سنن ترمذی: الجز، ۵، رقم: ۳۵۴۸، دار الغرب الاسلامی بیروت)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ! جس شخص کیلئے دعاء کا دروازہ کھل گیا تو گویا اس کیلئے رحمت کے دروازے کھل گئے اور اللہ کو اس سے زیادہ پیاری اور کوئی دعا نہیں کہ اس کے لئے بھی جو ابھی نازل نہیں ہوئی اور اگر اقضاو قدر کو کوئی چیز پھیر سکتی ہے تو وہ دعا ہی ہے (فضیلتِ دعا میں مبالغہ ہے) پس تم کو لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیا کرو۔

(۳) قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ : اِنَّ اللّٰهَ حَيِيٌّ كَرِيمٌ يَسْتَحِيْ اَنْ يَرْفَعَ الْعَبْدُ يَدَيْهِ فَيَرُدَّهُمَا صَفْرًا۔

(مسند البزاز: الجز، ۶، رقم: ۲۵۱۱ مکتبۃ العلوم والحکم المدینۃ المنورۃ)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ تمہارا پروردگار نہایت شرم والا اور سخی ہے وہ اس بات سے شرم کرتا ہے کہ وہ اپنے بندے کے ہاتھوں کو جبکہ وہ اسکی طرف اُٹھاوے خالی ہاتھ لوٹا دے۔

(۴) مَا مِنْ مُسْلِمٍ يَدْعُو اللّٰهَ بِدَعْوَةٍ لَيْسَ فِيهَا إِثْمٌ وَلَا قَطِيعَةُ رَحِمٍ إِلَّا أَعْطَاهُ اللّٰهُ بِهَا إِحْدَى

ثَلَاثِ خِصَالٍ: إِمَّا أَنْ يُعَجِّلَ لَهُ دَعْوَتَهُ، وَإِمَّا أَنْ يدّخرها لَهُ فِي الْآخِرَةِ، وَإِمَّا أَنْ يَصْرِفَ عَنْهُ مِنَ السُّوءِ مِثْلَهَا۔

(فتح القدیر للشوکانی: الجزء ۱، سورۃ البقرۃ، ۱۸۶، دار ابن کثیر دمشق)

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جب کوئی مسلمان دعا کرتا ہے اور اس کی دعا کسی گناہ یا قطعِ رحم کے متعلق نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ اسے اس کے جواب میں تین میں سے ایک چیز عنایت فرماتا ہے۔ یعنی یا تو اسکی دعا اسی وقت پوری کر دیتا ہے۔ یا اس کو ثواب جمع کر دیتا ہے یا اس سے اس کے ثواب کے بدلے کے برابر کسی برائی کو دور کر دیتا ہے۔

وروی انه اذا کان یوم القیمة واستقر اهل الجنة فی الجنة فبینما العبد المؤمن فی قصره واذا ملا ئکة من عند ربه یاتونه بتحف من عند الله فیقول ما هذا الیس الله قد انعم علی وا کرمنی فیقول الست کنت تدعو الله فی الدنیا۔ هذا دعاءك الذی کنت تدعوه قد ادخره لك۔

اور یہ بھی ایک روایت میں آتا ہے کہ جب قیامت کا دن ہوگا اور جنتی جنت میں چلے جائیں گے تو جس وقت مومن اپنے محل میں ہوگا فرشتے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تحفے لے کر اس کے پاس آئیں گے تو مومن کہے گا کہ یہ کیا ہے کیا اللہ تعالیٰ نے مجھ پر تھوڑا انعام واکرام فرمایا ہے تو وہ جواب دیں گے کہ کیا تو دنیا میں اللہ تعالیٰ سے دعا نہ کیا کرتا تھا۔ یہ وہی دعائیں ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے تیرے لئے جمع کر کے رکھ دیا تھا۔

کس کس کی دعا جلدی قبول ہوتی ہے:

(۱) قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ دَعْوَةٌ أَسْرَعَ إِجَابَةً مِنْ دَعْوَةِ غَائِبٍ لِغَائِبٍ"۔

(سنن الترمذی: جز ۳، رقم: ۱۹۸۰، دار الغرب الاسلامی بیروت)

یعنی حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ غائب شخص کی دعا کسی غائب شخص کیلئے تمام دعاؤں سے زیادہ سریع الاجابت ہوتی ہے

(۲) قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ ثَلَاثُ دَعَوَاتٍ مُسْتَجَابَاتٌ لاَ شَكَّ فِيهِنَّ : دَعْوَةُ الْمَظْلُومِ ، وَدَعْوَةُ

الْمُسَافِرِ، وَدَعْوَةُ الْوَالِدِ عَلٰی وَلَدِهٖ ''

(سنن الترمذی: جز، ۳، رقم: ۱۹۰۵، دار الغرب الاسلامی بیروت)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تین دعاؤں کی قبولیت میں کوئی شک نہیں۔ مظلوم کی دعا۔ مسافر کی دعا۔ اور والد کی دعا اپنے بیٹے کے خلاف یعنی بد دعا۔

دعا کن اوقات اور حالات میں جلدی قبول ہوتی ہے ابن عطاء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ داعی کو چاہیے کہ دعا کرتے وقت دعا کے ارکان۔ اسکے اسباب اور اوقات کو ملحوظ رکھے تا کہ اس کی دعا اڑ کر دربارِ قبولیت میں بلا تکلیف پہنچ سکے دعا کے ارکان تو دل کا حضوع وخشوع ہے اسکے پر سچائی اور اکلِ حلال ہیں اسکا وقت صبح اور دوسرا احادیث شریف میں بیان کردہ اوقات ہیں اور اسکی قبولیت کا سبب حضور پر درد شریف پڑھنا ہے چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں!

الدعاء لایرد اذا کان قبلہ و بعدہ الصلوۃ علی ''۔
یعنی جس دعا کے اول وآخر مجھ پر درود ہو تو وہ دعا رڈ نہیں کی جاتی۔

احادیث شریف کے استقراء سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اوقات جن میں مسلمانوں کی دعاؤں کو درجۂ قبولیت سے نوازا جاتا ہے یہ ہیں۔ یعنی صبح کا وقت، افطار کا وقت، اذان واقامت کا درمیانی وقفہ، خطیب کے دو خطبوں کے درمیان بیٹھنے کا وقت، نزولِ بارش کے وقت، جہاد میں لشکرِ اسلام کے کفار سے مقابل ہونے کے وقت، رات کے ثلثِ آخر میں حالتِ سجدہ میں، بدھ کے دن عصر ومغرب کے درمیان سخت پریشانی کے وقت، سفر اور مرض میں۔

دعا کرنے والے کی ہیئت کے بیان میں:

(۱) قَالَ » لَا تَسْتُرُوا الْجُدُرَ مَنْ نَظَرَ فِیْ کِتَابِ اَخِیْهِ بِغَیْرِ اِذْنِهٖ فَاِنَّمَا یَنْظُرُ فِی النَّارِ سَلُوا اللّٰهَ بِبُطُوْنِ اَكُفِّكُمْ وَلَا تَسْاَلُوْهُ بِظُهُوْرِهَا فَاِذَا فَرَغْتُمْ فَامْسَحُوْا بِهَا وُجُوْهَكُمْ ''۔

(سنن ابی داؤد: جز، ۱، رقم: ۱۴۸۷، باب الدعاء، دار الکتاب العربی بیروت)

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دیواروں کو کپڑے مت پہناؤ اور جو کسی مسلمان بھائی کے خط کو اس کی

اجازت کے بغیر دیکھتا ہے تو گویا وہ آگ میں دیکھ رہا ہے اور اللہ تعالیٰ سے ہتھیلیوں کو اوپر رکھ کر سوال کرو اور انکی پیٹھ سے سوال نہ کر یعنی الٹے ہاتھوں سے اور جب دعا کر چکو تو ہتھیلیوں کو اپنے منہ پر پھیر لیا کرو۔

(۲) عَنْ اَنَسٍ قَالَ رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِي الدُّعَاءِ حَتّٰى يُرٰى بَيَاضُ اِبْطَيْهِ''۔

(صحیح مسلم: جز، ۳، رقم: ۲۱۱۱، دار الجیل بیروت)

یعنی حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ! حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا میں اپنے ہاتھوں کو اتنا بلند فرمایا کہ میں نے آپ کی بغلوں کی سپیدی کو دیکھا۔

گویا ان دونوں حدیثوں کا خلاصہ مطلب یہ نکلا کہ دعا کرتے وقت دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو آسمان کی طرف اٹھائے اور بتدریج استقبالِ رحمت کیلئے اتنا بلند کردے کہ بازو بغلوں سے پورے پورے جدا ہو جائیں۔ اور دعا میں!

إِذَا صَلَّى أَحَدُكُمْ فَلْيَبْدَأْ بِتَحْمِيدِ اللهِ وَالثَّنَاءِ عَلَيْهِ، ثُمَّ لْيُصَلِّ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، ثُمَّ لْيَدْعُ بَعْدُ بِمَا شَاءَ۔

سب سے پہلے حمد بعد ثنا اور پھر درود شریف اور اس کے بعد داعی کا مطلب و مقصد ہونا چاہیئے۔

دعاء کے اختتام پر دونوں ہاتھوں کو جو رحمتِ الٰہیہ کا مورد تھے اپنے منہ پر پھرے اس کے ساتھ دعا کے قبول ہونے میں شک نہ کرے۔ بلکہ اللہ کی کریمی و رحیمی پر نظر رکھتے ہوئے اپنی دعا کے قبول کئے جانے کا یقین رکھے کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے!

''اُدْعُوا اللّٰهَ وَاَنْتُمْ مُوْقِنُوْنَ بِالْاِجَابَةِ''۔

(سنن الترمذی: جز، ۵، رقم: ۳۴۷۹، دار الغرب الاسلامی بیروت)

یعنی اللہ تعالیٰ سے دعا کرو اور تم کو قبولیتِ دعا کا پورا پورا یقین ہونا چاہیئے۔

تو گویا ''اھدنا'' کے لفظ میں ایک تو دعا کے متعلق تعلیم دی گئی کہ عبادتِ ربی ادا کرنے اور مجرائے شاہانہ بجالانے کے بعد اپنے مقصود کو پیش کر اور اپنی حاجات کو بیان کر کے ان کے ازالہ کیلئے دربارِ رب الارباب میں عرض کر۔ اب بندہ درخواست گزارتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ چونکہ

بندہ سراپا محتاج ہے۔ اس کی رگ رگ احتیاج کی قید میں جکڑی ہوئی ہے۔ اب اگر یہ اپنے حالات کو پورا بیان کر کے فرداً فرداً ہر تکلیف اور حاجت کے دفعیہ کی درخواست کرتا۔ تو درخواست کی طوالت آدابِ شاہانہ اور تخاطبِ خسروانہ کے مناسب نہ رہتی۔

اور حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ!

كَانَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ يَسْتَحِبُّ الْجَوَامِعَ مِنَ الدُّعَاءِ وَيَدَعُ مَا سِوٰى ذٰلِكَ۔

(سنن ابی داؤد: جز، ۲، رقم: ۱۴۸۲، باب تفریح صلاۃ السفر، دار الفکر بیروت)

یعنی حضور ﷺ جامع دعاؤں کو پسند فرماتے جو تھوڑے الفاظ میں وسیع مقاصد کو لئے ہوئے ہوتیں اور غیر جامع دعاؤں کو چھوڑ دیتے اس واسطے مصلی کو بھی اس مقام پر ایک ایسی دعا سکھائی جا رہی ہے۔ جس میں ایجاز و اختصار کے ساتھ اس کی تمام ضروریات کو خواہ وہ دنیوی ہوں یا اخروی باحسنِ وجوہ جمع کر دیا گیا ہے۔ اور جسطرح دعا معجونِ عبادات ہے اسی طرح اس "اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ" کو معجون مطالب بنا دیا گیا ہے اور صراطِ مستقیم میں کس طرح دینی مقاصد کو جمع کیا گیا ہے۔ اس کا کچھ بیان تو آگے ہو چکا ہے اور کچھ باقی مستقیم کی تشریح میں بیان کر دیا جائے گا۔ لیکن سر دست تو "اِهْدِنَا" ہی کے بیان کو پورا کیا جاتا ہے۔ اهدنا کے ایک اشارہ دُعا کے متعلق تو کافی سے زیادہ بیان ہو چکا اب اهدنا کا دوسرا اشارہ ہدایت کی طرف ہے۔

ہدایت کا معنی:

ہدایت کہتے ہیں لطف اور مہربانی سے رستہ دکھانے کو یہی وجہ ہے کہ اس کا استعمال ہمیشہ امورِ خیر اور بھلائی کے کاموں کی طرف ہنمائی کرنے پر بولا جاتا ہے کیونکہ لطف و نوازش کا تقاضا یہ ہے کہ وہ رہنمائی صراطِ خیر کی طرف ہو نہ کہ ضیر کی طرف۔ چوری یا کسی اور فسق و فجور کا رستہ دکھانے کو ہدایت نہ کہیں گے بلکہ ایسا راستہ لطیف کی صفتِ لطف کے سراسر منافی ہے اور قرآن پاک میں جو

"فَاهْدُوهُمْ إِلَى صِرَاطِ الْجَحِيمِ ۝" (الصفت: ۲۳) آیا ہے وہ

"فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ۝" (الانشقاق: ۲۴)

کی طرح بطور تہکم و استہزاء استعمال کیا گیا ہے۔

لفظِ ہدایت کے استعمال کا قاعدہ:

لفظِ ہدایت کے استعمال کے متعلق علماء ادب نے چند ایک قانون بنائے ہیں۔ جو اگرچہ زبان کے استقراء سے قواعدِ کلیہ تو نہیں معلوم ہوتے لیکن تاہم لفظِ ہدایت کا استعمال غالب طور انہی کے ماتحت ہوتا ہے وہ کہتے ہیں کہ رستہ دکھانا دو طرح پر ہوتا ہے ایک تو رستے کے تمام نشانات اور ضروری علامات کا بتا دینا۔ مثلاً آپ سے کوئی شخص کسی مکان کا پتہ پوچھے اور آپ اسے کہیں کہ یہاں سے دو سو قدم کے فاصلے پر ایک سفید مکان ملے گا وہاں بڑی سڑک کے دائیں جانب سے ایک چھوٹی سی گلی اندر جاتی ہوئی دکھائی دے گی۔ اس گلی میں دائیں ہاتھ کے دس مکانوں کو چھوڑ کر گیارھواں مکان ہے دوسرا رستہ دکھانے کا یہ طریقہ ہے کہ خود پوچھنے والے کے ساتھ ہو کر اسے منزلِ مقصود تک پہنچا آئے۔ اور یہ ہدایت کا بہترین درجہ ہے کیونکہ اس میں مستفسر کو کسی قسم کا دھوکہ لگنے کا کوئی خدشہ نہیں تھا۔ اب اگر کلام عرب میں ہدایت کے پہلے معنیٰ یعنی اراءۃ الطریق یا نشان دادن کو بیان کرنا مقصود ہو تو اس کا استعمال مفعولِ ثانی کی طرف لام یا الیٰ کے ذریعہ ہوتا ہے جیسے:

”اِنَّ ھٰذَا الْقُرْاٰنَ یَھْدِیْ لِلَّتِیْ ھِیَ اَقْوَمُ “(بنی اسرائیل:۹)

اور”وَ ھَدَیْنٰھُمْ اِلٰی صِرٰطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ⭘ “(انعام:۸۷)

اور اگر ہدایت کے دوسرے معنی یعنی ایصال الی المقصود کو ظاہر کرنا مطلوب ہو تو اس وقت اسے متعدی نفسہا کرتے ہیں اور لام یا اِلیٰ کے بغیر ہی استعمال کرتے ہیں۔ جیسے”اِھْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِیْمَ “میں۔

ہدایت چار قسم کی ہے:

اب اس کے بعد غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہدایت اپنی جگہ پر چار قسم کی ہوتی ہے یعنی ہدایتِ فطری، ہدایتِ احساسی، ہدایتِ عقلی اور ہدایتِ الہامی۔

ہدایتِ فطری:

اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں فرماتا ہے!

”اَعْطٰی کُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی ⭘ “۔(طٰہٰ:۵۰)

کہ ہر چیز پیدا فرما کر ہدایت بخشی یہی وہ فطری ہدایت ہے۔

جس کے ذریعے سے ہر حیوان اپنے مایحتاج کو حاصل کرتا ہے۔ اسی کی وساطت سے بچہ پیدا ہوتے ہی ماں کے پستانوں سے اسطرح دودھ پیتا ہے کہ گویا اسے اسکی برسوں مشق کرائی گئی۔ یہ فطری ہدایت ہی کا طفیل ہے کہ شہد کی مکھیاں اپنی سکونت کیلئے ایسا مسدس خانوں والا چھتہ بناتی ہیں کہ ایک ماہر انجینئر بھی اسکو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ بئے کا گھونسلہ، ریشمی کیڑے کا ڈوڈا، چیونٹی کی بھول بھلیاں سب اسی ہدایت کا نتیجہ ہیں۔ اور قدرت نے اس ہدایتِ فطری سے دنیا کی کسی چیز کو بھی محروم نہیں رکھا بلکہ ہر ایک کو اس کی ضروریات کے مطابق فطری ہدایت سے پورا پورا نوازا ہے۔

ہدایتِ احساسی:

ہدایتِ فطری سے دوسرے درجہ پر ہدایتِ احساسی ہے اس کا تعلق فطرت سے خاص ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ حواسِ ظاہری (سامعہ۔ شامہ۔ باصرہ۔ ذائقہ۔ لامسہ) اور حواسِ باطنی (حس مشترک۔ خیال۔ وہم۔ حافظہ۔ متصرفہ) سے متعلق ہوتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ دنیا کی تمام چیزوں کو ان قوتوں سے نہیں نوازا گیا۔ بلکہ بعض کو پوری دی گئی ہیں۔ تو بعض کو کم۔ اسی ہدایت کی وساطت سے انسان سرد و گرم۔ نور و ظلمت جمیل و قبیح اور رقیق و دبیز میں فرق کرسکتا ہے۔

ہدایتِ عقلی:

اس کے بعد ہدایت کی تیسری قسم ہدایتِ عقلی ہے۔ جس جگہ ہدایتِ احساسی حواس کی عدم رسائی کی وجہ سے رک جاتی ہے وہاں پر عقل ظاہری و باطنی حواس کے مدرکات سے کلیات کا انتزاع کر کے منزلِ مقصود کی طرف رہنمائی کر دیتا ہے۔ اب یہ انتزاع بعض دفعہ بوجہ تجربہ حدس یا تواتر کے ایسا بدیہی اور ظاہر ہوتا ہے کہ اس کے حاصل کرنے میں عقل کو کسی قسم کے استدلال یا ترتیبِ مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی۔ مثلاً اگرچہ ہم نے مدینہ شریف کو اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا مگر دیکھنے والوں سے سنا۔ کتابوں میں پڑھا اور اس قدر باوثوق ذرائع سے اس کا ہونا معلوم ہوا کہ عقل نے باوجود ہدایتِ احساسی کے نہ ہونے کے اس قول کو صحیح تسلیم کر لیا اور اس میں کسی قسم کے استدلال کی ضرورت نہ پڑی مگر بعض دفعہ یہ انتزاع بجائے بدیہی

کے نظری ہوتا ہے اور اس کے حاصل کرنے میں قوتِ استدلال اور ترتیبِ مقدمات سے کام لینا پڑتا ہے۔ مثلاً زمانہ کا حدوث اور قدمِ زمین کی گردش وسکوں اور دوسرے ہزاروں ایسے نتائج ہیں جو مقدمات کو ترتیب دیکر قوتِ استدلال کے ذریعے حاصل کئے گئے ہیں۔ ہدایتِ عقلی کی اس قسم کو استدلالی اور پہلی کو بدیہی کہا جاتا ہے چونکہ عقلاء کے عقل آپس میں مختلف ہوتے ہیں۔ اسلئے کوئی اپنے استدلال کی بنا پر زمانے کو قدیم کہتا ہے اور کوئی حادث۔ کوئی زمین کو ساکن مانتا ہے۔ تو کوئی گردان۔ اس لئے ہدایتِ عقلی استدلالی کے خلاف کو مٹانے کے لئے ہدایت کی چوتھی اور اعلیٰ قسم ہدایتِ الہامی ہے۔ جس میں انبیاء علیہم السلام اللہ جل شانہ کی طرف سے بذریعہ الہام اور وحی کے ہدایت پا کر لوگوں کی رہنمائی فرماتے ہیں۔

ہدایتِ الہامی:

قرآن پاک فرماتا ہے!

وَجَعَلْنٰهُمْ اَئِمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا وَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرٰتِ وَاِقَامَ الصَّلٰوةِ وَاِيْتَآءَ الزَّكٰوةِ ج۔

(الانبیاء:۷۳)

ہم نے انہیں وحی بھیجی اچھے کام کرنے اور نماز برپا رکھنے اور زکوٰۃ دینے کی اور وہ ہماری بندگی کرتے تھے۔

جس طرح عام لوگ اپنے عقلی استدلالات میں عقلا کی تابعداری کو ضروری سمجھتے ہیں۔ اسی طرح عقلا وحکماء کو بھی اپنے مختلف فیہ نظریات میں ہدایتِ الہامی کا اتباع ضروری ہوتا ہے۔

مولانا روم صاحب فرماتے ہیں۔

گربہ استدلال کارِ دیں بُدے　　　فخرِ رازی راز دارِ دیں بُدے
پائے استدلالیاں چوبیں بَوَد　　　پائے چوبیں سخت بے تمکیں بَوَد

ترجمہ: اگر استدلال کرنے سے دین کا کام ہوتا تو امام فخر الدین رازی علیہ الرحمہ دین کے راز دار ہوتے۔ استدلالیوں کے پاؤں لکڑیوں کے بنے ہوتے ہیں اور لکڑی کے پاؤں بالکل بے کار ہوتے ہیں۔

اعتراض: جب مصلی حاضر دربار ہوا۔ پاک وصاف اور قبلہ رو ہو کر دربارِ ربی میں کھڑا ہوگیا۔ تو اب اسے بذریعہ حضورِ خداوندی اور عبادتِ ربی کے ہدایت تو حاصل ہوگئی اور عبادت بقول قرآن خود صراطِ مستقیم ہے۔”

وَاَنِ اعۡبُدُوۡنِیۡ هٰذَا صِرَاطٌ مُّسۡتَقِیۡمٌ ''(یٰسین:٦١)
تو اب پھر دوبارہ ہدایت اور صراطِ مستقیم کے لئے عرض کرنا تحصیل کی التجا نہیں تو اور کیا ہے۔

جواب: ہدایت اور عبادت میں فرق ہے۔ عبادت تو نام ہے مجاہدہ کا، کوشش اور سعی کا۔ ہاں اس کے نتیجہ کا نام ہدایت ہے۔ انسان اللہ جل شانہ کی عبادت کرتا ہے۔ نفس کشی کرتا ہے۔ رات اور دن ریاضتوں میں مشغول رہتا ہے۔ تو آخر کار اللہ جل شانہ اسے ہدایت کے درجے سے نوازتے ہیں۔ اسی واسطے فرمایا ہے!

وَالَّذِیۡنَ جَاهَدُوۡا فِیۡنَا لَنَهۡدِیَنَّهُمۡ سُبُلَنَا۔ (عنکبوت:٦٩)
اور جنہوں نے ہماری راہ میں کوشش کی ضرور ہم انہیں اپنے راستے دکھا دیں گے۔

تو گویا ہدایت سبیل یا اراءۃ صراط (راستہ دکھانا) مجاہدہ و ریاضت کے بعد ہوتا ہے۔ اور چونکہ یہ نتیجہ مجاہدہ کے ساتھ لازم ملزوم نہیں۔ بلکہ رب العزت کی مرضی پر موقوف ہے۔ کہ کسی انسان کے مجاہدہ کو بار آور فرمائیں یا نہ اگر عبادت کا نتیجہ لازمی طور پر ہدایت ہوتا۔ تو پھر ''وَمَنۡ یُّضۡلِلۡهُ فَلَا هَادِیَ لَهٗ۔ بالکل بے معنی ہو جاتا۔ اور ابلیس کو باوجود عبادتِ شاقہ کے راندۂ دربار نہ کیا جاتا۔ تو معلوم ہوا کہ عبادت کا نتیجہ اُس احکم الحاکمین کے ہاتھ میں ہے۔ اس واسطے مصلی عبادت کے بعد نتیجہ کے دیئے جانے کی عرض کرتا ہے۔ کہ اے معبود۔ میری عبادت کو بار آور فرما کر مجھے صراطِ مستقیم کی ہدایت فرما۔

اس کے علاوہ حضور نے فرمایا!

''وَاِنَّمَا الۡاَعۡمَالُ بِالۡخَوَاتِیۡمِ''۔

(صحیح بخاری: جز،٨، رقم:٦٦٠٧، باب، العمل بالخواتیم طبع دار طوق النجاۃ)

یعنی اعمال کا اعتبار خاتمہ پر موقوف ہے۔
ابتدا یا وسط کو کوئی نہیں دیکھتا ہر ایک کی نظر انجام پر ہوتی ہے۔
کسی نے کہا ہے۔

کب کیا کیونکر کیا یہ پوچھتا کوئی نہیں
بلکہ ہیں یہ دیکھتے جو کچھ کیا کیسا کیا

ایک شخص نہایت جانفشانی سے کام کرتا ہے اسکی ابتدا شاندار اور وسط قابلِ ستائش ہوتی ہے۔ مگر اختتام پر وہ اُسے ایسا بگاڑ دیتا ہے کہ اپنی سالوں کی محنت پر پانی پھیر دیتا ہے۔ اب اُس کے کام کی ابتدا اور وسط کو دیکھ کر تعریف نہ کی جائے گی بلکہ انجام کو دیکھ کر اسے قابلِ مذمت انسان سمجھا جائے گا۔ اسی طرح ایک شخص خوب عبادت و ریاضت کرتا ہے۔ مگر خاتمہ پر ایسے افعال کا مرتکب ہوتا ہے کہ گویا قطرہ قطرہ سے بھرے ہوئے پیالے کو انڈیل دیتا ہے۔ اور اس طرح اپنی تمام عبادت و مجاہدہ کو برباد کر دیتا ہے۔ بلعم باعور اور ابلیس کی عبادتوں کا جو انجام ہوا وہ آپ میں سے ہر ایک جانتا ہے تو گویا مصلی اس دُعا میں انجام بخیر ہونے کی التجا کر رہا ہے۔ اور بات تو یہ ہے کہ ہدایت بھی زر و مال کی طرح کوشش کرنے سے حاصل تو ہو جاتی ہے۔ مگر جس طرح مال کو محفوظ و مصون رکھنا ایک نہایت اہم کام ہے۔ اسی طرح حصولِ ہدایت کے بعد اُس پر قائم رہنا ایک کٹھن کام ہے۔ ہزاروں نے رات دن کے مجاہدہ و ریاضت سے ہدایت حاصل بھی کی۔ مگر یہ حصول بجلی کے کوندنے کے مشابہ تھا۔ کہ ادھر سے چمک اُٹھی اور اُدھر غائب ہوگئی۔ اور پھر عابد و مرتاض کی حالت ''الان کما کان'' کے ذیل میں جا داخل ہوئی۔ اس واسطے حصولِ عبادت کے بعد اس پر ثبات و دوام ایک نہایت قابلِ ستائش مقصود ہے۔ اسی واسطے تو مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے یہ دعا سکھائی کہ!

''رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا'' (آلِ عمران:۸)

یعنی اے اللہ ہدایت دینے کے بعد ہمارے دلوں کو ٹیڑھا نہ فرمانا۔

چنانچہ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے!

اَنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیۡہِ وَسَلَّمَ کَانَ یَقُولُ: " یَا مُقَلِّبَ الْقُلُوبِ ثَبِّتْ قَلْبِی عَلَی دِینِكَ ثُمَّ قَرَاَء : {رَبَّنَا لاَ تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ ھَدَیْتَنَا وَھَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ رَحْمَةً اِنَّكَ اَنْتَ الْوَھَّابُ۔

(تفسیر ابن ابی حاتم: ج، ۲، رقم: ۳۲۲۲، مکتبہ نزار مصطفیٰ الباز)

یعنی حضور یوں دُعا فرمایا کرتے تھے کہ! اے دلوں کے پلٹنے والے میرے دل کو اپنے دین پر قائم رکھ۔ اور پھر اُس کے بعد'' رَبَّنَا لاَ تُزِغْ قُلُوْبَنَا۔۔۔ الخ تک تلاوت فرمایا کرتے تو گویا اگر عبادت سے ہدایت پر ثابت قدم اور قائم رکھنے کی آرزو پیش کی جا رہی ہے۔

از برائے چارہ ایں قومہا　　آمد اندر ہر نمازے اھدنا
کیں نمازم رامیامیزا ے خدا　　بانماز ضالین اھلِ ریا

ترجمہ: ان قوموں کے چارے (اور فائدے) کے لیے ہر نماز میں ''**اِھْدِنَا**'' آیا ہے کہ اے اللہ میری نماز کو ''ضالین'' (گمراہوں) ریاکاروں کی نماز کے ساتھ نہ ملا۔

نکتہ: ہدایت نتیجہ ہے عبادت کا۔ اور عبادت موقوف ہے اللہ تعالیٰ کی مدد و اعانت پر۔ اور اعانت کا استحقاق اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے تسلیم کرنے اور اپنی عبدیت کے اظہار سے ہوتا ہے۔ اور ایسی ہدایت کا نفع اور فائدہ یومِ دین میں ظاہر ہوگا۔ تو گویا سورۂ فاتحہ کا ایک ایک لفظ مضمون کے لحاظ سے یہاں تک بالکل مربوط اور منسلک ہے۔

''اِھْدِنَا'' کی توضیح:

''اِھْدِنَا'' یعنی ہم کو ہدایت دے۔ مصلی باوجود ایک ہونے کے جو یہاں ''ہم'' کہہ رہا ہے۔ اس میں ایک تو اشارہ ہے لزومِ جماعت کی طرف۔ کہ اے مسلمانوں تمہاری عبادت اجتماعی شکل میں ہونی چاہئے جس پر ہم کا اطلاق ہو سکے۔ دوسرے امام صاحب کا مذہب عدمِ قرات خلف الامام بھی ثابت ہوتا ہے۔ کیونکہ آپ ''قراۃ الامام قراۃ المقتدی'' کی حدیث سے امام کی قرأت مقتدیوں کے لئے بھی کافی سمجھتے ہیں۔ تو ''نا'' سے معلوم ہوتا ہے کہ حقیقت میں وہ کافی ہو جاتی ہے۔ اسی واسطے امام سے بجائے ''میں'' کے لفظ ''ہم'' کہلوایا جاتا ہے۔ اور پھر چونکہ ''اِھْدِنَا'' دعا ہے اسلئے مصلی اپنی دعا میں اپنے دوسرے حاضر اور غیر حاضر بھائیوں کو بھی شامل کر لیتا ہے۔ تاکہ اگر یہ دعا اس کی نیکی و تقوی کے ذریعے قابلِ قبول ہو تو اس سے اس کے دوسرے مسلمان بھائی بھی محروم نہ رہیں۔ اور اگر اس کے ذاتی عیوب۔ معاصی اور نافرمانیوں کے باعث دربارِ ربی میں قابلِ اعتنا نہیں۔ تو شاید دوسرے شریک کئے ہوئے مسلمان بھائیوں میں سے کسی مقرب کے باعث ارحم الراحمین کے رحمت متوجہ حال ہو جائے۔ ایک مالی بھی جب ایک پھولدار یا پھلدار درخت کو پانی دینا چاہتا ہے تو اُس کے ساتھ کیکر، ببول، گھاس پات اور دوسرے بیکار جھاڑ پتیوں کو بھی پانی مل جاتا ہے۔ اسی طرح داعی جب اپنی دعا میں مقرب درختوں کو شامل کر کے بستانِ دنیا کے مالک سے

بارانِ رحمت کی التجا کرتا ہے تو ان پھلدار اشجار کے ساتھ اس کے کانٹے ببول کو بھی سیراب کر دیا جاتا ہے۔

اگر آپ ذرا غور کرینگے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اس ''نا'' (ہم) میں ایک ایسا سبق سکھایا ہے کہ جس پر پہلے مسلمانوں نے عمل کیا تو ان کو وہ عروج نصیب ہوا کہ جس کا آج یاد کرنا ''پدرم سلطان بود'' سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا ہے۔ اور جس کے اعراض سے دورِ موجودہ کے مسلمان اس انحطاط و تنزل کے غار میں جا گرے جس کی اتھاہ ہی نہیں۔ وہ کیا ہے؟ حضور پرنور کی زبانِ درفشاں ہی سے سن لو۔ آپ ﷺ فرماتے ہیں کہ! مسلمان پر چھ حقوق ہیں۔ جن کا مفصل بیان آگے ہو چکا ہے۔ اُن میں سے ایک حق یہ ہے۔ کہ!

''اَنْ یُّحِبَّ لِاَخِیْہِ مَا یُحِبُّ لِنَفْسِہٖ''

(صحیح بخاری: جز:۱، رقم: ۱۳، طبع دار طوق النجاۃ)

یعنی ہر ایک مسلمان اپنے دوسرے مسلمان بھائی کے لئے وہی چیز پسند کرے۔ جو خود وہ اپنے لئے پسند کرتا ہے۔

یعنی دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ!

دوسرا مسلمان گویا تمہارا مثنی ہے۔ اس کی تکلیف تمہاری تکلیف۔ اُس کی راحت تمہاری راحت۔ اُس کی مرضی تمہاری مرضی۔ اُسکی مکروہ تمہاری مکروہ ہونی چاہئے۔ اسی واسطے ''اِھْدِنِیْ'' کی جگہ ''اِھْدِنَا'' کہلوایا جاتا ہے تا کہ مسلمان قولاً اور فعلاً ایک دوسرے کے خیر خواہ اور بھائی بن جائیں۔ چنانچہ جب تک یہ جذبہ قول کے ساتھ فعل اور ملفوظ کے ساتھ معمول کی بھی حیثیت رکھتا تھا تو مسلمانوں نے وہ وہ کام کیئے کہ آج دنیا اُن کی کارگزاریوں کو حیرت کی نظر سے دیکھتی ہے۔ مگر جب سے مسلمانوں کا یہ قول قولِ محض رہ گیا تو اس وقت سے قوم کی قوم میں بدانتظامی آنی شروع ہو گئی۔

انسان کا وجود اتحادِ عناصر کا نتیجہ ہے:

انسان کا خود وجود تک اتحادِ افراد کا نتیجہ ہے اگر آج وہ ایک دوسرے کے بدخواہ ہو کر مختلف ہو جائیں۔ تو پھر یہ جسمانی ترکیب بھی چند لمحوں کی مہمان رہ جاتی ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

زندگانی آشتی دشمناں　　مرگ اور فتن با صل خویش دان
صلح دشمن داربا شد عاریت　　دل بسوئے جنگ ناز و عاقبت

یعنی انسان کی زندگی دشمنوں کی صلح کا نتیجہ ہے۔ اور اس کو موت ان دشمنوں کا اپنی اصلیت کی طرف لوٹ جانا ہے۔ یعنی انسان جو چار اجزاء مٹی۔ پانی۔ ہوا اور آگ سے بنا ہے۔

یہ چاروں کے چاروں اجزا ایک دوسرے کے سخت مخالف ہیں۔ ایک کا وجود دوسرے کے عدم کا مقتضی ہے مگر اُس قادرِ بے مثال کی صفتِ باکمال کے جلال و جمال کا نظارہ کرو۔ کیسے ان دشمنوں اور مخالفوں کو اعتدال پر لاکر انسان کے حیرت انگیز جسم کو مرکب فرمایا۔ اور غور کرو تو انسان کا وجود خود باری تعالیٰ کے وجودِ باجود پر زبردست دلیل ہے۔

انسان کا وجود ذاتِ باری پر زبردست دلیل ہے:

الماء والنار فی ذات قد اجتمعا
والماء والنار کیف الحال ضدان

ترجمہ: پانی اور آگ ایک ذات میں جمع ہو گئے اور پانی و آگ اس وقت ضدین کیسے ہیں۔

تو اب مولانا فرماتے ہیں کہ! اے شخص تو اس زندگی پر مغرور نہ ہو۔ غفلت کی پٹی آنکھوں سے ہٹا کر سوچ کہ دشمنوں کا ملاپ کب تک رہیگا۔ ایک نہ ایک دن وہ آپس میں مخالف ہو کر تیری زندگی کا خاتمہ کر دینگے۔

تو بیان یہ ہو رہا تھا کہ جب معاندین کے اتحاد سے زندگی جیسی میٹھی اور پیاری چیز ملتی ہے تو مسلمین کے اتحاد سے دین و دنیا کا وہ کونسا قلعہ ہے جو سر نہیں کیا جا سکتا۔ مگر افسوس اور ہزار افسوس کہ آج ہم مسلمانوں کی عملی زندگی آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے سراسر مخالف ہے۔ اور پھر اس صریح خلاف کے باوجود محبت کا دعویٰ "اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عَجِيْبٌ" کسی شاعر نے کہا ہے

تعصی الرسول وانت تظهر حبه　　هذا لعمری فی الزمان بدیع
لوكان حبك صادقا لاطعته　　ان المحب لمن يحب مطيع

ترجمہ: تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی نافرمانی کرتے ہو۔ اور اس کے باوجود ان سے محبت کا دعوی بھی کرتے ہو۔

میری عمر کی قسم تو زمانے میں نرالی ہی بات ہے، اگر تم اپنی محبت میں سچے ہوتے تو ان کی اطاعت کرتے اس لیے کہ سچا محب اپنے محبوب کی اطاعت کرتا ہے۔

اِھْدِنَا کے "نا" سے مسئلہ شفاعت کا استخراج:

اسی کے ضمن میں ایک اور مسئلہ بھی سن لیجئے۔ اور وہ مسئلہ شفاعت ہے۔ کیونکہ نا میں سے ایک مسلمان دوسرے مسلمان بھائیوں کے لئے دربار ربی میں دعا کے رنگ میں شفاعت و سفارش کرتا ہے۔ تو گویا اس سے یہ اشارہ بھی کیا جارہا ہے، کہ شفاعت حق ہے ایک مسلمان کو مسئلہ شفاعت پر بھی ایمان رکھنا اور جاننا ضروری ہے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

شنیدم که در روز اُمید و بیم
بداں را بہ نیکاں بہ بخشد کریم

جس طرح ایک انسان کو دنیا میں بعض وقت بعض دوستوں کی سفارش سزا سے بچا لیتی ہے۔ اسی طرح دنیا و آخرت میں مقربین کی شفاعت دربار ربی میں کام آتی ہے اور آئیگی۔ اور مقربین اس لئے کہ جیسے دنیا کا حاکم بھی سوائے کسی اپنے مقرب کے دوسرے کی سفارش قبول نہیں کرتا۔ اسی طرح دبارِ ربی میں بھی مقربین کا قول ہی مسموع و منظور ہوگا نہ کہ ہر کس ناکس کا آج جو بعض بناوٹی اور مصنوعی سجادہ نشین شفاعت کے کنٹریکٹر ہونے کا دعوٰے کرتے ہیں۔ اور بلا تقرب ہی۔ جیسا کہ ان کے اعمال۔ اقوال اور اعتقاد سے ظاہر ہوتا ہے۔ دوسروں کو بخشانے کے دعویدار بنتے ہیں۔ سراسر کذاب اور جھوٹے ہیں۔ حدیث شریف میں تو آتا ہے کہ!

اُس دن بڑے بڑے الوالعزم پیغمبر بھی نفسا نفسی پکار رہے ہونگے اور اپنی ادنیٰ سے ادنیٰ ذلت کے باعث حاضریِ دربار پر جرأت نہ کرسکیں گے۔ آخر کار حضور سرور عالم ﷺ کو اولین و آخریں کا شفیع بنا کر پیش کیا جائیگا اور آپ گنہگاروں کی شفاعت فرما کر اُنہیں انعاماتِ خداوندی سے بھرپور فرمائینگے۔

چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ!

حضور ﷺ نے ایک دفعہ صحابہ کرام سے فرمایا کہ! اے صحابہ کیا تم جانتے ہو کہ میں کیوں تمام مخلوقات کا سردار بنایا گیا ہوں۔ پھر آپ نے خود ہی فرمایا کہ! جب تمام مخلوقات میدانِ محشر میں جمع کر دی

جائیں گی اور سورج قریب آجائیگا تو لوگ غم اور تکلیف کی وجہ سے پریشان ہو کر کسی تشفیع کی تلاش کرینگے ۔ سب سے پہلے آدم علیہ السلام کے پاس آئینگے ۔ اور عرض کرینگے کہ اے صفی اللہ ۔ آپ تمام انسانوں کے باپ ہیں ۔ آپ کے قالب کو خود اللہ جل شانہ نے اپنے دستِ قدرت سے بنا کر نفخ روح فرمایا۔ آپ خلیفۃ اللہ اور مسجود ملائک ہیں ۔ اس لئے آپ مہربانی فرما کر آج رب العزت سے ہماری شفاعت کر کے موجودہ تکلیف کو ہم سے دور کروایئے ۔ حضرت آدم علیہ السلام فرمائینگے کہ ! اے لوگو: آج میرا رب اس قدر غضبناک ہے کہ یہ ایسا کبھی ہوا ہے اور نہ ہوگا۔ اور میں نے باوجود نہی کے شجر ممنوعہ سے جالیا تھا۔ اس لئے آج میری طاقت نہیں کہ میں اسکے حضور تمہاری سفارش کرسکوں ۔ تم نوح علیہ السلام کے پاس جاؤ ۔ چنانچہ لوگ آپ سے مایوس ہو کر نوح علیہ السلام کے پاس آینگے ۔ اور عرض کرینگے کہ اے نبی اللہ ۔ آپ کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں پہلا رسول بنا کر بھیجا۔ آپ کو عبداً شکوراً کے لقب سے ملقب فرمایا۔ اسلئے آپ مہربانی فرما کر آج ہماری سفارش کریں کہ اس تکلیف کو ہم سے دور کردیا جائے ۔ وہ فرمائینگے ۔ کہ اے لوگو۔ آج ذاتِ بابرکات اس قدر پرغضب ہے ۔ کہ نہ پہلے کبھی ہوئی اور نہ ہوگی ۔ مجھے دنیا میں ایک مقبول دعا کا موقعہ دیا گیا تھا۔ مگر میں نے اُسے اپنی قوم کی تباہی کے لئے استعمال کیا۔ اس واسطے آج مجھ میں کسی کی سفارش کی طاقت نہیں ۔ آج تو میری اپنی جان کا بچ جانا ہی بڑی غنیمت ہے ۔ تم ابراہیم کے پاس جاؤ ۔

چنانچہ لوگ وہاں سے حضرت ابراہیم کے پاس جا کر عرض کرینگے کہ اے خلیل اللہ اے اللہ کے مقرب ومعزز رسول ۔ ہماری حالت کو دیکھئے اور جنابِ باری میں ہماری سفارش فرما کر اس تکلیف کا ازالہ فرمائیں ۔ آپ فرمائینگے کہ اے لوگو۔ میں اس قابل نہیں کیونکہ میں نے تین ایسی باتیں دنیا میں کہیں تھیں جو بادی النظر میں سامع کو خلافِ واقع معلوم ہوسکتی تھیں ۔ اس لیے تم مجھے میرے حال پر چھوڑ دو اور موسیٰ سے جا کر اس کے متعلق عرض کرو ۔ لوگ اُن کے پاس جا کر کہیں گے !! اے موسیٰ! آپ اللہ کے کلیم اور اولوالعزم رسول ہیں ہماری حالتِ زار پر رحم کر کے دربارِ ربی میں سفارش فرمائیں کہ ہم سے آج کی تکلیف کو دور کیا جائے آپ فرمائیں گے اے لوگو! آج رب العزت کا غضب حدِ کمال پر ہے میں نے دنیا میں ایک ایسے آدمی کو قتل کیا ہے جس کے قتل کا مجھے حکم نہ تھا اس واسطے آج تو نفسانفسی ہے، تم حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے جا کر اس عرض

کو پیش کرو۔ لوگ اُن کے پاس آکر عرض کریں گے کہ اے رسول آپ کلمۃ اللہ ہیں، آپ روح اللہ ہیں، آپ نے پنگوڑے میں بات فرمائی، آج ہماری سفارش کر کے ہمیں اس دکھ سے نجات دلوائیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام فرمائیں گے کہ اے لوگو! آج تو باری تعالیٰ نہایت غضبناک ہے آج نفسا نفسی کا معاملہ ہے تم خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ بابرکت میں جاؤ۔ چنانچہ مخلوقات حضور ﷺ کی خدمت میں آکر عرض کرے گی کہ اے سردار انبیاء آپ خاتم المرسلین ہیں، آپ طاہر و مطہر ہیں اس واسطے نوازش فرما کر آج ہم لوگوں کی آپ شفاعت فرمائیں تا کہ رب العزت ہم سے اس تکلیف کو دور فرمادے۔ چنانچہ حضرت نبی کریم ﷺ فرماتے ہیں کہ میں جا کر عرش کے نیچے سجدہ میں گر جاؤں گا پھر اللہ تعالیٰ اُس وقت مجھے وہ نوازش فرمائیں گے جو اس سے پہلے آپ نے کسی نبی پر نہ فرمائی ہوگی۔ پھر حکم ہوگا!

”یَا مُحَمَّدُ ارْفَعْ رَأْسَكَ وَاشْفَعْ تُشَفَّعْ وَسَلْ تُعْطَهُ“

(سنن ترمذی: جزء ۴، رقم: ۲۴۳۴، دارالغرب الاسلامی بیروت)

یعنی اے محمد اپنا سر اُٹھایئے اور مانگئے دیا جائے گا اور شفاعت کیجئے آپ کی شفاعت قبول ہوگی۔

اس وقت حضور ﷺ شفاعت فرمانی شروع کریں گے۔

غم نخورد آنکه شفیعش توئی — پایه وه قدرِ رفیعش توئی
حاصلی از نیست زطاعت مرا — هست امیدے بشفاعت مرا

ترجمہ: وہ آدمی غم نہیں کھائے گا جس کے شفیع آپ ہیں اس کو بلند مرتبہ اور اونچا درجہ آپ ہی دینے والے ہیں۔ مجھے اپنی اطاعت (وعبادت) سے کچھ حاصل نہیں مجھے صرف آپ کی شفاعت کی اُمید ہے۔

نام نہاد پیر اور اُن کی شفاعت:

تو اب آپ ہی بتایئے کہ اُس ہولناک مقام میں جہاں آدم و نوح علیہما السلام جیسی مقدس ہستیاں نفسی نفسی پکار رہی ہوں گی اور نہایت ادنیٰ قسم کی ذلالت سے بھی وہ اس قدر محجوب ہوں گے کہ دربارِ ربی میں حاضر ہونے کی جرأت نہ کر سکیں گے تو پھر اس جگہ ان بہروپیوں اور نقالوں کا کیا حال ہوگا۔

شیخ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

دراں دم کہ از فعل پرسند وقول   اولوالعزم راتن بلرزد زہول
بجائے کہ دہشت خورند انبیاء   تو عذرے گناہاں چہ داری بیا

ترجمہ: اُس گھڑی کہ ہر قول و فعل کے بارے میں باز پرس ہوگی اولوالعزم رسولوں کے وجود بھی خوفِ الٰہی سے لرز رہے ہوں گے۔ جس جگہ انبیاء کرام بھی دہشت کھائیں گے تو گناہوں کا کیا عذر رکھتا ہے (اگر کوئی عذر ہے) تو لے آ۔

ان بہروپیوں کے اجارۂ شفاعت سے مجھے ایک حکایت یاد آگئی جسے سن کر اُمید ہے آپ بھی محظوظ ہوں گے۔

ایک پیر کا دلچسپ قصہ:

ایک دفعہ ایک گاؤں میں وہاں کے لوگوں کے آبائی پیر آئے۔ لوگوں نے دیکھا کہ آگے تو پیر صاحب خوب لحیم شحیم اور موٹے تازے تھے نہ معلوم غریب کو کیا بیماری ہوئی ہے کہ بالکل ہڈیوں کا ہار دکھائی دیتا ہے۔ ایک مرید نے جرأت کر کے عرض کی کہ صاحب کیا معاملہ ہے، کہاں وہ تن و توش اور کہاں یہ ہڈی اور پوست۔ پیر صاحب کا مرید سے یہ الفاظ سننا تھا کہ دھاڑیں مار مار کر رونا شروع کر دیا۔ مریدوں کو اس پر اور بھی تعجب ہوا اور جو غیر متوجہ تھے وہ بھی متوجہ ہو بیٹھے اور پیر صاحب سے اس لاغری اور گریہ وزاری کا باصرار سبب پوچھنے لگے۔ پیر صاحب نے ایک سرد آہ بھری۔

گاہ گاہ آہے دروغے مے زنی
ایں برائے مسکہ دوغے مے زنی

فرمایا! احمقو تم میرے مرید ہو اور میرے ساتھ باطنی تعلق رکھتے ہو۔ مگر تمہاری حالت پر سخت افسوس ہے کہ تمہیں آج تک میری کمزوری کا سبب معلوم نہ ہوا۔ سنو تم نہ نماز پڑھتے ہو، نہ روزہ رکھتے ہو، نہ حج کرتے ہو اور نہ زکوٰۃ دیتے ہو، تو پھر تم کس طرح پلِ صراط سے گذر سکو گے جو بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوگا۔ اس واسطے میں رات دن اُس پلِ صراط پر چلنے کی مشق کرتا رہتا ہوں تاکہ قیامت کے دن تم کو بھی باری باری وہاں سے امن و آرام کے ساتھ گزار سکوں اور یہی شوق اور رات دن کا ایسی دقیق و خطرناک چیز پر چلنا مجھے لاغر اور کمزور بنا رہا ہے۔ وہاں ہی ایک زمیندار بیٹھا تھا۔ اُس نے سوچا کہ پیر صاحب جب ہمارے لیے اتنی

تکلیف اُٹھاتے ہیں تو ہمیں بھی چاہیے کہ اُن کی محنت کا کچھ نہ کچھ معاوضہ دیں، اور اگر چہ وہ ہماری دنیوی پیش کردہ چیز کو قبول تو نہ کریں گے مگر پھر بھی ہماری طرف سے کم از کم پیش کر دینی ضروری ہے۔ چنانچہ وہ اُٹھا اور عرض کی یا حضرت جب آپ نے ہمارے لیے اس قدر مصیبتیں اُٹھانی گوارا فرمائی ہیں تو میں آپ کی خدمت میں اپنی طرف سے فلانا زمین کا قطعہ بطور ہدیہ پیش کرتا ہوں، اُمید ہے کہ آپ اسے قبول فرما کر میری عزت افزائی فرمائیں گے۔ پیر صاحب نے دیکھا کہ ایک مرغ تو دام میں آیا مگر ہے زمیندار اُس کی زبان کا کیا اعتبار اس سے جتنی جلدی ہو سکے زمین کا قبضہ لے لینا چاہیے، چنانچہ آپ نے فرمایا برخوردار تیرا ہدیہ قبول ہے مگر چل کر مجھے اُس زمین کا قبضہ دے دے تاکہ پھر بعد میں شیطان تجھے اس نیک کام کے پورا کرنے میں مانع نہ آسکے۔ چنانچہ زمیندار پیر صاحب کے ساتھ اُس زمین کا قبضہ دینے کے لیے روانہ ہوا مگر زمیندار دل میں بڑا پریشان کہ میں نے تو صرف ایک رسمی طور پر کہا تھا مگر پیر صاحب تو حقیقت سمجھ کر لینے کو تیار ہو بیٹھے لیکن اب کیا ہو سکتا ہے، اب تو زبان سے نکال چکا ہوں۔

چنانچہ زمیندار اسی کشش و پنج میں مبتلا پیر صاحب کو گاؤں سے باہر لاتا ہے جہاں سے لوگوں کی زمینیں شروع ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ زمینوں کی ڈولیں نہایت باریک اور اونچی تھیں۔ پیر صاحب تو ایسی ڈولوں پر چلنے کے عادی نہ تھے۔ ہاں زمیندار کو روزانہ آمد و رفت کے باعث پوری مشق تھی۔ زمیندار نے پیر صاحب کو آگے کیا کہ صاحب اس ڈول سے گزرنے کے بعد میری زمین شروع ہو گی۔ پیر صاحب جو چلنے لگے تو بوجہ مشق نہ ہونے کے بار بار ڈول سے پھسل کر گر جاتے۔ ایک دفعہ تو ایسے گرے کہ اگر جلدی ہاتھ سے بچاؤ نہ کرتے تو آپ کی بتیسی مبارک کا خاتمہ تھا۔ مگر غریب نے بتیسی کیا بچائی۔ کہ اوپر سے زمیندار نے لاتوں کی بوچھاڑ شروع کر دی۔ پیر صاحب نے بڑے پیر کی دہائی دینی شروع کر دی۔ کہ کمبخت مجھ سے کیا قصور ہو گیا ہے کہ تو مجھ مرے کو مارے جا رہا ہے زمیندار کہنے لگا کہ پیر صاحب کم بخت میں یا تم کہ تو جھوٹ بول کر مجھ سے زمین لینا چاہتا ہے۔ تو جب اس اتنی بڑی ڈول پر دو قدم نہیں چل سکتا۔ تو تو نے پلِ صراط پر چلنے کی کیا مشق کی ہو گی معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ سب ہماری حجامت کرنے کا تو نے ذریعہ سوچا تھا۔ چنانچہ پیر صاحب ضرب یضرب کی گردان اور وہ بھی زمیندار کے ہاتھوں، سیکھ کے ایسے بھاگے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ تو آج

کل ان نقالوں کی شفاعت بھی پیر صاحب کے اس پلِ صراط پر چلنے کے مطابق ہے۔

اصل کا کچھ فائدہ نہیں بلکہ عمل چاہئیے اس پر ہارون الرشید کا واقعہ:

بعض خانوادے اور سجادہ نشین، سادات یا پیرزادے ہونے کی وجہ سے اپنے آپ کو جنت کا اجارہ دار سمجھتے ہیں۔ انہیں نہ تو اپنے لئے کسی علم وعمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور نہ حلقہ بگوش خدام کے لئے۔ ان کیلئے بس اتنا کافی ہے کہ ان کا شجرہ نسب کسی صاحبِ ارشاد ہستی سے جا کر مل جائے۔

لکھا ہے کہ ہارون رشید جب حج سے لوٹا تو چند دن کوفہ میں ٹھہرا۔ اس کی عادت تھی کہ بند گاڑی میں جس کے ساتھ پردے لگے ہوئے تھے۔ بیٹھ کر شہر میں ادھر ادھر پھرتا۔ تا کہ کوئی شخص پہچان نہ لے۔ ایک دن جب اس کا گزر قبرستان کے پاس سے ہوا تو بہلول مجنون جو اس وقت کہیں وہاں بیٹھے ہوئے تھے زور زور سے ہارون رشید کہنا شروع کیا۔ ہارون رشید نے سوچا کہ ایسا شخص کون ہے جس نے مجھے پردوں کے اندر پہچان لیا اور پھر طرہ یہ کہ پہچان کر ایسی گستاخی کے ساتھ مخاطب کر رہا ہے۔ چنانچہ ہارون رشید نے گاڑی کھڑی کرنے کا حکم دیا اور خود پردے کو ہٹا کر باہر نکلا۔ دیکھا تو ایک مجنون سا شخص قبرستان کی دیوار کے ساتھ تکیہ لگائے پاؤں پھیلائے بیٹھا ہے ہارون رشید نے آگے بڑھ کر پوچھا کہ اے دیوانے کیا تو مجھے نہیں جانتا۔ حضرت بہلول نے فرمایا ہاں جانتا ہوں۔ تو وہ ہے کہ اگر کسی پر مشرق میں ظلم ہو تو اس کے متعلق تجھ سے مغرب میں سوال کیا جائیگا۔ بادشاہ سمجھ گیا کہ دیوانہ نہیں مستانہ ہے۔ پھر تو اور قریب ہوا اور پوچھا!

کیف تری حالی (تو میرا حال کیسا پاتا ہے)

بہلول علیہ الرحمہ نے فرمایا!

''اعرض علی الکتاب وھی اِنَّ الۡاَبۡرَارَ لَفِیۡ نَعِیۡمٍ ۝ وَاِنَّ الۡفُجَّارَ لَفِیۡ جَحِیۡمٍ ۝

(یعنی اپنے حال کو کتاب اللہ پر پیش کر کے دیکھ لے اور وہ یہ کہ نیکوں کے لئے نعمتیں اور بروں کے لئے جہنم ہے)

اس پر ہارون رشید نے کہا!

”وابن قرابت من رسول الله صلعم
(یعنی ہماری اور حضور کی قرابت پھر کدھر گئی)

حضرت بہلول علیہ الرحمہ نے فرمایا!

”فَاِذَا نُفِخَ فِي الصُّوْرِ فَلَا اَنسَابَ بَيْنَهُمْ
(جب صور پھونکی جائیگی۔ تو پھر نسب وغیرہ کا سلسلہ کچھ نہ رہیگا)

اس پر ہارون رشید نے کہا!

”وابن شفاعة
(کہ پھر حضور ﷺ کی شفاعت کدھر گئی) آپ نے فرمایا!

”يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلاً ()
(اس دن شفاعت کسی کو نفع نہ دیگی۔ مگر اسے جس کے لئے اللہ تعالیٰ اجازت دے اور اس کے لئے بات کو پسند کرے)

بادشاہ نے آپ کے برجستہ اور عالمانہ جوابوں کو سن کے تفتیش کی کہ وہ کون شخص ہے۔ معلوم ہوا کہ بہلول مجنون ہے۔ ہارون رشید نے کہا! واللہ اگر جنون اسی کو کہتے ہیں تو پھر ہمیں اس نام نہاد عقل سے کیا کام۔

زیں خرد بیگانہ مے باید شدن

دست در دیوانگی بائد زدن

ترجمہ: اس قسم کی عقل سے بیگانہ ہونا چاہیے اور دیوانگی میں ہاتھ ڈالنا چاہیے۔

اور اُسی دن سے بہلول مجنوں بہلول دانا کے نام سے مشہور ہونا شروع ہوئے۔ چونکہ اُمید و بیم کے دن سوائے اعمالِ صالحہ کے قرابتِ انبیاء اور عالی نسبی کچھ کام نہ دے سکے گی۔ اسی واسطے جب حضور ﷺ پر
”وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ()“ (الشعراء: ۲۱۴)
اور اے محبوب اپنے قریب تر رشتہ داروں کو ڈراؤ۔
کی آیت اُتری تو آپ نے اپنے سب اقارب کو مخاطب کر کے فرمادیا!

”یَا فَاطِمَةُ بِنْتُ مُحَمَّدٍ یَا صَفِیَّةُ بِنْتُ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ یَا بَنِیْ عَبْدِ الْمُطَّلِبِ لاَ اَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا سَلُوْنِیْ مِنْ مَالِیْ مَا شِئْتُمْ ۔

(صحیح مسلم: جز، ا، رقم: ۵۲۴، باب فی قولہ تعالیٰ وَ أَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الأَقْرَبِينَ، دار جیل بیروت)

یعنی اے میری پیاری بیٹی فاطمہ۔ اے میری پھوپھی صفیہ اور اے بنی عبد المطلب میں تمہارے لیے اللہ تعالیٰ سے کسی چیز کا مالک نہیں رہا، ہاں البتہ تم میرے مال سے جو چاہو وہ مانگ سکتے ہو۔

اس حدیث سے شفاعت کا انکار نہیں بلکہ شفاعتِ لاا ملک کے الفاظ سے باہر ہے۔ اس واسطے اس حدیث کا مسئلہ شفاعت پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اور شفاعتِ لاا ملک سے کیوں باہر ہے؟ اس کی تشریح میں عنقریب ہی کرتا ہوں۔ سرِ دست تو میں آپ کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ یہ مدعیانِ تصوف جو اپنے آپ کو بلا عمل و کسب ہی جنت کا ٹھیکیدار سمجھتے ہیں کہاں تک صحیح ہے۔

اگر صرف نسب اور اصل ہی کافی ہوتی تو کنعان کو ضرور نوح علیہ السلام کی نبوت سے حصہ دیا جاتا اور ابراہیم میں نعوذ باللہ آزر کا اثر ظاہر ہوتا۔ دیکھو کستوری کی اصل خون ہے اور عود کی اصل ایک جنگلی درخت۔ اب تم خود درخت اور خون کو عود اور مشک سے مقابلہ کرکے اصل اور فرع کے فرق کا صحیح اندازہ لگا سکتے ہو۔

مولانا روم فرماتے ہیں!

چو کنعان را طبیعت بی هنر بود   پیمبر زادگی قدرش نیفزود
هنر بنمای اگر داری نه گوهر   گل از خارست و ابراهیم از آزر

ترجمہ: جب کنعان کی فطرت بے ہنر اور اُجڈ تھی، پیغمبر زادگی (پیغمبر کی اولاد سے ہونے) نے اُس کی قدر نہیں بڑھائی۔ کوئی ہنر دکھا دے اگر تیرے پاس ہے نہ کہ ذات اور نسل۔ پھول کانٹے سے ہے اور ابراہیم علیہ السلام آزر سے۔

قرآنِ پاک میں آتا ہے!

”یُخْرِجُ الْحَیَّ مِنَ الْمَیِّتِ وَمُخْرِجُ الْمَیِّتِ مِنَ الْحَیِّ ط۔ (انعام: ۹۵)

یعنی: زندہ کو مردہ سے نکالنے اور مردہ کو زندہ سے نکالنے والا۔

کبھی زندہ یعنی مسلمان سے مردہ یعنی کافر کو پیدا کر دیا جاتا ہے اور کبھی برعکس۔

آدم علیہ السلام کیسے جلیل القدر انسان تھے اور قابیل کیسا دنی القلب بیٹا تھا۔ اسی واسطے شیخ علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

اصل را اعتبار چنداں نیست   روئے تر گل زخار خنداں نیست

مے زغورہ شود شکر از نے   عسل از نحل حاصل است بقی

ترجمہ: اصل کا اتنا اعتبار نہیں ہے پھول کا تروتازہ چہرہ کانٹے کی وجہ سے خنداں (ہنسنے والا) نہیں۔ شراب انگور سے حاصل ہوتی ہے، شکر گنے سے، شہد مکھی سے قے کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔

ہاں تو ہم اپنے مطلب سے بہت دور جا رہے ہیں۔ ''**اِھْدِنَا**'' میں ایک مسلمان دوسرے کی شفاعت کرتا ہے اور اس سے بات چھڑی جھوٹے پیروں کے دعویٰ شفاعت کی اور اس سے بات نکلی اُن کے غلط نسبیٔ تفاخر کے متعلق اور اسی میں ایک حدیث بیان ہوئی جس میں حضور ﷺ نے اپنی لختِ جگر اور پھوپھی صفیہ سے فرمایا!

لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللهِ شَيْئًا۔

اور اس پر میں نے عرض کی کہ اس ''لَآ اَمْلِكُ'' سے مسئلہ شفاعت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ اس واسطے یہاں پر اُس عدمِ تعلق کی تشریح کرتا ہوں تاکہ ایک طرف تو یہ تفصیل ہو جائے اور دوسری طرف عیسائیوں کے کفارے اور مسلمانوں کی شفاعت کا فرق بھی سمجھ میں آجائے۔

شفاعت کی تشریح:

شفاعت کا لفظ لغت میں شفع سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں جوڑا۔ اور جو نقیض ہے وتر کا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بعض گناہ گار بندے نیکوں کے ساتھ جڑنے کی وجہ سے عذابِ آخرت سے بچا لیے جائیں گے اور شفاعت جیسا کہ میں آگے بیان کر چکا ہوں ایک دعا ہوگی جس کو حضور ﷺ دربارِ ربی میں سربسجود ہو کر قبول کروائیں گے۔ اب اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائیگا کہ اسلامی مسئلہ شفاعت میں نہ تو کفارہ کی طرح افراط ہے اور نہ تفریط۔ بلکہ اھدنا الصراط المستقیم کے ''نا'' میں مسئلہ شفاعت کو پوشیدہ رکھ کر شفاعت میں

صراطِ مستقیم کو دکھا دیا۔ کیونکہ مسئلہ کفارہ کے معتقدین تو بخشش میں اس قدر بڑھے کہ کفارہ پر ایمان لانے کے بعد گناہوں کو حدِ گناہ ہی سے نکال دیا۔ اور صاف کہہ دیا کہ کفارہ پر ایمان لانے کے بعد کوئی گناہ بھی اخروی سزا کا باعث نہیں بن سکتا۔ کیونکہ خدا کا اکلوتا بیٹا (نعوذ باللہ) ہمارے تمام گناہوں کا کفارہ بن کے مصلوب ہو چکا ہے۔ اور پھر مسئلہ تناسخ کے ماننے والوں نے اللہ تعالیٰ کو قانون کے سامنے ایسا مجبور کیا کہ اس سے عفو و بخشش کی طاقت ہی کو سلب کر دیا۔ لیکن اسلام نے اگر ایک طرف یہ فرمایا!

”مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ط۔ (البقرۃ:۲۵۵)

کہ کون ہے جو اس کے پاس بغیر اجازت کے سفارش کرے۔

تو دوسری طرف!

”وَلَا یَشْفَعُوْنَ اِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰی۔ (انبیاء:۲۸)

اور نہیں شفاعت کریں گے مگر اسی کے لئے جسے اللہ تعالیٰ پسند فرمائے۔

تو گویا شفیع بھی باذنہٖ ہو گا اور مشفوع لہ بھی اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ ہی ہو گا نہ کہ ہر ایک۔ پس شفاعت نہ تو شفاعت کرنے والے کے اختیار کی چیز ہو گی کہ جب اور جس کے لئے چاہے کرے۔ بلکہ شفیع و مشفوع لہ دونوں کا تعلق اذنِ خداوندی سے ہو گا۔ اور یہی مطلب ہے ”لا املك“ کا۔ تو گویا اذن نے اگر ایک طرف کفارہ کہ تعمیم کو باطل کیا تو دوسری طرف تناسخ کی بھول بھلیوں کو بھی غلط ٹھہرا کر صراطِ مستقیم کی طرف رہنمائی کر دی۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا شفیع عاصیاں ہونا:

اب حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا قیامت کے دن شفیع ہونا اور شفاعت کبریٰ کے درجہ نوازا جانا قرآنِ پاک میں بالاجمال اور احادیث میں بالتصریح موجود ہے۔ جنہوں نے اس اذنِ قرآنی کے ابہام کو باحسنِ وجوہ حل کر دیا ہے۔

قرآن پاک میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر نور کے شفیع یوم النشور ہونے پر“

”عَسٰۤی اَنْ یَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝“۔ (بنی اسرائیل:۷۹)

قریب ہے کہ تمہیں تمہارا رب ایسی جگہ کھڑا کرے جہاں سب تمہاری حمد کریں۔

کی آیت دلالت کرتی ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ نے خود مقامِ محمود کے معنی مقامِ شفاعت بیان فرمائے ہیں۔ پھر اللہ جل شانہٗ نے سورہ والضحیٰ میں فرمایا ہے!

''وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى ()۔(الضحیٰ:۵)

اور بے شک قریب ہے کہ تمہارا رب تمہیں اتنا دے گا کہ تم راضی ہو جاؤ گے۔

اور معتزلہ جو اپنے انکار شفاعت پر!

''وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِيْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْـًٔا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا شَفَاعَةٌ ۔(البقرۃ:۴۸)

اور ڈرو اس دن سے جس دن کوئی جان دوسرے کا بدلہ نہ ہو سکے گی اور نہ کافر کے لئے کوئی سفارش مانی جائے وغیرہ جیسی آیتیں پیش کرتے ہیں وہ سب کی سب کفار کے حق میں ہیں نہ کہ گنہگار مسلمانوں کے لئے۔ احادیث شریف سے ثابت ہوتا ہے کہ اس دن فرشتے، شہدا، علماء، حفاظ، اولیاء اور چھوٹے بچے تک اپنے متعلقین کی سفارش کریں گے۔ مگر یہ سب شفاعتیں جزئی ہیں شفاعتِ کلی یا کبریٰ کے سردار آقائے نامدار صلی اللہ علیہ وسلم ہونگے۔ سچ ہے۔

اس ماہ رُو کا سب سے نرالا ہی طور ہے   دلبر تو بہت ہیں پر وہ دلبر کچھ اور ہے
آفاقہا گردیدہ ام، مہرِ بتاں ورزیدہ ام   بسیار خوباں دیدہ ام، لیکن تو چیزے دیگری

ترجمہ: آفاق و اطرافِ عالم میں پھرا ہوں میں نے۔ بہت سے حسینوں سے محبت کی ہے، بہت سی حسینوں کو میں نے دیکھا ہے لیکن اے مصطفیٰ ﷺ آپ اور چیز ہیں۔

اللهم صلى الله سيدنا و مولانا محمد خاتم الانبيا والمرسلين، رحمة اللعالمين و شفيع المذنبين۔ وعلى اله واصحابه الطاهرين الطيبين۔

سبیل اور طریق کو چھوڑ کر صراط لانے کی وجہ:

اب اس کے بعد الصراط المستقیم ہے یعنی سیدھا رستہ، صراط کے مترادف اور ہم معنی سبیل اور طریق وغیرہ الفاظ بھی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے لفظ الصراط کو یہاں منتخب فرما کر بیان کیا۔ تا کہ اس لفظ سے نمازی کا ذہن پُلِ صراط کی طرف بھی منتقل ہو جائے۔ اور وہ یہ سمجھ جائے کہ اگر یہاں پر صراطِ مستقیم کو اختیار کیا۔

تو وہاں پُلِ صراط پر گزرنے میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہوگی۔ کیونکہ یہ آگے بیان ہو چکا ہے کہ صراطِ مستقیم افراط و تفریط کے درمیان ہے۔ یا صراطِ مستقیم دو نقطوں کے درمیان سیدھے سے سیدھا خط ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ دو نقطوں کے درمیان سیدھے سے سیدھا خط صرف ایک ہی ہو سکتا ہے۔ باقی جس قدر خطوط ان دو نقطوں کو ملائینگے۔ وہ سب کے سب منحنی اور ٹیڑھے ہونگے۔ تو گویا صراطِ مستقیم نہایت باریک اور عسیر العبور رہے۔ باقی ٹیڑھے رستے کثیر ہونے کے باعث بڑے اور سہل العبور رہیں۔ اسی واسطے دنیا میں گمراہوں کی تعداد ہدایت یافتوں سے ہمیشہ زیادہ رہی ہے۔ اور اخلاقِ رزیلہ کا ظہور اخلاقِ فاضلہ کی نسبت بہت زیادہ ہوتا ہے۔ مگر جو شخص اس صراطِ مستقیم کے دقیق اور کٹھن رستے پر چلنے کی تکلیف گوارہ کر لیتا ہے تو وہ اس رستے کو عبور کرنے کے بعد دوسری جانب نہایت اعلیٰ قسم کے روح افزا باغات کو پاتا ہے۔ جن میں اسے ایک ابدی اور لطیف سرور حاصل ہوتا ہے۔ مگر جو شخص اس رستے پر چلنے کی تکلیف نہیں اٹھا سکتا۔ بلکہ ٹیڑھے اور سہل العبور رستوں کو اختیار کرتا ہے تو بالآخر وہ رستے کے اندر ہی یا دوسری طرف شقاوت وضلالت کی جہنم میں جا گرتا ہے۔ جہاں اس کے جسم اور روح کو نہایت ہی دردناک عذابوں سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔ اسی طرح جو شخص اس دنیا میں شریعت کے مجوزہ صراطِ مستقیم پر چلنے کا عادی ہو جاتا ہے۔ تو قیامت میں اسے اس اخروی صراطِ مستقیم پر جو اس صراطِ مستقیم کا مثنیٰ ہوگا۔ چلنے میں کسی قسم کی دِقت محسوس نہ ہوگی۔

پُلِ صراط:

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ وہ رستہ بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہوگا۔ اس کی نیچے جہنم اور پرلی طرف بہشت ہوگی۔ جو لوگ مطیع ہونگے وہ اس پر اپنی نیکی اور اطاعت کے موافق تیزی سے عبور کرینگے۔ کوئی بجلی کی چمک کی طرح گذریگا۔ کوئی ہوا کی طرح، کوئی پرندوں کی طرح، کوئی گھوڑے کی طرح اور کوئی اس سے کم اور کوئی اس کم۔ پُلِ صراط پر اندھیرا ہوگا جس میں صرف ایمان کی روشنی کام دے سکے گی۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب ایماندار جنت کو جائینگے اور پُلِ صراط کے اندھیرے میں ان کا ایمانی نور ان کی رہنمائی کریگا تو وہ باری تعالیٰ سے عرض کرینگے!

''رَبَّنَا اَتْمِمْ لَنَا نُوْرَنَا وَاغْفِرْ لَنَا اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ○۔ (تحریم:۸)

یعنی ہمارے رب ہمارے نور کو ہمارے لئے کامل فرما ایسا نہ ہو کہ وہ بجھ جائے۔ اور ہم ظلماتِ صراط کو عبور نہ کر سکیں۔ اور ساتھ ہی غفران و احسان سے ہمارے مدارج کو بلند فرما۔ کیونکہ تو ہر چیز پر قادر ہے۔

مگر منافق جن کے پاس ایمانی نور نہ ہوگا۔ اس دن نہایت ذلیل وخوار ہوں گے اور حسرت بھرے لہجے میں مومنین سے عرض کرینگے کہ اے مومنو ذرا ٹھہرو تاکہ ہم بھی تمہارے نور کی روشنی میں اس رستے کو طے کر سکیں۔ اس وقت مومن کیا جواب دینگے۔ قرآنی الفاظ میں آپکو سناتا ہوں ارشاد ہوتا ہے!

’’یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِیْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِیْهِ الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ۔ (الحدید: ۱۳)

یعنی جس دن منافق مرد وعورت مومنوں سے کہیں گے ذرا ہمارا انتظار کرو کہ ہم بھی تمہارے نور سے روشنی حاصل کریں۔ حکم ہوگا کہ اپنے پیچھے کو لوٹ جاؤ اور نور تلاش کرو۔ پس ان کے درمیان ایک دیوار کھڑی کر دی جائے گی۔ جس میں ایک دروازہ ہوگا۔ دروازے کے اندر کی طرف رحمت وبخشش کا نظارہ ہوگا اور باہر کی طرف عذاب وعتاب کا منظر۔

چونکہ منافقین دنیا میں صراطِ مستقیم پر نہ چلتے تھے۔ اس واسطے آج وہ آخرت میں بھی صراطِ مستقیم پر نہ چل سکیں گے۔ حکم ہوگا!

’’ارْجِعُوْا وَرَاءَ كُمْ ‘‘ کہ واپس جاؤ اور نور تلاش کرو۔

یعنی اب جیسا تمہارا واپس دنیا میں لوٹنا محال ہے۔ ایسا ہی تمہارے لئے اب نور کا حاصل کرنا بھی محال ہے۔

’’ارْجِعُوْا وَرَاءَ كُمْ‘‘ میں ایک لطیف اشارہ:

اور اس ’’ارْجِعُوْا وَرَاءَ كُمْ ‘‘ میں ایک اور بھی لطیف اشارہ ہے کہ بعض لوگوں کو جب عباداتِ مالیہ کی ترغیب دی جائے تو وہ کہتے ہیں کہ پیچھے بچہ ہے۔ بیوی ہے بھائی ہے۔ یہ سب صدقات وخیرات سے ثواب پہنچاتے رہیں گے۔ گویا اللہ تعالیٰ کو حکم تو تھا کہ!

’’وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ۔ کہ اپنے آنے سے پہلے اپنے لئے روشنی بھیج دو۔

مگر یہ حضرات اپنے پیچھے سے روشنی کے آنے کے امیدوار تھے۔ اور یہ ایک ایسی موہوم امید ہے جو ہزاروں میں سے کسی ایک آدھ قسمت والے کی ہی پوری ہوتی ہے۔ سچ ہے۔

تو باخود ببر توشۂ خویشتن
کہ شفقت نیامد زفر زند و زن

ترجمہ: تو اپنا توشۂ آخرت خود اپنے ساتھ لے جا کیونکہ بیٹوں اور بیوی سے شفقت نہیں آئے گی۔

تو اس واسطے ارشاد باری ہوتا ہے! ''ارْجِعُوْا وَرَاءَكُمْ'' کہ اب وہ اپنے پیچھے آنے والی روشنی سے جس کے ساتھ تمہاری امیدیں وابستہ تھیں نور حاصل کر کے پُلِ صراط کو عبور کرو۔ مگر پیچھے سے تو روشنی کوئی آئی نہیں۔ اس واسطے عبورِ صراط بھی نہ ہو سکا۔

مضمون سابق پر ایک نصیحت آموز واقعہ:

کہتے ہیں کہ ایک شخص کو جب کسی مالی عبادت کے لئے کہا جاتا تو وہ یہی جواب دیتا کہ مال زیادہ ہے اور بفضلہ تعالیٰ اولاد بھی کثیر اور نیک ہے۔ کیا یہ میرے مرنے کے بعد میرے پیچھے کچھ نہ کریں گے۔ ایک دن وہ ایک بیٹے کے ساتھ اندھیری رات میں کہیں جا رہا تھا۔ بیٹے کے ہاتھ میں لالٹین تھی۔ اور وہ باپ کے ادب کے لئے اس کے پیچھے چل رہا تھا۔ لالٹین کے پیچھے ہونے کی وجہ سے اسے اچھی طرح سجھائی نہ دیتا تھا۔ آخر ایک جگہ جب کسی پتھر سے ٹھوکر لگی تو بیٹے کو نہایت غصے ہو کر کہنے لگا۔ کہ احمق تیرے لالٹین لانے کا کیا فائدہ۔ روشنی تو آگے ہونی چاہیے کہ رستے کے اونچ نیچ کو دیکھا جا سکے۔ بیٹے نے فوراً عرض کی کہ ابا آپ تو ہمیشہ یونہی کہا کرتے ہیں کہ میرے وارث میرے پیچھے میری اخروی روشنی کا انتظام کر دینگے۔ تو اگر ایسا ہی ہے کہ پیچھے لالٹین رکھنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ تو پھر آپ کو وہاں پر پچھلوں کی روشنی سے کیا فائدہ حاصل ہو گا۔ اس شخص نے جب ایک کمسن بچے کی زبان سے یہ الہامی الفاظ سنے تو پکار اٹھا۔

جزاک اللہ چشمم باز کردی
مرابا جانِ جاں ہمراز کردی

ترجمہ: اللہ تجھے بہترین بدلہ عطا کرے کہ تو نے مجھے حقیقت سے آشنا کر دیا۔

تو مطلب یہ بیان ہو رہا تھا کہ ایمانی روشنی اور وہ بھی آگے بھیجی ہوئی ظلماتِ صراط پر کام کر سکے گی۔

شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

چوں ہمہ نیک و بد بباید مرد　خنک آنکس کہ گوے نیکی برُود
برگِ عیشے بگور خویش فرِست　کس نیارد زِپس از پیش فرِست

ترجمہ: جب ہر نیک و بد نے (آخر) مر جانا ہی ہے تو خوش قسمت وہ آدمی ہے جو نیکی کے میدان میں جیت گیا۔ آخرت کی زندگی کا سامان اپنی قبر میں خود بھیج تیرے پیچھے کوئی نہیں پہنچائے گا تو پہلے سے بھیج دے۔

اسی واسطے حدیث شریف میں آتا ہے!

’’اَنَّ الْعَبْدَ اِذَا مَاتَ قَالَ النَّاسُ مَا خَلَّفَ وَقَالَتِ الْمَلَائِکَةُ مَا قَدَّمَ۔

(تفسیر القرطبی: جزء، ۲، سورۃ البقرۃ: ۱۰۹، دارالکتب المصریہ قاھرہ)

یعنی جب آدمی مر جاتا ہے تو لوگ کہتے ہیں کہ اس نے پیچھے کیا چھوڑا ہے اور فرشتے کہتے ہیں کہ اس نے آگے کیا بھیجا ہے۔

ولقد احسن القائل۔

قدم لنفسك قبل موتك صالحاً
واعمل فليس الى الخلود سبيل

ترجمہ: اپنی موت سے پہلے اپنے لیے صالح عمل بھیج دے اور عمل کرتے رہو کیونکہ دنیا میں ہمیشہ رہنے کا کوئی راستہ نہیں۔

عبادتِ مالی مردے کو ضرور فائدہ دیتی ہے:

میرا یہ مطلب نہیں کہ پیچھے کے صدقہ وخیرات کا مردے کو ثواب نہیں پہنچتا۔ پہنچتا اور ضرور پہنچتا ہے۔

قرآن پاک صاف فرما رہا ہے!

’’وَنَکْتُبُ مَا قَدَّمُوْا وَآثَارَهُمْ ۔(یٰسین: ۱۲)

کہ ہم مردوں کے آگے بھیجے ہوئے اور پچھلے اعمال کو لکھتے ہیں۔

حدیث شریف میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم بالتصریح فرما رہے ہیں!

''اِذَا مَاتَ الْاِنْسَانُ انْقَطَعَ عَمَلُهُ اِلَّا مِنْ ثَلَاثٍ صَدَقَةٌ جَارِيَةٌ وَعِلْمٌ يُنْتَفَعُ بِهِ وَوَلَدٌ صَالِحٌ يَدْعُوْ لَهُ۔ (صحیح مسلم: جز، ۵، رقم: ۴۳۱۰، دار جیل بیروت)

یعنی جب انسان مرجاتا ہے تو اس کے تمام اعمال منقطع ہو جاتے ہیں۔ مگر تین۔ ایک صدقہ جاریہ مثل مسجد، سرائے، پل، تالاب وغیرہ۔

شیخ سعدی فرماتے ہیں۔

ازاں کس که خیرے بماند رواں　　دما دم رسد رحمتش بر رواں
نمرد آنکه ماند پس از وئے بجائے　　پل و مسجد و خان و مہمان سرا ے
ہراں کو نماند از پس اش یادگار　　درخت و جودش نیاوردِ بار
وگر رفت و آثار خیرش نماند　　نشاید پس مرگ الحمد خواند

ترجمہ: جس شخص سے جاری بھلائی باقی رہ جائے اُس کو ہر دم اللہ کی جاری رحمت پہنچتی رہے گی۔ وہ آدمی نہیں مرا جس کے جانے کے بعد اُسکی طرف سے پُل اور مسجد و مسافر خانہ اور مہمان خانہ باقی رہ جائے۔ جس کسی کے پیچھے کوئی یادگار باقی نہیں رہی اُس کے وجود کا درخت پھل نہیں لائے گا، اور اگر وہ چلا گیا اور اُس سے خیر کے آثار باقی نہ رہے تو شاید اُس کے مرنے کے بعد الحمد شریف یعنی فاتحہ نہ پڑھا جائے۔

دوسرے علمِ نافع۔ کیونکہ غیرِ نافع مضر یا پوشیدہ ہے تو وہ الٹا وبال ہے اور ایسے عالم کے حق میں وارد ہے کہ من کتم علما الجم بلجام من النار۔

(تفسیر الرازی: جلد ۳، سورہ البقرۃ، صفحہ ۱۳۸، دار الکتب العلمیہ بیروت)

(الرد علی القائلین للقاری: ص، ۳۷، دار المامون للتراث دمشق)

اور تیسری اولادِ صالح۔ کیونکہ طالح بجائے فائدہ کے الٹی باعثِ تکلیف ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان تین چیزوں کو اس لئے مستثنیٰ فرمایا ہے کہ اگر غور کیا جائے تو انسان دو چیزوں سے مرکب ہے۔ جسم اور روح سے۔ جسم کی اولاد۔ ایک تو مال ہے اور جسے ہاتھ پاؤں اور دوسرے اعضا سے

کماتا ہے دوسرے بچے۔ جو اس کے جسم کا خلاصہ ہوتے ہیں۔ اور روح کی اولاد علمِ نافع ہے۔ اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ان دونوں اجزا کے تینوں بچوں مال، اولاد اور علمِ نافع کے اعمال کو غیرِ منقطع فرما کر بہت بڑی بشارت دے دی ہے۔ کہ اگر تم ان کو شریعت کے مطابق استعمال کرو گے۔ تو وہ تمہیں تمہارے بعد بھی فائدہ پہنچاتے رہیں گے۔

تو گویا میرا مطلب پچھلی روشنی سے متمتع نہ ہوسکنے کا یہ ہے کہ وہ ہزاروں میں سے کسی ایک آدھ ہی کے حصے میں آتی ہے۔ اور ایسے خوش نصیب افراد بہت ہی کم ہوتے ہیں کہ جن کو ان کے ورثا ان کے مرنے کے بعد بھی غفران و احسان کی روشنی بھیجتے رہیں۔ لہٰذا بجائے اس موہوم اُمید کے کیوں نہ یقینی روشنی آگے بھیجنے کی کوشش کی جائے۔

دیکھئے بات کہاں سے کہاں نکل گئی۔ بیان یہ ہو رہا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے لفظِ صراط میں مصلی کے ذہن کو پُلِ صراط کے واقعے کی طرف بھی منعطف فرمایا ہے کہ اے شخص دنیا میں صراطِ مستقیم یا دینِ حق پر چلنے کی ممارست رکھ۔ اس سے پُلِ صراط پر چلنا بھی نہایت آسان ہو جائیگا۔ اور اگر تو یہاں پر وسطِ حقیقی کو چھوڑ کر افراط وتفریط کے غلط رستوں پر بھٹکے گا تو وہاں بھی پُلِ صراط سے پار ہونے کی بجائے جہنم کی وادیوں میں جا گرے گا۔ اس واسطے دینِ حق، صراطِ مستقیم اور اعتدالِ حقیقی پر چلنے کی عادت پیدا کر۔ تاکہ دارین کی کامیابیوں سے نواز دیا جائے۔ ورنہ ابدی ندامت اور دوامی خجالت اٹھانی پڑے گی۔

ندامت اور اس کی چار قسمیں:

کتابوں میں لکھا ہے کہ ندامت چار قسم کی ہوتی ہے۔ یعنی ایک دن کی ندامت ایک سال کی ندامت۔ عمر بھر کی ندامت اور ابدی ندامت۔

ایک دن کی ندامت تو یہ ہے کہ انسان کھانے کے وقت بلا کھائے گھر سے نکلے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب دوسرے مکان پر پہنچتا ہے۔ تو کھانے کا وقت ختم ہو چکتا ہے۔ اس لئے وہ بھی یہ سمجھ کے کر گھر سے کھا کر آیا ہوگا۔ اس کے کھلانے کا اہتمام نہیں کرتا۔ لہٰذا تمام دن بھوکا رہ کر ندامت اٹھاتا ہے۔ سال کی ندامت یہ ہے کہ تمام سال بیکار گزارا اب جب کہ اس کے ہم پیشہ اپنی محنتوں کا پھل جمع کر رہے ہیں۔ یہ اپنی سستی کی

وجہ سے کفِ افسوس ملتا ہے۔ مثلاً ایک لڑکا ہے تمام سال سکول میں کچھ نہیں پڑھتا۔ اختتامِ سال پر امتحان میں فیل ہو کر افسوس کرتا ہے یا ایک تاجر تمام سال بیکار گزارتا ہے۔ اور پھر سٹاک نکالتے وقت نقصان پر متاسف ہوتا ہے۔ اور عمر بھر کی ندامت یہ ہے کہ عورت ملے مگر خلافِ طبع۔ دونوں کی طبیعتوں میں بہت بڑا فرق ہے تو یہ عمر بھی کی ندامت ہوتی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں!

”ان الجنة فی الدنیا المراة الصالحة وفی الاخرة الحوراء۔ وعذاب النار المراة السوء۔

ترجمہ: بے شک نیک عورت دنیا میں جنت ہے اور آخرت میں حور (حوروں کی سردار) ہوگی اور بری عورت آگ کا عذاب ہوگی۔

دِلۡآرَام باشد زن نیک خواہ
ولے از زن بد خدایا پناہ

ترجمہ: نیک خو عورت دل کے لیے آرام کا باعث ہوتی ہے لیکن بد اخلاق عورت سے خدا کی پناہ مانگنی چاہیے۔

اور ابدی پشیمانی یہ ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف چلے اور اپنی دنیوی زندگی کو اس کی نافرمانیوں میں گزارے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان اعمالِ طالحہ کی پاداش میں وہ ابدی ندامت اٹھاتا ہے چنانچہ ان کی ندامت کو اللہ تعالیٰ قرآن پاک میں بیان فرماتے ہیں۔

ندامتِ اخروی:

کہ ایسے نافرمان وہاں پر کہیں گے!

”رَبَّنَآ اَخِّرۡنَآ اِلٰٓی اَجَلٍ قَرِیۡبٍ ۙ نُّجِبۡ دَعۡوَتَکَ وَنَتَّبِعِ الرُّسُلَ ؕ۔ (الانبیاء: ۴۴)

اے اللہ ہمیں تھوڑی سی مہلت دیجیے کہ ہم تیری دعوت کو قبول کریں گے۔ اور تیرے پیغمبروں کی پیروی کریں گے۔

دوسری جگہ آتا ہے!

”رَبَّنَآ اَخۡرِجۡنَا مِنۡهَا فَاِنۡ عُدۡنَا فَاِنَّا ظٰلِمُوۡنَ ()۔ (المومنون: ۱۰۷)

اے اللہ ہمیں اس عذاب سے نکال دے اور اگر ہم نے پھر دوبارہ یہ کام کیا تو ہم ظالم ہونگے۔

اس پر ارشاد باری ہوگا!

”قَالَ اخْسَـُٔوْا فِيْهَا وَلَا تُكَلِّمُوْنِ ○۔(المومنون:۱۰۸)
یعنی اسی میں ذلیل ہو کر رہو اور میرے ساتھ بات نہ کرو۔
تو اب یہ ندامت ابدی کیسی بری ندامت ہوگی۔

اللهم وفقنا بطاعتك وحسن عبادتك واحفظنا من شرور الدنيا والاخرة وقنا عذاب النار۔

صِرَٰطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ **کی تفسیر:**

رستہ اُن لوگوں کا جن پر تو نے انعام فرمایا۔

جب مصلی نے اھدنا الصراط المستقیم کہہ کر راہِ راست کے دکھائے جانے کی نہایت عاجزانہ وفدویانہ درخواست کی۔ تو اب اللہ جل شانہ اسی کی زبان سے صراطِ مستقیم کو معین فرماتے ہیں۔

ارشاد ہوتا ہے!

”صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۔(الفاتحہ:٦)
یعنی رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے انعام فرمایا۔

گویا دوسرے لفظوں میں اللہ تعالیٰ مصلی کو ارشاد فرماتا ہے کہ اگر تو صراطِ مستقیم پر چلنے کا خواہاں ہے تو میرے منعم علیہم بندوں کے رستے پر چلنے کی کوشش کر۔ انہی کا رستہ سیدھا اور مستقیم ہے۔ اگر باری تعالیٰ صراطِ مستقیم کی تفسیر ”صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ“ سے نہ فرماتے۔ تو ہر ایک باطل پرست اپنے رستے کو صراطِ مستقیم سے تعبیر کر سکتا تھا۔ مگر ان لفظوں نے ان کے باطل قلعوں کو ھباءً منشورا کر دیا۔ کیونکہ منعم علیہم فرقے اللہ تعالیٰ نے سورہ نساء کے نویں رکوع میں یوں فرمائے ہیں!

”وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ؕ○۔(النساء:٦٩)

یعنی جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریگا تو اس کا حشر ان لوگوں کے ساتھ ہوگا جو منعم علیہم ہیں یعنی اللہ تعالیٰ نے انعام فرمایا ہے۔ اور وہ لوگ انبیاء، صدیق، شہداء اور صلحا ہیں۔ اور یہ نہایت اچھے رفیق ہیں۔

چونکہ:

”اَلْقُرْآنَ یُفَسِّرُ بَعْضُهٗ بَعْضًا“۔

قرآن کا بعض حصہ بعض حصے کی وضاحت کرتا ہے۔

(عمدۃ القاری: جز ۱۹، سورۃ الزمر، دار احیاء التراث العربی بیروت)

اس لئے گویا رب العزت تلقین فرما رہے ہیں کہ اے صراطِ مستقیم کے جویا ان کی اتباع اختیار کر۔ انہی کے طریقے پر چلنے کا نام راہِ راست اور صراطِ مستقیم ہے۔

انبیاء علیہم السلام: انبیاء علیہم السلام وہ مقدس گروہ ہے جو ذاتِ باری سے بذریعہ وحی احکام حاصل کر کے لوگوں کو دینِ حق اور صراطِ مستقیم کی طرف بلاتے ہیں۔ وہ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا و غیرِ رضا سے آگاہ کر کے سلوکِ رضامندی پر چلنے کی ہدایت فرماتے ہیں۔

وحی اور اس کی اقسام:

وحی لغت میں خفیہ طور پر کسی چیز کی خبر دینے کو کہا جاتا ہے۔ اسی میں اشارہ جو کسی پیغمبر پر بحیثیت نبی ہونے کے نازل ہوتی ہے۔ اس لئے شرعی اصطلاح میں غیرِ انبیاء کو صاحبِ وحی نہیں کہا جاتا۔ ہاں لغوی معنی کے لحاظ سے غیرِ انبیاء پر اس کا اطلاق ہوا ہے۔ جیسے: ”وَ اَوْحٰی رَبُّكَ اِلَی النَّحْلِ (النحل: ٦٨)۔ ”وَاَوْحَیْنَآ اِلٰٓی اُمِّ مُوْسٰی ۔(القصاص: ٧) وغیرہ

جن حضرات کو باری تعالیٰ منصبِ نبوت سے سرفراز فرماتے ہیں۔ ان کو اللہ جل شانہٗ قرآنِ پاک کی اس آیت کے مطابق تین طریقوں سے علم عنایت فرماتے ہیں!

”وَ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ یُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْیًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ یُرْسِلَ رَسُوْلًا فَیُوْحِیَ بِاِذْنِهٖ مَا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ عَلِیٌّ حَكِیْمٌ ۝ ۔(الشوریٰ: ۵۱)

یعنی کسی انسان کی یہ شان نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس سے کلام کرے۔ مگر یا تو بذریعہ القاء فی القلب یا الہام کے اور یا

پردے کے پیچھے سے اور یا کوئی فرشتہ بھیج کر اپنے حکم سے جو چاہے وحی کرے وہ بلند حکمت والا ہے۔

تو گویا اس آیت کی رو سے وحی کی تین قسمیں ہو جاتی ہیں۔

الہام:

الہام یعنی دل پر کلام الٰہی کا نازل ہونا خواہ بیداری کی حالت میں ہو یا خواب میں۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کی خوابیں سچی ہوتی ہیں۔

چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے!

”رُؤْیَا الْمُؤْمِنِ جُزْءٌ مِنْ سِتَّةٍ وَاَرْبَعِیْنَ جُزْءًا مِنَ النُّبُوَّةِ۔

(صحیح بخاری: جز،۹، رقم:۶۹۸۷، باب، الرویاء الصالحۃ، طبع دار طوق النجاۃ)

یعنی مومن کا خواب نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں!

”ذَهَبَتِ النُّبُوَّةُ، وَبَقِیَتِ الْمُبَشِّرَاتُ۔

(سنن الدارمی: ج،۲، رقم:۲۱۳۸، دار الکتاب العربی بیروت)

کہ نبوت تو ختم ہو گئی مگر ہاں مبشرات باقی ہیں۔

صحابہ کرام نے عرض کی!

قَالُوا: یَا رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا الْمُبَشِّرَاتُ؟ قَالَ: رُؤْیَا الْمُؤْمِنِ وَهِیَ جُزْءٌ مِنْ أَجْزَاءِ النُّبُوَّةِ

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مبشرات کیا ہیں۔ فرمایا مومن کی خواب۔ اور وہ نبوت کے حصوں میں سے ایک حصہ ہے۔

تو جب ایک مومن کی خواب نبوت کے حصوں میں سے ایک حصہ قرار دی جائے۔ تو خود انبیاء علیہم السلام کی خوابیں کس طرح جزوِ وحی نہ سمجھی جائیں گی۔

انبیاء کی خوابیں وحی کا درجہ رکھتی ہیں اور اس پر یوسف علیہ السلام کی خواب:

حضرت یوسف علیہ السلام کی خواب کے متعلق تو آپ نے سنا ہوگا۔ سورۂ یوسف جو بارہویں سپارہ

سے شروع ہو کر تیرھویں میں جا کر ختم ہوتی ہے۔ اس میں یوسف علیہ السلام کی اس خواب کو نہایت ہی دلکش اور جاذبانہ پیرایہ میں آپ ہی کی زبان سے ادا کیا گیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے!

”اِذْ قَالَ یُوْسُفُ لِاَبِیْهِ یٰۤاَبَتِ اِنِّیْ رَاَیْتُ اَحَدَ عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَیْتُهُمْ لِیْ سٰجِدِیْنَ○ قَالَ یٰبُنَیَّ لَا تَقْصُصْ رُءْیَاكَ عَلٰۤى اِخْوَتِكَ فَیَكِیْدُوْا لَكَ كَیْدًا ؕ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ○۔ (یوسف: ۴،۵)

یعنی جب یوسف علیہ السلام نے باپ یعقوب علیہ السلام سے عرض کی کہ اے باپ میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے اور سورج اور چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں۔ اس پر یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ اے بیٹے اس خواب کو اپنے بھائیوں سے نہ بیان کرنا۔ ورنہ وہ تیرے لئے کوئی خراب تجویز سوچیں گے۔ کیونکہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے۔

چنانچہ اس کے بعد جب حضرت یوسف علیہ السلام **بِک** کر **عزیزِ** مصر ہوتے ہیں۔ اور آپ کے بھائی بمع والدین کے کنعان سے مصر کو آتے ہیں۔ یوسف علیہ السلام کو دیکھ کر سجدۂ تعظیمی میں گر جاتے ہیں۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام ان کو اُٹھا کر گلے لگاتے ہیں اور فرماتے ہیں!

”یٰۤاَبَتِ هٰذَا تَاْوِیْلُ رُءْیَایَ مِنْ قَبْلُ ۫ قَدْ جَعَلَهَا رَبِّیْ حَقًّا ؕ۔ (یوسف: ۱۰۰)

کہ اے میرے باپ یہ میرے خواب کی تعبیر ہے اور میرے رب قدیر نے اسے سچا کر دکھایا۔

دیکھو۔ یہ خواب حضرت یوسف علیہ السلام کا قبلِ بعثت تھا۔ مگر پیغمبروں کو احادیثِ صحیحہ کی رو سے قبلِ نبوت یا ابتدائے بعثت میں تقرب کے آثار رویائے صالحہ کے رنگ میں دکھائے جاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے بخاری شریف میں مروی ہے کہ!

”اَوَّلُ مَا بُدِئَ بِهٖ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الْوَحْیِ الرُّؤْیَا الصَّالِحَةُ فِی النَّوْمِ، فَكَانَ لَا یَرٰى رُؤْیَا اِلَّا جَاءَتْ مِثْلَ فَلَقِ الصُّبْحِ۔

آنحضرت ﷺ پر وحی کا ابتدائی دور اچھے سچے پاکیزہ خوابوں سے شروع ہوا۔ آپ خواب میں جو کچھ دیکھتے وہ صبح کی روشنی کی طرح صحیح اور سچا ثابت ہوتا۔

(صحیح البخاری: جزا، رقم: ۳، باب، کیف کان بدء الوحی الی رسول، صفحہ ۷، طبع دار طوق النجاۃ)

نکتہ: لکھا ہے کہ جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اس خواب کو اپنے والد سے محترم سے بیان کیا تو ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسوؤں کی بارش ہونے لگی۔ یوسف علیہ السلام نے عرض کی کہ اے پدر بزرگوار کیا وجہ ہے کہ آپ اس بشارت پر بجائے خوشی کے اشکبار ہو رہے ہیں۔ یہ خواب تو باعثِ سرور وجبور ہے۔ نہ کہ وجہ رنج ومحن۔ حضرت نے فرمایا۔ اے بیٹا۔ خواب کے بیان کرنے میں تو نے جس لفظ سے ابتداء کی ہے۔ وہ انجام کار کسی آنے والے غم ورنج کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ یوسف علیہ السلام نے عرض کی۔ کہ حضرت وہ کونسا لفظ ہے۔ آپ نے فرمایا۔ بیٹا۔ وہ لفظ انی ہے۔ ابو البشر علیہ السلام کی پیدائش سے لے کر آج تک جس کسی نے بھی ''اَنَا یَالِیْ یَا عِنْدِیْ یَا نَحْنُ '' یا اور کوئی ایسا لفظ جس سے بوئے انانیت اور خودی آتی ہو کہا ہے تو اللہ تعالیٰ نے آخر کار اسے ضرور کسی نہ کسی ابتلا میں مبتلا فرمایا ہے۔ دیکھئے ملائکہ نے '' نَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ '' کہا تو آدم علیہ السلام کے سامنے جھکائے گئے اور اعلانیہ ''سُبْحَانَكَ لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا '' کا اقرار کروایا گیا۔

ابلیس نے ''اَنَا خَیْرٌ مِّنْهُ '' کہا تو '' فَاخْرُجْ إِنَّكَ مِنَ الصَّاغِرِیْنَ '' کی سزا کا مستوجب ہوا۔

قارون نے ''عِنْدِیْ خَزَائِنُ الْاَرْضِ '' منہ سے نکالا ''فَخَسَفْنَا بِهٖ وَبِدَارِهِ الْاَرْضَ ۚ '' کا تازیانہ کھایا۔

فرعون نے ''اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَ هٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ '' کا دعویٰ کیا تو '' فَغَشِیَهُمْ مِّنَ الْیَمِّ مَا غَشِیَهُمْ '' کے مطابق اسے بمعہ اس کی تمام قوم کے دریا برد کر دیا گیا۔ نہ معلوم اب تجھ پر اس لفظ کی وجہ سے کیا ابتلا نازل ہو۔

وہ ابتلا کیا تھی۔ مدت تک والدین سے جدائی، بھائیوں کی دشمنی، غلامی، عورتوں کی تہمت، قید و بند، یہ کیا تھا محض ان کا زبانِ درفشاں سے نکالنا۔ کیونکہ ایسی معزز ہستیوں کے منہ سے ایسے الفاظ کو بھول کے بھی نکلنا۔ حسنات الابرار سیئات المقربین کی شق میں جا داخل ہوتا ہے۔ اسی طرح رب العزت نے پھر آپ کی ابتلاء کو دور فرمانے کے بعد والدین سے ملاقات، بھائیوں سے محبت، عفت کا اعلان، مصر کی عزیزی بھی عنایت فرمائی۔ اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے سورۂ یوسف کو قرآن شریف میں احسن القصص کے نام

سے یاد فرمایا ہے۔ کیونکہ اس کے لفظ لفظ پر حالات کے بدلنے کے باوجود واقعہ کو اس قدر دلکش اور جاذب پیرایہ میں بیان فرمایا ہے کہ ایک غیر متعصب انسان کا دل خود بخود قرآنِ پاک کے کلامِ الٰہی ہونے کا اعتراف کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ کہیں حاسد و محسود کا نظارہ ہے۔ تو کہیں شاہد و مشہود کا۔ کہیں مالک و مملوک (غلام) کا بیان ہے تو کہیں عاشق و معشوق کی رنگینیاں۔ کہیں حبس و اطلاق کا منظر ہے تو کہیں خصب و جذب کا۔ کہیں ذنب و عفو کا ذکر ہے تو کہیں فراق و وصال کا۔ ایک جگہ سقم و صحت کا نقشہ ہے۔ تو دوسری جگہ ذلت و عزت کا۔ ایک جگہ اقامت کا بیان ہے۔ تو دوسری جگہ ارتحال و انتقال کا۔ غرضیکہ ایک چھوٹی سی سورت میں باوجود اختلافِ حالات و رنگینی واقعات کے اس پر ترتب تنظیم اور جاذبانہ فصاحت سے کام لیا گیا ہے کہ بے ساختہ منہ سے ما ھذا کلام البشر نکل جاتا ہے۔

نئی روشنی والوں کا صحت خواب پر اعتراض اور اس کا جواب:

آج کل نئی روشنی کے تعلیم یافتہ حضرات خواب کی صحت اور صدقِ تعبیر کا انکار کر دیتے ہیں کہ انسانی بدن کا قیام چار خلطوں سے ہے۔ صفراء، خون، سودا اور بلغم۔ اب اگر ان میں سے کوئی خلط بقیہ اخلاط پر غالب آجائے تو نیند میں خون، زردی، آگ، چراغ، سورج یا اور ایسی اشیا جو زرد یا زردی مائل ہوں نظر آتی ہیں۔ اور اگر خون غالب آجائے تو خواب میں شراب، باغ، گانا بجانا اور دوسری عیش و تنعم کی چیزیں دکھائی دیتی ہیں۔ اور اگر سودائی خلط کا غلبہ ہو جائے تو سوتے وقت سیاہی، تاریکی، بگولے، آندھیاں، ڈر، خوف اور دوسرے بھیانک منظر نظر آتے ہیں۔ اور بلغمی خلط کے غلبہ کے وقت سمندر، دریا، نہریں، کپڑے، کاغذ اور دوسری سفید اشیاء نظر آتی ہیں۔

لیکن اگر غور کیا جائے تو فوراً معلوم ہو جاتا ہے کہ ان کی یہ دلیل اور تقریر سراسر غلطی اور کم فہمی پر مبنی ہے۔ کیونکہ ہم میں سے ہر ایک نے سینکڑوں دفعہ ایسی خوابیں دیکھی ہیں کہ جن کا بیان کردہ رنگوں سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا۔ اور بعض دفعہ یہ چاروں کے چاروں رنگ ایک ہی خواب میں نظر آجاتے ہیں۔ اور پھر وہی ڈراما جو ہم رات کو دیکھتے ہیں۔ بسا اوقات عالم بیداری میں دنیا کی سٹیج پر دکھایا جاتا ہے۔ اس واسطے کسی شخص کا خواب کے صدق و صحت سے کلیۃً انکار کرنا صریح غلطی ہے ہاں اس سے ہر ایک شخص کی ہر ایک

خواب کا باوثوق ہو جانا بھی ثابت نہیں ہوتا مگر ہم کلام کر رہے ہیں ۔ انبیاء علیہم السلام کی خوابوں کے بارے میں جو عالمِ بیداری کے احکام کی طرح حتمی اور یقینی ہوتی ہیں اسی واسطے انبیاء علیھم السلام ان خوابوں پر اسی طرح عمل کرتے ہیں ۔ جس طرح کہ وہ عالمِ بیداری کے احکام کو واجب التعمیل سمجھتے ہیں ۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خواب:

چنانچہ میں مثالاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک خواب کو بیان کرتا ہوں ۔ جس سے آپ پر انبیاء علیہم السلام کے خوابوں کی وحی کی طرح قابلِ عمل اور عالمِ بیداری کی طرح قابلِ تصدیق ہونا بخوبی واضح ہو جائے گا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو چھیاسی سال کی عمر میں جس میں عموماً ابنائے آدم کا سلسلۂ تولید منقطع ہو جاتا ہے ۔ بڑی دعاؤں، آرزوؤں اور التجاؤں کے بعد حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادت کی بشارت دی گئی ۔ ”اسمع“ کہتے ہیں سن لینے کو اور ”ایل“ کہتے ہیں اللہ کو ۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے خلیل کی دعاؤں کو سن کر شرفِ قبولیت عطا فرمایا ۔ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی ولادتِ باسعادت ظہور میں آئی ۔ بیٹے کی وجہ سے خلیل اللہ کا قلبی میلان بی بی ہاجرہ کی طرف دیکھ کر بی بی سارہ نے عرض کی ۔ کہ آپ اسی وقت اس بچے کو اس کی ماں سمیت میرے گھر سے نکال دیں ۔ کیونکہ میں ہرگز نہیں دیکھ سکتی ۔ کہ آپ میرے ہوتے ہوئے میرے ہی گھر میں ان ماں بیٹے کو اپنی محبت و عنایت کا مورد بنا کر میرے دل کو رنج کیا ۔

یہاں پر سوال کہ بی بی سارہ جیسی پاکباز اور ولیہ خاتون کے سینہ بے کینہ میں ایسا خیال پیدا ہونا ان کے رتبہ عالیہ کے خلاف ہے ۔ قابلِ اعتنا نہیں ۔ کیونکہ یہ سب کچھ بتقاضائے بشریت تھا جس کے مقابلے میں قویٰ بشریہ نحیف وضعیف ہیں ۔

چنانچہ آپ نے چند دن تک اس معاملہ میں ارشاد باری کا انتظار کیا ۔ بالآخر وحی نازل ہوئی کہ اے خلیل: اپنی عفیفہ بیوی اور چہیتے بیٹے کو لے کر عرب کے فلاں لق و دق صحرا میں چھوڑ اور پھر دیکھ کہ ہماری کریمی و بے نیازی کیا گل کھلاتی ہے ۔ اور اس وادیٔ غیر ذی زرع کو کس طرح زرع و ذیشان بنایا جاتا ہے ۔ چنانچہ آپ نے حکمِ ربی کی تعمیل فرمائی اور فوراً بی بی صاحبہ اور کمسن بچے کو لے کر اس مقام کی طرف روانہ ہو

گئے۔ جس جگہ آج دنیا کے ستر کروڑ مسلمانوں کا قبلہ وکعبہ ہے۔ اور جہاں پر ہر سال دنیا کے کونے کونے سے لاکھوں مسلمان اس شمعِ ہدایت پر پروانہ وار طواف کرنے کے لئے جاتے ہیں۔ اب میں اختصار کے لئے اس سب واقعہ کو چھوڑ کر وہاں سے بیان کرتا ہوں کہ جہاں سے خواب کا تعلق ہے اور جس کی وجہ سے ہم موجودہ واقعہ کو بطور دلیل پیش کر رہے ہیں۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنی فرمانبردار بیوی اور عظیم المرتبت لاڈلے کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کر کے واپس ہو گئے۔ تو حضرت اسماعیل علیہ السلام اس ہو کے عالم میں اپنی شفیقہ ماں کی خدمتِ تربیت پا کر حدِ بلوغ کو پہنچے۔ اس اثناء میں حضرت ابراہیم علیہ السلام ہر سال آتے اور ماں بیٹے کی خیر و عافیت معلوم کر کے واپس چلے جاتے۔ جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی عمر باختلافِ اقوال سات، نو یا تیرہ برس کی ہوئی تو حضرت خلیل اللہ کو خواب میں ارشاد ہوا کہ اے ابراہیم۔ جا اور میرے نام پر اپنے اکلوتے بیٹے کو ذبح کر۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب دربارِ ربی سے مطالبہ اسمٰعیل کی بشارت پائی تو دل بلیوں اچھلنے لگا۔ چہرے پر بجائے رنج وغم کے خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ کہنے لگے زہے قسمت کہ میرا ربِ جلیل اپنے دیئے ہوئے تحفے کو میری طرف منسوب کر کے مانگ رہا ہے۔ کسی عاشق صادق نے کیا ہی سچ کہا ہے۔

ولو بید الحبیب سقیت سماً
لکان السم من یدہ یطیب
وقد قیل۔ ضرب الحبیب۔ زبیب

ترجمہ: اگر محبوب کے ہاتھ سے مجھے زہر پلایا جائے تو اُس کے ہاتھ سے زہر بھی اچھا ہے۔ محبوب کی مار میٹھی ہوتی ہے۔

تعمیل میں کیا تامل تھا رخت سفر باندھ عازم سفر حجاز ہوئے۔ بیوی اور بیٹے سے مل کر آنکھوں کو ٹھنڈا کیا۔ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو گلے سے لگایا اور پیار کیا۔ تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ آپ نے حضرت اسماعیل علیہ السلام سے فرمایا بیٹا چھری اور رسی لے لو تا کہ جنگل سے جلانے کے لئے لکڑیاں کاٹ لائیں۔ اسمٰعیل نے فوراً چھری اور رسی لی اور باپ کے ساتھ خوشی خوشی کوہ شبیر کے نشیب کو روانہ ہو گئے۔ وہاں پہنچ کر

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیٹے سے اپنی تمام خواب کا ماجرا بیان کیا اور فرمایا!

’’یٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰی فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی ؕ۔ (الصفت : ۱۰۲)

یعنی اے میرے بیٹے میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ تجھے ذبح کر رہا ہوں ۔ تو دیکھ کہ تیری کیا رائے ہے ۔ دیکھئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی خواب کو کالوحی سمجھتے ہیں اور اس کی تعبیر کو عملی جامہ پہنانے کے متعلق اپنے جگر گوشہ سے مشورہ فرما رہے ہیں ۔ ذیشان بیٹا بھی یہ نہیں کہتا کہ اے باپ خواب خواب ہے اس کی حیثیت خیالاتِ پریشان سے زیادہ نہیں ۔ کیا آپ ایک خواب کے لئے میرے حنجرہ پر چھری پھیرنا چاہتے ہیں ۔ مگر سبحان اللہ، محترم اور پیارا بیٹا بھی اپنی معصوم زبان سے عرض کرتا!

’’یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ٘ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ () (الصفت : ۱۰۲)

کہ اے مقدس باپ، جو تجھے حکم دیا گیا ہے اسے کر ڈال، ان شاء اللہ تو مجھے صبر کرنے والوں میں سے پائے گا۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی رقت انگیز وصیت:

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد آپ نے اپنے برگزیدہ باپ سے عرض کی کہ اے میرے باپ، اس سے قبل کہ آپ مجھے اللہ کے رستے میں قربان کریں ۔ چند ایک باتیں آپ کی خدمت میں عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں ۔ اول یہ کہ آپ چھری کو خوب رگڑ لیں اور ذبح کرتے وقت میرے ہاتھ پاؤں کو خوب مضبوط باندھ دیں تا کہ نہ تو گلے کے کٹنے میں دیر ہو اور نہ ہی تڑپتے وقت آپ کے مبارک کپڑوں پر میرے خون کی چھینٹیں پڑ سکیں ۔

اگر خون بریزی غم ندارم زاں ہمے ترسم
کہ ناگاہ دامن پاکت شود از خونم آلود
(ترجمہ) ڈر نہیں قتل کا خوف اس کا مجھے ہے کہ تیرا
دامنِ پاک نہ ہو خون سے میرے آلود

دوسرے یہ کہ مجھے ذبح کرتے وقت منہ کے بل لٹائیں ۔ تا کہ میرا چہرہ کہیں آپ کی محبت کو بھڑکا کر کار خیر میں

تاخیر نہ ڈال دے۔ اور تیسرے یہ کہ اگر مناسب سمجھیں تو میرا خون آلودہ کرتہ میری ماں کو دے دیں۔ تاکہ شاید اس کا مغموم دل اس کو دیکھ کر تسلی و تشفی پائے۔

چنانچہ باپ اور بیٹے کی یہ جگر دوز باتیں ختم ہونے کے بعد عملی تعبیر کا فوٹو قرآنی الفاظ میں یوں اترتا ہے!

''فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَ تَلَّهٗ لِلْجَبِيْنِ ۔ (الصفّت: ۱۰۳)

سوجب دونوں نے فرمانبرداری ظاہر کی اور رویا کو عملی جامہ پہنانے کے لئے تیار ہو گئے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے کریم النفس بیٹے کو اس کی درخواست کے مطابق ماتھے کے بل لٹایا۔ چھری کو تیز کیا اور قرۃ العین کے نازک گلے کو کاٹنے کے لئے اپنے ہاتھ چلانے شروع کئے۔

ملاء اعلیٰ میں کہرام مچ گیا۔ عالم ملکوتی کی سبوح قدوس کہنے والی مخلوقات بھی اس عجیب منظر سے متحیر و مضطرب تھی۔ مگر کسے طاقت کہ جبروتی بارگاہ میں زبان تک ہلا سکے۔ چھری کا چلنا تھا کہ فرشتے حیرت و استعجاب سے پکار اٹھے۔ اللہ اکبر۔ اللہ اکبر نیچے سے حضرت ذبیح نے فرمایا۔ لاالہ الااللہ واللہ اکبر۔ اس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا اللہ اکبر وللہ الحمد۔ یعنی آپ نے فرشتوں کے اضطراب، بیٹے کی اطاعت اور اپنے سکون کو دیکھ کر اللہ جل شانہٗ کا شکریہ ادا کیا کہ اتنی بڑی ابتلاء میں بھی میرے نہ تو قدم ڈگمگائے اور نہ ہی ہاتھوں کو لرزش ہوئی۔

حضرت لقمان کا سبق آموز واقعہ:

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ لقمان اثنائے سیاحت میں ڈاکوؤں کے ہاتھ گرفتار ہو گئے۔ انہوں نے آپ کو غلام کی حیثیت سے ایک مالدار شخص پر بیچ دیا۔ آپ زمانے تک اس کی خدمت اور چاکری (نوکری) کرتے رہے۔ ایک دفعہ مالک نے آپ کو ایک حنظل کا ٹکڑا دیا اور کہا کہ اے لقمان دیکھ تو اس ککڑی کا کیا مزہ ہے۔ آپ نے مالک کے ہاتھ سے اس حنظل کے ٹکڑے کو لے کر اس خوشی سے کھایا کہ گویا وہ مصری کی ڈلی یا مٹھائی کی قاش تھی۔ کھا چکنے کے بعد مالک نے کہا۔ اے لقمان یہ ککڑی تو نہ تھی۔ بلکہ حنظل کا نہایت ہی کڑوا ٹکڑا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ اے مالک مجھے معلوم تھا کہ یہ ککڑی نہیں بلکہ حنظل تھا مگر مجھے شرم آئی کہ اس ہاتھ

کا یہ تحفہ کہ جس کے ہاتھ سے سینکڑوں نہیں بلکہ ہزاروں دفعہ مٹھائیاں کھا چکا ہوں۔ کڑوا سمجھ کر کھانے میں ہچکچاؤں اور حکم کے بجالانے میں کسی قسم کی پس و پیش کروں۔ بلکہ ؎

ہرچه ز دوست میر سد نیکو است
نشود نصیبِ دشمن که شود ہلاک تیغت
سرِ دوستاں سلامت که تو خنجر آزمائی

ترجمہ: دوست کی طرف سے جو کچھ پہنچتا ہے وہ اچھا ہے۔ دشمن کے نصیب میں یہ نہ ہو کہ تیرے تیغ سے ہلاک ہو، دوستوں کا سر سلامت رہے کہ تو خنجر آزمائے۔

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے بیٹے کی قربانی پر وللہ الحمد فرما کر اس ابتلائے ربی کو منجملہ انعام خداوندی کے قرار دیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے پوری قوت سے اُس ریشمی حلقوم پر چھری پھیری۔ مگر وہاں تو صرف امتحان منظور تھا نہ کہ خون بہانا۔ وہاں تو تقویٰ و اطاعت کی قربانی قبول کی جاتی ہے نہ کہ لحم و شحم کی۔ اسی واسطے تو فرمایا!

’’لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ؕ۔ (الحج:۳۷)

یعنی ان قربانیوں کے گوشت اور خون اللہ کو نہیں پہنچتے بلکہ اسے تو تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔

چنانچہ حضرت خلیل علیہ السلام و ذبیح علیہ السلام کے صدق و اطاعت پر رحیمِ بے عدیل کی رحمت و رافت کا بحرِ بے کراں جوش میں آتا ہے۔ چھری کو حکم ہوتا ہے کہ اے چھری۔ خبردار۔ ہمارے حبیب کے ولدِ لبیب کو کسی قسم کی ایذا نہ پہنچانا۔ یہی وجہ تھی کہ چھری ربِ جلیل کے حکم سے ایسی کند اور بیکار ہو گئی۔ کہ حضرت خلیل باوجود انتہائی کوشش کے اپنے مطلب میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آپ چھری کے اس فطرتی اثر کے زائل ہو جانے پر بڑے حیران ہوئے اور غصے میں آ کر چھری کو زمین پر دے مارا۔ لکھا ہے کہ چھری زمین پر لگ کر جو اچھلی تو ہوا میں ٹڈی کو لگی اور پھر قریب کے پانی میں گر کر ایک تیرتی ہوئی مچھلی کو گھائل کر گئی۔ یہ وہی ابراہیمی ذبح ہے جو آج تک آپ کی اولاد کے کام آ رہا ہے۔ اور ان دونوں چیزوں کو بلا ذبح ہی کھایا جاتا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا چھری پر غصہ کرنا اورچھری کا جوابِ لاجواب دینا:

آپ نے چھری سے پوچھا کہ اے چھری آج تجھے کیا ہوگیا ہے کہ باوجود اس قدر تیز ہونے کے تو اسمٰعیل جیسے بچے کا نازک گلا نہیں کاٹ رہی۔ کیا تو لوہا ہی نہیں یا اور کسی بات نے تیرے فطرتی اثر کو زائل کر دیا ہے۔ چھری نے زبان حال سے عرض کی کہ اے خلیل اللہ میری طبیعت نہیں بدلی۔ میں وہی لوہا ہوں مگر کیا کروں کہ اگر آپ ایک دفعہ کاٹنے کا حکم دیتے ہیں تو باری تعالیٰ ستر دفعہ کاٹنے سے منع فرماتے ہیں۔ تو اب آپ ہی بتائیے کہ میں ایک حقیر سے مخلوق رب العزت کے فرمان عالیشان کے برخلاف کیا کر سکتی ہوں۔

مولانا روم صاحب کی زبان سے چھری کا جواب سنئے کہتی ہے۔

طبع من دیگر نگشت و عنصرم
تیغ حقم ہم بدستورے برم

کہ اے خلیل اللہ میں وہی چھری ہوں۔ مگر میں حق تعالیٰ کی تلوار ہوں۔ اور اجازت خداوندی ہی سے کاٹ سکتی ہوں۔ بالاستقلال مجھ میں **قطع و برید (کاٹنے چھانٹنے)** کی کوئی طاقت نہیں۔

بر درِ خرگاہ سگانِ تر کمان
چاپلوسی کردہ پیش مہمان

دیکھئے ترکمانی قوم کے کتے جوان کے خیموں کے دروازے پر پڑے رہتے ہیں۔ اگر کوئی مہمان یا جان پہچان والا آتا ہے تو وہ کس طرح خوشامد اور چاپلوسی کرتے ہیں ان کو دیکھ کر دم ہلاتے ہیں۔ ان کے پاؤں کو چومتے ہیں اور اپنے مالک کے تعلق کا بہت لحاظ رکھتے ہیں

من زسگ کم نیستم در بندگی
کم زترکی نیست حق در زندگی

ترجمہ: فرمانبرداری اور بندگی میں کتے سے کم نہیں ہوں زندگی میں حق تعالیٰ ترکی مالک سے کم نہیں۔

جب ایک فانی و محتاج انسان کا کتا اپنے مالک کا اس قدر خیال رکھے کہ اپنے مالک کے دوست و دشمن

میں تمیز کرے۔ تو کیا میں کتے سے بھی فرمانبرداری اور اطاعت میں کم ہو جاؤں۔ اور اس حی و قیوم اور غنی و بے نیاز مالک کا حق ترکی سے بھی کم سمجھ لوں۔

اس پر مولانا رحمۃ اللہ علیہ نتیجہ نکال کر فرماتے ہیں۔ کہ

باد و خاک و آب و آتش بندہ اند
بامن و تو مُردہ باحق زندہ اند

ترجمہ: ہوا مٹی پانی اور آگ بندہ ہیں، میرے اور تیرے ساتھ مُردہ اور حق کے ساتھ زندہ ہیں۔

قرآن عناصر کو زندہ کہتا ہے:

یعنی یہ ہوا، مٹی، پانی اور آگ اللہ تعالیٰ کے بندے اور مطیع ہیں۔ اگرچہ وہ ہمارے تمہارے لئے مردہ ہیں۔ مگر حق تعالیٰ کے روبرو زندہ اور حی ہیں۔ اور ان کو بھی علیٰ حسب المراتب معرفت اور اطاعت حاصل ہے قرآن پاک سے بھی ان عنصریات یا ان کے مرکبات کا زندہ ہونا ثابت ہوتا ہے۔ چنانچہ پتھروں کے متعلق قرآن پاک میں آتا ہے!

”وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ۔ (البقرۃ: ۷۴)

اور بیشک ان میں سے بعض ایسے پتھر ہیں کہ وہ اللہ کے خوف سے گر جاتے ہیں!

دوسری جگہ آتا ہے!

”لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْاٰنَ عَلٰى جَبَلٍ لَّرَاَيْتَهٗ خٰشِعًا مُّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ۔

(الحشر: ۲۱)

یعنی اگر ہم اس قرآن کو پہاڑ پر نازل کرتے تو تو دیکھتا کہ وہ اللہ کے خوف سے پھٹ جاتا۔

ساتھ ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث بھی سن لیجئے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جبلِ احد کے متعلق فرماتے ہیں!

”هٰذَا جَبَلٌ يُحِبُّنَا وَنُحِبُّهٗ۔ () کہ یہ پہاڑ ہمیں چاہتا ہے اور ہم اسے چاہتے ہیں۔

اور یہ تو ظاہر ہے کہ خوف اور محبت کا احساس اس حیات کا متقاضی ہے لہٰذا ثابت ہوا کہ جمادات (پتھر) میں بھی زندگی ہوتی ہے اور ممکن ہے کہ وہ حیات ایسی ہو کہ جس کے ہوتے ہوئے بھی ان کو چیرنے پھاڑنے سے

اذیت نہ محسوس ہوتی ہو تو معلوم ہوا کہ چھری اطاعتِ ربی کے باعث حضرت اسماعیل کے گلے کو کاٹنے سے باز رہی۔

ادھر آپ نے غصے سے چھری پھینکی ادھر سے محبت بھری ندا آئی!

”قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ ۝ وَ فَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ ۝۔ (الصفت: ۱۰۷تا۱۰۵)

کہ اے ابراہیم تحقیق تو نے خواب کو سچ کر دکھایا۔ اسی طرح ہم نیکوں کو بدلا دیتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک بڑا امتحان تھا جس میں آپ پورے اترے۔ اس لیے ہم اسماعیل کے بدلے میں ایک اعلیٰ قربانی کو بطور فدیہ پیش کرتے ہیں تو اسے ذبح کر کے اپنے خواب کو پورا کر لے۔

مفسرین نے لکھا ہے کہ وہ قربانی وہی مینڈھا تھا جو ہابیل نے قابیل کے مقابلے میں پیش کیا تھا اور جو مقبول ہو کر آج اسماعیل علیہ السلام کا فدیہ بن گیا۔

حضرت یوسف وابراہیم علیہما السلام کی خوابوں کا نتیجہ:

حضرت یوسف اور ابراہیم علیہما السلام کی خوابوں سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ انبیاء علیہم السلام کی خوابیں عام خوابوں کی طرح نہیں ہوتیں بلکہ وہ بھی وحی اور جزءِ نبوت ہوتی ہیں۔ تو بیاں یہ ہو رہا تھا کہ پیغمبروں کو علم تین طرح پر دیا جاتا ہے اور اعطائے علم کا پہلا طریقہ الہام بیان ہوا ہے یعنی اللہ تعالیٰ اپنے کلام کو اپنے برگزیدہ انسان کے دل پر حالتِ بیداری یا خواب میں القا فرماتا ہے اور خواب کس طرح جزو نبوت ہے۔ وہ بیان ہوتے ہوتے اصلی مطلب سے بہت دور نکل آئے۔

وحی کی دوسری قسم:

من وراء حجاب ہے۔ یعنی پردے کے پیچھے سے بات کا کرنا۔ اس میں سامع کلام تو سکتا ہے مگر متکلم کو نہیں دیکھ سکتا۔ اور یہ حجاب کچھ جسمانی پردہ نہیں ہوتا بلکہ ذاتِ باری کے کمالِ ظہور اور بندے کے غایتِ ضعف سے پیدا ہوتا ہے۔ جس طرح کسی چیز کو جب بالکل آنکھ کے متصل کر دیا جاتا ہے تو اس کا غایتِ قرب اور کمالِ ظہور دیکھنے میں مانع آ جاتا ہے۔ اسی طرح ذاتِ باری کا حبل الورید سے اقرب ہونا خود حجابِ

اکبر ہے۔

غیب دو قسم کا ہوتا ہے:

اسی واسطے تصوف کی کتابوں میں لکھا ہے کہ غیب کی دو قسمیں ہیں ایک تو غیب، غاب عنک۔ اور دوسرے غیب، غبت، عنہ۔ یعنی ایک غیب تو وہ ہے جو تجھ سے پوشیدہ ہے جیسے عالمِ ارواح کہ عہدِ میثاق کے پہلے ہم پر ظاہر تھا ہم اُسے دیکھتے تھے اور اُسی میں رہتے تھے۔ اللہ جل شانہ کی کلام اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ ''کو بلا اِن کانوں کے سنتے تھے۔ انبیاء و اولیاء کی ارواح سے ملاقات کیا کرتے تھے اور ملائکہ کو بے آنکھوں کے دیکھ سکتے تھے مگر جب ہماری روح کو عالمِ ارواح سے جدا کر کے اس خاکی قالب کی کوٹھڑی میں قید کر دیا گیا تو اس کے ساتھ ہی ہمارے مشاہدات کو بھی حواسِ ظاہریہ اور باطنیہ سے وابستہ کر دیا گیا اور آج وہ عالم جو ہمارا وطن اصلی اور مسکنِ حقیقی تھا ہماری آنکھوں سے اوجھل اور غائب ہو گیا۔ اور ہم اس عالم میں ایسے غافل اور بدمست ہو گئے ہیں کہ ایک لمحہ کے لیے بھی اُس وطنِ اصلی کا خیال نہیں آتا نہ اُس کی یاد ہمارے دلوں کو تڑپاتی ہے اور نہ اُس کا فراق ہماری آنکھوں کو رلاتا ہے۔

دیکھو اس دنیا میں جب ہم ایک مقام پر پیدا ہوتے ہیں تو وہ عارضی وطن صرف مسقط الراس ہونے کی وجہ سے ہم کو اتنا عزیز اور پیارا ہے کہ ہم کہیں بھی سفر کریں کسی جگہ بھی جائیں مگر ہمارا دل ہر وقت اس فانی مولد کی طرف بے ساختہ کھنچتا رہتا ہے ہمیں سفر میں خواہ کتنا ہی آرام ہو مگر پھر بھی رات دن اپنے وطن کے نظارے ہماری آنکھوں میں پھرتے ہیں اور وطن کے کانٹے سفر کے پھولوں سے آرام دہ معلوم ہوتے ہیں۔

حُبِ وطن از ملک سلیمان خوشتر است کا واقعہ:

کہتے ہیں کہ ایک دفعہ ایک کوے نے حضرت سلیمان علیہ السلام سے اپنے ملک جانے کی رخصت طلب کی۔ آپ نے فرمایا کہ تو کیوں جانا چاہتا ہے کیا تجھے میرے پاس کسی قسم کی تکلیف ہے۔ اس نے عرض کی کہ حضور تکلیف تو کچھ نہیں۔ ہر طرح کا آرام اور آسائش ہے مگر مجھے رات دن اپنے وطن کی یاد تڑپاتی ہے۔ اگر آپ مجھے اجازت دیں تو چند دن وطن میں گزار کر پھر خدمت میں حاضر ہو جاؤں گا۔ سلیمان علیہ السلام نے اسے رخصت دی اور ایک دوسرے پرندے کو حکم دیا کہ تم اس کوے کے پیچھے پیچھے جاؤ اور دیکھو کہ اس کا وہ

کون سا وطن ہے جو اسے ان شاہی محلات اور خسروی مکانات سے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ اور جس کے لئے یہ کئی دفعہ بیتابانہ گذارشیں کر چکا ہے۔ چنانچہ وہ پرندہ حسب الحکم کوے کے پیچھے پیچھے گیا دیکھا کہ دلدل کا مقام ہے ہو کا جنگل ہے۔ پانی کے ٹھہرنے اور جنگل کی تاریکی کی وجہ سے ایسی بدبو آتی ہے کہ وہاں کھڑا ہونا بھی دوبھر معلوم ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ پرندہ یہ سب کچھ دیکھ کر سلیمان علیہ السلام کے دربار میں حاضر ہوا اور کوے کے وطن کی من وعن حکایت خدمتِ اقدس میں کہہ سنائی۔ چند دنوں کے بعد جب کوا واپس آیا تو آپ نے فرمایا کہ اے کوے! میں نے تیرے وطن کی معلومات حاصل کرنے کے لئے فلاں پرندے کو بھیجا تھا جس نے واپس آ کر اس قسم کی رپورٹ پیش کی ہے۔ کیا یہ سب کچھ سچی حقیقت ہے۔ کوے نے عرض کی کہ حضور اس پرندے نے بالکل صحیح اور ٹھیک کہا ہے۔ اس پر سلیمان علیہ السلام نے فرمایا کہ پھر اے کوے تو ایسے شاہانہ مقام کو چھوڑ کر ایسے غلیظ بیابان میں جانے کی کیوں کرتا ہے۔ کوے نے عرض کی!

حب وطن از ملک سلیمان خوشتر است　　خارِ وطن از سنبل و ریحان خوشتر است
یوسف که بمصر پادشاہی مے کرد　　مے گفت گدا بودن کنعان خوشتر است

یعنی وطن کی محبت سلیمان علیہ السلام کے ملک سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے اور وطن کا کانٹا دوسری جگہ کے سنبل و ریحان سے بھی اچھا ہے۔

یوسف علیہ السلام جو مصر میں بادشاہی کرتے تھے فرمایا کرتے تھے کہ اس سلطنت سے اپنے وطن کنعان کا فقیر ہونا اچھا ہے۔ اور اسی واسطے آپ نے انتقال فرماتے وقت وصیت کی تھی کہ جب میری قوم مصر سے ہجرت کرے تو اسے چاہیے کہ میرے تابوت کو بھی ساتھ لے جائے اور اسے میرے آباؤ اجداد کے قریب دفن کر دے۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کے ساتھ مصر سے نکلے تو آپ کی وصیت کے مطابق حضرت کے تابوت کو بھی ساتھ لے لیا تو مطلب یہ تھا کہ غربت کی شاہی و امیری وطن کی گدائی وفقیری پر قربان کئے جانے کے قابل ہے۔

تو جب انسان اس عارضی اور فانی وطن کے ساتھ محض ایک ادنیٰ تعلق کی بنا پر اس قدر محبت کرتا ہے۔ تو پھر اس کی یہ اعلیٰ درجہ کی غفلت وحماقت نہیں کہ اپنے اصلی وطن کو وہ کبھی بھول کر بھی یاد نہیں کرتا۔ وہ

وطن کہ جس کو چھوڑ کر یہ آیا ہے۔ وہ وطن کہ جس میں نہ تکلیف تھی نہ رنج تھا، نہ ہجر تھا نہ فراق، اور پھر جس کی طرف طوعاً اور کرہاً لوٹ کر ہی جانا ہے۔ کوئی شخص ہزار سال بھی اس دنیائے فانی میں گذارے پھر بھی آخر کار اسے اسی وطن کی طرف لوٹا دیا جائے گا۔ اس کی طرف جانے سے نہ اقرار کام دے گا نہ انکار۔

شیخ سعدی کے بے ثباتی دنیا کے متعلق اشعار

شیخ سعدی فرماتے ہیں: ؎

اے دل بکام خویش جہاں را تو دیدہ گیر   در وے ہزار سال چو نوح آرمیدہ گیر
ہر نعمتے کہ ہست بعالم تو خور دہ آں   ہر لذتے کہ ہست سراسر چشیدہ گیر
ہر گنج و ہر خزانہ کہ شاہاں نہادہ اند   آں گنج و آں خزانہ بچنگ آوریدہ گیر
ہر ماہرُو کہ ہست در ایام روزگار   آں را نیاز دربرخود آوریدہ گیر
روز پسیں کہ ہیچ نماند بجز دریغ   صد بار پشت دست بدنداں گزیدہ گیر

ترجمہ: اے دل تو سمجھ لے کہ ساری کی ساری دنیا تیری خواہش کے مطابق ہے اور تو اس میں حضرت نوح علیہ السلام کی طرح ہزار سال رہنے والا ہے۔ عالم میں جو بھی نعمت ہے تو اُسے کھائی ہوئی سمجھ اور دنیا کی ہر لذت کو بھی تو چکھی ہوئی سمجھ۔ ہر گنج اور ہر خزانہ جو بادشاہ رکھتے ہیں اُس گنج اور خزانے کو اپنے قبضہ میں کیا ہوا فرض کر لے۔ ہر چاند جیسا چہرہ و رُخ رکھنے والا زمانہ کے ایام میں جو بھی ہو اُس کو اے نیاز اپنے بغل میں لیا ہوا سمجھ لے۔ مگر آخر موت کے وقت جب افسوس کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا تو سو بار اپنے ہاتھ کی پشت کو اپنے دانتوں سے کاٹنے کو بھی یاد رکھ۔

روح کی وطن ملکوتی کے لئے فریاد:

روح تو اپنے اصلی وطن یعنی عالمِ ارواح کیلئے تڑپتا ہے۔ اور وہ تو یہ چاہتا ہے کہ کسی طرح اس عالمِ ناسوت سے چھٹکارا حاصل کر کے پھر عالمِ ملکوت کی طرف لوٹ جائے۔ مگر یہ تڑپ ہر انسان کو معلوم نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ بہتوں نے روح کی اس آتشِ شوق کو جسمانی شہوات اور بہائمی لذات کے نیچے اس طرح دبا دیا ہے کہ وہ قریب قریب بجھے ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ اور وہ روح کے اس میلان اور حبِ وطن کو سمجھ ہی نہیں

سکتا۔ ہاں جب کسی کامل کی صحبت یا جذبہ غیبی سے متنبہ ہوتا ہے۔ تو پھر روح کے شوقِ وطن کا راز اس پر کلیۃً منکشف ہو جاتا ہے۔ اور وہ روح کی اس فریاد کو جسے مولانا روم ذیل کے اشعار میں بیان فرماتے ہیں۔ پورے طور پر سن سکتا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے ؎

بشنو ازنے چوں حکایت میکند
وزجدا ئیہا شکایت مے کند

یعنی روحِ انسانی کے قصہ دردو فراق کو سن کہ وہ کس طرح اپنی جدائی وطن کا قصہ بیان کرتا ہے۔

کزنیستاں تا مرا ببریده اند
از نفیرم مرد و زن نالیده اند

کہ جب سے اصلی وطن کے لئے اس قدر شور و فریاد کرتا ہوں کہ جہاں والے بھی میرے رونے سے متاثر ہو کر رو دیتے ہیں۔

سینه خواہم شرحه شرحه از فراق
تا بگویم شرح درد اشتیاق

لیکن اس بادۂ فراق کی لذت اسی کو معلوم ہو سکتی ہے جس نے فراقِ یار میں کچھ گھڑیاں گزار کر اس شراب ناب کا مزا چکھا ہو اور جس کا سینہ ہجر حبیب میں ٹکڑے ٹکڑے ہو چکا ہو۔ ایسا شخص ہی میرے دردِ شوق کے قصے کو بالتفصیل سننے کا مجاز ہے۔

ہر کسے که دور مان از اصل خویش
باز جوید روزگار وصل خویش

اب روح وجہ شکایت کو بیان کرتا ہے کہ میں کیسے اپنے شورشیون کو بند کر سکتا ہوں کیونکہ یہ تو مسلمہ قاعدہ اور تجربہ ہے کہ جب کوئی اپنی اصل اور اپنے موطن سے جدا ہوتا ہے تو پھر اس کو طبعی تقاضا ہوتا ہے کہ کسی طرح دوبارہ اپنے اصل کی طرف لوٹ جاؤں تا کہ یہ خلال وصال کے ساتھ بدل جائے۔

تو عرض یہ کر رہا تھا کہ روح کی حقیقی خواہش سے مطلع ہونے کیلئے جسمانی خواہشات کو کم کرنا ضروری

ہے۔ ورنہ اس کی زاری وفریاد باوجود قرب واتصال کے کانوں تک نہیں پہنچ سکتی۔ یاد رکھو کہ اس جسم کے پہاڑ کے نیچے روحانی سونے کی کان ہے۔ پہلے پہاڑ کو کھودو کہ وہ بے بہا سونا ہاتھ آجائے جسم کی حیات اور خواہشات کم ہونے سے روح کو قوت اور طاقت آتی ہے۔ اور جسم کی طاقت وتوانائی روح کے تعلق کو کمزور کر دیتی ہے۔ اس واسطے انسان کو چاہیے کہ روح کی طاقت کو بڑھانے کیلئے اس جسم کی نفسانی خواہشات کو ریاضت وعبادت سے کم کرے۔ تاکہ حقیقی وطن کا میلان پورے طور پر محسوس ہو سکے۔ مولانا روم علیہ الرحمہ فرماتے ہیں۔

صحت ایں حسن زمعمورئے تن　　صحت آں حسن زتخریب بدن
کرد ویراں خانہ بہر گنج و زر　　د رہماں گنجش کند معمور تر
قلعہ ویراں کرد ازکافر ستد　　بعد ازاں برسا ختش صد برج وسد

اس واسطے اے سعید تجھے چاہیے کہ جس طرح تو رات دن اپنے نفس کی خواہشات پوری کرنے کے پیچھے مارا مارا پھرتا ہے۔ اسی طرح چوبیس گھنٹوں میں سے کچھ نہ کچھ روح کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے وقف کر۔ اور جس طرح تو اس عارضی وطن کی محبت میں بے چین رہتا ہے۔ اسی طرح اس اصلی وطن کی تڑپ بھی پیدا کر۔ اور یاد رکھ کہ اصلی وطن کی محبت انسان کے ایمان کی نشانی ہے۔

روایت ہے!

”حُبُّ الْوَطَنِ مِنَ الْاِیْمَانِ۔

(روح البیان: جلد ٦، سورہ القصص، داراحیاء التراث العربی)

یعنی وطن کی محبت ایمان کا جزو ہے۔

حُب الوطن من الایمان کا صحیح مطلب:

لیکن افسوس آج عوام نے اس وطن سے وطنِ ناسوتی مراد لیا ہے حالانکہ وطنِ ناسوتی کے متعلق تو ارشاد نبوی ہے!

”اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ۔

(تفسیر اللباب: ج ۱، سورۃ النساء، دار الکتب العلمیہ بیروت)

کہ دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے۔

اسے چاہیے کہ اس سے نکلنے کی کوشش کرے۔ ورنہ اس کی محبت ایمان کو زنگ آلودہ کر دیگی۔ تو پھر آپ باوجود ان مبارک اقوال کے اس دنیا کی محبت کو جزو ایمان کس طرح قرار دے سکتے ہیں تو معلوم ہوا کہ یہاں وطن سے مراد وطن ملکوتی ہے، کہ جس کے نیستان سے اس روح کے نرکل (سرکنڈہ) کو کاٹ کر ناسوت **(انسانی فطرت)** کے علائق **(دلچسپیاں)** میں جکڑ دیا گیا ہے۔ اور اسی کی محبت جزو ایمان قرار دے رہے ہیں۔ چنانچہ بہاؤ الدین آملی رحمۃ اللہ علیہ اسی حدیث شریف کے متعلق فرماتے ہیں۔

گنجِ علم ما ظہر مع ما بطن　　گفت از ایماں بود حب الوطن
ایں وطن مصر و عراق و شام نیست　　ایں وطن شہر یست کاں را نام نیست
زانکہ از دنیا است ایں اوطاں تمام　　مدحِ دنیا کے کند خیر الانام
حُبِ دنیا ہست راس ہر خطا　　از خطا کے مے شود ایماں عطا
تو دریں اوطاں غریبی اے پسر　　رو بغربت کردۂ خاکت بسر

ترجمہ: ظاہر و باطن کے علم خزانے نے فرمایا کہ وطن کی محبت ایمان میں سے ہے۔ یہ وطن (سے مراد) مصر وعراق اور شام نہیں ہے یہ وطن وہ شہر ہے جس کا نام نہیں ہے کیونکہ یہ تمام اوطان دنیا سے (تعلق رکھتے) ہیں اور خیر الانام ﷺ دنیا کی تعریف کیسے کر سکتے ہیں۔ دنیا کی محبت ہر خطا کی جڑ ہے اور خطا سے کیسے ایمان عطا ہوتا ہے۔ اے بیٹے تو ان اوطان میں غریب (واجنبی مسافر) ہے تو نے اپنا رُخ غربت کی طرف کیا ہے اور خاک تیرے سر پر ہے۔

لقائے خداوندی کا عاشق موت کو محبوب سمجھتا ہے:

تو بھائیو! اُس وطن کی محبت پیدا کرو اور اُس کی طرف جانے کو تیار ہو جاؤ تا کہ بلاوا آنے پر اس قارب کے قید خانہ کو چھوڑنے میں کسی قسم کا رنج اور تکلیف نہ ہو۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں!

’’مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللهِ اَحَبَّ اللهُ لِقَاءَہٗ، وَمَنْ کَرِہَ لِقَاءَ اللهِ کَرِہَ اللهُ لِقَاءَہٗ۔

(صحیح مسلم: جزء ۸، رقم: ۶۹۹۶، باب مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللهِ طبع دار الجیل بیروت)

یعنی جو اللہ تعالیٰ کے ملنے کو دوست رکھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ملنے کو دوست رکھتا ہے۔ اور جو اللہ تعالیٰ کے ملنے کو برا سمجھتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ملنے کو برا سمجھتا ہے۔

اور لقائے ربی کے شوق اور محبت کی علامت یہ ہے کہ انسان موت کو دوست رکھتا ہے کیونکہ حدیث شریف میں آتا ہے!

’’لَنْ تَرَوْا رَبَّکُمْ حَتّٰی تَمُوْتُوْا۔

(سنن الکبریٰ للنسائی: جزء ۷، رقم: ۷۷۱۶، موسسۃ الرسالۃ)

یعنی تم اپنے رب کو موت سے پہلے نہیں دیکھ سکتے۔

تو گویا موت ایک پُل ہے جو حبیب کو حبیب سے ملا دیتا ہے۔

اسی واسطے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے۔

’’اَلْمَوْتُ جِسْرٌ یُّوْصِلُ الْحَبِیْبَ اِلَی الْحَبِیْبِ۔

(تفسیر مظہری: جلد ۱، سورہ بقرہ، صفحہ ۹۷، دار احیاء التراث العربی بیروت)

(ارشاد الساری: جلد ۹، باب مَنْ أَحَبَّ لِقَاءَ اللهِ أَحَبَّ اللهُ لِقَاءَہٗ، رقم: ۶۵۰۷، المطبعۃ الکبریٰ الامیریہ مصر)

مگر موت کو انسان اسی وقت دوست رکھ سکتا ہے کہ جب اس کے لئے کچھ تیاری بھی کر چکا ہو۔

ورنہ اس نام نہاد آبادی سے اس ویرانے کی طرف جانا کاہے کو پسند کریگا۔ تو گویا لقائے خداوندی کی محبت کی علامت یہ ہے کہ موت کو محبوب سمجھے۔ اور موت کو محبوب تب ہی سمجھ سکتا ہے کہ اس کے لئے کچھ توشہ اور زاد بھی ہو تو نتیجہ نکلا کہ لقائے خداوندی کی محبت کی علامت اتباعِ شریعت ہے۔ کیونکہ اسی سے وہ توشہ سفر اور زادِ راہ جمع کرسکتا ہے۔ اور جس شخص کے پاس سفرِ آخرت کے لئے زادِ راہ جمع ہوگئی تو پھر اس کو وطن کی طرف جانے میں کس قدر خوشی ہوسکتی ہے۔ اس کا ادنیٰ سا اندازہ اس دنیا کے مسافروں کی حالت سے کر سکتے ہو۔ دیکھو جب ایک شخص اپنے اہل وعیال اور اپنے گھر بار کو چھوڑ کر سفر میں نکلتا ہے اور سفر میں جا کر جلدی یا دیر

سے اچھے طور پر کامیابی حاصل کر لیتا ہے۔ تو پھر اس کی گھر کو لوٹ کر جانے کی بے تابی بھی قابلِ دید ہوتی ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ کہیں پر لگ جائیں کہ اڑ کر جا پہنچوں۔ اسے مقصود حاصل ہونے کے بعد سفر کا عیش اور تنعم آرام و آسائش کاٹنے کو دوڑتا ہے۔ تو جب اس عارضی وطن کی یاد حصولِ مقصد کے بعد اس طرح بے چین کرتی ہو۔ تو پھر اس مزرعِ آخرت میں زرع وحصاد کے بعد کس طرح کوئی شخص اپنے حقیقی اور ملکِ ملکوتی کی طرف لوٹنے کو بے تاب نہ ہوتا ہوگا۔ اور یہی مطلب ہے۔ حب الوطن من الایمان کا۔

حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ کی موت سے محبت:

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضرت سلیمان فارسی رضی اللہ عنہ نے انتقال سے پہلے اپنی بیوی کو فرمایا کہ میں نے اس دن کے لئے فلانی جگہ پر تھوڑی سی مشک چھپا کر رکھی ہوئی ہے۔ جا اور اسے میرے پاس لے آ۔ بیوی صاحبہ نے ارشاد کے مطابق مشک حاضر کی۔ آپ نے پانی مانگا۔ اور اس میں اس کو گھول کر پانی کو اپنے ارد گرد چھڑکا اور فرمانے لگے کہ آج میرے پاس خوشبو کو پسند کرنے والی مخلوقات آنے والی ہے۔ اور بیوی کو باہر نکل جانے کا فرمایا اور دروازے کو بند کروا دیا۔ تھوڑی دیر بعد آواز سنائی دی۔ قد وصل الحبیب الی الحبیب۔ کہ دوست، دوست سے جا ملا۔ بی بی صاحبہ دوڑی ہوئی آئیں۔ دروازہ کھول کر دیکھا تو واقعی حبیب حبیب سے مل چکا تھا۔

رجوع بسوئے مضمونِ سابق اور غیب کی دوسری قسم کی توضیح:

اب پھر ہم اصلی مضمون کی طرف رجوع کرتے ہیں بیان یہ ہو رہا تھا کہ انبیاء علیہم السلام کی باری تعالیٰ سے تین طرح پر علم حاصل ہوتا ہے۔ یا تو بذریعہ الہام خواہ بحالت تعیظہ ہو یا منام دوسرے پردے کے پیچھے سے۔ اور یہ پردہ کچھ جسمانی نہیں ہوتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کا غائتِ قرب اور کمالِ وضوع دیکھتے ہی حجاب بن جاتا ہے۔ اور اس پر غیب کی دو قسمیں بیان ہوئیں ایک غیب غاب عنک۔ اور اس کی تا حال تشریح وتوضیح ہوتی رہی۔ دوسرے غیب غبت عنہ یعنی وہ غیب کہ جس سے تو غائب نہیں۔ بلکہ وہ تو:

”وَهُوَ مَعَكُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ط“ (الحدید: ۴)

کی رو سے ہر جگہ ہر وقت اور ہر حالت میں ہمارے ساتھ ہے۔ اور اس کا تعلق تو حَبْلِ الْوَرِیْدِ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ اور نزدیک کا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔ ؎

اتصالے بے تکیف بے قیاس
ہست رب الناس را با جان ناس

ترجمہ: رب الناس (لوگوں کا رب) کا اتصال لوگوں کی جانوں کے ساتھ بغیر کسی کیفیت و تکلیف اور بغیر قیاس کے ہے۔

مگر جب نفسِ ناطقہ کو اس خاکی قالب کے ساتھ متشخص و متعین کر دیا گیا تو اب یہ تشخص و تعین کے باعث اس وُجودِ کل کے قرب و اتصال کے باوجود اُس کے مشاہدہ سے غائب ہو گیا ہاں جب کبھی وہ اس تشخص و تعین کو چھوڑتا ہے تو پھر اس کا وجودِ کل مالک الملک کے دیکھنے کے قابل ہوتا ہے۔

اذا قلت ما اذنبت قالت مجیبة   وجودك ذنب لا یقاس به ذنب
گفتم چہ دورم از تو چو مارا گناہ نیست   گفتا کہ ہست ہستی تو بدتریں گناہ

ترجمہ: جب میں نے کہا کہ میں نے گناہ نہیں کیا تو اُس نے جواب دیتے ہوئے کہا کہ تیرا وجود اتنا بڑا گناہ ہے جس پر کوئی گناہ قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ میں نے کہا آپ سے میں اتنا دور (کیوں) ہوں جب میرا گناہ نہیں اُس نے کہا تیری ہستی بدترین گناہ ہے۔

معتزلہ کیوں رویتِ باری کا انکار کرتے ہیں؟

اسی واسطے معتزلہ کے سوا باقی سب اہلِ اسلام نے رویتِ باری کا اقرار کیا ہے۔ معتزلہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں صاف فرما دیا ہے!

"لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ۔ (انعام:۱۰۳)
اُس کو آنکھیں نہیں پا سکتیں۔

تو پھر کس طرح ممکن ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کو دیکھ سکے گا۔ اور پھر ساتھ ہی کسی چیز کے دیکھنے کے لئے چند شرائط ہیں۔ جب تک وہ سب کی سب نہ پائی جائیں تو اس چیز کا دیکھ سکنا محال ہے اور وہ شرائط یہ ہیں

سب سے اوّل زمان یعنی وقت کہ جس میں اس چیز کو دیکھے۔ دوم مکان یعنی وہ چیز کسی جگہ پر ہو۔ سوم جہت یعنی وہ چیز جو کسی طرف میں ہو۔ چہارم تقابل۔ یعنی وہ چیز دیکھنے والے کے سامنے ہو۔ اور ظاہر ہے کہ یہ تمام باتیں جسم کے متعلقات سے ہیں۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ جسمیت سے پاک ہے۔ اس لئے ان شرائط کے تعلق سے بھی مبرا و منزہ ہے۔

ادراک اور رویت کا فرق:

جواب: ادراک اور رویت میں فرق ہوتا ہے۔ ادراک کسی شے کے کنہ اور حقیقت سے مطلع ہونے اور اس کا احاطہ کر لینے کا نام ہے۔ مگر رویت کبھی بالاحاطہ ہوتی ہے اور کبھی بلا احاطہ جیسے مثلاً کسی نے دور سے ایک چیز کو دیکھا مگر احاطہ نہ کر سکا یا اندھیرے میں کسی چیز کو دیکھا مگر پہچان نہ سکا تو اب دیکھئے دونوں حالتوں میں رویت تو پائی گئی۔ مگر احاطہ اور ادراک نہ پایا گیا۔ تو معلوم ہوا کہ رویت اور ادراک میں عموم خصوصِ مطلق کا تعلق ہے یعنی ہر ادراک رویت ہے۔ مگر ہر رویت ادراک نہیں۔ اور قاعدہ مسلمہ ہے کہ!

”نفی الاخص لا یستلزم نفی الاعم۔ یعنی خاص کی نفی سے عام منفی نہیں ہوتا۔

تو ادراک کی نفی سے رویت کی نفی لازم نہیں آتی۔ جیسے دنیا میں اللہ تعالیٰ کو پہچانا جاتا ہے۔ اور جس قدر اس کی آیات و مظاہرہ کا علم بڑھتا ہے اسی قدر اس کی معرفت بھی بڑھتی جاتی ہے۔ مگر کتنی ہی معرفت کیوں نہ حاصل ہو جائے احاطۂ باری محال ہوتا ہے۔ اور اسی واسطے حضور ﷺ جیسی دریائے معرفت کی شناور اور غواص ہستی ”مَا عَرَفْنَاكَ حَقَّ مَعْرِفَتِكَ“ کا اقرار فرما رہی ہے۔ اسی معرفت پر جنت کی رویت کو بھی قیاس کر لو کہ وہاں رویت تو ہوگی مگر ادراک اور احاطہ نہ ہوگا۔ جس کی نفی ”لَا تُدْرِكُهُ الْأَبْصَارُ“ میں کر دی گئی ہے۔

اور وہ شرائط جو کسی چیز کو دیکھنے کے لئے بیان کئے گئے ہیں۔ وہ سب کے سب جسمانیات کے لئے ہیں۔ مگر ذات باری تو جسم سے منزہ ہے۔ اس کی رویت بھی ان شرائط سے منزہ ہوگی۔

لقائے ربی کے امکان پر دلائل:

(۱) قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے!

”وُجُوْهٌ يَّوْمَىِٕذٍ نَّاضِرَةٌ ۙ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ ۚ۝۔ (القیمۃ: ۲۲،۲۳)

یعنی بہت سے منہ آج کے دن تروتازہ اپنے رب کی طرف دیکھ رہے ہوں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آخرت میں جنتی لوگ دیدارِ ربی سے سرفراز کیئے جائیں گے۔

(۲) سورۃ المطففین میں جہنمیوں کے لئے آتا ہے!

”كَلَّآ اِنَّهُمۡ عَنۡ رَّبِّهِمۡ يَوۡمَئِذٍ لَّمَحۡجُوۡبُوۡنَ ؕ۔ (المطففین:۱۵)

یعنی آج کے دن وہ اپنے رب سے اوٹ میں ہوں گے۔

اللہ تعالیٰ تو وہاں پر بھی حجاب میں نہ ہوگا۔ مگر اشرار وفساق اپنی نافرمانیوں اور بدکاریوں کے پردوں میں محجوب ہونے کیوجہ سے رویتِ باری سے محروم رہ جائینگے۔ تو معلوم ہوا کہ آخرت میں جہنمیوں کو رویت نہ ہوگی ہاں جنتیوں کو ضرور ہوگی۔ اور اگر جنتیوں کو رویت نہ ہوتی تو پھر اسے دوزخیوں کے لئے عذاب کے پیرایہ میں بیان کرنا بے سود تھا۔

(۳) حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب اللہ تعالیٰ سے التجا کی۔ ”رَبِّ اَرِنِیۡۤ اَنۡظُرۡ اِلَیۡكَ ؕ“

(اعراف:۱۴۳)

کہ اے اللہ مجھے اپنا دیدار کرائیں تا کہ آپ کو دیکھوں۔

ارشاد ہوا!

”لَنۡ تَرٰىنِیۡ۔ کہ اے موسیٰ تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا۔

دیکھئے باری تعالیٰ نے یوں نہ فرمایا کہ ”لَنۡ اُرٰی“ کہ میں دکھائی نہیں دے سکتا۔ بلکہ عدمِ رویت کو موسیٰ علیہ السلام سے متعلق فرمایا کہ تو مجھے نہ دیکھ سکے گا۔ اگر اللہ جل شانہٗ کا دیکھا جانا محال ہوتا تو یوں فرماتے کہ اے موسیٰ مجھے دیکھ سکنا محال ہے۔ اور پھر اللہ کا دیدار محال ہوتا۔ تو موسیٰ علیہ السلام جیسا اولوالعزم پیغمبر ایک محال بات کو اور پھر وہ بھی ذاتِ باری کے متعلق کس طرح طلب کرنے کی جرأت کرسکتا۔ تو معلوم ہوا کہ رویتِ باری آخرت میں ممکن ہے۔ اور جنتیوں کو ان کے مرتبوں کے مطابق اللہ جل شانہٗ کا دیدار حاصل ہوگا۔

ان آیات کے علاوہ آقائے نامدار کی کثیر حدیثیں اللہ تعالیٰ کے دیدار کے متعلق صحاح میں مکتوب ہیں۔ آپ فرماتے ہیں!

”سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ عِيَانًا۔

(صحیح بخاری: جز،۹،رقم:۷۴۳۵،دارطوق النجاۃ)

کہ تم اپنے رب کو آنکھوں سے دیکھو گے۔

دوسری جگہ ارشاد ہوتا ہے!

”سَتَرَوْنَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرَوْنَ الْقَمَرَ لَيْلَةَ الْبَدْرِ۔

(سنن ترمذی: جز،۴،رقم:۲۵۵۴،دارالغرب الاسلامی بیروت)

یعنی تم اللہ جل شانہ کو چودھویں رات کے چاند کی طرح دیکھو گے۔

جیسے وہ صاف، بلاتکلف روشن اور منور دکھائی دیتا ہے۔ اسی طرح تم اپنے پروردگار کو آخرت میں دیکھ سکو گے۔

”من وراء حجاب“ میں حجاب سے کیا مراد ہے:

تو مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ کا باوجود قرب و اتصال کے دکھائی نہ دینا غیب غبت عنہ کی شق میں داخل ہے اور پردے کے پیچھے سے باری تعالیٰ کا کلام فرمانا کوئی جسمانی حجاب نہیں بلکہ یہی حجابِ کبریائی اور ردائے توانائی بندہ کے عجز و ضعف کے مقابل میں خود ایک حجابِ اکبر بن جاتا ہے۔

پردے کے پیچھے سے بات کرنے کی مثال:

رب العزت کے پردے کے پیچھے سے بات کرنے کی مثال حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ میں نظر آئی ہے۔

چنانچہ آپ کوہ طور پر جانے اور اللہ جل شانہ سے شرف تخاطب پانے کو قرآن پاک ان الفاظ میں بیان کرتا ہے!

”فَلَمَّآ اَتٰىهَا نُوْدِيَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَيْمَنِ فِي الْبُقْعَةِ الْمُبٰرَكَةِ مِنَ الشَّجَرَةِ اَنْ يّٰمُوْسٰٓى اِنِّيْٓ اَنَا اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ○۔(القصص:۳۰)

یعنی جب موسیٰ اس آگ کے پاس آئے اور وادی کے دائیں درخت کی بابرکت جگہ سے آواز آئی کہ اے موسیٰ میں جہانوں کا رب ہوں۔

چنانچہ موسیٰ علیہ السلام سے بات چیت ہوتی ہے۔ اور آگے بعض فرمان بھی صادر ہوتے ہیں۔ مگر رب العالمین خود دکھائی نہیں دیتے موسیٰ علیہ السلام غایتِ شوق میں پکار اٹھتے ہیں۔ ''رَبِّ أَرِنِي'' کہ اے اللہ مجھے اپنا دیدار دکھا مگر دیدار نہیں ہوتا اور ردائے کبریائی کے پیچھے سے تمام ہدایات کا صدور ہوتا ہے۔

حضرت موسی علیہ السلام کے بے خود ہونے اور دیدار نہ پا سکنے کے متعلق ایک نکتہ:

سامعین کے دل میں خیال پیدا ہوسکتا ہے کہ کیا وجہ ہے کہ حضرت موسی علیہ السلام کو باوجود رب ارنی کی التجا کے دیدارِ فیض آثار نہیں دکھایا جاتا۔ مگر خاتم الانبیاء سید الورا حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو آسمانوں پر بلا کر قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنَىٰ (النجم:۹) کا تماشہ دکھایا جاتا ہے۔ اور پھر موسی علیہ السلام تو ایک ہی تجلی میں بیہوش ہو جاتے ہیں۔

بس ایک ہی جلوے میں ہم بن گئے سودائی
جی بھر کے نہ دیکھا تھا لینے کو قضا آئی

مگر حضور ﷺ کی ذاتِ باری کی تجلیات کو بلاحجاب دیکھتے ہوئے بیہوش یا مدہوش نہیں ہوتے۔

موسیٰ زہوش رفت بیک جلوہ صفات
تو عین ذات مینگری در تبسمی

ترجمہ: حضرت موسیٰ علیہ السلام صفات کے ایک جلوہ سے بے ہوش ہو گئے اور اے نبی ﷺ آپ عین ذاتِ الٰہی کو دیکھ رہے ہیں اور تبسم فرما رہے ہیں۔

جواب: ہر ایک پیغمبر کو ایک خاص خاص امتیاز دیا گیا ہے۔ کسی کو کلام سے نوازا گیا تو کسی کو خلعت سے۔ کوئی صفی اللہ تو کوئی روح اللہ۔ چونکہ دیدار کا ارتحال سے قبل دیکھنا حضور ﷺ کا امتیاز تھا۔ اس واسطے کسی دوسرے پیغمبر کو یہ درجہ عطا نہ کیا گیا۔ اور چونکہ حضور ﷺ ولادت ہی سے یتیم تھے اس لئے آپ کی وراثت دیدارِ موسیٰ علیہ السلام کو نہ دی گئی۔ بلکہ آپ کے اصرار کو ''خَرَّ مُوسَىٰ صَعِقًا'' (اعراف:۱۴۳) کی صورت میں پورا کر دیا گیا۔

خَرَّ مُوْسیٰ کے متعلق ایک دلچسپ لطیفہ:

لطیفہ: خَرَّ موسیٰ سے مجھے ایک بات یاد آ گئی۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص نہایت خوش نویس تھا مگر اس کی عادت یہ تھی کہ کتاب کو لکھتے وقت اپنے عقل سے اس میں ردّ و بدل کر دیا کرتا تھا۔ ایک دفعہ ایک شخص نے اسے قرآنِ پاک لکھنے کے لئے دیا اور کہا کہ میاں صاحب! اس میں کچھ ہیر پھیر نہ کرنا یہ خدا کی کتاب ہے۔ تغیر و بتدل کرنے سے بڑا گناہ ہوگا۔ چنانچہ مزدوری طے ہونے کے بعد اس نے نہایت اعلیٰ ہاتھ سے قرآن پاک لکھنا شروع کیا۔ جب کامل ہو گیا۔ تو مالک کو اطلاع کی۔ وہ لینے کے لئے آیا۔ اور پوچھنے لگا کہ کاتب صاحب سچ سچ بتانا کچھ ہیر پھیر تو نہیں کیا۔ کاتب صاحب کہنے لگے۔ صاحب اور تو کچھ نہیں کیا مگر تین جگہ پر تصحیح ضروری معلوم ہوتی تھی۔ وہ میں نے کر دی ہے، امید ہے کہ آپ بھی دیکھ کر داد دیں گے۔ دیکھئے ایک تو ''عَصٰی آدَمُ '' ہے۔ حالانکہ عصا تو موسیٰ علیہ السلام کا تھا۔ اور دوسری جگہ ''خَرَّ مُوْسَی '' ہے حالانکہ خَرَّ عیسیٰ مشہور ہے۔ اور تیسری جگہ ''وَلَقَدْ نَادَانَا نُوْحٌ '' تھا میں نے اسکو دانا نوح کیا ہے کیونکہ نوح علیہ السلام نعوذ باللہ نادان نہ تھے۔ شاید پہلے کاتب سے غلطی ہو گئی ہو گی یا کیا۔ اس شخص نے اس کاتب کو سمجھایا کہ بیوقوف عصیٰ سے مراد عصا نہیں بلکہ اس کا معنی نافرمانی ہے۔ اور خر کا معنی گدھا نہیں بلکہ گرنا ہے۔ اور اسی طرح نادانا فارسی کا لفظ نادان نہیں بلکہ اس معنی یہ ہے کہ نوح علیہ السلام نے ہم کو ندا دی۔ چنانچہ جب کاتب صاحب کی سمجھ میں یہ باتیں آئیں تو تائب ہوا۔ سچ ہے، بیوقوف دوست سے دانا دشمن اچھا ہوتا ہے۔

ہزار خویش کہ بیگانہ از خدا باشد
فدا ے یک تن بیگانہ کا شنا باشد

ترجمہ: اپنے ہزار (رشتہ دار، دوست وغیرہ) جو اللہ تعالیٰ سے بے گانہ ہوں وہ اس ایک بے گانے پر قربان ہوں جو اشنا ہو (اُسے معرفتِ الٰہی حاصل ہو)

وحی کا تیسرا طریقہ: ہے کہ فرشتہ بھیج کر اس کے ذریعہ نبی کو احکامِ تبلیغیہ کی تعلیم دی جاتی ہے۔ جیسے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس بھیجا جاتا تھا۔ اور قرآن سب کا سب حضور سرورِ عالم کو اسی طریقہ سے دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک فرماتا ہے!

''نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِیْنُ ۙ۝ (الشعراء: ۱۹۳)

کہ اس پاک کتاب کو جبرئیل امین حضور ﷺ کے پاس لائے۔

فرشتے کا نزول پیغمبر پر دو طرح سے ہوتا ہے۔ یا تو وہ بصورت انسان متمثل ہو کر آتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا فرمان بالمشافہ پڑھ کر سنا تا ہے۔ جیسے حضرت جبرئیل علیہ السلام حضور ﷺ کے پاس اکثر اور بیشتر دحیہ کلبی رضی اللہ عنہ کی صورت میں تشریف لاتے تھے۔

چنانچہ بخاری شریف میں آتا ہے!

''وَاَحْیَانًا یَتَمَثَّلُ لِیَ الْمَلَكُ رَجُلًا فَیُكَلِّمُنِیْ فَاَعِیْ مَا یَقُوْلُ۔

(صحیح بخاری: ج ۱، رقم: ۲، باب، کیف کان بدء الوحی، طبع دار طوق النجاۃ)

اور یا وہ فرشتہ احکامِ الٰہیہ کو نبی کے قلب پر القا کرتا ہے اور خود ظاہر نہیں ہوتا۔ اس کو شرعی اصطلاح میں نفث کہا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں آتا ہے!

''قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِیْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ۔ (البقرۃ: ۹۷)

یعنی اے حبیب کہہ دے کہ جو کوئی جبرئیل علیہ السلام کا دشمن ہو تو ہوا کرے مگر اس نے تو یہ قرآن تیرے دل پر خدا کے حکم سے اتارا ہے۔

اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۙ کی تفسیر میں قرآن پاک کی رو سے چار منعم علیہم فرقے بیان ہوئے یعنی انبیاء۔ صدیقین۔ شہدا اور صالحین۔ یہاں تک تو انبیاء علیہم السلام کے متعلق بیان ہوا کہ وہ کونسا گروہ ہے۔ اور ان کے علم حاصل کرنے کے کیا کیا ذرائع ہیں۔ اب صدیقین کے متعلق عرض کرتا ہوں۔

منعم علیھم کے دوسرے گروہ یعنی صدیق کے متعلق:

صدیق مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی بہت ہی سچا۔ بہت سے یہ نہ سمجھ لیں کہ وہ کبھی کبھی تو جھوٹ بولتا ہوگا۔ بلکہ وہ سچ کا عادی ہوتا ہے کہ اس کے اقوال اور افعال ہر وقت جھوٹ سے بالکل پاک اور منزہ ہوتے ہیں۔ اور وہ نبی کی قوتِ نظریہ کا ایسا کامل پرتو ہوتا ہے کہ سچ اور جھوٹ کے پرکھنے میں اسے کسی قسم کی دقت نہیں ہوتی۔ اور وہ سچ جھوٹ سے ایسا نتھار لیتا ہے جیسے لسی سے پانی کو جدا کیا جاتا ہے۔

قوتِ نظریہ اور قوتِ عملیہ کا بیان:

ہر ایک انسان کو اللہ تعالیٰ نے دو قوتیں عطا کی ہیں۔ ایک قوتِ نظریہ اور دوسری قوتِ عملیہ۔ قوتِ نظریہ کے باعث وہ ہر ایک چیز میں فرق کرتا ہے۔ اور کھرے اور کھوٹے اور صحیح کو غلط سے ممتاز کرنا اسی قوت کا خاصہ ہے۔ قوتِ عملیہ سے انسان کو عمل کی طاقت ملتی ہے۔ انسان کے تمام اعمال اور افعال اسی قوت کا نتیجہ ہیں۔ انبیاء علیہم السلام میں یہ دونوں قوتیں بغیر کسی مشق اور ریاضت۔ بغیر کسی استاد کے ایسی کامل کر دی جاتی ہیں کہ پھر ان سے نہ تو قوتِ نظریہ کے متعلقات میں غلطی ہوتی ہے اور نہ قوتِ عملیہ کے منسوبات میں۔ اسی واسطے شرعاً پیغمبروں کو معصوم اور نبوت کو وہبی ماننا ضروری ہے۔ جس طرح انبیاء علیہم السلام کو اصالتہ قوتِ نظریہ کے کمال کے باعث صدق وکذب کے امتیاز میں دقت نہیں ہوتی۔ اسی طرح صدیقین بھی پیغمبروں کی اس قوت کا کامل پرتو ہونے کے باعث صحیح اور غلط کو ادنیٰ تامل سے بھانپ جاتے ہیں۔ اور وہ مقامات جہاں پر عوام کو سخت ٹھوکر لگتی ہے یہ حضرات قوتِ نظریہ کے کمال کی وجہ سے صحیح وسلامت نکل جاتے ہیں۔

صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے قوتِ نظریہ کے کمال کے باعث واقعہ معراج کی تصدیق فرمائی:

چنانچہ اسی قوتِ نظریہ کا کمال تھا کہ جب حضور ﷺ نے دعویٰ فرمایا کہ مجھے آج رات کو معراج ہوئی ہے اور میں مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ کو گیا اور پھر وہاں سے تمام آسمانوں کی سیر کرتے ہوئے عرشِ معلیٰ پر تجلیاتِ ربانی کو بلاحجاب دیکھا۔ اور مجھے یہ یہ احکام عطا ہوئے تو تمام کے تمام کافر آپ کو جھٹلانے لگے۔ ابو جہل یہ سن کر اپنے حواریوں کے ساتھ دوڑا دوڑا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور کہنے لگا کہ ابن قحافہ: کیا اپنے دوست کی نئی بات سنی؟ کیا اب بھی تیرے دوست کے جھوٹا ہونے میں کچھ شبہ ہو سکتا ہے۔ دیکھ وہ کہتا ہے کہ میں گذشتہ رات کو یہاں سے مسجدِ اقصیٰ کو گیا۔ اور پھر وہاں سے تمام آسمانوں کی سیر کرتے ہوئے رب العزت سے ملاقات کی۔ اور پھر ابھی میرا بستر گرم ہی تھا کہ میں واپس بھی لوٹ آیا۔ ابوبکر بھلا اب تو ہی بتا کہ یہ باتیں کچھ کرنے یا ماننے کی ہیں۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے مستفسرانہ لہجہ میں پوچھا کہ کیا حضور ﷺ اس قسم کا دعویٰ کرتے ہیں۔ ابوجہل اور اس کے یاروں نے یہ سمجھ کر کہ شاید اس کے قدم بھی جادۂ

عقیدت سے ڈگمگانے کے قریب ہیں۔ یک زبان ہو کر کہا کہ ہاں ہاں۔ وہی تمہارے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس قسم کا بے سر و پا دعویٰ کر رہے ہیں۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے فوراً بلا تامل فرمایا کہ اے ابو جہل۔ پھر وہ تو پیغمبر ہیں وہ جو کچھ فرما رہے ہیں حرف بحرف صحیح ہوتا ہے۔ خدا کی قسم اگر وہ اس سے ہزار درجہ بھی بظاہر مشکل دعویٰ کرتے تو وہ بالکل سچ اور راست ہوتا۔ ابو جہل اور اس کے چیلے آپ کی اس تصدیق سے نہایت شرمندہ ہوئے اور اپنا سا منہ لے کے واپس چلے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب آپ کی اس فوری تصدیق کے متعلق سنا تو آپ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو صدیق کا لقب عطا فرمایا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے اس دعویٰ کی اتنی جلدی تصدیق کیوں کی؟ وجہ یہ تھی کہ آپ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی قوتِ نظریہ کے مکمل پرتو تھے۔ اس لئے آپ نے صدق وکذب میں فوراً امتیاز کر لیا۔

بات سے بات نکل جاتی ہے۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے لقب صدیق کے ضمن میں واقعہ معراج کا ذکر آ گیا جس کی تصدیق سے آپ کو صدیق کا لقب ملا۔ بفضلہ تعالیٰ سامعین میں چونکہ جدید تعلیم یافتہ حضرات بہت سے شریک ہیں۔ اس لئے واقعہ معراج کے متعلق جو جو شبہات پیش کئے جاتے ہیں۔ ان کو مختصراً بیان کر کے ان کا جواب دے دینا بھی مناسب سمجھتا ہوں جس سے ازالہ شکوک کے ساتھ ساتھ داشتہ بکار آید (رکھی ہوئی چیز کام آجاتی ہے) کے مطابق یہ تقریر کسی نہ کسی موقعہ پر کام دے جائے گی۔

واقعہ معراج پر بعض شبہے اور ان کا ازالہ:

(۱) جدید فلسفے کی رو سے آسمانوں کو کوئی وجود نہیں۔ اور یہ جو ہمیں نیلا نیلا نظر آتا ہے محض منتہائے نظر اور حدِ نگاہ ہے اور جب آسمان ہی نہیں تو آسمانوں پر جانا کیسے ہو سکتا ہے۔

(۲) اگر آسمان کا وجود مان بھی لیا جائے تو فلاسفہ نے اس میں جوڑ جوڑ اور حذق والتیام کو محال مانا ہے اس واسطے آسمانوں کے ہونے کے باوجود ان میں سے پار ہونا محال ہے۔

(۳) اگر حذق والتیام (چمٹ جانا) کو تسلیم بھی کر لیا جائے تو تب بھی ایک جسمِ ثقیل کا آسمانوں کی طرف جانا محال ہے۔

(۴) اگر جسمِ ثقیل کا آسمانوں پر جانا ممکن بھی ہو۔ تو اتنے قلیل عرصہ میں کروڑوں میل کے راستے

کو طے کر کے واپس آجانا سراسر باطل ہوتا ہے۔

(۵) اور اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ اتنے قلیل عرصہ میں کوئی جسم کروڑوں میل کے فاصلہ کو طے کر سکتا ہے تو پھر آسمان اور زمین کے درمیان اس قدر سرد و گرم طبقات ہیں۔ کہ ان میں سے کسی جاندار کا زندہ نکل جانا اور پھر واپس آنا محال ہے۔

(۶) اور اگر اس مرورِ طبقات کو بھی تسلیم کر لیا جائے تو پھر اعتراض وارد ہوتا ہے۔ کہ کیا مسجدِ حرام سے آسمانوں کو سیدھا رستہ نہ تھا کہ آپ کو بجائے براہِ راست آسمان پر لے جانے کے:

”سُبْحٰنَ الَّذِیۡۤ اَسۡرٰی بِعَبۡدِہٖ لَیۡلًا مِّنَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ اِلَی الۡمَسۡجِدِ الۡاَقۡصَا“
(بنی اسرائیل: ۱)

کی رو سے مسجد حرام سے بیت المقدس میں لایا گیا۔ اور پھر وہاں کی مسجد اقصیٰ سے عروجِ سماوی شروع ہوا

(۷) پھر اللہ تو ہر جگہ حاضر و ناظر ہے معراج کے لئے آسمانوں کو کیوں مخصوص فرمایا۔ کیا زمین پر مخاطبت اور اعلائے درجات ممکن نہ تھا۔

(۸) اور پھر اگر آسمانوں ہی پر بلوا کر آپ کو عزت اور امتیاز دینا مقصود تھا تو اس کے لئے دن نہایت مناسب وقت تھا۔ تا کہ کفار اور مخالفین حضور کو آسمان کی طرف جاتا دیکھ کر خود بخود معراج کے قائل ہو جاتے جب وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیتے کہ حضور براق پر سوار ہیں اور فرشتوں جیسی مقدس ہستیاں آپ کی رکابدار ہیں۔ تو پھر کس کو جرأت ہو سکتی کہ وہ اس غیبی مشاہدہ کو جھٹلاتا۔

یہ چند ایک اعتراضات ہیں کہ جن کی بنا پر بعض لوگوں نے واقعہ معراج کو روحانی رنگ میں ظاہر کرنیکی کوشش کی ہے۔ اور بعض نے اس کا کلیتہً انکار کر کے اسرائیلیات کی شق میں جا داخل کیا۔

مذکورہ اعتراضات کا جواب عرض کرنے سے پہلے میں اس واقعہ کے جسمانی ہونے کے متعلق ایک مختصر سی تقریر کرتا ہوں۔ تا کہ وہ لوگ جو اسے روحانی واقعہ سمجھتے ہیں اپنی غلطی پر متنبہ ہو جائیں۔

معراج کے جسمانی ہونے پر دلائل:

(۱) قرآن پاک میں آتا ہے!

"سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا ۔ (بنی اسرائیل:۱)

یعنی پاک ہے وہ اللہ جس نے سیر کرائی اپنے بندے کو رات کے وقت ۔

اب دیکھئے آیت میں اللہ تعالیٰ نے عبد کا لفظ استعمال فرمایا ہے ۔ اور یہ ظاہر ہے کہ عبد صرف روح یا صرف جسم کو نہیں کہا جاتا بلکہ روح معہ الجسم کا نام عبد ہے ۔ لہٰذا لفظ عبد کے ہوتے ہوئے اس واقعہ کو روحانی ماننا سراسر غلطی اور خطا ہے ۔ اور بعض نے جو یہ کہا ہے کہ اس آیت سے تو جسمانی معراج صرف مسجدِ اقصیٰ تک ثابت ہوتا ہے ۔ اس سے آگے اگر جسم کے ساتھ تشریف لے جاتے تو اللہ تعالیٰ ضرور اس کا ذکر بھی یہاں فرما دیتے ۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ کسی چیز کے عدمِ ذکر سے عدمِ وقوع لازم نہیں آتا ۔ یہاں مسجدِ اقصیٰ کو خصوصیت سے بیان کرنے کی یہ وجہ ہے کہ چونکہ وہ دنیا کی سیر کی انتہا تھی اور اس سے اوپر سیرِ سماوات تھی جس سے نہ تو قریش کچھ واقف تھے اور نہ دوسرے منکرین ۔ مگر بیت المقدس کو تو چونکہ ہزاروں نے دیکھا ہوا تھا ۔ اس لئے سیرِ دنیا کی انتہا کو بیان کر دیا گیا ۔ تاکہ وہ ثبوتِ صحت کے لئے بیت المقدس کے حالات پوچھ کر اپنی تسلی کرنا چاہیں تو کر سکیں ۔ اور پھر اس سے ان کو سیرِ سماوی پر ایمان لانے میں مدد مل سکے ۔ کیونکہ وہ مقدس انسان جو چشم زدن میں بیت المقدس جیسے دور دراز مقام پر پہنچ سکتا ہے ۔ تو پھر اسے آسمانوں پر اس سرعت کیساتھ جانے میں کیا چیز مانع ہو سکتی ۔ چنانچہ کفار کو حضور ﷺ کے امتحان اور صدق وکذب کے پرکھنے کا موقعہ دینے کے لئے صرف سیرِ دنیا کی دور دراز غائت کو بیان کر دینے پر اکتفا کیا گیا ۔ اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ پھر مسجدِ اقصیٰ کے بعد جسمانی معراج نہیں ہوا بلکہ روحانی تھا ۔

(۲) براق پر سوار ہونا ۔ راستے میں قافلے والوں سے ملاقات کرنا اور ان سے پانی لینا یہ سب کے سب جسمانی خواص ہیں روح جسم کے بغیر نہ تو سوار ہو سکتی ہے ۔ اور نہ پانی لے اور پانی پی سکتی ہے ۔

(۳) اگر معراج کا واقعہ روحانی ہوتا ۔ تو پھر لوگ اس قدر شدومد سے تکذیب کیوں کرتے روح تو آنکھ جھپکتے ثریٰ سے ثریا تک کی سیر کر سکتی ہے ۔ مگر لوگوں نے آپ کو اس واقعہ کے بیان کرنے پر اس قدر جھٹلایا کہ قرآن پاک میں "وَمَا جَعَلْنَا الرُّءْيَا الَّتِیْٓ اَرَیْنٰکَ اِلَّا فِتْنَةً لِّلنَّاسِ" (بنی اسرائیل:۶۰) نازل کیا گیا

یعنی نہیں دکھایا ہم نے آپ کو رویا یا دکھاوا مگر یہ کہ بنایا ہم نے اس کے آزمائش اور فتنہ واسطے لوگوں کے۔

اور ''رویا'' رویت سے ہے جس کا معنی ہے آنکھوں سے دیکھنا۔ چنانچہ دیوان متبنی میں ہے!

ورویاك فی العیون احلی من الغمض اور حضرت عباس بھی رویا کی تفسیر رویتِ بالبصر ہی فرماتے ہیں۔

لہٰذا معلوم ہوا کہ حضور ﷺ کا یہ معراج جس کی شان پندرھویں سیپارے کی ابتدا میں بیان ہوئی ہے۔ جسم کے ساتھ بیداری کی حالت میں ہوا۔ باقی روحانی معراج تو حضور ﷺ کو ایک نہیں بیسیوں دفعہ ہوا۔ جن کا ذکر حدیث کی کتابوں میں بالتصریح موجود ہے۔

اس کے بعد واقعہ معراج پر جو اعتراض کئے گئے ہیں۔ ان کا بالترتیب جواب عرض کرتا ہوں۔ ہاں اگر کسی اعتراض کا جواب پوری طرح سمجھ نہ آئے یا دوران تقریر کسی قسم کا شبہ پیدا ہو جائے تو آپ کو پوری پوری اجازت ہے کہ جواب ختم ہونے پر اپنے شک کو بیان فرما دیں۔ ان شاء اللہ اس کے ازالہ کی بھی حتی الامکان کوشش کی جائے گی۔

پہلے اعتراض کا جواب: آسمان کے وجود کا انکار محض وہمی دلیلوں پر مبنی ہے جس میں یقین اور حتمیت کو دور کا بھی تعلق نہیں۔ برعکس اس کے آسمانوں کے وجود کے متعلق ایک نہیں دنیا کی تمام مذہبی کتابیں یک زبان ہیں اور سب سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آسمان ایک موجود اور مجسم شے ہے۔ تو پھر آسمانی اور الہامی کتابوں کے مقابلے میں کسی ایرے غیرے کی زٹلیات کو کیا وقعت دی جا سکتی ہے۔

دوسرے اعتراض کا جواب: آسمان میں خرق والتیام کو محال ماننا خود دلیل کا محتاج ہے۔ برخلاف اس کے سینکڑوں ستارے اور سیارے آج تک ٹوٹ کر سطح زمین پر گر چکے ہیں۔ جن کے ٹکڑے برلن اور لندن، پیرس اور نیویارک کے میوزموں میں آج بھی دیکھے جا سکتے ہیں تو اب آپ ہی بتائیے کہ ایسے عینی مشاہدوں کے ہوتے ہوئے زمین کے انسانوں کی واہمیات کو کیسے قبول کیا جائے۔

تیسرے اعتراض کا جواب: جسمِ ثقیل کا آسمانوں کی طرف جانا بیشک محال ہے مگر جسمِ لطیف کا جانا تو مسلم ہے۔ دیکھو فرشتے بھی جسم رکھتے ہیں۔ مگر جسمِ لطیف۔ اس واسطے ان کا آسمانوں پر جانا ہر ایک مذہب سے تعلق رکھنے والا انسان تسلیم کرتا ہے۔ تو اب اس کے بعد اتنا اور بھی سمجھ لو کہ جب یہ

کثیف انسان دنیا کے تعلقات کو کم کرتا ہے اور رات دن ریاضتیں کرتا ہے۔ تو اس تزکیہ سے اس میں ایسی لطافت آجاتی ہے کہ اس کا جسم عوام کے روح سے بھی زیادہ لطیف اور پاکیزہ ہو جاتا ہے۔ اور پھر جس طرح روح کو سیرِ سماوی میں کوئی خلل مانع نہیں ہوتی۔ اسی طرح مرتاض کا جسم بھی سیرِ عروجی میں روح کا مماثل بن جاتا ہے۔

مداری انڈے کس طرح نچاتے ہیں اور اس سے سبق:

شاید آپ نے کبھی دیکھا ہو گا کہ مداری انڈے کو نچاتے ہیں اور انڈا زمین سے چار پانچ گز تک کی بلندی تک اچھل کر زمین پر واپس آجاتا ہے۔ دیکھو ایک کثیف انڈا کیوں زمین سے اس قدر خود بخود بلند ہو جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مداری پہلے اس انڈے کو جسے اس مطلب کے لئے منتخب کرتے ہیں۔ سوئی کے ساتھ سوراخ کر کے اس میں سے تمام کثافت کو نکال لیتے ہیں۔ جب وہ بالکل اندر سے صاف ہو جاتا ہے تو پھر اس میں پارہ بھر کر اس کا منہ بند کر کے گرم جگہ پر رکھتے ہیں۔ پارہ گرمی سے اڑنے کی کوشش کرتا ہے جس کی وجہ سے انڈا بھی اس کے ساتھ بلند ہو کر گرتا ہے۔ اسی طرح وہ زاہد جو اپنے جسمانی انڈے کو ریاضت کی سوئی سے صاف کر لیتا ہے۔ اور پھر سوز و گداز اور عشق و محبت کا پارہ اپنے سینہ بے کینہ میں بھر کو ہونٹوں پر چپ کی مہر لگا لیتا ہے۔ تو پھر اسے غیب سے غیبی پر ملتے ہیں۔ کہ ان کی طاقت پرواز فرشتوں کے پروں سے بھی بڑھ جاتی ہے۔

چشم بندو گوش بند و لب بہ بند
گر نیابی سرِّ حق بر من بخند

ترجمہ: آنکھیں بند کر، کان بند کر اور ہونٹ بند کر (اس کے بعد) اگر تو حق کا راز نہ پائے تو مجھ پر ہنس۔

خواجہ غریب نواز کی کھڑاؤں کا اڑنا:

حضرت خواجہ خواجگان خواجہ معین الدین حسن چشتی سنجری رحمۃ اللہ علیہ کی جن لوگوں نے سوانح پڑھی یا سنی ہو گی انھیں معلوم ہو گا کہ جب خواجہ صاحب اجمیر میں رونق افروز ہوئے اور رائے پتھورا ہر قسم کے مقابلہ میں ناکامیاب ہوا تو اس نے آخر کار جوگی اجیپال کو مقابلہ کے لئے طلب کیا۔ وہ شخص نہایت مرتاض اور عابد

تھا۔ ریاضتِ شاقہ کی وجہ سے اس کے جسم میں بھی ایسی لطافت آچکی تھی کہ تمام لوگوں کے سامنے ایک مرگ چھالا بچھا کر اس پر بیٹھا اور ہوا میں اڑنا شروع کیا۔ مگر چونکہ اس کی ریاضت بلا تعلق اور بلا طریقہ تھی۔ اس واسطے اس میں بھی اسے کچھ کامیابی نہ ہو سکی۔ حضرت خواجہ صاحب نے اپنی کھڑاؤں کو حکم دیا کہ جاؤ اور سرکش جوگی کو مغلوب کر کے زمین پر لاؤ۔ سبحان اللہ۔ وہ جسمِ ثقیل۔ وہ لکڑی کے ٹکڑے جن میں نہ سمجھ تھی نہ عقل۔ نہ حرکت تھی نہ روح۔ مگر حضرت کے مقدس پاؤں کے توصل سے انہیں بھی یہ درجہ حاصل ہو گیا کہ وہ حکم پاتے ہی ہوا میں اڑنے لگیں اور آسمان پر پہنچ کر جوگی اجیپال کو مارتے مارتے واپس لے آئیں۔ جوگی صاحب مسلمان ہوئے اور آپ کا نام عبداللہ بیابانی رکھا گیا جس کا ذکر کئی دفعہ ہو چکا ہے۔

خواجہ صاحب کی کھڑاؤں میں طاقتِ پرواز کہاں سے پیدا ہوئی:

دیکھو کھڑاؤں میں صرف ایک عاشق کی معیت سے طاقت پرواز پیدا ہو گئی۔ اگر آپ کسی لوہے کو چند دن کسی مقناطیس کے ساتھ رکھیں تو آپ دیکھیں گے کہ اس جاذب لوہے کی چند روزہ معیت نے معمولی لوہے میں بھی قوتِ جاذبہ پیدا کر دی ہے۔ شیخ سعدی صاحب سے اس راز کو ان اشعار میں کیسے ہی پر لطف طریقے سے بیان فرمایا ہے۔

مجلس کا اثر اور اس کی مثال سعدیؒ کے اشعار میں

گلے خشبوئے در حمام روزے
رسید از دست محبوبے بدستم
بدو گفتم که مشکی یا عبیری
که از بوئے دلآویز تو مستم
بگفتا من گلے ناچیز بودم
ولیکن مدتے باگل نشستم
جمال ہم نشین درمن اثر کرد
وگرنه من ہماں خاکم که بودم

ترجمہ: ایک دن حمام میں خوشبو دار مٹی مجھے اپنے محبوب کے ہاتھوں سے ملی، اس سے میں نے پوچھا کہ تو مشک ہے یا عنبر ہے کہ تیری دل آویز خوشبو سے میں مَست ہو گیا ہوں تو وہ کہنے لگی کہ میں ایک ناچیز مٹی تھی لیکن ایک مُدت میں گُل کی صحبت میں رہی اُس کے ساتھ بیٹھی تو اُس ہم نشین کے جمال وحُسن نے مجھ پر اثر ڈالا (اور میں خوشبو دار ہو گئی) وگرنہ میں وہی مٹی ہوں جو کہ پہلے تھی۔

ریڈیم اور مقاطیس کا اثر اور اس سے ایک لطیف سبق:

گھڑیوں پر تو آپ ریڈیم دیکھتے ہیں یہ حقیقت میں ریڈیم نہیں ہوتی بلکہ یہ ایک دھات ہوتی ہے جو ریڈیم کی صحبت میں ایسی چمکدار بن جاتی ہے۔ ورنہ خود ریڈیم تو بہت ہی مہنگی اور بڑی قلیل مقدار میں پائی جاتی ہے۔ کہتے ہیں کہ اس وقت تمام دنیا میں پندرہ تولے سے زیادہ ریڈیم نہیں پائی جاتی۔ مگر گھڑیوں کا ریڈیم اس ریڈیم کے متاثر ہونے کی وجہ سے اسقدر چمکدار اور دوسروں پر اثر انداز ہو جاتا ہے۔ میں نے کسی انگریزی رسالے میں پڑھا کہ فرانس میں ایک لڑکی کا جسم روزانہ اسقدر چمکدار ہوتا گیا کہ اگر رات کو کسی جگہ کھڑی ہوتی تو اس کی روشنی سے اسے دیکھنا تو درکنار دوسری چیزوں کو بھی دیکھ لیا جاتا۔ لڑکی کے والدین اسے ڈاکٹروں کے پاس لے گئے۔ اور اس حیرت انگیز واقعہ کی وجہ تفتیش کروائی۔ ڈاکٹر خود بھی پہلے اس عجیب انکشاف پر بہت متحیر ہوئے۔ مگر بعد میں معلوم ہوا کہ یہ لڑکی گھڑیوں کی فرم میں ملازمہ تھی اور ریڈیم سے ڈائلوں پر لکھنے کا کام کرتی تھی۔ دورانِ تحریر وہ ریڈیم سے لگی ہوئی سوئی کو بلا سمجھے منہ میں رکھ لیا کرتی تھی۔ جس کے اثر سے اس کا جسم اب چمکنے لگ گیا ہے۔ ڈاکٹروں نے اس کا بہت علاج کیا مگر اس ریڈیم کے اثر نے اس کی جان کو لے کے ہی چھوڑا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نور مجسم تھے:

دیکھو۔ ہم مطلب سے بہت دور جا رہے ہیں۔ آپ مثالوں سے پوری طرح سمجھ گئے ہونگے کہ جس طرح مقناطیس یا ریڈیم دوسروں میں اثر کرتی ہے۔ اسی طرح حضرت خواجہ صاحب کی کھڑاؤں کی طاقتِ پرواز خواجہ صاحب کے وجودِ باوجود کے اتصال کا نتیجہ ہے۔ مگر خود خواجہ صاحب کی یہ طاقت سید الکائنات کی التفات فیضِ آیات کا صدقہ تھی۔ وہ سید الکونین کہ جن کے الفاظ، جن کی ہدایت اور جن کی رہنمائی سے کروڑوں انسان تزکیہ کے انتہائی مدارج پر پہنچے۔ تو اب آپ اندازہ لگائیں۔ کہ وہ منبعِ فیض اور مصدرِ ہدایت خود کتنا لطیف اور ازکیٰ ہوگا۔ اسی تزکیہ و تصفی کے باعث قرآنِ پاک آپ کو نور قرار دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے!

”قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّ كِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۙ“۔ (المائدہ:۱۵)

کہ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس ایک نورِ مجسم نبی مکرم سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو بھیجا گیا۔ اور ایک کتاب مبین اور

فرقان متین کو۔

اسی واسطے صحیح احادیث کی رو سے حضور ﷺ کے وجودِ مقدس کا سایہ نہ تھا۔ کیونکہ سایہ تو ہوتا ہے کثیف کا۔ مگر وہ جانِ جاں لطیف تو کیا سراپا نور تھا پھر نور کا سایہ کس طرح ہوتا۔

حضور ﷺ کے سایہ نہ ہونے پر اعتراض اور اس کا جواب:

بعض لوگوں نے حضرت مولانا عبدالحق محدث دہلوی قدس سرہٗ پر اعتراض کیا ہے کہ یہ کس طرح ہوسکتا ہے کہ حضور ﷺ کا سایہ نہ ہو۔ حالانکہ قرآنِ پاک تو آپ کو بشر قرار دے رہا ہے۔ اور بشر بوجہ گوشت پوست کے کثیف ہے۔ اور کثیف کا سایہ لازمی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ یہ لازمی نہیں کہ ہر جسم کا سایہ بھی ضرور ہو۔ دیکھو ایک مجسم چیز کو لے کر اس کے چاروں طرف لیمپ روشن کردو۔ اور پھر دیکھو کہ اس جسم کا سایہ کیسے غائب ہوتا ہے۔ اسی طرح حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی باوجود بشریت کے کے نورِ خداوندی کے ساتھ ہر طرح سے ایسی محاط تھی کہ آپ کا سایہ زمین نہ پڑتا تھا۔

جسمش نہ داشت سایہ والحق چنیں سنزد
زیرا کہ بود جوہر پاکش زنورِ حق

ترجمہ: اور آپ ﷺ کا جسم مبارک سایہ نہیں رکھتا تھا اور حق بھی یہی ہے اس لیے کہ آپ کا جوہرِ پاک حق تعالیٰ کے نور (کے فیض) سے ہے۔

حضور ﷺ کی صورتِ بشری ملکی اور حقی کی توضیح:

اس کے علاوہ اگرچہ یہ سچ ہے کہ حضور ﷺ آیت قرآنی کی رو سے بشر تھے۔ مگر آپ کی بشریت عام نہ تھی۔ بلکہ ''قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ'' کو ''یُوْحٰٓی اِلَیَّ'' سے مقید کردیا گیا۔ اور اس قید نے جیسا آپ کو مہبطِ وحی ہونے کے لحاظ سے دوسرے انسانوں سے ممتاز کردیا ہے اسی طرح قرآنِ پاک کی اور بہت سی آیتوں نے آپ کی بشریت پر کئی ایک اور قیود بڑھا کر دوسرے ہم شکل اور متشابہ انسانوں سے ممیز و مختص فردیا ہے۔

اسی واسطے مواہب صوفیہ میں لکھا ہے کہ حضور ﷺ کی تین صورتیں ہیں۔ بشری۔ ملکی اور حقی۔

بشری تو اس لئے کہ قرآن پاک فرماتا ہے!

’’قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ۔

ملکی اس لئے کہ آپ نے فرمایا!

اِنِّي لَسْتُ كَهَيْئَتِكُمْ اِنِّي يُطْعِمُنِي رَبِّي وَيَسْقِيْنِ

(صحیح بخاری: جز، ۳، رقم: ۱۹۶۴، طبع دار طوق النجاۃ)

یعنی میں تم جیسا نہیں ہوں۔ میں اپنے رب کے پاس رات گذارتا ہوں۔ اور وہ مجھے کھلاتا اور پلاتا ہے۔

اور **حقی** اس لئے کہ آپ فرماتے ہیں!

’’لِيْ مَعَ اللّٰهِ وَقْتٌ لَا يَسَعُنِيْ فِيْهِ مَلَكٌ مُقَرَّبٌ، وَلَا نَبِيٌّ مُرْسَلٌ۔

(مرقاۃ المفاتیح: جز، ۴، باب، الاستغفار والتوبہ، رقم: ۲۳۲۴، دار الفکر بیروت)

کہ میرا اللہ جل شانہ کے ساتھ ایک ایسا وقت ہوتا ہے۔ کہ جس میں نہ تو کسی مقرب فرشتے کو گذر ہوسکتا ہے نہ اور کسی رسول کا۔ گویا اس وقت دوئی کو ہٹا دیا جاتا ہے۔ اور حالت یہ ہوتی ہے۔

من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جاں شدی
تاکس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگری

ترجمہ: میں تُو ہوگیا اور تُو میں ہوگیا، میں جسم ہوگیا اور تُو جان ہوگیا تاکہ اس کے بعد کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ میں اور ہوں اور تُو اور ہے۔

اور رب العزت نے ان میں سے ہر ایک صورت میں حضور ﷺ سے کلام فرمایا۔ مرکب کلمات تو صورتِ بشری کا کلام ہے۔ مقطعات صورتِ ملکی کا اور ابہام یا ایحا صورتِ حقی کا۔ چنانچہ فرمایا!

’’فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ؕ○۔ (النجم: ۱۰)

تو خلاصہ یہ نکلا کہ حضور ﷺ نور تھے۔ الطف تھے۔ ازکیٰ اور اصفیٰ تھے۔ اس واسطے آپ کا عالمِ بالا کی طرف جانا عقلاً اور نقلاً کسی طرح بھی مستبعد نہیں ہوسکتا۔

چوتھے اعتراض کا جواب: روح القدس یا جبرئیل امین جب ایک لحظہ میں سدرۃ المنتہا سے زمین پر نزول فرما سکتے ہیں۔ اور ان کا جسمِ لطیف اس سرعت اور عجلت میں مانع نہیں آتا۔ تو پھر

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا پچھلے معنوں کے سمجھ جانے سے اس قدر جلدی جانا اور آنا کس طرح مستحیل قرار دیا جاسکتا ہے۔

مشتری جو حال کی تحقیق کے مطابق ہماری زمین سے ایک ہزار چار گنا بڑا ہے۔ اہلِ سائنس کے نزدیک ایک گھنٹے میں تیس ہزار میل چلتا ہے۔ تو گویا انسان کے ایک سانس لینے کے عرصے میں مشتری نو میل کا فاصلہ طر کر جاتا ہے تو جب اس قدر عظیم جسم کا اس سرعت سے چلنا مانا اور دیکھا جاسکتا ہے۔ تو پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسمِ منور کے اس قدر تیز جا کر واپس چلے آنے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔

پانچویں اعتراض کا جواب: بعض شعبدہ باز اور مداری تک ظاہر میں چلتے پھرتے اور لوٹتے کودتے ہیں۔ مگر دیکھا جاتا ہے کہ محض ان کی ڈھٹھ بندی کے باعث وہ آگ کے ضرر سے محفوظ رہتے ہیں۔ تو جب ان شعبدہ بازوں کا یہ حال ہے تو پھر اس شہبازِ حقیقت کو آگ کس طرح نقصان پہنچا سکتی ہے۔

پھر آگ یا ٹھنڈک اسی کو نقصان پہنچا سکتی ہے کہ جو اس میں ٹھہر جائے لیکن اگر آپ خود تیزی کے ساتھ آگ کے شعلے سے اپنے ہاتھ گذاریں تو اس سے آپ کے ہاتھ کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچے گا۔ اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی اس قدر سرعت اور عجلت کے ساتھ گرم اور سرد منطقوں سے گذرے کہ آپ کے جسمِ مطہر و منور پر سردی و گرمی کا کچھ اثر نہ ہوا۔

چھٹے اعتراض کا جواب: مسجدِ حرام سے آپ کو سیدھا آسمانوں پر نہ لے گئے بلکہ پہلے آپ کو بیت المقدس میں لایا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو بیٹے تھے۔ حضرت اسمٰعیل اور حضرت اسحٰق علیہما السلام۔ حضرت اسحٰق کی اولاد حضرت یعقوب علیہ السلام کے لقب اسرائیل کے نام سے مشہور ہوئی۔ اب بنی اسرائیل میں سے جتنے بھی انبیاء ہوئے ہیں ان سب کا قبلہ بیت المقدس تھا۔ مگر بنی اسماعیل اپنے دادا اسماعیل علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کے بنائے ہوئے کعبہ کی طرف منہ کر کے عبادت کیا کرتے تھے۔ تو گویا حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد دو قبلوں میں تقسیم تھی۔ بنی اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس تھا اور بنی اسماعیل کا قبلہ بیت اللہ۔

اب جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تمام دنیا کے لئے پیغمبر بنا کر بھیجا گیا اور آپ کی شان کا قرآنِ پاک نے”

كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّ نَذِيْرًا" (سبا:۲۸)

کے الفاظ میں اعلان کر دیا تو ضروری ہوا کہ آپ کی ذاتِ گرامی میں دونوں قبلوں کو بھی جمع کر دیا جائے۔ چنانچہ یہی وجہ تھی کہ آپ ایک عرصہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے عبادت کرتے رہے۔ بعدۂ جب:

"وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ؕ۔ (البقرة:۱۴۹)

اور جہاں سے آؤ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کرو۔

کا حکم نازل ہوا تو آپ بالاستقلال خانہ کعبہ کی طرف منہ کر کے عبادت کرنے لگے۔ اسی طرح آپ کو لیلۃ المعراج میں بھی مسجدِ حرام سے بیت المقدس کو اس غرض سے لے گئے۔ تا آپ کی ذاتِ گرامی میں دونوں قبلوں کو جمع کر دیا جائے اور مسجدِ اقصیٰ میں آپ کو تمام انبیاء و اولیاء کا امام بنا کر اعلان کر دیا جائے کہ آج سے سرکار مدینہ میں دونوں قبلوں کو جمع کر کے نبی القبلتین کا پیارا لقب دیا جاتا ہے۔ اور اس واسطے آج سے بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں کو چاہیے کہ اس فخرِ رُسل کی پیروی اور اطاعت کر کے فلاحِ دارین حاصل کریں۔

ساتویں اعتراض کا جواب: حضور ﷺ کے معراج کے لئے آسمان کو چند وجوہات کے باعث منتخب کیا گیا ایک تو چونکہ حضور ﷺ زمین میں پیدا ہوئے اور زمین ہی آپ کا مسکن اور موطن تھا۔ اسلئے اگر آپ کو یہ واقعہ سطحِ زمین ہی پر پیش آتا تو نہ عروج کہلاتا اور نہ ہی عوام کی نظروں میں کچھ زیادہ وقیع معاملہ سمجھا جاتا۔ بلکہ اسے محض خواب و خیال سے تعبیر کر کے اس کے ماننے یا نہ ماننے کو برابر سمجھا جاتا۔

دوسرے چونکہ زمین کی نسبت آسمان آیاتِ الٰہیہ کا اعلیٰ مظہر ہے۔ اس واسطے ان آیتوں اور مظاہروں کو دکھانے کے لئے آسمانوں پر بلایا گیا۔

تیسرے یہ کہ زمین کو فخر تھا کہ مجھ پر فخر الرُسل کا مقام اور قیام ہے فخر کو توڑنے اور آسمان کی فضیلت کو بڑھانے کے لئے عالمِ علوی کو اس وقوعہ کے لئے چنا گیا۔

چوتھے یہ کہ معراج آسمانوں پر نہ ہوا۔ بلکہ ماوراءِ سموات تھا جس پر لامکان کا اطلاق کیا جاتا ہے۔

اور جہاں پر تجلیاتِ ربانی کی اس قدر چمک ہے کہ مولانا جامیؒ کے الفاظ میں جبرئیل امین بھی یوں کہنے لگے۔

بگفتا فراتر مجالم نماند　　بماندم که نیروئے و بالم نماند
اگر یک سر موئے بر تر پرم　　فروغ تجلی بسوزد پرم

ترجمہ: حضرت جبریل علیہ السلام نے کہا اس سے آگے میری مجال نہ رہی میں پیچھے رہ گیا اس لیے کہ میرے پروں کی طاقت نہ رہی اگر ایک بال کے سر کے برابر بھی میں آگے جاؤں اور اُڑوں تو تجلیاتِ الٰہی کی زیادتی میرے پروں کو جلا دے گی۔

ہاں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آسمانوں سے گذرتے ہوئے اس مکانِ لامکان پر پہنچے۔

پانچویں یہ کہ اگر آپ کو زمین پر معراج ہوتا تو پھر بھی تو یہی اعتراض وارد ہوتا کہ آپ کو آسمانوں پر کیوں نہ ہوا۔ زمین کو اس کے لئے کیوں منتخب کیا گیا جو جواب آپ اس حالت میں دیتے۔ اسی جواب کو اس حالت کے لئے بھی کافی سمجھ لو۔

آٹھویں اعتراض کا جواب: رات کو معرج کے لئے اس واسطے پسند فرمایا کہ رات ہی عاشقانہ راز و نیاز کے لئے مناسب ہوتی ہے۔ رات بچھڑوں کو ملاتی ہے۔ رات ستار ہے اور ستارِ حقیقی کی صفت میں رنگی ہوئی ہے۔ اور یہی منہ وجہ اشتراکِ انتخاب کا باعث بنا۔ رات عدم پر دلالت کرتی ہے۔ اور عدمِ وجودِ معراج کا پایا جانا انسان کے لئے ایک نہایت نصیحت آمیز نکتہ ہے۔ کہ اے انسان تو اپنے عدم سے وجود میں آنے کو یاد کر۔ اور پھر وجودِ عارضی سے ایسا کچھ کام لے کہ دوام بھی اس بیدوامی کا غلامِ بے دام بن جائے۔ رات اپنی ٹھنڈک، آرام اور آسائش کے لحاظ سے جنت کا نمونہ ہے۔ مگر دن بوجہ تپش، مصیبت، تکلیف اور کشاکش کے دوزخ کے مشابہ ہے۔ اس واسطے تفاؤلا رات کو منتخب کیا گیا۔ تاکہ اس واقعہ کے ماننے والوں اور صاحبِ معراج کی اقتدا کرنے والوں کو سراً جنت کی بشارت بھی ہو جائے۔ معراج کے لئے رات کے وقت کو منتخب کرنے میں یہ بھی حکمت ہے تاکہ ظاہر ہو جائے کہ کون ایمان بالغیب لاتا ہے اور کون نہیں لاتا۔ اسی رات ہی کے وقت نے ابوجہل کی جہالت اور صدیق رضی اللہ عنہ کی صداقت کا اظہار کیا، کیونکہ اگر

دن ہوتا اور معتقدین و منکرین سب آنکھوں سے عروجِ سماوی کو دیکھتے تو یہ ان کے ایمان کو پرکھنے کے لئے صحیح کسوٹی ثابت نہ ہوتی۔ کیونکہ اس صورت میں انہیں اس وقوعہ کے ماننے میں انکار کی گنجائش نہ رہتی۔ ہاں یہ ممکن تھا کہ بد بخت اس کو سحر کی طرف منسوب کرتے اور نیک بخت اس سے اطمیانِ قلب اور قوتِ ایمانی حاصل کرتے پھر اس کے علاوہ قرآنِ پاک نے ذاتِ گرامی کو سراجاً منیراً کے لقب سے ملقب فرمایا ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ سراج یا سورج یا روشنی کی ضرورت اندھیرے میں ہوتی ہے۔ کوئی چراغ دن میں نہیں جلایا کرتا۔ گویا سراجاً منیراً کو رات کے وقت معراج کرانے میں یہ اشارہ فرمادیا کہ اے حبیب آپ کفر کی تاریکی اور شرک کی ظلمت کو دور کرنے کیلئے چراغ ہیں۔ اور جیسے ہم رات کے وقت آپ کو آسمانوں کی سیر کرانے کو لے جا رہے ہیں۔ اسی طرح آپ کا دین، آپ کا نام اور آپ کا اسلام کفر و شرک کی راتوں میں آسمانِ شہرت اور قبولیت پر چڑھا دیا جائے گا۔ چنانچہ اس معراج کی طرف ''وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ'' میں اشارہ فرمادیا، یعنی ہم نے آپ کے ذکر کو جس میں آپ کا نام آپ کی رسالت، آپ کا کام اور آپ کا اسلام سب کچھ آگیا۔ بلند اور اونچا کر دیا۔

ورفعنالک ذکرک کی عجیب وغریب تفسیر:

کبھی آپ نے یہ بھی سوچا ہے کہ حضور ﷺ کے نام نامی اور آپ کے دینِ سامی کو کس طرح بلند اور رفیع کر دیا گیا۔ اور قرآنی وعدہ ''وَرَفَعۡنَا لَكَ ذِكۡرَكَ'' کو کس طرح پورا کر کے تمام دنیا پر آپ کے ذکر کو پھیلا دیا گیا۔ دیکھو میں آپ کے سامنے اس کی تشریح کرتا ہوں۔ اور آپ اسے سن کر حیران ہونگے کہ دنیا کے کسی نبی، کسی بادشاہ، کسی ولی اور کسی انسان کو یہ درجہ نہ ملا۔ اور ان کا ذکر اتنا بلند نہ ہو سکا جتنا کہ آمنہ کے یتیم لاڈلے اور عبدالمطلب کے ایک بے کس پوتے کے ذکر کو رفیع و منیع کر دیا گیا۔ سچ ہے!

''وَتُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ ؕ بِيَدِكَ الۡخَيۡرُ ؕ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ ۝۔

(آلِ عمران:۲۶)

اور جسے چاہے عزت دے اور جسے چاہے ذلت دے ساری بھلائی تیرے ہی ہاتھ ہے بے شک تو سب کچھ کر سکتا ہے۔

جس طرح یہ حقیقت ہے کہ سورج سطحِ ارضی میں کبھی بھی غروب نہیں ہوتا بلکہ اگر ایک جگہ اس کا غروب ہوتا ہے تو دوسری جگہ طلوع۔ بعینہٖ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ حضور ﷺ کے مبارک ذکر کا سورج بھی کبھی صفحۂ زمین سے غروب نہیں ہوتا۔ بلکہ اگر ایک جگہ اس کا غروب ہوتا ہے۔ تو دوسری جگہ طلوع ہوتا ہے۔ اگر ایک جگہ اس کی ظہر ہوتی ہے تو دوسری جگہ عصر، تیسری جگہ مغرب نظر آتی ہے تو چوتھی جگہ عشا، کیوں؟ دیکھو! زمین گول ہے اور آپ یہ جانتے ہیں کہ سورج مشرقی مقامات سے پہلے ظاہر ہوتا ہے جو مغربی مقام کسی مشرقی مقام سے ایک عرض بلد کے فاصلے پر واقع ہوتا ہے۔ تو وہاں سورج اس مشرقی مقام سے پانچ منٹ پیچھے طلوع ہوتا ہے اور اس طرح جتنا کسی مقامات میں فاصلہ زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی ان میں طلوع کا فرق بھی زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ اور پھر آپ کو یہ بھی معلوم ہے کہ باری تعالیٰ کے فضل و کرم سے آج اسلامی آفتاب کی کرنیں تاریک سے تاریک کونوں تک پہنچ چکی ہیں۔ اس وقت اگر ایک طرف یورپ کے صلیب پرستوں کے درمیان اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ'' کا آوازہ بلند ہوتا ہے۔ تو دوسری طرف جاپان کے بت پرستوں کے درمیان رسالت محمدی ﷺ کا اعلان سنائی دیتا ہے۔ تو گویا سطح ارضی کا شاذ و نادر ہی کوئی ایسا قطعہ ہو گا کہ جہاں پر اسلام کی روشنی نہ پہنچی ہو۔ اور پھر یہ بھی ظاہر ہے کہ جہاں پر اسلام ہو گا۔ وہاں پر مسلمان نماز بھی پڑھتے ہوں گے۔ ہر نماز سے پہلے انہیں ایک بلند جگہ پر کھڑے ہو کر ''اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ'' کے ساتھ'' اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللهِ'' کا بھی اعلان لازمی طور پر کرنا ہو گا۔

اذان کو ہر نماز سے اول کیوں لازمی قرار دیا ہے:

اور اس اعلانِ توحید اور رسالت کو مسلمانوں پر اس لئے لازمی کر دیا گیا ہے کہ ایک تو وہ دنیا میں اپنی پیدائش کا صحیح مطلب یاد رکھیں۔ اور وہ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی وحدانیت اور حضور ﷺ کی رسالت کا پرچار دنیا کے کونے کونے میں کر دیا جائے۔ ورنہ ان سے پہلے بھی دنیا آباد تھی دنیا میں یہودی، عیسائی، گبر اور آتش پرست موجود تھے۔ پھر اس قوم کو کیوں پیدا کیا گیا۔ اس قوم کی پیدائش کا صرف ایک ہی مقصود تھا اور وہ یہ کہ دنیا کو توحید کی طرف بلائے، انہیں شرک کی تاریکی سے نکال کے اسلام کی روشنی میں لائے۔ ایک تو اس لئے نماز کے ساتھ لازماً مسلمانوں کو اس مقصود کے اعلان کر دینے کا حکم ہوا۔ دوسرے یہ کہ مسلمانوں کو معلوم

ہو جائے کہ آج سے اسلام کی کسی چیز کو نہ چھپایا جائے گا۔ بلکہ تمام دنیا میں پانچ وقت اپنی ہستی، اسلام کے مقدس وجود، رب العزت کی توحید، فخرِ موجودات کی رسالت کا اعلان ہوتا ہی رہیگا۔ اور سچا مسلمان اسلام کی کسی بات کو کسی وقت میں بھی چھپانے کی کوشش نہ کرے گا۔ مگر اس وقت مسلمانوں کی ایک عجیب حالت ہے۔ غیر قوموں کے سامنے نماز پڑھتے ہوئے شرمائیں گے کہ یہ ہمارے سجدہ کی ہیئت کذائی دیکھ کر ہمارے ساتھ مذاق اڑائیں گے۔ یورپین میں ٹوپی پہن کر جانے میں ہچکچائیں گے کہ وہ ہماری ٹوپی دیکھ کر ہمارے ساتھ استہزاء کریں گے۔ مگر یہ نہیں سمجھتے کہ اوّل تو اس قوم نے ہماری کونسی چیز کے مذاق نہیں اڑائے ہماری غلامی نے ہماری اعلیٰ سے اعلیٰ چیزوں کو ان کی نظروں میں بے قدر کر دیا ہے۔ یہ ہماری عبادتوں، طریقوں اور رسموں کا قصور نہیں بلکہ اس سب قصور کا منبع اور مصدر ہماری غلامی ہے۔ آج چونکہ ان کی سلطنت ہے حکومت ہے اور طاقت ہے۔ اس لئے ان کی غیر مہذب سے غیر مہذب حرکات بھی نوجوانوں کی نظروں میں پسندیدہ اور جاذب معلوم ہوتی ہیں۔ آج ان کی فحاشی، بدمعاشی اور عیاشی کچھ زیادہ عیب دار معلوم نہیں ہوتی۔ ان کا رقص، ان کا آفتابی غسل، ان کا ایک دوسرے کی کمروں میں ہاتھ ڈالے ہوئے کھلے بازار پھرنا، ان کا سرِ راہ ایک دوسرے کے بوسوں سے لطف انگیز ہونا۔ آج ان کی اسفل ترین تہذیب اور ارذل ترین ذہنیت کے کھلے مظاہرے ہیں۔ مگر حکومت دولت اور قوت کے ملمع سے آج یہ بدتہذیبیاں بھی تہذیب کا اعلیٰ نمونہ کہلائی جاتی ہیں۔ پھر ایسی مقلوبُ الفطرت قوم کے استہزاء اور تمسخر کی وجہ سے سجدہ کرتے ہوئے ہچکچانا یا ٹوپی پہن کر ان کی مجلسوں میں جانے سے گریز کرنا کہاں کی دانائی اور قوتِ ایمانی ہے۔

سجدہ غائتِ تذلل کیوں ہے:

سجدہ رب العزت کے سامنے غایت اور نہایت عاجزی کا اظہار ہے کیونکہ زمین دنیا کی تمام چیزوں سے کم درجہ کی چیز ہے۔ پاؤں کے نیچے روندی جاتی ہے پیشاب پاخانہ اس پر ڈالا جاتا ہے۔ گدھے، کتے اور سور تک اس پر چلتے ہیں۔ اور دنیا کی حقیر سے حقیر چیز بھی اس سے اپنی خدمت لیتی ہے۔ مگر اس کے برعکس انسان تمام دنیا کی مخلوقات سے اشرف اور افضل ہے۔ اس کے سر پر:

”وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْ آدَمَ“ (بنی اسرائیل: ۷۰)

اور بیشک ہم نے اولادِ آدم کو عزت دی۔

کا جگمگاتا ہوا تاج ہے۔ اور خلافتِ ربانی کے مقدس عہدہ سے ممتاز ہے۔ اب تمام جسم میں منہ اشرف الاعضاء ہے کیونکہ کسی انسان کا حسن وقبح، اس کا رعب وداب، اس کا اثر اسی سے ظاہر ہوتا ہے۔ مگر دیکھو ایک ساجد انسان اپنے اعلیٰ عضو یعنی منہ کو دنیا کی خسیس اور کم مرتبہ چیز یعنی زمین پر رکھ کر باری تعالیٰ کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار کرتا ہے۔ اور پھر یوں بھی نہیں بلکہ اسے دھو کر پاک اور صاف کر کے دربارِ باری میں اظہارِ تذلل کے لئے زمین پر رکھ دیتا ہے تو اب آپ ہی بتائیں کہ سجدہ کا مذہبِ اسلام میں کہ مذہبِ عشق ومحبت ہے کتنا درجہ اور مرتبہ ہوگا۔ اسی طرح ٹوپی کے متعلق ان کا استھزاء اگر غور کیا جائے تو ٹوپی سے نہیں۔ بلکہ اسلام سے ہے کیونکہ اگر یہ ٹوپی ہی سے مذاق اڑاتے تو اپنے ٹوپی پہننے والوں کا کیوں نہیں اڑاتے۔ بات یہ ہے کہ ہماری ٹوپی کو پہچان کر سمجھ جاتے ہیں کہ یہ مسلمان ہے اس واسطے وہ پھر مذاق کرتے ہیں۔ اور ہمارے نوجوان ان کے مذاق سے جھینپ کے فوراً ٹوپیوں کو اتار لیتے ہیں تاکہ ہمارا مسلمان ہونا ظاہر نہ ہو سکے۔ اور اس طرح ہم ان کے مذاق سے بچ جائیں۔ مگر یہ طریقہ مذاق سے بچنے کا کسی طرح پسندیدہ نہیں۔ کیونکہ اس میں گویا ہم اپنے اسلام کو چھپانے کا جرم کرتے ہیں۔ حالانکہ اذان کا پانچ وقتہ اعلان ہمیں اس جرم سے بچنے کی تلقین کر رہا ہے۔

غیروں کے مذاق کا جواب ان کے مذاق سے دو:

ایسے مذاق کا قرآنِ پاک نے یہ علاج بتایا ہے کہ اگر وہ تمہاری ٹوپی سے مذاق کرتے ہیں تو تم بھی ان کے ننگا سر ہونیکا تمسخر اڑاؤ اور صاف کہہ دو۔

”اِنْ تَسْخَرُوْا مِنَّا فَاِنَّا نَسْخَرُ مِنْكُمْ كَمَا تَسْخَرُوْنَ ؕ۝“۔ (ھود: ۳۸)

اگر تم ہم پر ہنستے ہو تو ایک وقت ہم تم پر ہنسیں گے جیسا تم ہنستے ہو۔

ہاں جہاں پر مسلمان کمزور ہوں طاقت نہ ہو، تعداد نہ ہو، تو وہ ایک الگ معاملہ ہے مگر طاقت، قوت، اور تعداد کے ہوتے ہوئے۔ نماز نہ پڑھنا یا ان کی مجالس میں ٹوپی پہنے ہوئے جانے میں ہچکچانا، خوئے بدرا بہانہ بسیار (**بری عادت کو بہانے کافی مل جاتے ہیں**) نہیں تو اور کیا ہے۔

تو بات یہ بیان ہو رہی تھی کہ جہاں پر اسلام ہوگا وہاں مسلمان نماز پڑھتے وقت لازمی طور پر اذان دے کر حضور ﷺ کی رسالت کا اعلان کرینگے۔ تو گویا دنیا میں ہر وقت کسی نہ کسی مقام پر حضور ﷺ کا ذکرِ خیر ہی رہتا ہے۔ اور چوبیس گھنٹے میں سے ایک لمحہ یا ایک دقیقہ بھی ایسا نہیں مل سکتا کہ جس میں آپ کے نامِ نامی کا اعلان نہ کیا جاتا ہو۔

ورفعنالک ذکرک کی زندہ مثال:

مثلاً صبح کے وقت جب جزائر فلپائن کی مسجدوں سے اشھد ان محمد الرسول اللہ کی آواز بلند ہوتی ہے تو یہی آواز سورج کے طلوع کے ساتھ ساتھ سطحِ ارضی کو طے کرتے ہوئے ایک گھنٹہ بعد جاوا کے لوگوں کو خوابِ نشینی سے ہوشیار کرتی ہے۔ اس کے بعد جاوا کے مغربی مقامات سے رسالت کی نوبت بجتی ہوئی ٹھیک ایک گھنٹہ بعد کلکتہ کی فضا سے یہ دلکش ترانہ بلند ہوتا ہے۔

پھر ایک گھنٹہ بعد بمبئی کی مسجدیں اس مقدس آواز سے گھونجتی ہیں تو دوسرے گھنٹے میں ورفعانا لک ذکرک کی لہر افغانستان سے ہوتی ہوئی وسط ایشیا اور پھر سمرقند سے ہو کر بخارا پہنچتی ہے بخارا میں ابھی صبح ہی ہوتی ہے کہ پھر فلپائن پر ظہر کا نقارہ بجنا شروع ہو جاتا ہے۔ اور یہ ذکرِ محمدی کی رُو یہاں سے کچھ ہی آگے بڑھتی ہے کہ فلپائن پر عصر کا وقت ہو جاتا ہے۔ اور اسی طرح وہ لہر جو یہاں سے صبح کے وقت روانہ ہوئی تھی۔ ابھی تک پوری دنیا کو طے نہیں کرنے پاتی کہ مغرب اور عشا کے بعد پھر صبح کا وقت ہو جاتا ہے۔ اور پھر پہلی غیر مختتم رُو کے پیچھے دوسری دو کو روانہ کر دیا جاتا ہے۔ ذکرِ حبیب کی وہ پہلی رُو جو فلپائن سے صبح کے وقت روانہ ہوئی تھی۔ وقتِ روانگی کے عین چھ گھنٹے بعد مکہ معظمہ پہنچتی ہے۔ اور پھر یہ لہر ساتویں گھنٹے میں قاہرہ سے ہوتی ہوئی آٹھویں گھنٹے میں ٹرپولی پہنچتی ہے۔ وہاں سے نویں گھنٹے میں الجیریا کی بستیوں سے ٹکراتی ہوئی اور بحرِ اوقیانوس کو طے کرتے ہوئے فری ٹاؤن ساریون میں جا گونجتی ہے۔ یہ تو ذکرِ رسول کی پہلی ہی لہر کا بیان ہے۔ اس کے پیچھے تو ظہر عصر مغرب اور عشا کی لہریں بڑی تیزی سے سطحِ دنیا کو طے کرتی ہوئیں آ رہی ہیں اور ابھی وہ رستے ہی میں ہوتی ہیں کہ فلپائن پھر دوبارہ صبح کا نغمہ ان کے پیچھے جاری کر دیتا ہے۔ اور اس طرح سید المرسلین شفیع المذنبین، مراد العاشقین اور رحمۃ اللعالمین ﷺ کے نامِ نامی اور ذکرِ سامی دنیا کے کونے کونے

سے ہر آن اور ہر لحظہ بلند کر کے ورفعنا لک ذکرک کے مقدس وعدے کو پورا ہوتے ہوئے دکھایا جاتا ہے

یا صاحب الجمال ویا سید البشر　　من وجهك المنير لقد نور القمر
لا يمكن الثناء كما كان حقه　　بعد از خدا بزرگ توئی قصه مختصر

ترجمہ: اے صاحب الجمال (ﷺ) اور اے انسانوں کے سردار۔ آپ (ﷺ) کے رخِ انور سے چاند چمک اٹھا۔ آپ ﷺ کی ثنا کا حق ادا کرنا ممکن ہی نہیں۔ قصہ مختصر یہ کہ خدا کے بعد آپ (ﷺ) ہی بزرگ ہیں۔

اللھم صلی علیٰ سیدنا ونبینا و مولانا محمد وعلیٰ آلہٖ واصحابہٖ کما تحب و ترضیٰ۔

اب پھر سے یہاں اصل مطلب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ انعمت علیہم کی تفسیر میں منعم علیہم چار فرقے بیان ہوئے۔ پہلا فرقہ انبیاء علیہم السلام کا تھا۔ جس مفصل بیان ہو چکا ہے۔ دوسرا فرقہ صدیقین کا کہ جس کا کچھ بیان چل رہا ہے۔ اور جس کے ضمن میں اور بہت سے مفید اور نادر نکات بیان ہوئے۔ اب صدیق کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ صدیق کی تشریح وتوضیح کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ یہ فرقہ انبیاء علیہم السلام کی قوتِ نظریہ کا کامل عکس ہوتا ہے۔ اور انبیاء کرام کی باتوں کی تصدیق کرنے میں امت کے باقی لوگوں سے پیش پیش ہوتا ہے۔

شہید کا بیان:

اب اس کے بعد منعم علیہم کے تیسرے فرقے یعنی شہداء کے متعلق عرض کرتا ہوں۔ شہداء جمع ہے شہید کی۔ اور شہید کہتے ہیں۔ گواہ کو۔ وہ لوگ جو اپنی گردنیں اللہ کے رستے میں کٹاتے ہیں تو گویا وہ بھی نبی کی صداقت اور اس دعویٰ کی سچائی پر گواہ ہوتے ہیں۔

جب وہ پیغمبر کی زبانِ فیض ترجمان سے سنتے ہیں کہ جو شخص اللہ کے رستے میں اپنا مال خرچ کرتا ہے تو اِس کو اُس کا اتنا اتنا درجہ دیا جاتا ہے۔ تو وہ اس پر صدقِ دل سے یقین کر کے اپنے مال کو اس اخروی تجارت میں لگا دیتے ہیں۔ اور جب لسانِ نبوی سے ان کے کانوں میں یہ آواز آتی ہے۔ کہ جو اپنی جانوں کو اللہ کے رستے میں قربان کرتے ہیں تو ان کو ہدیہ بدلا دیا جاتا ہے۔ تو وہ پیغمبر ﷺ کے ان الفاظ پر اپنی جانوں کو

رب العزت کے رستے میں نثار کر دیتے ہیں، تو گویا وہ پیغمبر ﷺ کے الفاظ کو صرف وعدے کی حیثیت سے نہیں بلکہ عقیدے کی پختگی ان کے سامنے سے دنیوی حجابات کو دور کر کے ان وعدوں کو حقائق کی صورت میں لا کھڑا کرتی ہے اس واسطے وہ مال وجان جیسی قیمتی چیز کو اس بازی میں دینا ایک نہایت ادنیٰ کام سمجھتے ہیں۔

جنگِ بدر کا ایک عجیب واقعہ:

جنگِ بدر میں جب ایک صحابی کی لڑنے کی باری آئی تو اُس نے اپنے مشکیزے کھول کر پانی پینا چاہا۔ تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ اے شخص کیا تو نہیں دیکھتا کہ جنت کی حوریں کوثر کے بھرے ہوئے گلاس لئے تیرا انتظار کر رہی ہیں۔ صحابی کا یہ سننا تھا کہ مشکیزے کو ہاتھ سے رکھ دیا اور میدانِ کارزار میں جا کر ایسی بہادری سے لڑے کہ اپنے اور پرائے سب آپ کی شجاعت سے دنگ رہ گئے۔

مگر چونکہ حضور ﷺ نے کوثر کے الفاظ میں اسے جنت کی بشارت دی تھی اس لئے اس وعدۂ مبارک کا پورا ہونا ضروری تھا۔ چنانچہ آپ نہایت مردانگی اور بسالت کے ساتھ لڑتے ہوئے دین کی حمایت میں شہید ہو گئے۔ اور حضور ﷺ کے مقدس وعدے کے مطابق منتظر حوروں کے ہاتھوں سے کوثر کا ماءِ طہور جا پیا۔ تو مطلب یہ ہے کہ شہید نبی کے وعدوں کی سچائی پر ایک کامل شاہد ہوتا ہے۔ اور وہ اپنے عمل سے ثابت کر دکھاتا ہے کہ گویا نبی کے وعدوں کو ان دنیوی آنکھوں سے عملاً مشاہدہ کر رہا ہے۔ اسی لئے وہ اتباعِ نبوی میں اپنی گردن کٹانے کو اس قدر لذیذ سمجھتا ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ!

دنیا کا کوئی نیک انسان مرنے کے بعد اس دنیا میں آنے کی تمنا نہیں کرتا مگر شہید وہ چاہتا ہے کہ اسے دوبارہ دنیا میں بھیجا جائے۔ تا کہ پھر وہ پہلے کی طرح اللہ کے رستے میں اپنی گردن کٹوائے اور اسی طرح پھر سہ بارہ زندہ کیا جائے تا کہ راہِ جاناں میں سہ بارہ قربان ہونے کی پرکیف لذت کو چکھے۔

جس طرح صدیق انبیاء علیہم السلام کی قوتِ نظریہ کا کامل پرتو ہوتا ہے۔ اسی طرح شہید ان کی قوتِ عملیہ کا پورا پورا عکس ہوتا ہے۔ جس طرح وہ انبیا علیہم السلام کی باتوں کی بلا تامل تصدیق کرتا ہے۔ اس طرح یہ بھی ان کے ہر ارشاد پر عمل کرنے کے لئے کمر بستہ رہتا ہے۔

صالحین کا بیان:

اب اس کے بعد منعم علیہم کا چوتھا گروہ صالحین کا ہے یہ گروہ انبیاء علیہم السلام کی قوتِ نظریہ وعملیہ کا معتدل عکس ہوتے ہیں۔ ان کی قوتیں اگرچہ صدیق وشہید کی قوتوں سے دوسرے درجے پر ہوتی ہے۔ مگر پھر بھی انبیاء کرام کی اتباع سے یہ اپنے ظاہر و باطن کو ایسا صاف کر لیتے ہیں کہ اگر ایک طرف یہ اعمالِ حسنہ سے مزین ہوتے ہیں۔ تو دوسری طرف ان کا باطن عقائدِ حقہ سے آراستہ۔ ان کا شیوہ صلح کل ہوتا ہے۔ وہ ہر ایک سے نہایت پیار ومحبت سے پیش آتے ہیں۔ اور کسی سے اپنا انتقام لینا جائز نہیں سمجھتے۔

صُلح کُل سے کیا مراد ہے:

صلح کل سے یہ نہ سمجھ لینا کہ وہ صالح وطالح اور نیک و بد سے یکساں سلوک کرتے ہیں۔ اور اُن کا طریقہ ”با مسلمان اللہ اللہ با ہنوداں رام رام“ ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ تو صریح منافقت ہے اسی کو اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں یوں بیان فرمایا ہے!

”وَاِذَا لَقُوا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰی شَیٰطِیْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ۔

(البقرۃ: ۱۴)

یعنی منافقوں کی شان یہ ہے کہ جب وہ مسلمانوں سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے اور جب اپنے خبثا سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ تو اس قسم کی صلح کل تو منافقت ہے نہ کہ مرد صالح کی شان۔

منافقت اور صُلح عام کے فرق کی ایک مثال:

کسی کتاب میں نظر سے گزرا کہ ایک پیر صاحب نے اپنے دو مریدوں کو کسی شہر میں بھیجا اور وصیت فرمائی کہ لوگوں سے صلح آشتی کے ساتھ گذارہ کرنا۔ کچھ زمانہ گذرا کہ دونوں مرید مرشد کی ملاقات کے لئے حاضر ہوئے آپ نے دونوں سے لوگوں کے تعلقات کے متعلق پوچھا۔ ایک مرید نے تو عرض کی کہ حضور، اللہ کے فضل وکرم سے شہر کا ہر چھوٹا بڑا، نیک و بد مجھ سے راضی اور خوش ہے۔ اور آج تک کسی کو بھی مجھ سے شکایت کا موقعہ نہیں ملا۔ دوسرے نے عرض کی کہ حضرت مجھ سے بعض تو راضی ہیں اور بعض ناراض بعض خوش ہیں اور

بعض خفا لیکن میرے دل میں ان کی رنجش سے نہ کچھ انقباض ہوتا ہے۔ اور نہ اثر۔ بلکہ ان کی خفگی کے باوجود میں ان سے اچھے تعلقات رکھتا ہوں۔ اس پر آپ نے پہلے کو فرمایا کہ میاں تیری چال تو منافقانہ ہے کیونکہ نیک تو تیری نیکیوں اور وعظ ونصیحت سے راضی ہوتے ہیں۔ مگر فاسق وفاجر انسان تیرے اس طریق سے کس طرح خوش ہوسکتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ تو مداھنت سے کام لیتا ہے۔ اور ہر ایک کی ہاں میں ہاں ملا دیتا ہے۔ دوسرے سے آپ نے فرمایا کہ تو مخلص اور صالح ہے صالح کا کام یہی ہے کہ وہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرتا رہے۔ اور اس ابلاغ احکام میں اس کے نفس کا کچھ تعلق نہ ہو بلکہ نفس شخصیت، اور ذاتی حملوں سے نہایت بلند و بالا مقام پر بیٹھ کر تبلیغ وارشاد کے فرض کو سرانجام دے۔ جس سے محبت رکھے۔ وہ حب فی اللہ ہو۔ اور جس سے بغض رکھے تو وہ بھی محض دین کے لئے ہو تو اگرچہ یہ بغض ظاہراً بغض نظر آتا ہے مگر حقیقت میں محبت ہے اور یہ محبت ایسی ہے جیسے کہ کسی کو پھوڑا یا پھنسی نکل آتا ہے تو ڈاکٹر نہایت گہرا نشتر لگا کر گندے مواد کو نکال دیتا ہے۔ چھوٹا بچہ اور نادان انسان تو سمجھتا ہے، کہ ڈاکٹر میرے ساتھ دشمنی کر رہا ہے۔ کہ میرے جسم کو نہایت بیدردی اور بے رحمی کے ساتھ چاقو سے کاٹ رہا ہے۔ مگر عاقل انسان خوش ہوتا ہے کہ یہی آپریشن جو اس وقت تکلیف کا باعث دکھائی دیتا ہے۔ آخر کار آرام وراحت کا سبب بن جائے گا۔ سچ ہے۔

طفل مے لرزد زِ نیش احتجام
مادر مشفق ازاں خوش شاد کام

ترجمہ: بچہ سینگی لگانے والے کے نشتر کے ڈر سے لرزتا ہے لیکن مشفق ماں باپ اُس سے خوش اور شاد کام ہوتے ہیں۔

تو صالح کے مصلح عام ہونے کا مطلب نیک و بد کی ہاں میں ہاں ملانا نہیں ہوتا۔ بلکہ جیسے اس کی محبت لِلّٰہ ہوتی ہے۔ ایسے ہی اس کی رنجش بھی فی اللہ ہوتی ہے۔ اور ایسی رنجش جو اللہ کے لئے ہو۔ وہ رنجش کے رنگ میں کامل محبت اور شفقت ہوتی ہے۔

تو اب صِرَاطَ الَّذِينَ أَنعَمتَ عَلَيهِمۡ کا مطلب یہ نکلا کہ اے اللہ ہمیں انبیاء صدیقین، شہدا اور صالحین کا رستہ دکھا۔ گویا دوسرے الفاظ میں اللہ تعالیٰ مصلی کو تلقین فرماتا ہے کہ اے نمازی اگر تجھے صراطِ مستقیم

پر چلنے کی خواہش ہے اور تیرے یہ دعائیہ الفاظ اپنے اندر کچھ حقیقت رکھتے ہیں تو تجھے چاہیے کہ ان چار منعم علیہم فرقوں کے طریقِ عمل کو اپنا رہنما بنا۔ اور ان کے اسوہ حسنہ سے سبق سیکھ کر ان کے چلے ہوئے رستے پر چلنے کی کوشش کر۔ کیونکہ انہی کا رستہ صراطِ مستقیم اور سبیلِ قویم ہے۔

منعم علیہم فرقوں کے رستوں پر چلنے کی تشریح:

مثلاً جس طرح انبیاء علیہم السلام نے تبلیغِ حق کے لئے دنیا کی مخالفتوں کو برداشت کیا۔ امر بالمعروف کی پاداش میں پتھر کھائے گھر سے بے گھر ہوئے، آگ میں ڈالے گئے، آروں سے چیرے گئے، مگر خدا کے احکام کو ہر حال میں لوگوں تک پہنچا دیا۔ اسی طرح تو بھی تبلیغِ حق کے لئے مخالفتوں کی بوچھاڑ کا مقابلہ کر نیک باتوں کو جس طرح بنے لوگوں تک پہنچا اور اس پہنچانے میں اگرچہ تجھے تکلیف دی جائے۔ ذلیل کر کے جلا وطن کر دیا جائے۔ مگر تیرے پاؤں انبیاء کرام کی اتباع میں جادۂ استقامت سے ذرہ برابر لڑکھڑانے نہ پائیں۔ پھر صدیقین کی طرح تمام تکالیف کا مقابلہ کر کے پیغمبر کی معیت حاصل کرنے کو اپنا فخر جان۔ اور پیغمبر کی معیت یہی نہیں کہ تو جسماً ان سے قریب ہو۔ بلکہ روحانی اور تقلیدی قرب بھی ایک نہایت شاندار معیت ہے۔ اس واسطے ان کی اتباع میں اگر کچھ تکلیف پہنچے تو اسے بطیب خاطر برداشت کر۔ مگر ان کی روحانی معیت کو کسی حال میں مت چھوڑ۔ اس کے بعد اگر اسلام کو تیرے مال یا جان کی ضرورت پڑے۔ تو تجھے چاہیے کہ شہداء کرام کی زندگیوں کو پیش نظر رکھ کر اپنے مال و جان کو دین کی عزت کے لئے قربان کر۔ کیونکہ انسان کو چار چیزیں ایسی عطا ہوئی ہیں کہ ان میں سے ایک کے ذریعے دوسری کی حفاظت کی جاتی ہے۔

چار چیزیں جو ایک دوسرے کی حفاظت کرتی ہیں:

وہ چار چیزیں کہ جن میں سے ایک سے دوسرے کی حفاظت کی جاتی ہے یہ ہیں: ایک مال، دوسرے جان، تیسرے عزت اور چوتھے ایمان۔ ان چاروں میں سے مال سب سے زیادہ ادنیٰ اور ایمان سب سے اعلیٰ درجہ کی چیز ہے۔ اس واسطے حکم ہے کہ اگر کوئی شخص مال کو خرچ کر کے اپنی جان کو بچا سکے تو اسے چاہیے کہ مال کو جان کی حفاظت کے لئے قربان کر دے۔ مثلاً ایک شخص بیمار ہے اور مرض کی تشخیص اور علاج کے لئے ڈاکٹر کو کچھ دینا پڑتا ہے تو مال کو جان کی خاطر صرف کرنے سے دریغ نہ کرے۔ یا ڈاکو اور

لٹیرے اسے مارنا چاہتے ہیں مگر وہ مال دیکر اپنی جان بچا سکتا ہے تو اسے چاہیے کہ مال دیکر اپنی جان بچائے۔ اس کے بعد عزت ہے اگر کسی کا مال اور جان دونوں جاتے ہوں مگر اس کی عزت محفوظ رہتی ہو تو اسے چاہیے کہ اپنی عزت بچانے کے لیے مال اور جان دونوں کو خرچ کر ڈالے اس کے بعد ایمان ہے یہ ایسی قیمتی چیز ہے کہ اگر اس کی حفاظت کے لئے مال جان اور عزت تینوں قربان ہوتی ہوں تو چاہیے کہ تینوں کو قربان کر کے اس دُرِّ یگانہ کو محفوظ رکھنے کی کوشش کرے یہ ہے تو سب کچھ ہے، اور یہ نہیں تو سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں۔ اسلئے شہداء کرام دین کی حفاظت کے لئے کہ منبع ہے ایمان کا۔ اپنے مال جان اور عزت سب کچھ قربان کر دیتے ہیں۔

مگر بھائیو! آج ہمارا معاملہ تو اس بیان کے بالکل الٹا نظر آتا ہے۔ آج اگر ایک معاملے میں ایمان اور مال کا مقابلہ ہوتا ہے۔ تو ہم مال پر ایمان کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ مال پر ایمان کو قربان کرنا نہیں کہ ہم دنیا کی چند خسیس کوڑیوں کے کمانے کے لئے محض گاہکوں کو دھوکا دینے کے لئے جھوٹی قسمیں کھاتے ہیں۔ ایمان کے واسطے دے کر مکر و فریب سے کچھ کما لینا آج ہمارے نزدیک نہایت چالاکی اور کمال سمجھا جانے لگا ہے۔ اسی طرح اگر جان یا عزت کے ساتھ مال کا مقابلہ ہوتا ہے۔ تو وہاں پر بھی ہم مال پر ان دونوں کو بلا دریغ قربان کر دیتے ہیں۔ کیونکہ آج ہماری زندگی کا مفہوم سوائے کسبِ مال کے اور کچھ رہا ہی نہیں۔ لیکن بھائیو! یہی مفہوم غلط ہے اللہ تعالیٰ نے ہماری زندگی کے مفہوم کو ”وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَ الْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ۝ میں مفصل و مصرح بیان فرما دیا ہے۔ اور چونکہ عبادت مصدر ہے ایمان کا۔ تو گویا ہماری زندگی کا صحیح مفہوم حفاظتِ ایمان اور صیانت دین ہے۔

خلاصہ کلام:

اب جب مصلی انبیاء علیہم السلام کی طرح تبلیغ حق میں ثابت قدم رہنے کا تہیہ کر لیتا ہے۔ پھر اس فیصلے کے بعد وہ صدیقین کی طرح ان کے رنگ میں رنگے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ اور پھر اس علمی کوشش کے ساتھ ساتھ شہداء کی طرح عملی قدم بھی اٹھاتا ہے۔ تو اب اسے گروہ صالحین کے ساتھ مل جانے کا ارشاد ہوتا ہے۔ جہاں پر کہ وہ بیک وقت صدیقین و شہداء کی قوت نظریہ و عملیہ کو بالاعتدال استعمال کر کے

ظاہر و باطن کو تزکیہ و تصفیہ سے مزین کرلیتا ہے۔

تو خلاصہ کلام یہ ہوا کہ نمازی نے جب ”اهدِنَا الصِّرَاطَ المُستَقِيمَ ()“ کی التجا کی تو اسی کی زبان سے صراط مستقیم کی توضیح ”أَنعَمتَ عَلَيهِمْ“ سے کردی گئی۔ اور پھر ”أَنعَمتَ عَلَيهِمْ“ کی تفسیر ”القرآن يفسر بعضه بعضا“ کے مطابق دوسری جگہ ”مِّنَ النَّبِيِّينَ وَالصِّدِّيقِينَ وَالشُّهَدَاء وَالصَّالِحِينَ“ کے ساتھ کرکے یہ ارشاد فرمادیا کہ صراطِ مستقیم انہی چار گروہوں کی اتباع میں منحصر ہے۔ اس واسطے صراطِ مستقیم کے متلاشی کو چاہئے کہ وہ ان گروہوں کے چلے ہوئے رستوں پر گامزن ہوتا کہ بلاتکلف منزلِ مقصود اور قصدِ مطلوب تک پہنچ سکے۔

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلاَ الضَّالِّيْنَ ()۔ نہ رستہ ان لوگوں کا جن پر غضب کیا گیا ہے۔ اور نہ گمراہوں کا:

اس سے پہلے بیان ہوچکا ہے۔ کہ صراطِ مستقیم نام ہے معتدل اور بین بین رستے کا یعنی وہ رستہ جو افراط و تفریط، زیادتی اور کمی سے پاک ہو۔ اب اگرچہ صراطِ مستقیم کی توضیح ”صِرَاطَ الَّذِينَ أَنعَمتَ عَلَيهِمْ“ سے کردی گئی تھی۔ مگر چونکہ اس حاضری، عبادت اور دعا کا مقصود صرف صراطِ مستقیم کی طلب تھی۔ اس لئے باری تعالیٰ صراطِ مستقیم کے دونوں پہلو یعنی افراط و تفریط کو بیان فرما کر مزید وضاحت فرماتے ہیں تاکہ سالک کو راہ میں کسی قسم کا ابہام نہ رہے اور مستقیم رستہ غیر مستقیم کے ساتھ مشتبہ نہ ہوجائے۔

سب سے پہلے تفریط کے پہلو کو المغضوب کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ یعنی نہ رستہ ان لوگوں کا جن پر آپ نے غضب نازل فرمایا۔ غضب کے معنی ہیں سزا کے ارادے سے خون کا جوش مارنا۔ مگر چونکہ اس جگہ یہ لفظ اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہے۔ اس لئے یہاں اس سے صرف اس کی غایت اور غرض مراد ہے یعنی سزا، عتاب اور عقاب وغیرہ۔

اس کے بعد ضالین میں افراط کی جانب کو بیان فرمایا گیا ہے۔ یعنی نہ رستہ ان لوگوں کا جو گمراہ ہیں۔ ضالین جمع ہے ضال کی اور ضال مشتق ہے ضلال سے جس کے معنی ہیں۔ سیدھی راہ سے ہٹ جانا خواہ عمداً ہو یا سہواً۔

یا سلوك طريق لا یوصل الی المطلوب۔

یعنی ایسے رستے پر چلنا جو مقصود تک نہ پہنچائے۔ پس ضالین وہ لوگ ہیں جو سیدھی راہ سے بھٹک گئے یا ایسے راہ پر چلے جو انہیں مطلوب تک نہیں پہنچاتا۔

اب جب یہ سب تشریح سمجھ گئے۔ اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ صراطِ مستقیم نام ہے راہِ اعتدال کا۔ اور پھر وہ رستہ قرآن پاک کی رو سے انبیاء صدیقین، شہدا اور صالحین کا رستہ ہے۔ تو اب یہ سمجھو کہ اس رستے میں افراط اور تفریط کیا ہے۔ اور پھر تفریط والے فرقے کو مغضوب علیہم اور افراط والے کو ضالین کیوں کہا جاتا ہے۔

صراط مستقیم میں افراط و تفریط اور اس کا یہودو نصاریٰ پر انطباق:

صراطِ مستقیم یا مذکورہ منعم علیہم فرقوں کے متعلق تفریط تو یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام کی تکذیب کرے ان کے قتل کے درپے ہو۔ ان کی شریعتوں کی نافرمانی کرے۔ اور ان کی شان کو ان کے اصلی مرتبہ سے گھٹائے۔ اور افراط یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو خدا بنالیا جائے ان کے شرعی احکام میں غلو اور مبالغہ کر کے ان کی اصلی شکل کو بگاڑ دیا جائے۔ اور ان کی شان کو حقیقت سے بڑھا کر کہیں کا کہیں پہنچا دے۔ اب چونکہ تفریط کی تمام شکلیں یہودیوں میں پائی جاتی ہے۔ اور افراط کی عیسائیوں میں۔ اس لئے محققین نے مغضوب علیہم سے مراد یہود اور ضالین سے مراد نصاریٰ لئے ہیں۔ اس کے علاوہ خود قرآن پاک دوسرے متعدد مقامات پر ان دونوں فرقوں کو قریب قریب انہی ناموں سے تعبیر فرماتا ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں یہودیوں کے متعلق ارشاد ہے!

’’وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ بِغَيْرِ الْحَقِّ ؕ۔

(البقرۃ:۶۱)

یعنی وہ اللہ تعالیٰ کے غضب کے مستحق ہوئے کیونکہ وہ اللہ کی نشانیوں کا انکار کرتے تھے۔ اور انبیاء علیہم السلام کو ناحق قتل کرتے تھے۔

اسی طرح نصاریٰ کے متعلق فرماتے ہیں!

”قُلْ يَاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّ ضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۝“۔ (المائدہ: ۷۷)

یعنی اے اہلِ کتاب اپنے دین میں ناحق غلو نہ کرو، اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو پہلے گمراہ ہوئے۔ اور بہتوں کو گمراہ کیا اور سیدھے رستے سے بھٹک گئے۔

قرآنِ پاک میں اس کے علاوہ اور بھی ایسی بہت سی آیتیں ہیں جن میں یہود کو مغضوب علیہم اور نصاریٰ کو ان کی کرتوتوں کی وجہ سے ضالین کہا گیا ہے۔

تو خلاصہ کلام یہ کہ نمازی کی زبان سے ”غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝“ کہلا کر اسے تلقین کی جا رہی ہے کہ اگرچہ صراطِ مستقیم انبیاء صدیقین، شہدا اور صالحین کا رستہ ہے۔ مگر بعض حرص و ہوا کے بندوں نے اپنے غیر مستقیم رستوں کو ان کی طرف منسوب کر کے انہیں بھی صراط مستقیم سمجھا ہوا ہے۔ حالانکہ وہ رستے یا تو افراط میں مبتلا کر دیتے ہیں یا تفریط میں۔ اس لئے تجھے چاہیے کہ اس رستے کو اختیار کرے جس میں نہ افراط، نہ غلو ہے نہ تکذیب۔ بلکہ منقیٰ، مصفیٰ اور سیدھا رستہ ہے۔

انسان تمام کام دو خیالوں کے ماتحت کرتا ہے:

اس کے علاوہ اگر غور کرو تو انسان اپنے تمام کاروبار اور حرکات و سکنات دو خیالوں کے ماتحت کرتا ہے۔ ایک جلبِ منفعت (**نفع حاصل کرنا**) اور دوسرے دفعِ مضرت (**نقصان دور کرنا**) کے لئے۔ جب طبیعت میں کسی چیز کی خواہش پیدا ہو یا نفس کو کسی قسم کی ضرورت ہو اور ہم اس ضرورت کو پورا کرنے کے لئے اپنی قوتِ عمل کو کام میں لائیں۔ تو یہ جلبِ منفعت کہلاتا ہے۔ جلبِ منفعت کا منبع شہوت یا خواہش ہے جب قوتِ شہوی کسی چیز کا تقاضہ کرتی ہے۔ مثلاً بھوک یا پیاس لگتی ہے۔ تو قوتِ عمل حرکت میں آ کر اس کے تقاضے کو پورا کر دیتی ہے۔ اگر انسان کے اندر یہ قوت نہ ہو تو انسان قطعاً کسی کام کو ہاتھ نہ لگائے اور یہ دنیا کا نظام تھوڑے ہی دنوں میں تباہ ہو جائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی جلبِ منفعت کے لئے جو اسباب ہم پیدا کرتے ہیں۔ اگر دشمنوں کے ہاتھوں سے محفوظ نہ رکھ سکیں تو سب محنت بیکار رہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ان اسباب کی حفاظت اور جلبِ منفعت کے رستے میں جو موانع پیش آئیں۔ ان کو دور کرنے کے لئے ایک اور قوت

عنائت فرمائی ہوئی ہے۔ جس کا نام قوتِ غضبی ہے اسی قوت کے ماتحت انسان کے تمام مدافعانہ افعال سر زد ہوتے ہیں اگر انسان کو یہ قوت نہ دی جاتی تو وہ کبھی بھی قوتِ شہوی کے پیدا کردہ اسباب سے تمتع حاصل نہ کر سکتا۔

تفریط وافراط والے مغضوب علیہم وضالین کیوں ہیں؟

اب جب آپ یہ سب کچھ تشریح سمجھ چکے۔ تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ کامل انسان وہی ہوتا ہے۔ جو ان دونوں قوتوں کو حدِ اعتدال سے متجاوز نہ ہونے دے۔ بلکہ ان کو ان کے مناسب مقام پر اور صحیح محل میں استعمال کرتا ہے۔ لیکن اگر وہ جلبِ منفعت کے لئے حدِ اعتدال کو چھوڑ دے اور حرام وحلال طیب ونجس اور اپنے اور غیر کے فرق وامتیاز کو نظر انداز کر دے۔ تو اس عدول وتجاوز کے باعث عربی میں اسے ضال کہتے ہیں۔ جس کی جمع ہے ضالین۔ اور پھر جلبِ منفعت کے اسباب کی نگہداشت میں وہ ایک خونخوار درندہ اور سفاک ظالم بن جائے اور ایک کے بدلے میں دس کو قتل کرے یا ایک پیسے کے انتقام میں دوسروں کے سینکڑوں پر پانی پھیر دے۔ تو اس وقت اس شخص کو قوتِ غضبیہ کا غلام کہا جاتا ہے۔ اور چونکہ اس کے افعالِ غضبیہ منتقمِ حقیقی کے غصے کا باعث ہوتے ہیں۔ اس لئے وہ مغضوبٌ علیہ بن جاتا ہے جو مفرد ہے مغضوبٌ علیہم کا۔ تو گویا نمازی دعا کرتا ہے کہ اے اللہ مجھے غضب زدوں اور گمراہوں کے رستے سے بچا اور طاقت دے تاکہ میں افراط وتفریط سے بچ کر قوائے غضبیہ وشہویہ کے معتدل اور مستقیم رستے پر چل سکوں۔

سورۂ فاتحہ کے اختتام پر آمین کہنا سنت ہے:

امین۔ اے اللہ ہماری دعا قبول فرما۔ امین اسم فعل ہے اور اس کا معنی ہے استجب یعنی اے اللہ ہماری دعا قبول فرما۔ یہ لفظ بالاتفاق قرآن پاک سے نہیں۔ مگر سنت ہے کہ سورۂ فاتحہ پڑھنے کے بعد آمین کہی جائے۔ کیونکہ حضور ﷺ فرماتے ہیں!

”علمنی جبریل آمین عند فراغی من قراءۃ الفاتحۃ۔

(روح البیان: ج ۱، سورۃ الفاتحہ، دار الاحیاء التراث العربی)

یعنی جبرئیل نے فاتحہ کی قرأت کے بعد مجھے آمین کہنا سکھایا۔

دوسری حدیث ہے!

”إِذَا قَالَ الإِمَامُ {غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ ، وَلاَ الضَّالِّينَ} فَقُولُوا آمِينَ فَمَنْ وَافَقَ قَوْلُهُ قَوْلَ الْمَلاَئِكَةِ غُفِرَ لَهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْبِهِ۔

(صحیح بخاری: جز،۶، رقم: ۴۴۷۵، کتاب بدء الوحی، طبع دار الشعب قاھرہ)

یعنی جب امام غیر المغضوب علیھم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہا کرو۔ اور جس کی آمین فرشتوں کی آمین کے ساتھ موافق ہو جاتی ہے۔ تو اس کے تمام صغیرہ گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

سورہ فاتحہ کی فضیلت اور بعض مجرب اوراد:

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ سورہ فاتحہ کی تفسیر کو تین مہینے متواتر بیان کرنے کے بعد آج اختتام پر پہنچایا ہے۔ اگر چہ اس میں بہت سی غیر متعلق باتیں بھی بیان ہوتی گئیں۔ مگر سلسلہ ایسا چھڑ جاتا تھا کہ بلا تکلف مضمون خود بخود اس طرف پہنچتا تھا۔ جس کے لئے اس غیر متعلق بات کو چھوڑ کر صرف موضوع میں مقید رہنا نہایت دشوار ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ یہ ایسے مرتبط اور منظم طریقے سے خود بخود چلا آتا تھا کہ اگر اس کو نظر انداز کر دیا جاتا تو بیان کی لذت زائل ہونے کے علاوہ مضمون بالکل روکھا اور غیر مرتبط سا معلوم ہوتا۔ پھر ساتھ ہی وہ غیر متعلق نکات میرے نقطۂ نظر میں ایسے اہم، مفید اور ضروری تھے، کہ ان کا چھوڑنا گویا واعظانہ تقریر تفسیر کے رنگ کو بدل دینا تھا۔ بہر حال باری تعالیٰ کا بے پایاں شکر یہ کہ جس نے اس قدر مجھے اور سامعین کو قرآنِ پاک کے ذکر سماع میں مشغول رکھا اور یہ ایک نہایت زبردست نعمت ہے۔ کہ اس وقت جبکہ دوسرے لوگ سینما اور تھیٹر میں اور فضول دنیاوی کاموں میں اپنے عزیز اوقات اور اموال کو ضائع کر کے نیکی برباد گناہ لازم کا مصداق رہے ہوں۔ تو ایک فرقہ اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب کے ذکر و فکر میں مشغول نظر آئے۔ اے اللہ ہم سب کو اس قرآن پاک کی برکت سے عزتِ دارین دے اور ہمارے دنیوی اور اخروی مقاصد کو اس کے طفیل پورے فرما۔

”یَّقُوۡلُ رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنۡیَا حَسَنَۃً وَّ فِی الۡاٰخِرَۃِ حَسَنَۃً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ“۔

(البقرۃ:۲۰۱)

اے ربّ ہمارے ہمیں دنیا میں بھلائی دے اور ہمیں آخرت میں بھلائی دے اور ہمیں عذابِ دوزخ سے بچا۔

آخر میں میں سورۃ فاتحہ کے چند ایک مجرب اُوراد بیان کر دیتا ہوں تاکہ اگر کوئی صاحب عمل کر کے فائدہ اٹھانا چاہے تو اٹھا سکے۔ یہ تمام اوراد تجربہ کئے ہوئے ہیں اور ان کا اثر تیر بہدف ہے۔

(۱) عشاکی نماز کے بعد سونے سے پیشتر ایک دفعہ سورۃ فاتحہ اور ایک دفعہ سورۃ اخلاص پڑھنا سوائے موت کے ہر ایک بلا سے مامون رکھتا ہے۔

(۲) عشاکی دوسنتوں کے بعد وتروں سے پہلے سورۃ فاتحہ کو دوسو ساٹھ دفعہ روزانہ دوسو ساٹھ دن تک پڑھنا غنائے ظاہری و باطنی کے لئے نہایت آزمودہ ہے۔

(۳) اگر کسی کو تیجے کا بخار ہو تو بخار آنے سے دو گھنٹے پہلے روئی کے دو پھوئے لے کر ایک پر سات دفعہ الحمد پڑھے اور دوسرے پر چھ دفعہ۔ سات دفعہ والے کو دائیں کان میں رکھے۔ اور دوسرے کو بائیں کان میں۔ انشااللہ بخار آنا بند ہو جائے گا۔

(۴) اگر کسی کو سانپ کاٹے تو الحمد کو دودھ پر اکیس دفعہ پڑھ کے اس میں لہسن پیس کر مار گزیدہ کو پلاؤ۔

(۵) اگر کسی کا کوئی نوکر یا غلام لاپتہ ہو اور باوجود تفتیش کے نہ ملے تو کسی پرانے تالے پر ۲۱ دفعہ سورہ الحمد کو پڑھ کر دم کیا جائے پھر اس کی کسی کوری ہانڈی میں پانی سے بھر کر آگ پر گرم کرے۔ صبح سے شام تک روزانہ اس کے نیچے آگ جلایا کرے۔ انشااللہ تیسرے دن اس کا پتہ مل جائے گا۔ یا وہ خود واپس چلا آئے گا۔

(۶) اکیس دانے گندم کے لے کر ان پر اکیس اکیس دفعہ الحمد پڑھے۔ پھر ان کو ایک پیالی دودھ میں ڈال کر آگ پر پکائے اور ملے۔ جب پک کر دانے اس میں غائب ہو جائیں۔ تو پھر اس دودھ کو ذرا ذرا زوجین گیارہ دن تک چاٹیں۔ انشااللہ ان ایام کی خلوت ضرور بار آور ہوگی۔

یہ چھ اعمال نہایت مجرب اور تیر بہدف ہیں۔ میں تمام مسلمان بھائیوں کو اس کی لِلّٰہ اجازت دیتا ہوں۔ تاکہ وہ ان کو عمل میں لا کر ان کے فیوضات سے متمتع ہو سکیں۔

خاتمہ ودعا:

سب حضرات درود شریف پڑھیں اور دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمارے تمام صغیرہ وکبیرہ گناہوں کو اس ذکر کی برکت سے معاف فرمائے۔ اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اس وقت تک جس قدر مسلمان اور مسلمات فوت ہوئے ہیں۔ ان کی مبارک روحوں کو اس ثواب پہنچائے۔ خصوصاً حضور پرنور سید المرسلین ﷺ کے روح پرفتوح کو۔ سب سے آخر میں میرے والدِ ماجد حضرت مولانا قاضی غلام جیلانی صاحب مرحوم ومغفور کے لئے دعا فرمائیں۔ جن کے طفیل اس ناکارہ وسیہ کار کو بہت کچھ ظاہری وباطنی فائدے حاصل ہوئے ہیں۔

اللھم صلی علیٰ سیدنا ومولانا محمد صلوۃ تنجینا بھا من جمیع الاھوال والافات وتقضی لنا بھا من جمیع الحاجات وتطھرنا بھا من جمیع السیئات و ترفعنا بھا عندك اعلی الدرجات وتبلغنا بھا اقصی الغایات من جمیع الخیرات فی الحیوت وبعد الممات انك علی کل شئ قدیر۔ اللھم ایقظنا بجاہ نبیك من سنة الفضلات۔ وارزقنا التیقظ فیما بقی والتدکر لما قد فات وھا انا اختم الکتاب علی ھذہ الأبیات۔

ترجمہ: اے اللہ ایسی رحمت نازل فرما ہمارے آقا ومولا محمد ﷺ پر جس سے تو ہمیں تمام ڈر اور خوف سے نجات دے اور جس کی برکت سے تُو ہماری تمام حاجات کو پورا فرما دے اور جس کی بدولت تو ہمیں تمام گناہوں سے پاک کر دے اور جس کے وسیلہ سے ہم تیری بارگاہ میں اعلیٰ درجوں پر متمکن ہوں اور جس کے ذریعے سے تو ہمیں زندگانی اور مرنے کے بعد کی تمام نیکیوں اچھائیوں میں سے بدرجہ غائت بلندیوں تک پہنچا دے۔ تحقیق تو ہی ہر چیز پر قادر ہے۔ اے اللہ ہمیں اپنے نبی ﷺ کی شان کے صدقے سے غفلتوں کی نیند سے بیدار کر دے اور باقی زندگی میں بیداری نصیب فرما اور جو فوت ہوا ہے یعنی گزر چکا ہے اس سے نصیحت حاصل کرنے کی توفیق عطا فرما۔ اور اب میں ان اشعار پر اس کتاب کو ختم کرتا ہوں

یامن یرجی للشدائد کلھا   یامن الیه المشتکی والمفزع
یامن خزائن رزقه فی قول کن   امنن فان الخیر عندک اجمع

مالی سوی فقری الیک وسیله   فبالافتقار الیک فقری ادفع
مالی سوی قرعی لبابک حیلة   فلئن رددت فای باب اقرع
ومن الذی ادعوا واهتف باسمه   ان کان فضلک عن فقرک یمنع
حاشا لجودک ان تقظ عاصیاً   الفضل اجزل والمواهب اوسع

ترجمہ: اے وہ ذات جس کی تمام سختیوں میں اُمید کی جاتی ہے اور جس کی طرف شکایت کی جاتی ہے اور اُسی کی پناہ لی جاتی ہے۔ اے وہ ذات جس کے ایک قولِ کُن میں رزق کے سب خزانے ہیں۔ احسان فرما، سب بھلائی تیرے پاس جمع ہے۔ میرے لیے تیری طرف محتاجی کے سوا کوئی وسیلہ نہیں، پس تیری طرف محتاج ہونے کے ساتھ میں اپنے فقر کو دور کرتا ہوں، میرے واسطے تیرا دروازہ کھٹکھٹانے کے سوا کوئی حیلہ نہیں، پس اگر تو نے مجھے لوٹایا تو میں کس کا دروازہ کھٹکھٹاؤں گا۔ اور میں کس سے مانگوں گا اور کس کا نام پکاروں اگر تیرا فضل تیرے فقر سے منع کرے۔ تیرے جود وسخا سے یہ بعید ہے کہ وہ کسی عاصی گناہ گار کو ضرب لگائے (اور اسے محروم کردے) تیرا فضل بہت بڑا ہے اور تیری عطائیں بہت وسیع ہیں۔

خادمِ دین
قاضی انوار الحق
لارنس مارکوئس (افریقہ)
مورخہ ۱۸ جولائی ۱۹۳۹

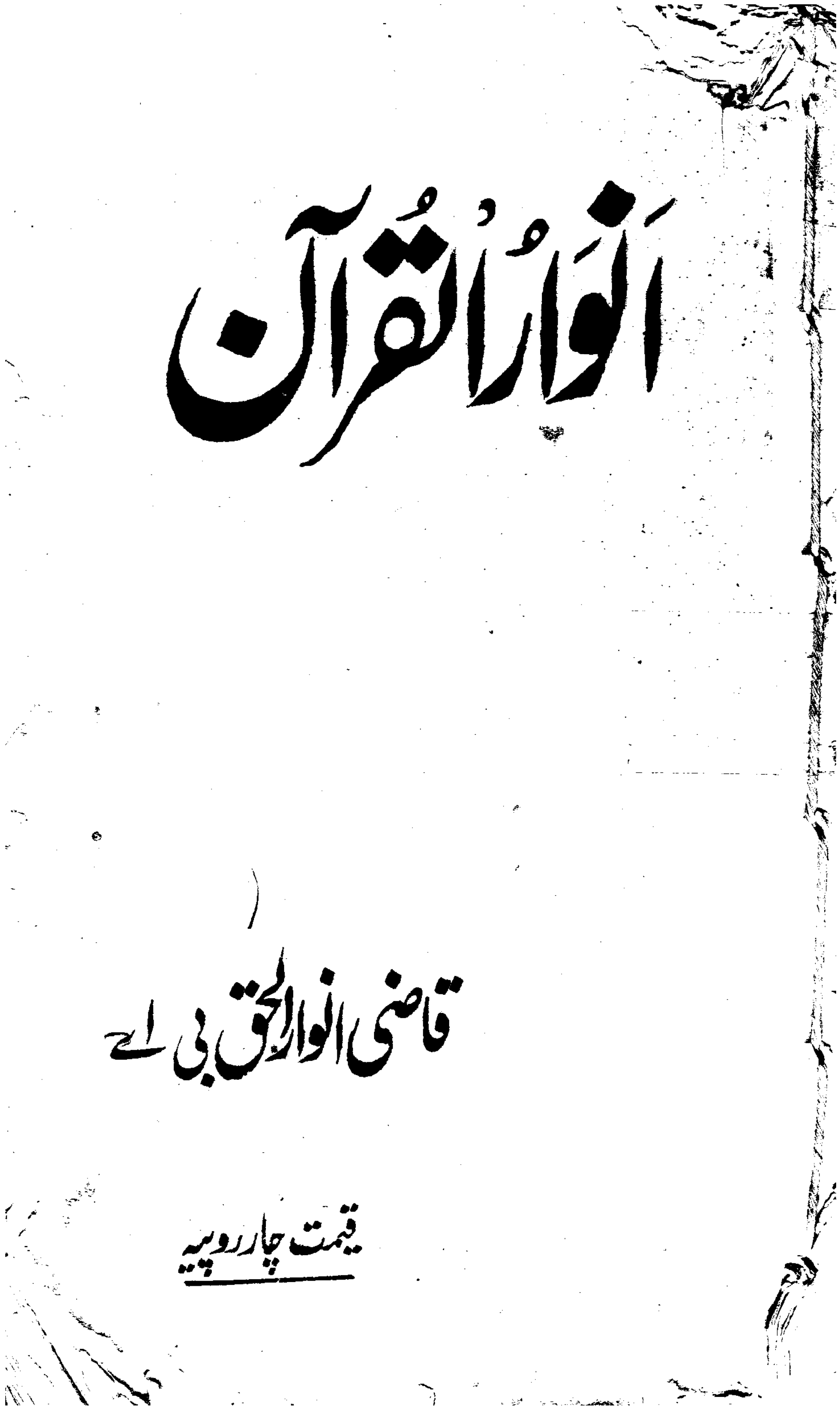

اَنوَارُ القُرآن

قاضی انوار الحق بی اے

قیمت چار روپیہ

جملہ حقوق محفوظ ہیں

(۷۸۶)

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ أُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ إِلَى الْخَيْرِ وَيَأْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ

انوارُ القرآن

مُصَنَّفَہ

علامہ مفتی انوارُ الحق صاحب بی۔ اے منشی فاضل
فاضل دارالعلوم فتحپوری دہلی
و مبلغ اسلام پرتگالی و جنوبی افریقہ

جسے

مولانا ابوالضیا نور الاسلام
شمس آباد ضلع کیمل پور (پنجاب)

نے شائع کیا

ول
تعداد
قیمت

اِتحاد پریس پُل روڈ لاہور میں

باہتمام شیخ امین الدّین پرنٹر چھپی اور مولانا ابو الضیا نُور الاسلام پبلشر نے
شمس آباد ضلع کیمل پور (پنجاب) سے شائع کی ۔